

# مسلم فکر کی قرآنی جہات

ڈاکٹر عبد الحفیظ فاضلی

سابق چیئرمین شعبہ فلسفہ، جامعہ پنجاب لاہور۔

عبوری صدر پاکستان فلسفہ کا نگریں برائے سال 2012

جزل سیکریٹری فاضلی فاؤنڈیشن (1986-2016)

سیکریٹری پبلیکیشنز، آسانیاں، (2017-)

Author of The Qur'anic Theology, Philosophy And Spirituality (2016)

hafeez.fazli@gmail.com



آسانیاں پبلیکیشنز

یا اللہ آسانیاں عطا فرما اور آسانیاں تعمیم کرنے کا شرف بخش۔

## جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

All rights reserved. No part of this book may be reproduced in any form or by any means, electronic or mechanical, including photocopying, recording or by any information storage retrieval system, without prior permission of the publisher except for the brief quotations in critical reviews or articles.

ISBN: 978-969-9325-43-4

کتاب: مسلم فکر کی قرآنی جہات

مصنف: ڈاکٹر عبدالحفیظ فاضلی

+92 300 4550698

[hafeez.fazli@gmail.com](mailto:hafeez.fazli@gmail.com)

آسانیاں پبلیکیشنز: قرآنی فکر و فلسفہ سیریز نمبر 1

رابطہ: بک ٹرینڈ، خالد بلازا، اردو بازار لاہور

Book Trend, Urdu Bazar, Lahore.

042-37324130

+92 333 4812884

بار اول: جنوری 2018ء

تعداد: 700

طباعت و پیشگوئی: پنجاب یونیورسٹی پرنس لاهور

قیمت: - / 1000 روپے

ضخامت: 360 صفحات

فرمانِ الٰہی کے مطابق قرآن پاک قول ہے اور 'الحق' ہے۔ مثلاً، أَلْحُقُّ مِنْ تَبِعِكَ فَلَا تَكُونُ مِنَ الْمُفْتَرِينَ۔ الحق تھارے رب کی طرف سے ہے۔ تو شک لانے والوں میں سے نہ ہونا۔ (القرآن، 3:60) أَلْحُقُّ مِنْ تَبِعِكَ فَلَا تَكُونُ مِنَ الْمُفْتَرِينَ۔ الحق تھارے رب ہی کی طرف سے ہے، تو شک لانے والوں میں سے نہ ہو۔ (القرآن، 2:147) وَالَّذِينَ أُنْذِلُوا إِلَيْكَ مِنْ تَبِعِكَ الْمُتَّقِيُّونَ۔ اور جو کچھ آپ کی طرف آپ کے رب سے نازل ہوا وہ حق ہے۔

(القرآن، 13:1) قرآن پاک کے حوالے سے بات کرنا، سد (authority) کے ساتھ بات کرنا ہے۔ حال پر صرف قرآن پاک ہی سند کا درج رکھتا ہے۔ کسی بھی نظریہ، اصول، عقیدہ، روایت، ارشاد، قول، گمان، خیال، احساں، وہم، قیاس، تصور، تخلیل، تاثیر، وجود ان، واردات، حال، کشف، شہود، تشریح، تعمیر کی صداقت کا حقیقتی معیار قرآن پاک ہی ہے۔ قرآن پاک جس کی تصدیق کرتا ہے وہ حق ہے، جس کو رد کرتا ہے وہ بغیر الحق ہے۔

(القرآن، 3:154, 3:21, 2:61) قرآن پاک کے حوالے کے بغیر کی گئی بات مغض رائے، قیاس، گمان یا ظن کا درج رکھتی ہے، اللہ کا فرمان ہے: "اور ظن کسی کو حق سے مستغنی نہیں کر سکتا۔" (القرآن، 53:28)

(القرآن، 10:36) فرمانِ الٰہی سے انحرافِ العدل (گمراہی) ہے۔ فرمایا گیا ہے: "الحق کے بعد ہے ہی کیا گمراہی۔"

(القرآن، 10:32) قرآن پاک کے مقابل نظریات باطل ہیں۔ (القرآن، 17:81, 21:18) فرمانِ الٰہی ہے: "اور فرمادیجئے، کہ حق آیا اور باطل مٹ کیا، بے شک باطل کو مناہی تھا۔" (القرآن، 17:81) اللہ کے بارے میں بے سند بات کرنا اللہ پر افتراء باندھنا (concoction) ہے، اور اس سے منع فرمایا گیا ہے۔ (القرآن، 4:171) حکمِ الٰہی ہے: "... اور اللہ پرنہ کہو گمراہ حق ... " (۳:۱۷) فرمانِ الٰہی کو لپی نواعش کے مطابق بانا فتن ہے، اور اللہ فاسق ہی کو گراہ کرتا ہے۔ حق اور ناحق کے درمیان فرق کرنے کی کسوٹی بھی فرقان ہے۔ اعمال کی قدر کے تعین کامیز ان بھی یہی ہے۔ "قرآن عربی وہ کتاب ہے جس کی آیات کو علم والے لوگوں کیلئے مفصل فرمایا گیا ہے۔ یہ حضور ﷺ کی مغض داستان انذار ہی نہیں، بشارت اور انذار دونوں پر مشتمل ہے،" (القرآن، 41:3-4)

”نَبِيٌّ كَرِيمٌ عَلَىٰ تَعْلِيقٍ تَامٌ بْنِ آدَمَ كَلِيلَةَ اللَّهِ كَيْمَانِ عَبْدِيَّتِ كَامِيَارِ مَطْلُقِ بَيْنِ۔ اللَّهُ تَعَالَى نَفَرَ ’عَبْدَهُ‘، كَمْهَ كَرَ اپْنَےِ مَحْبُوبِ پَاکَ کَےِ عَبْدِيَّتِ كَامِيَارِ مَطْلُقِ ہُونَےِ کَیِ تَصْدِيقِ فَرْمَائِیِ ہے۔ (القرآن، 17:1، 25:1) اللَّهُ کَےِ مَحْبُوبِ بَنْدُوں کَیِ صَفَاتِ جَسْ أَكْمَلَ دَرْجَےِ مِنْ حَضُورِ نَبِيٍّ كَرِيمٍ عَلَىٰ تَعْلِيقٍ مِنْ مِنْ پَائِیِ جَاتِیِ ہیں، وہ کسی اور میں نہیں پائی جا سکتیں۔ اپنےِ مَحْبُوبِ پَاکَ کَوْ یہِ صَفَاتِ خَوَدِ اللَّهِ تَعَالَى نَفَرَ اعْنَاطَتِ فَرْمَائِیِ ہیں۔ مُحْسِنِ کو یہِ صَفَاتِ حَالِ پَرِ اللَّهِ کَےِ مَحْبُوبِ سَعْدَتِ عَطَا ہوتی ہیں۔ حَضُورُ نَبِيٍّ پَاکَ عَلَىٰ تَعْلِيقٍ، اللَّهُ کَےِ مَحْبُوبِ تَرِینِ بَنْدَےِ اورِ رُوْشَنِ چَراغِ ہیں۔“

---

انسان ‘خَلِيقَةُ اللَّهِ فِي الْأَرْضِ‘، نہیں ہے۔ اللَّهُ پَاکَ ہے اس بات سے کہ کائنات کے کسی حصے میں کوئی اس کا خلیفہ، نائب، قائم مقام یا جا شنیں ہو۔ انسان کو اللَّهُ نے ‘فِي الْأَرْضِ خَلِيقَةً‘ (القرآن، 2:30) بنایا کر بھیجا ہے۔ (مزید حوالے، 10:14، 38:26) خلافت کی حقیقت اختیار ہے جس کا منشایہ ہے کہ زمین پر موجود تمام توفیق کو حق کے مطابق استعمال میں لایا جائے، لوگوں کے درمیان حق کے مطابق حکم کیا جائے، اور زمین پر انفرادی، اجتماعی اور میں الا تَوَّاَ حَسْطَ پر خواہش کی پیرودی کو راجح نہ ہونے دیا جائے۔“ الْبَيْتُ اللَّهِ مُخْتَصٌ فَرْمَلِيَّتُهُ ہے اپنی رحمت کیلئے جسے چاہے، اور اپنی رحمت کے خزانوں کی تقسیم کے شرف سے نواز دیتا ہے جسے چاہے۔ حَضُورُ عَلَىٰ تَعْلِيقٍ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا گیا۔ مقام جاری ہے۔ جنہیں رحمۃ للعالمین کی بارگاہ سے نوازے جانے کا شرف ہوتا ہے، وہ بھی رحمتیں تقسیم کرنے والے ہو جاتے ہیں۔

## فہرست

11 .....	تعارف
11 .....	بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
17 .....	پیش لفظ
57 .....	ذات و صفات پاری میں تعلق کی نوعیت
59 .....	عقیدہ سٹیٹ پر ہونے والے مباحث
61 .....	امثال کی درون ذات اور بیرون ذات تعبیر
63 .....	عیسائی مذہب کی عقلي تکمیل
69 .....	”اسم“ اور ”صفت“ کی منطق میں فرق — پروفیسر عبدالحمید کمالی
71 .....	کیا ”الحق“، اسماء الحسنی میں شامل ہے!
74 .....	ذات پاری کی ماورائیت
75 .....	اُلوی اور انسانی صفات میں تعلق
77 .....	الله تعالیٰ کی سات بنیادی صفات — امام غزالی
79 .....	قرآن: خلق یا امر
84 .....	تغییری جائزہ
87 .....	حاصل بحث
89 .....	مسئلة تقدیر
89 .....	خلاصہ
91 .....	محمد فتح اللہ گلن
95 .....	محمد فتح اللہ گلن کے نظریات کا خلاصہ
96 .....	الله کے علم مطلق اور انسانی آزادی کا قرآنی تصور
98 .....	لوح محفوظ کا قرآنی تصور
102 .....	رضا اور مشیت (Divine Pleasure & Divine Will)
104 .....	ازل اور ابد (Eternity and Everlastingness)
105 .....	الله تعالیٰ کی صفت ارادہ اور صفت علم

قرآن پاک کے قدیم یا حادث ہونے کا مسئلہ ..... 109
علم مطلق اور اس کے مضرات ..... 111
مسئلہ تقدیر کے چند دیگر پہلو ..... 113
تقدیر اور تدبیر ..... 115
قضاء اور قدر ..... 116
حاصل بحث ..... 117
<b>اللہ تعالیٰ کی قدرت اور انسانی آزادی میں توافق ..... 119</b>
مسئلہ اور اس کے حل ..... 120
معقولہ کا آفیش نظریہ ..... 121
اشاعرہ کا نظریہ ..... 122
لام غزالی کا نظریہ ..... 123
‘دکب’ اور ‘خلق’ ..... 123
ابو الحسن اشعری — انسان کا اخلاقی عمل بھی اللہ کی تحقیق ہے ..... 124
کیا اللہ ’الدّھر‘ ہے! ..... 129
صحابہؓ میں شامل ایک حدیث ..... 130
حدیث ”لَا تَشْبُهُ اللَّهَ“، کی پانچ صورتوں میں روایت ..... 131
نمہی فکر کی تکمیل جدید کا مفہوم ..... 131
نمہی فکر کی سائنسی تکمیل ..... 132
خدا اور زمان میں عینیت ..... 134
قرآن پاک میں لفظ ’الدّھر‘ کے مقامات ..... 135
آیاتِ تباہات کی تاویل کا قرآنی اصول اور تاویل احادیث پر اسکا الطلاق ..... 137
خدا اور زمان کی عینیت کے حوالے سے قرآن پاک کے آٹھ مقامات کا جائزہ ..... 140
حاصل بحث ..... 141
<b>تحقیق، صدور اور ہم ازیزیت ..... 145</b>
لام غزالی کا فلسفہ مذہب ..... 149
تہافتۃ الفلاسفہ — مسلم فلسفیوں کا ابطال ..... 151
1۔ ازیزیت کائنات کا مسئلہ ..... 151
ارادے کی تعریف — بھور کے انتخاب کی مثال ..... 152

154 .....	نظريہ صدور کا ابطال .....
156 .....	2- خدا کے علم جزئیات سے اکار کا مسئلہ .....
159 .....	نظريہ علت کا استرداد .....
160 .....	امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ — نظريہ تسلیل بالآثار .....
161 .....	نظريات کا تقاضی جائزہ .....
163 .....	ازلیت کا مفہوم اور نظريہ تسلیل بالآثار .....
164 .....	'مقام وحدت' اور 'مقام احادیث' .....
167 .....	وحدت الوجود، وحدت الشہود اور وحدت شاهدین .....
168 .....	طریقہ شاهدین .....
172 .....	معاملات دین میں سند سے بات کرنے کا طریقہ .....
176 .....	کشف و شہود اور کرامات .....
177 .....	شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کیلئے قدم کی تمثیل .....
179 .....	انعام یافتہ بندوں کی کیمیگریز — غبین، صدقین، شہداء اور صالحین .....
181 .....	شاهد کا مرتبہ .....
181 .....	سید حسین نصر .....
181 .....	شریعت، طریقت، حقیقت کیلئے دائرے کی تمثیل .....
183 .....	خدا بطور 'حقیقت' یا 'حقیقت اولیٰ' .....
184 .....	وحدت الوجود کے بنیادی مفروضے .....
187 .....	قرآن پاک ہی 'الحق' ہے .....
190 .....	سیدنا حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں ایک تمثیل .....
192 .....	اپنا ترکیب آپ کیوں نہیں کیا جا سکتا!
194 .....	ذاتِ اقدس ﷺ کی حیثیتوں کا نظریہ — ڈاکٹر اسرار احمد .....
195 .....	تائیر غل کے بارے میں روایت .....
196 .....	سیکولر علم اور مذہبی علم میں تقسیم .....
198 .....	ست کی پیروی — چند پہلو .....
200 .....	مواخات، بیان مدنیہ، اور صلح حدبیہ .....
201 .....	علم کسب اور علم الہی .....
203 .....	سورہ عبس کی چند آیات .....
204 .....	صیغہ واحد حاضر میں خطاب .....

قرآن کا اسلوب تقریری ہے۔	206
ذاتِ اقدس ﷺ سے تقدیر	207
گن، او گن کو گن کر مانو	211
علمِ لدنی	212
حدیث جبرائیل اور تصوف بطور احسانِ اسلام	213
تحیر الرؤوف، ایک بے معنی تصور	216
ذکر اور ہنگر	218
فلسفہ اور وجودیات	222
طریقت شاہدین	224
شہید اور شاہد	230
حال اور صاحبِ حال	233
برائی سے کراہت اللہ کو پسند، برے سے کراہت ناپسند	234
اللہ کے نور کی تمثیل	235
اویسیہ — عطاۓ علم کی ایک خاص صورت	236
وحدت الوجود اور وحدت الشہود	237
بدعت: علم کسب کو علم الهی سے مطابقت دینے کا قرآنی اصول	240
بدعت کے اصول کا ماغذہ اور قرآن و حدیث سے اسکی تنقید کی چند مثالیں	242
حال اور صاحبِ حال	246
حاصل	247
قرآن پاک اور فلسفہ و سائنس میں تعلق	249
ابن سینا، سر سید احمد خان، ڈاکٹر محمد اقبال اور چند معاصر علماء اور مکاتب فکر کے نظریات کا تنقیدی	
جاگرہ	249
نیوٹن کا نظریہ کائنات اور نیچرل ازم	253
سر سید احمد خان کا جدید علم الكلام	254
(Work of God overrides the Word of God)	254
آخر سائنس کا نظریہ کائنات اور نیچرل ازم	257
اقبال کا جدید علم الكلام: مذہبی علم کی سائنسی تھکیل	257
قرآنی تنازع میں نیچر کو سٹڑی کرنے کا جیمنس طریقہ — نام غزالی سے ایک مثال	259
علامہ محمد اقبال کے نظریات کا تنقیدی جاگرہ	263

نظریہ تخلیق اور نظریہ ارتقا کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش --- ڈاکٹر اسرار احمد.....	266
اشعرہ سے ایک متوالی مثال.....	270
تفصیدی جائزہ.....	272
عصری نظریات:.....	273
ڈاکٹر اسرار احمد، ڈاکٹر اسحاق خضر انصاری، مولانا وحید الدین خاں و دیگر۔.....	273
قرآن کی سائنسی تعمیر _____ موس بکائل (1920-1998ء).....	273
سید حسین نصر.....	281
اجمالی کتب فکر— ڈاکٹر ضیاء الدین سردار.....	283
انثر پیشہ انسٹیبوٹ آف اسلام کٹھات (آئی آئی آئی ٹی).....	284
ہماری محوڑہ پیرزادم.....	285
قرآن پاک اور سائنس: آویزش یا ہم آہنگی.....	292
قرآنی وجودیات (Qur'anic Ontology).....	292
اُلوی انتظام کے تحت چلنے والی کائنات.....	293
قوانین نظرت اور مجذرات.....	294
مسئلہ شر (Problem of evil).....	300
سائنس کی وجودیات.....	302
جدید کاسمولوژی.....	304
قرآنی کاسمولوژی.....	305
تخلیق کائنات .....	305
مقصد تخلیق.....	306
خالق کائنات .....	307
جدید کاسمولوژی .....	310
کوائیم فرکس .....	311
گگ-پینگ ماذل .....	312
فائن ٹیوبڈیونیورس .....	314
لاز آف نچر .....	314
لامحدود تخلیقاتی زمان — سیلوں ہانگ .....	316
کیا سائنس، خدا پر اعتقاد کو ختم کر دیتی ہے؟ — محمد باصل الطائی .....	317
کیا قوانین نظرت خدا کی بجھے لے سکتے ہیں۔ .....	318

320 .....	جدید نظریہ: غیر جبریتی عیّلت (Indeterministic causality)
320 .....	تصور خدا کی ترانسفارمیشن
321 .....	اساء الحسنه
323 .....	خدا کا مخدانہ نظریہ
324 .....	کو انتم فرکس: کیا قوانین نظرت خدا کی جگہ لے سکتے ہیں!
324 .....	2۔ اشاعرہ کا نظریہ، جواہر، اور کو انتم لیکھن:
325 .....	کیا کائنات اپنے ہونے کیلئے خدا کی محتاج ہے؟
331 .....	List of Articles Included in the Book
331 .....	“The Qur’anic Theology, Philosophy And Spirituality”
333 .....	نام، اصطلاحات اور کتابیات

## ضمیمه

361 .....	جرائم شنيعه (Heinous Crimes) اور انکا تدارک
	قانون سازی کی قرآنی بنیاد

## تعارف

(اڑ جناب ملک شمس الدین قادری فاضلی)



”پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے خلق فرمایا۔  
انسان کو علق سے خلق فرمایا۔  
پڑھ کہ تیر ارب ہی اکرم ہے۔  
جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی۔  
اس نے انسان کو وہ علم دیا جو وہ نہیں جانتا تھا۔  
ہاں ہاں بے شک انسان سر کشی کرتا ہے۔  
اس لئے کہ وہ خود کو بے نیاز جانتا ہے۔  
بے شک مراجعت تیرے رب ہی کی طرف ہو گی۔  
بھلا دیکھو تو جو منع کرتا ہے۔  
بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے۔  
بھلا دیکھو تو اگر وہ ہدایت پر ہو۔  
یا تقوے کا امر کرتا ہو۔

بھلا دیکھو تو اگر اس نے تکذیب کی اور منہ پھیرا۔  
کیا اسے معلوم نہیں کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔  
کوئی نہیں اگر وہ باز نہ آئے گا تو ہم اسے پیشانی کے بالوں سے کپڑا کر گھسیٹیں گے۔  
وہی جھوٹی خطا کار پیشانی۔  
تو اب پکارے اپنی مجلس کو۔  
ہم بھی سزا دینے والوں کو بلا کیں گے۔  
ہر گز نہیں، اس کی اطاعت نہ کر، اور سجدہ کر اور قریب ہو جا۔ (اقرآن، سورہ العلق، ۱۹-۱)

خلق فرمانے والا ہر شے کا علم رکھتا ہے۔ خالق کل کا ہر ہر فرمان سند کا درجہ رکھتا ہے اور خالق کل کافرمان ہی سند کا درجہ رکھتا ہے۔ خالق کے فرمان کا رخ رکھنے سے ہی پڑھنے والے کا توازن ٹھیک رہ سکتا ہے۔ یہ اپنے رب کے نام سے پڑھنے کی صورت ہو گی۔

نفعہ کے بعد کا درجہ علقہ ہے۔ اس درجے میں جنین کو حمادر سے خوارک ملنے لگتی ہے۔ علم حقیقی کو اپنے خالق کے فرمان سے خوارک ملتی ہے۔ جس طرح علقہ حمادر سے الگ رہ کر پروش نہیں پاسکتا، علم حق بھی اپنے خالق کے فرمان سے الگ رہ کر پروان نہیں چڑھ سکتا۔

رب العالمین ہی سب سے بڑا کریم ہے۔ اس کے کرم کی کوئی حد نہیں، اس کی عطا کو کوئی روک بھی نہیں سکتا۔ وہ کسی پر اس کی وسعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ سب ارفع کام اس کی شان کرم سے ہی تکمیل پاتے ہیں۔

علم جاری کرنے کا آلہ قلم ہے۔ قلم کو ذریعہ تعلیم بھی اللہ نے بنایا ہے۔ تعلیم دینا انسانی ضرورت ہے۔ تعلیم کے ذریعے ہی ہم اپنا اور نسل انسانی کا حال اور مستقبل بتیرنا سکتے ہیں۔ قلم کے تقدس کو ملحوظ رکھنا حق ہے۔ وہی لکھا جائے جو حق ہے تو قلم کا تقدس قائم رہتا ہے۔

حصول علم میں انسان کا رخ نہ جانے سے جانے کی طرف ہوتا ہے۔ قلم کے ذریعے نہ جانتا، جانے میں آتا ہے۔ ہمارا لکھنا، سند کے ساتھ ہو اور علم کی روشنی پھیلانے کیلئے ہو تو یہ انسانیت کی بڑی خدمت ہے۔

علم پانے کا شکر یہ اسی طرح ادا ہو سکتا ہے کہ جس حق سے ہمیں فائدہ پہنچا ہو وہ دوسروں کے سامنے لا یا جائے، اور انہیں رب کے قریب ہونے میں مددی جائے۔ اپنے نفس کی خوشی کو حق کے مقابل و قاعد دینا، اپنے گمان کو پھیلانا ہے۔ یہ بے علمی کو پھیلانے کی صورت ہے اور سرکشی ہے۔ سرکش کے لکھنے سے اس کی ذات کو بھی نقصان پہنچتا ہے، اور اسکی بات کو بلا تحقیق مانے والوں کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔

توفیق کو اپنے نفس کی خوشی پر لگاتے چلے جانا، اللہ تعالیٰ سے اپنی بے نیازی کے اظہار کیلئے ہوتا ہے، نام اسکا چاہے جو بھی رکھ لیا جائے۔ سرکش بھی سمجھتا ہے کہ وہ اللہ سے بے نیاز ہے۔

انسان کا آنا ہی یہ ثابت کرتا ہے کہ اسے جانا بھی ہے، اور جس کی طرف سے آیا ہے اس کی طرف جائے گا بھی۔ کسی کی چاہت اس کی مراجعت میں حاصل نہیں ہو سکتی۔

جس کو اپنے رب کی طرف مراجعت کا لقین نہ ہو، وہ لوگوں کو کار خیر سے منع کرتا ہے۔ نماز قائم کرنے کا حکم ہے۔ نماز ادا کرنا قول ہے، قول عمل کی شہادت سے ہی سچا ثابت ہوتا ہے۔ نماز کے بعد حقوق العباد کو بھی حق کے حوالے سے ادا کیا جائے، تو نماز قائم ہوتی ہے اور نمازی کی صداقت روشن ہوتی ہے۔

جو ہدایت پر ہو، وہ خوف و حزن سے پاک ہوتا ہے۔ وہ کسی کو ظن کے پیچے چلنے کو نہیں کہتا۔ وہ کبھی انفو گو نہیں ہوتا۔ جوبات اس کیلئے مفید ثابت ہوئی ہو وہی دوسروں کو بتا کر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔ جو ہدایت پر ہو، اسکی قدر کرنی چاہئے۔

وہ معاشرے کو فساد سے بچانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ وہ تقوے کا امر کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھا کرتا لوگ اس کے ساتھ کیا کرتے ہیں، یہی دیکھا کرتا ہے کہ اسے حق کے حوالے سے لوگوں کے ساتھ کیا کرنا چاہئے۔

ہمیں اپنے قول کی بھی حفاظت کرنی چاہئے، اعمال کی بھی حفاظت کرنی چاہئے۔ انجام سے غفلت قطعاً بے عقلی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے کچھ مخفی نہیں ہے۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ وہ ہماری نیتوں کا بھی علم رکھتا ہے۔ جو حق کی تکنیب سے باز نہ آئے اور کار خیر سے روکنے والا بن جائے، اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے کپڑا لیا جاتا ہے، کہ اسکی سب شان و شوکت خاک میں مل جاتی ہے۔ اس کا رب اس کا دبدبہ سب ختم ہو جاتا ہے۔ وہ اس درجے سے ہی گردا یا جاتا ہے، جہاں اسکی بات لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی تھی۔ سچ کی پیشانی، نیکو کار کی پیشانی، اسکی شخصیت کی عکاسی کرتی ہے اور وہ دیکھنے والوں کو قابل قدر نظر آتا ہے۔ جھوٹ، نابکار کی پیشانی سے اسکے عیوب نظر آنے لگتے ہیں۔ وہ لوگوں کی نظر وہ سے اس طرح گرا دیا جاتا ہے، کہ اس کی بات ان کے لئے بے وقت ہو جاتی ہے۔

اللہ کی گرفت میں آجائے کے بعد کسی کے ساتھیوں کی حیثیت پر کاہ کے برابر بھی نہیں رہتی۔ قادر مطلق کو کسی کو مغلوب کرنے میں دیر ہی کیا لگتی ہے۔

سرکش کی سوچ کبھی درست نہیں ہوتی۔ اس کی اطاعت نہ کرنے کا حکم ہے (تفسیر فاضلی منزل ہفتہ باخود

سورہ القيامة میں ارشاد ہے:

”اس کو سنبھال لینے کے لئے اپنی زبان سے تجھیل نہ کیجئے۔

اس کا جمع کرنا، اور پڑھانا ہمارے ذمے ہے۔

توجب ہم اس کو سنا چکیں تو اس کا اتباع کیجئے۔

پھر اس کا بیان بھی ہم پر ہے۔“ (القرآن، 19:16-75)

حق کو سنبھالنا اور سنبھالنے میں انتہائی احتیاط کرنا اظہار ادب کیلئے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بے کراں محبت، اپنے محبوب پاک کو اس عجلت سے بھی فارغ کر دیتی ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے قرآن شریف کی آیات کو جہاں جہاں رکھا ہے، حکم الہی سے رکھا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے قرآن شریف کو جیسے پڑھ کر سنایا ہے، ویسے ہی آپ کو پڑھایا گیا ہے۔ قرآن پاک کی ترتیب اور قرائت، اللہ کا کام ہے جو علیم مطلق ہے۔ اس میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ آیات کا وہ مجموعہ اور سورتوں کی وہ ترتیب جس کی نبی پاک ﷺ نے تصدیق فرمائی ہے، قرآن پاک ہے۔ ہماری تحقیق کے مطابق قرآن پاک کا متن کل 6238 آیات میں تقسیم ہے، بعض کے مطابق متن قرآن 6236 آیات میں تقسیم ہے۔ نفس متن میں کوئی اختلاف ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ متن قرآن پاک کو 666 آیات پر مشتمل ہے۔ قرار دینے والوں نے اپنے دعوے کے ساتھ کبھی کوئی سند پیش نہیں کی۔ تکرار دعویٰ کبھی ثبوت دعویٰ کے متراود نہیں ہوتا۔ (Number of Verses of the Qur'an)

آپ ﷺ معلم کتاب و حکمت ہیں۔ آپ نے جو سنا، وہی پڑھا، اور جو پڑھا، عملًا وہی کر کے دکھایا۔ صراط مستقیم کی یہی صورت اللہ نے رکھی ہے۔

قرآن پاک کا بیان اور اسکی وضاحت بھی اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے۔ جس بیان میں قرآن پاک کی وضاحت قرآن پاک سے ہو، اس میں اختلاف کامقام نہیں ہو سکتا (تفسیر فاضلی منزل ہفتمن، مخوذ ص 322-23)۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندے حضرت فضل شاہ (قطب عالم رحمۃ اللہ علیہ) کو پورے قرآن پاک کا بیان قرآن پاک ہی کے ذریعے کرنے کا شرف بخشنا۔ تفسیر فاضلی جو آپ کے بیان پر مشتمل ہے، پورے قرآن پاک کی

تفسیر بالقرآن ہے۔ اسلامی تہذیب کی چودہ صد سالہ تاریخ میں اس کی کوئی اور مثال ہمارے علم میں نہیں ہے۔ حضرت صاحب کے بیان کو ضابطہ تحریر میں لانے کی سعادت آپ کے دو عقیدت مندوں، جناب غلام رحمٰن صاحب (المعروف سیکریٹری صاحب)، اور جناب محمد اشرف فاضلی صاحب کے حصے میں آئی۔ جناب محمد اشرف فاضلی صاحب کی تحریر کو شائع کرنے جانے کی اجازت عطا ہوئی، جو تفسیر فاضلی کی صورت میں متن قرآن پاک کی سات منزلوں کے اعتبار سے سات جلدیوں پر مشتمل ہے اور فاضلی فاؤنڈیشن لاہور نے شائع کی ہے۔ اسکی پانچ منزلوں کا انگریزی ترجمہ بھی فاضلی فاؤنڈیشن کی طرف سے شائع کیا جا چکا ہے۔ جناب غلام رحمٰن صاحب کا مرتب کردہ حضرت فضل شاہؒ کا بیان ”ام الادیان“ ابھی تک خلوت میں ہے۔ ہمارے عقیدت مندوست جناب ڈاکٹر عبدالحفیظ صاحب کو جناب محمد اشرف فاضلی (مرحوم) کی خدمت میں رہ کر تفسیر فاضلی کی ساتوں منزلوں کی پروفیشنل نگارش ٹرانسلیشن کی پانچ منزلوں کی ایڈٹنگ کی سعادت حاصل رہی۔ ڈاکٹر عبدالحفیظ صاحب کی 2016 میں شائع ہونے والی کتاب The Qur'anic Theology, Philosophy And Spirituality اور موجودہ کتاب ”مسلم فکر کی قرآنی جہات“ بہت اہم علمی موضوعات پر تفسیر فاضلی سے حاصل ہونے والی بصیرت کے انہیار پر مشتمل ہے۔ ہم ڈاکٹر عبدالحفیظ صاحب کے اس وثائق سے متفق ہیں اور اسکی تصدیق کرتے ہیں کہ قرآن پاک ہی الحق ہے اور ”کسی بھی نظریہ، عقیدہ، روایت، پرکیش، ارشاد، قول، گمان، خیال، احساس، وہم، تصور، تخيیل، تاثر، وجود ان، واردات، حال، کشف، شہود، تشریح اور تعبیر کی صداقت کا حقیقی معیار قرآن پاک ہی ہے۔ قرآن پاک جس کی تصدیق کرتا ہے وہ حق ہے، جس کو رد کرتا ہے وہ بغیر الحق ہے۔ (القرآن، 10:23، 8:33، 40:75، 42:42، 46:20)

تصدیق سے خالی بات محض رائے، قیاس، گمان یا ظن کا درجہ رکھتی ہے، اور ظن کسی کو حق سے مستغنى نہیں کر سکتا۔ جس بات کا کوئی حاصل نہ ہو، وہ لا حاصل ہوتی ہے، اور لا حاصل بات ہی لغو ہوتی ہے۔ ”تصدیق کرتے ہیں کہ ڈاکٹر عبدالحفیظ صاحب کی موجودہ کتاب میں، ہمارے علم اور یقین کے مطابق، کوئی بات ایسی نہیں جو اس وثائق سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ ہم ڈاکٹر عبدالحفیظ صاحب کے اس وثائق کی بھی تصدیق کرتے ہیں کہ ”قرآن پاک قول ہے، حدیث پاک عمل ہے اور فقه علم ہے۔“ ہم اس بات کی بھی تصدیق کرتے ہیں کہ ”قرآن پاک حکم ہے، حدیث پاک حکم کی تفہیق ہے، اور تفہیق حکم وقت مقام اور مقدار کے مطابق ہوتی ہے۔“ مذوق سے ہم حدیث پاک اور قرآن پاک کے تعلق کے بارے میں

اس قائدہ کلیہ کو بیان کر رہے تھے، لیکن ڈاکٹر عبدالحفیظ صاحب سے پہلے کسی نے اس کی اہمیت کو اس طرح محسوس نہیں کیا جس طرح انہوں نے کیا ہے۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ پروفیسر عبدالحفیظ صاحب کے کام کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شرف قبولیت سے نوازا جانا نصیب ہو اور دنیا و آخرت میں رضاء الہی ان کے شامل حال رہے۔

مک شمس الدین قادری فاضلی عقی عنہ

بارہ ربیع الاول، 1439ھ،

(کید دسمبر، 2017ء)

نوروالوں کا ذیرہ پاک

ائز پورٹ لنک روڈ،

چکلالہ، راولپنڈی

+92 302 5353700

+92 334 8814599

## پیش لفظ

معیار مستند نہ ہو تو کسی شے کے معیاری ہونے کا فیصلہ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ معاملات دین میں تجھیں و نظر میں سے کبھی یقینی علم تک نہیں پہنچا جاسکتا۔ قرآن پاک ’الحق‘ ہے۔ معاملات دین میں سندا درجہ صرف اور صرف قرآن پاک کو حاصل ہے۔ (القرآن، 34:6، 32:2-3، 2:42) ”— اور جو کچھ آپ کی طرف آپ کے رب سے نازل ہوا وہ الحق ہے، مگر اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔“ (القرآن، 1:13) کسی بھی نظریہ، عقیدہ، روایت، پریکش، ارشاد، قول، گمان، خیال، احساس، وہم، تصور، تخیل، تاثیر، وجدان، واردات، حال، کشف، شہود، تشریح اور تعبیر کی صداقت کا حقیقی معیار قرآن پاک ہی ہے۔ قرآن پاک جس کی تصدیق کرتا ہے وہ حق ہے، جس کو رد کرتا ہے وہ بغیر الحق ہے۔ (القرآن، 7:146، 10:23، 7:33، 2:61، 40:75، 41:15، 42:42) تصدیق سے خالی بات مغض رائے، قیاس، گمان یا ظن کا درجہ رکھتی ہے، اور ظن کسی کو حق سے مستغفی نہیں کر سکتا۔ جس بات کا کوئی حاصل نہ ہو، وہ لا حاصل ہوتی ہے، اور لا حاصل بات ہی لغو ہوتی ہے۔ لغوبات مومن کے شایان شان نہیں ہوتی۔ ذات باری، اسکی صفات کریمہ اور اسماء الحسنی کے بارے میں ایسا تصور، تشبیہ اور فلسفہ، یا روحانی تجربہ کی ایسی تعبیر جس کی تصدیق قرآن پاک سے نہ ہوتی ہو، قرآن پاک اسے افتریٰ قرار دیتا ہے اور اللہ پر افتریٰ نہ باندھنے کا حکم ہے۔ (القرآن، 18:71، 11:18) فرمان الہی سے انحراف الفلال ہے۔ فرمایا گیا ہے حق کے بعد ہے ہی کیا مگر گمراہی۔ (القرآن، 53:28، 10:32) قرآن پاک کے مقابل نظریات باطل ہیں۔ (القرآن، 17:81، 21:18) فرمان الہی کو اپنی خواہش کے مطابق بنانا فتن ہے اور اللہ فاسق ہی کو گمراہ کرتا ہے۔ (القرآن، 2:26)

ہم شکر گزار ہیں اپنے پیر و مرشد جناب محمد اشرف فاضلی صاحب (1940ء-2016ء) کے جنہوں نے ہمیں قرآن پاک کی سندر کے ساتھ بات کرنے کا علم عطا فرمایا۔ ہم شکر گزار ہیں اپنے پیر و مرشد جناب ملک شمس الدین قادری فاضلی صاحب، نور والوں کا ذیرہ پاک راولپنڈی (پ 1959ء) کے جنہوں نے اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت سے نوازا، ہمارے سابقہ علم کی تصدیق فرمائی، مزید علم عطا فرمایا اور انعامات سے نوازا۔ ہم شکر گزار ہیں اپنے پیر و مرشد جناب سید اظہر شاہ گیلانی قادری فاضلی صاحب، نور والوں کا ذیرہ پاک، فیصل آباد کے جنہوں نے ’پیش لفظ‘ کو پڑھا، تصدیق فرمائی اور اشاعت کی اجازت عنایت فرمائی۔ سورہ الزمر میں ارشاد ہے: اللہ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثَ إِنَّا بِمَا أَنْتَ مُتَشَبِّهُ مَثَانِي۔ ”اللہ نے احسن الحدیث کتاب نازل فرمائی، ایک

جیسی دھرے بیان والی۔“ (القرآن، 39:23) احسن الحدیث کتاب سے بہتر کا تصور بھی درست نہیں۔ حدیث بات یا بیان کو کہتے ہیں۔ احسن حدیث وہی ہو گی جس کی قرآن پاک سے تصدیق ہو۔ اس آیت پاک سے استنباط کرتے ہوئے جناب ملک صاحب نے فرمایا: ضروری ہے کہ کسی بات کے درست یا نادرست ہونے کیلئے قرآن پاک سے کم از کم دو حوالے پیش کئے جائیں، مغض ایک حوالے سے الجھاؤ دور نہیں ہو گا۔ حوالے کے طور پر چند آیات پیش خدمت ہیں جو جناب ملک صاحب کے اس استنباط کی تصدیق کرتی ہیں۔ مثلاً، انْظُرْ كَيْفَ تُصَرِّفُ الْآيَاتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِلُونَ ﴿١﴾ ”نظر کرو ہم کیسے کیسے نشانیاں بیان کرتے ہیں، پھر بھی وہ کنارہ کرتے ہیں۔“ (القرآن، 6:46) انْظُرْ كَيْفَ تُصَرِّفُ الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ ﴿٢﴾ ”نظر کرو ہم کیسے کیسے آیات کو بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھ جائیں۔“ (القرآن، 6:65) وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَذَا الْقُرْآنَ لِيَذَّكَّرُوا۔۔۔ ”اور بے شک ہم نے اس قرآن مجید میں طرح طرح سے بیان فرمایا کہ وہ مانیں۔“ (القرآن، 17:41) ایک جگہ اگر دعویٰ ہو تو دوسری جگہ اسکی شہادت ہوتی ہے۔ یہ شہادت کسی آیت پاک کی عبارت متن کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے، اشارہ یا دلالت متن کی صورت میں بھی۔ دو مثالیں پیش کی جا رہی ہیں کہ کس طرح آیات قرآن پاک دھراتی ہیں اپنے آپ کو اور کس طرح سندی جاتی ہے قرآن پاک سے کسی بات کے درست یا نادرست ہونے پر۔<sup>۱</sup>

---

بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم سے نجات دلانا بہت بڑا احسان تھا رب احسان تھا رب عظیم کا۔ پھر ان کو مزید انعامات سے بھی نوازا گیا۔ لیکن بجائے شکر گزار ہونے کے بنی اسرائیل توکل کی حدود کو پھلانگ لگئے۔ جہاں سے توکل جاتا رہے وہاں مشقت ضرور آ جاتی ہے۔ سورہ البقرہ آیت نمبر 61 میں بنی اسرائیل کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے کہ:- وَصُرَبَتْ عَلَيْهِمُ الدِّلْلَةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَأْعُدُوا بِغَضْبٍ مِّنَ اللَّهِ طَلْكَ بِإِلَهٍ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحِقْطَ طَلْكَ بِمَا عَصَمُوا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿١﴾ تقریباً تمام متر جمین اور مفسرین قرآن نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے: ”ان پر ذلت اور ناداری ڈال دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں پھرے، یہ اس لئے ہوا کہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے، اور نبیوں کو ناحن قتل کرتے تھے۔ یہ اس لئے تھا، کہ وہ نافرمان تھے اور حد سے بڑھنے والے تھے۔“ (القرآن، 61:02) مزید حوالے کیلئے دیکھئے آل عمران، 3:112، (جب تفسیر فاضلی پر بیان ہو رہا تھا اور حضرت فضل شاہ رحمت اللہ علیہ کے سامنے یہ آیت مبارکہ پڑھی گئی تو

آپ نے فرمایا: ”کوئی نبی قتل نہیں ہوا۔“ عرض کیا گیا حضور! تمام مترجمین اور مفسرین نے اس کا یہی ترجمہ کیا ہے اور گریمر کے مطابق بظاہر یہی ترجمہ اسکا بتا ہے۔ آپ نے فرمایا: اللہ نے وعدہ فرمایا ہے انہیاء کی نصرت کا۔ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَنْ يَعْصِي وَإِنَّ اللَّهَ لِمَنْ يَعْصِي مُحْسِنٌ وَالَّذِينَ آتَوْا فِي الْحِجَّةِ أَذْيَانًا وَلَمْ يَكُونُوا مِنَ الْكُفَّارِ ۚ ۴۰— وَهُوَ خَيْرُ الظَّاهِرِيَّةِ ﴿٤١﴾ اور اللہ خیر الناصرین ہے۔ (3:150) نبی کا درجہ رسول سے بڑا ہوتا ہے۔ نبی ہونا مستلزم ہوتا ہے رسول ہونے پر۔ اگر اللہ نے رسولوں کی نصرت کا وعدہ فرمایا ہے تو یہ وعدہ نبی ہونے پر زیادہ لا گو ہوتا ہے۔<sup>2</sup> جس کا اللہ ناصر ہواں کا خاتمہ کسی کے بس کی بات نہیں۔ جو اللہ اپنے نبی کی نصرت نہیں فرماسکتا، وہ کیا دے سکتا ہے اور کسی کو! ”آپ نے مزید فرمایا: ”قرآن پاک میں دیکھیں، آپ کو اسناد مل جائیں گی۔“ تفسیر فاضلی جلد اول سورہ النساء، آیت نمبر 157 کی تفسیر میں دیکھا جا سکتا ہے، درج ذیل آٹھ حوالے دئے گئے ہیں قرآن پاک سے اس بات کیلئے کہ ”يَقْتَلُونَ بِغَيْرِ الْحُقْقِ“ کے معنی ہمیشہ ”ناحق قتل کرنا“ ہی کے نہیں ہوتے۔ اس کے معنی ”ناحق لڑنا، لڑ پڑنا، لڑائی کرنا“ بھی ہوتے ہیں۔ نواں حوالہ یہ ثابت کرنے کیلئے ہے کہ جس نبی پاک کے قتل کے عقیدے پر مذہب عیسائیت استوار ہے، اس کے قتل کئے جانے کی بھی قطعیت کے ساتھ نفی کی گئی ہے قرآن پاک میں۔

1۔ سورہ المتحنہ میں عدو اللہ کی دوستی سے منع کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: إِنَّمَا يَنْهَا كُفُّرُ اللَّهِ عَنِ الدِّينِ قَاتِلُوْكُفُّرِي الدِّينِ۔۔۔ ﴿٦٠﴾ بے شک اللہ تھیں، ان سے منع کرتا ہے جو دین میں تم سے لڑے۔ (اقرآن، 9:60)

2۔ سورہ توبہ میں ارشاد ہے کہ جب مخالفین (چچے ٹھہر جانے والے) آپ سے جہاد میں شمولیت کا اذن طلب کریں، تو فرمادیجئے: میرے ساتھ نہ نکلو۔۔۔ وَلَئِنْ نُقَاتِلُوْ اَعْدُوْا۔۔۔ اور میری معیت میں کبھی دشمن سے نہ لڑو۔ (اقرآن، 9:83)

3۔ سورہ توبہ میں ایمان والوں کی نشانی يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ اور کافروں کی نشانی يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ بیان فرمائی گئی ہے۔ (اقرآن، 9:83)

4۔ سورہ الصاف میں صفیں باندھ کر اللہ کے لئے لڑنے والوں کو اللہ کا محبوب فرمایا گیا ہے۔ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفَّاً كَأَكْفَأْ بُيَّانَ مُرْضِوصٍ (اقرآن، 61:4)

5۔ سورہ توبہ میں ارشاد ہے:۔۔۔ قاتلُهُمُ اللَّهُ أَكْبَرُ فَكُونُ ﴿٩﴾ اللہ انہیں مارے، کہاں اوندھے جاتے ہیں۔ (اقرآن، 9:30)

- 6۔ سورہ الحجرات میں ارشاد ہے: وَإِنْ طَالَتْ قَنَاطِعَنِ الْمُؤْمِنِينَ افْتَنْتُلُو أَفَأَصْلِحُوا يَنْهَىٰهُمَا حَقًّا اور اگر مومنین کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرو۔ (القرآن، 49:9)
- 7۔ فَإِنْ يَعْثِثُ إِلِيْخَدَاهُمَا عَلَى الْأَخْرَى فَقَاتِلُو الْأَخْرَى تَغْيِي حَتَّى تَفْيِي إِلَى أَمْرِ اللَّهِ حَقًّا۔ اور اگر ایک، دوسرا کے پر زیادتی کرے، تو زیادتی کرنے والے سے لڑو حتیٰ کہ وہ اللہ کے امر کی طرف لوٹ آئے۔ (القرآن، 49:9)
- 8۔ سورہ حشر میں ارشاد ہے: کہ منافق، اہل کتاب میں سے اپنے ساتھیوں کو کہتے ہیں کہ اگر تم نکال دیئے گئے تو ہم یقیناً تمہارے ساتھ نکل جائیں گے، اور ہر گز تمہارے بارے میں کسی کی نبیں مانیں گے۔۔۔ وَإِنْ قُوْتَلُوكُمْ لِتَتَصْرِيْكُمْ۔۔۔ اور اگر تم سے لڑائی ہوئی تو ضرور تمہاری مدد کریں گے۔ (القرآن، 59:11)
- 9۔ قرآن پاک میں صرف ایک ہی نبی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، کے قتل اور مصلوب کئے جانے کے بارے میں اہل کتاب کے دعوے کا ذکر ہے، اور اسی عقیدے پر مذہب عیسائیت استوار ہے۔ قرآن پاک اہل کتاب کے اس دعوے کی قطعیت کے ساتھ تردید کرتا ہے۔ ارشاد ہے: وَقُولُهُمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمُسِيْحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ حَقًّا وَمَا قَتَلْنُوكُمْ وَمَا أَصْلَبْنُوكُمْ وَلَكُنْ شَيْءَهُمْ حَقًّا وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلُوا فِيهِ لَهُيَ شَيْءٌ مِنْهُ طَمَاهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا تَبَاعَ الظَّلَّمُ وَمَا قَاتَلُوكُمْ يَقِيْنًا ﴿١﴾ اور ان کی اس بات پر کہ ہم نے اللہ کے رسول عیسیٰ (علیہ السلام) کو قتل کیا؟ اور انہوں نے آپ کو قتل کیا اور نا آپ کو صلیب پر چڑھایا، ولیکن ان کیلئے ایک شبیہ بن گئی۔ اور جو لوگ اس میں اختلاف کرتے ہیں، یقیناً وہ اس سے شک میں ہیں۔ انہیں اس کا کچھ علم نہیں سوائے ظن کے اتباع کے۔ اور یقیناً انہوں نے آپ کو قتل نہیں کیا۔” (القرآن، 4:157) اور تو کسی نبی علیہ السلام کے قتل کئے جانے کے بارے میں اہل کتاب کے دعوے کا ذکر ہی نہیں ہے قرآن پاک میں۔
- درج بالا اسناد اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ ”قتل“ کا لفظ قرآن پاک میں صرف جان سے ماردینے ہی کے معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ یہ لفظ ”لڑنے“ کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اللہ کی آیات کا انکار نبی سے عمل اڑائی ہے کہ اللہ کافرمان نبی سے عطا ہوتا ہے۔ قرآن پاک کسی بھی نبی کے قتل کئے جانے کی تصدیق نہیں کرتا۔ اگر بائیبل کی روایت کو بنیاد بنا کر کسی نبی پاک کے قتل کئے جانے کی بات کی جائے تو یہ خلاف حق ہو گا۔ تفسیر فاضلی واحد تفسیر ہے جو قرآن پاک کی نو اسناد کے ساتھ ”وَيَقْتُلُونَ اللَّيْلَيْنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ“ کا ترجمہ ”اور نبیوں سے ناحق لڑتے تھے۔“ کرتی ہے۔

قرآن پاک سے سند لینے کی دوسری مثال دیکھتے ہیں: سورہ النور آیت نمبر 26 میں فرمایا گیا ہے:

الْحَسِيبَاتُ لِلْحَسِيبِينَ وَالْحَسِيبُونَ لِلْحَسِيبَاتِ ۝ وَالطَّيِّبَاتُ لِلْطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلْطَّيِّبَاتِ ۝ أَوْلَئِكَ مُدَبَّرُونَ مِنَ الْأَنْبَابِ  
يَقُولُونَ طَهَ مَغْفِرَةٌ مَرِدْقٌ كَرِيمٌ ﴿26﴾ (القرآن، 24:26)

مترجمن و مفسرین قرآن کی اکثریت نے آیت کریمہ کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

1۔ ”خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لئے۔ اور طیب عورتیں طیب مردوں کے لئے ہیں، اور طیب مرد طیب عورتوں کیلئے۔ وہ لوگ بُری ہیں ان باتوں سے جو یہ کہتے ہیں۔ ان کے لئے مغفرت اور رزق کریم ہے۔“ (مانوڈ ’تمبر قرآن‘ از مولانا امین احسن اصلاحی)

2۔ ”(اس دن) خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے ہوں گی اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لئے۔ اور (اسی طرح) طیب عورتیں طیب مردوں کے لئے ہوں گی، اور طیب مرد طیب عورتوں کیلئے۔ وہ لوگ بُری ہوں گے ان باتوں سے جو یہ کہتے ہیں۔ ان کے لئے مغفرت اور رزق کریم ہے۔“ (مانوڈ ”بلیان“ از جاوید احمد غامدی)

3۔ ”ناپاک عورتیں ناپاک مردوں کے لئے (مخصوص) ہیں اور پلید مرد پلید عورتوں کے لئے ہیں، اور (اسی طرح) پاک و طیب عورتیں پاکیزہ مردوں کے لئے (مخصوص) ہیں اور پاک و طیب مرد پاکیزہ عورتوں کے لئے ہیں (سو تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاکیزگی و طہارت کو دیکھ کر خود سوچ لیتے کہ اللہ نے ان کے لئے زوجہ بھی کس قدر پاکیزہ و طیب بنائی ہو گی)، یہ (پاکیزہ لوگ) ان (تہمتوں) سے کلیتاً بری ہیں جو یہ (بد زبان) لوگ کہہ رہے ہیں، ان کے لئے (ق) بخشاش کش اور عزت و بزرگی والی عطا (مقدار ہو چکی) ہے (تم ان کی شان میں زبان درازی کر کے کیوں اپنا منہ کالا اور اپنی آخرت تباہ و بر باد کرتے ہو۔“) (عرفان القرآن، از ڈاکٹر طاهر القادری)

تفسیر فاضلی اس آیت کریمہ کا ترجمہ اس طرح کرتی ہے:

4۔ ”بُری باتیں بُرے لوگوں کے لئے ہیں اور بُرے لوگ بُری باتوں کے لئے ہیں، اور پاک باتیں پاک لوگوں کے لئے ہیں اور پاک لوگ پاک باتوں کے لئے ہیں۔ اور یہ لوگ ان باتوں سے جو یہ کہتے ہیں، مبڑا ہیں۔ ان کے لئے مغفرت اور رزق کریم ہے۔“ (تفسیر فاضلی چہارم)

آئیے دیکھتے ہیں کہ قرآن پاک کی سند کس ترجمہ کو حاصل ہے:

قرآن پاک میں یہ سند نازل فرمائی گئی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیویاں کافرہ عورتیں تھیں۔ (سورہ التحریم، 10:66) یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ فرعون کی بیوی ایمان والی خاتون

تھیں۔ (11:66) اس لئے یہ کہنا کہ ”خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے ہیں (یا مخصوص ہیں) اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لئے ہیں، اور طیب عورتیں طیب مردوں کے لئے ہیں اور طیب مرد طیب عورتوں کیلئے۔“ خلاف حق ہے کہ اس طرح ایک کے براہونے سے دوسرے کا براہونا، یا ایک کے اچھا ہونے سے دوسرے کا اچھا ہونا لازم آئے گا جو کہ اوپر دئے گئے حوالوں سے متفق ہے۔

اگر اس آیت کے بیان کو آخرت کے ساتھ جوڑتے ہوئے یہ کہا جائے کہ ”(اس دن) خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے ہوں گی اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لئے۔ اور (اسی طرح) طیب عورتیں طیب مردوں کے لئے ہوں گی، اور طیب مرد طیب عورتوں کے جوڑے بنادیئے جائیں گے قیامت کے دن جنت میں۔“ تو اس بات کی تصدیق تو ہوتی ہے قرآن پاک سے کہ طیب مردوں اور طیب عورتوں کے جوڑے بنادیئے جائیں گے قیامت کے دن جنت میں۔ لیکن خبیث عورتیں اور خبیث مرد ایک دوسرے کیلئے ہو نگے اس دن، اس بات کی تصدیق نہیں ہوتی قرآن پاک سے۔ یہ درست ہے کہ تمام بني نوع انسان اپنے اعمال کے اعتبار سے تین گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے جن میں سے ایک اصحاب الشہادت ہو نگے جنہیں ان کے اعمال نامے باشیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے۔ خبیث عورتیں اور خبیث مرد ایک ہی گروہ میں ضرور ہو نگے، لیکن یہ درست نہیں کہ خبیث عورتیں خبیث مردوں کیلئے اور خبیث مرد خبیث عورتوں کیلئے ہوں گے اس دن۔ کوئی کسی کیلئے نہیں ہو گا، دوزخ میں ہر فرد اپنے اعمال کی جزا میں مبتلا ہو گا۔ گھرے دوست بھی ایک دوسرے کے دشمن ہو نگے وہاں۔

1۔ سورہ نور آیت نمبر 26 کے علاوہ ”خبیث، اور طیب‘ کے الفاظ دونوں یا کوئی ایک، جمع یا واحد کی صورت میں، اشیاء، مال، مٹی، مسکن، بلدر، رتح، اشجار، رزق، حیات، اولاد کیلئے آئے ہیں قرآن پاک میں۔ ان میں سے کسی کے خواہی سے بھی آیت زیر بحث کا کوئی قابل فہم مطلب نہیں بنتا۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

”اے ایمان والو! خرچ کرو! طیبات سے جو تم کماتے ہو۔۔۔ اور اس میں سے خبیث کا قصد نہ کرو [اللہ کے راہ میں خرچ کرنے کیلئے]۔“ (القرآن، 2:267)۔

یتیم کے مال کو جو کسی کے پاس امانت ہو اپنی غرض وغایت کے لئے بدلتا طیب کو خبیث سے بدلتا ہے اور اس سے منع فرمایا گیا ہے۔ (ماخوذ، القرآن، 4:02)

”۔۔۔ اور تمھیں طیبات سے رزق دیا۔۔۔“ (القرآن، 40:64)

”اے ایمان والو! طیبات میں سے کھاؤ جو ہم نے تمھیں رزق عطا کیا۔“ (القرآن، 2:172)

”آپ فرمادیجئے خبیث اور طیب مساوی نہیں، اگرچہ تمھیں خبیث کی کثرت عجیب لگے۔۔۔“  
 (القرآن، 100:5)

## 2- ان الفاظ کا استعمال افراد کیلئے

”نَا كَمَّ اللَّهُ خَبِيْثٌ كَوْطِيْبٌ سَعَدَ جَدَ أَكْرَدَ، وَإِنْ خَبِيْثَ كَمَّ إِيْكَ كُوْدَ سَرَّ بَرَكَهُ جَمْعَ كَرَكَهُ كَهْ دِهِرَ بَنَهُ دَهَ، بَهْرَهُ سَعَدَ جَهْنَمَ رَسِيدَ كَرَدَ، وَهِيَ لَوْگَ خَسَارَهُ دَاهَلَهُ هِيَنَهُ۔“ (القرآن، 8:37) ”طَيِّبِيْنَ كَوْ جَبَ مَلَكَهُ وَفَاتَ دِيْسَ گَهُ تُوكَهِيْنَ گَهُ ”سَلَامٌ عَلَيْكُمْ!“ تَمَ جَنَتَ مِيْسَ جَاؤَ بَدَلَهُ اسَكَاجُو عَمَلَ تَمَ كَرَتَ تَهَهُ۔“ (القرآن، 32:16)

3- یہ الفاظ قول اور کلمات کیلئے بھی استعمال ہوئے ہیں قرآن پاک میں۔ جس کا حوالہ درج ذیل ہے:  
 الْأَنْتَرَى كَيْفَ صَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِكَلْمَةٍ طَيِّبَةٍ كَشَجَرَةً طَيِّبَةً أَصْلَهَا ثَابِتٌ وَفَرَغَهَا فِي السَّمَاءِ ﴿١٤﴾ كیا تم نے نہ دیکھا، اللہ نے کلمہ طیبہ [پاک بات] کی مثال کیسی بیان فرمائی! جیسے شجر طیب، جس کی جڑ ثابت ہوا اور شاخیں آسمان میں ہوں۔ (القرآن، 14:24) وَمَثَلٌ كَلْمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةٍ اجْتَثَثَهُنَّ فَوْقَ الْأَرْضِ مَا هَمُوا مِنْ قَرَابِ ﴿١٥﴾ اور کلمہ خبیثہ [خبیث بات] کی مثال شجر خبیث کی طرح ہے، کہ زمین کے اوپر سے اکھاڑ لیا گیا، اسے کچھ قرار نہیں۔ (القرآن، 14:26) وَهُدُوْا إِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَهُدُوْا إِلَى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ﴿١٦﴾ اور انھیں طیب قول کی ہدایت کی گئی، اور حمد کرنے گئے کے راہ کی ہدایت دی گئی۔  
 (القرآن، 24:22)

جو مفسرین کرام سورہ نور کی آیت نمبر 26 میں ’الخیثات‘، ’الخیثون‘، ’الطیبات‘ اور ’الطیبیون‘ سے مراد افراد یعنی خبیث عورتیں اور خبیث مرد، اور طیب عورتیں اور طیب مرد مراد ہیتے ہیں، ہم دیکھے ہیں کہ یہ ترجمہ متناقض ہے سورہ التحریم، آیت نمبر 10 اور 11 میں اللہ کے فرمان سے۔ اگر سورہ نور کی آیت نمبر 26 کے بیان کو ”(اس دن)“ کہہ کر آخرت کی طرف منسوب کیا جائے تو بھی یہ ترجمہ درست نہیں کیونکہ قرآن پاک اس بات کی تصدیق نہیں کرتا۔ سورہ التکویر (81) آیت نمبر 7 (وَإِذَا الْتَّقْوُسُ زُوِّجَتُ ﴿٧﴾) اور جب نفوس کے جوڑے بنیں گے۔ جس کے حوالے سے جانب غامدی صاحب قرآن پاک سے متناقض اس ترجمہ کو سپورٹ کرتے ہیں، اس سے صرف اتنا ہی مطلب نکلتا ہے کہ اس دن لوگوں کی ان کے اعمال کی بنیاد پر گروہ بندی کر دی جائے گی۔ اس سے قطعاً یہ مطلب نہیں نکلتا کہ ”خبیث عورتیں خبیث مردوں کیلئے ہو گئی اور خبیث مرد خبیث عورتوں کیلئے ہو نگے (اس دن)۔“ اس کی اور مثال بھی دیکھی جاسکتی ہے سورہ الصافہ 37 میں (أَحْشُرُوا الَّذِينَ ظَلَمُوا وَأَرْجُهُمْ وَمَا كَانُوا يَعْبُدُونَ ﴿٣٧﴾) جمع کرو

ظالموں کو اور ان کے جوڑوں کو اور ان کو جن کی بندگی کرتے تھے۔ 37:22) کیا یہاں ”أَذْوَاجُهُمْ“ سے بیوی / خاوند مراد لیا جاسکتا ہے؟ کیا فرعون کے ساتھ اسکی پاکباز بیوی، اور نوح اور لوٹ کی کافر ازدواج کے ساتھ ان انبیاء کرام کو جمع کرنے کا حکم دیا جائے گا! ظاہر ہے اس کا قطعی آیہ مطلب نہیں ہو سکتا۔

5۔ فقیر سید محمد عرب رفای نے تفسیر رفای میں اوپر بیان کئے گئے اعتراضات سے بچنے کیلئے اس آیت پاک کا ترجمہ بری اور اچھی عورتوں اور مردوں کے بجائے اس طرح کیا ہے۔  
”گندی چیزیں گندے لوگوں کیلئے، اور گندے لوگوں کیلئے گندی چیزیں، اور اچھی چیزیں اچھے لوگوں کیلئے اور اچھے لوگ اچھی چیزوں کیلئے۔۔۔“ (عرب n.d., 424) استثنی کو چھوڑ کر، مشاہدہ اس ترجمہ کی بھی تصدیق نہیں کرتا، نہ ہی اس سے اس آیت پاک کا مطلب واضح ہوتا ہے۔

6۔ حضرت فضل شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے الحبیقیاں سے مراد بُری باتیں اور الحبیقیوں اور الظَّنِینَ سے مراد بُرے لوگ، لیا ہے، اسی طرح الظَّنِیثاں سے مراد اُچھی باتیں، اور الظَّنِینَ اور الظَّنِینوں سے مراد اُچھے لوگ لیا ہے۔ دونوں کی اسناد ہیں قرآن پاک میں۔ قرآن پاک کی کسی دیگر آیت سے تناقض نہیں اس ترجیحے کا۔ بلکہ کئی دیگر آیات سپورٹ کرتی ہیں اس معنی کو۔ مثلاً سورہ المنافقون کی پہلی آیت پاک میں فرمایا گیا ہے:

إِذَا جَاءَكُمُ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا أَنَّهُمْ هُنَّا لَرَسُولُ اللَّهِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكُمْ لَرَسُولُهُ طَوْلَةٌ وَاللَّهُ يَشْهُدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَايِنُونَ ﴿١﴾ ”جب منافق آپ کے پاس آتے ہیں، تو کہتے ہیں، ہم شہادت دیتے ہیں، کہ آپ بیٹھا اللہ کے رسول ہیں۔ اور اللہ کو علم ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، اور اللہ شہادت دیتا ہے کہ منافق یقیناً جھوٹے ہیں۔“ (قرآن، 63:01)

اللہ کی بات پاک ہے اور منافق کی بات ناپاک ہے اگرچہ الفاظ ایک ہی ہیں۔ جناب ملک شمس الدین قادری فاضلی صاحب اسے اس طرح بیان کرتے ہیں: مفہوم کے اعتبار سے اللہ کی بات اور منافقین کی بات کہ ”آپ ﷺ، اللہ کے رسول ہیں۔“ یکساں ہے، لیکن اپنے مقصد کے اعتبار سے منافقین جھوٹے ہیں۔ جھوٹے کی بات جھوٹی ہوتی ہے۔ لغت اور گرائمر کو اہمیت دینے والے مفہوم کو اہمیت دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ”بات کو دیکھو، یہ نہ دیکھو کون کہہ رہا ہے۔“ جن کی نظر مقصد پر ہوتی ہے، وہ فرمان الٰہی پر عمل بیرونے کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع لانے والے کا اتباع ضروری سمجھتے ہیں، (وَاتَّبَعُ سَبِيلَ مَنْ أَنْتَابَ إِلَيْهِ) (قرآن، 31:15)

وہ کہتے ہیں: ”بات سے پہلے بات کرنے والے کو دیکھو۔“ یہ دیکھوبات کرنے والا خبیث ہے یا طیب۔ خبیث باتیں خبیث لوگوں کیلئے ہیں اور خبیث لوگ خبیث باتوں کیلئے ہیں۔ طیب باتیں طیب لوگوں کیلئے ہیں اور

طیب لوگ طیب باتوں کیلئے ہیں۔ اس آیت کریمہ میں بات کو، متکلم کے حوالے سے دیکھنے کا اصول بیان فرمایا گیا ہے۔ ’قتل انبیاء‘ کے حوالے سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ جو لوگ لخت، گرامر، دور جا حلیت کی عربی شاعری اور اسرائیلی روایات کو معیار سمجھ کر قرآن پاک کی آیات کا مفہوم معین کرتے ہیں، وہ قرآن پاک کی ان اسناد کو دیکھنے سے قاصر ہتے ہیں جو تفسیر فاضلی میں بیان فرمائی گئی ہیں۔ آئیے اس کی چند مثالیں ملاحظہ کرتے ہیں:

”یہ اس سب سے کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔۔۔“  
(القرآن، 61:02، ترجمہ از تدریر قرآن)

”۔۔۔ اور ان پر ذلت اور محتاجی مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کا غضب کمالاً۔۔۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ اللہ کی آیتوں کو نہیں مانتے تھے اور اُس کے نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔۔۔“  
(القرآن، 61:02، ترجمہ از البیان)

”۔۔۔ یہ (سب کچھ) اس وجہ سے تھا کہ وہ انکار کرتے رہتے تھے اللہ کی آیتوں کا اور قتل کرتے تھے انبیاء کو ناحق۔۔۔“ (61:02، ترجمہ از ضیاء القرآن)

مولانا مین احسن اصلاحیؒ کی تفسیر ”تدبر قرآن“، اور جناب جاوید احمد غامدی کی ”البیان“ میں قرآن پاک کی اسناد سے درخواست اعتماد کرتے ہوئے اور اس بات سے صرف نظر کرتے ہوئے کہ قرآن پاک کسی بھی مقام پر حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت میکا علیہ السلام سمیت کسی بھی نبی کے قتل کئے جانے کی تصدیق نہیں کرتا، اسرائیلی روایات کو بنیاد بناتے ہوئے کہا گیا ہے کہ

”یہ ذلت اور مسکنت اس لیے اُن پر تھوپی گئی کہ انہوں نے پے در پے جرام کا ارتکاب کیا اور اپنی سر کشی اور تعدی کے باعث ہر حد تؤڑ دی، یہاں تک کہ اللہ کے نبیوں تک کو قتل کر ڈالا۔ بیہوداہ میں اُن کے بادشاہ یو آس کے حکم سے زکریا علیہ السلام کو عین ہیکل میں مقدس اور قربان گاہ کے درمیان سگسسار کیا گیا۔ اُنھی کے فرماں روایہ ہر دلیں کے حکم سے تیکی علیہ السلام کا سر ایک تھاں میں رکھ کر اُس کی معشوقہ کی نذر کر دیا گیا۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کو بھی انہوں نے اپنے زعم کے مطابق سوئی پر چڑھا دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُنھیں اُن کے شر سے محفوظ رکھا۔“ (al-Ghamdi n.d.)

تفسیر ضیاء القرآن کا موقوف بھی ان سے مختلف نہیں۔ انہوں نے بھی 2، تاریخ 20، 24، اور مرقس باب 6، آیات 17-29، کے انہیں حوالوں سے اسی موقوف کی تائید کی ہے۔ (الازہری 1978، 62) حضرت احمد

رضاحاں بریلوی کا ترجمہ القرآن، کنز الایمان اور اسکے ساتھ شامل تفسیر خزانہ القرآن میں بھی یہی موقوف اختیار کیا گیا ہے۔ (بریلوی 17 n.d.,) تفسیر رفاعی بھی اسی ترجمہ سے اتفاق کرتی ہے۔ (عرب 12 n.d.) شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاهر القادری اپنے ترجمہ قرآن ”عرفان القرآن“ میں اس سے مماثل ترجمہ ہی کرتے ہیں۔ (عرفان القرآن, 2:61)

قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے کہ ’اہل کتاب کی الہامی کتابیں تحریف شدہ ہیں۔‘ (القرآن، 4:46) (2:75) سورہ العنكبوت کی آیت مبارکہ: ”اور اہل کتاب سے مجادلہ نہ کرو مگر بطریق احسن، سو ائے ان لوگوں کے جنہوں نے ان میں سے ظلم کیا، اور کہو کہ ہم اس پر ایمان لائے جو ہماری طرف نازل ہوا، اور جو تمہاری طرف نازل ہوا، اور ہمارا اور تمہارا اللہ ایک ہی ہے، اور ہم اسی کو مانتے ہیں۔“ (القرآن، 29:46) کے ذریعے مسلمانوں کو اہل کتاب سے مکالمہ کا اصول یہ دیا گیا ہے کہ ’اگر وہ اپنی کتاب کے حوالے سے کوئی بات کریں اور وہ قرآن پاک سے صریحاً متناقض نہ بھی ہو تو انکی کسی بات کی تصدیق سے احتراز کرنا بھی ویسے ہی ضروری ہے جیسے کہ انکی بات کی تردید ہے، یہ کبینہ کا حکم ہے کہ: ”ہم ایمان لائے اس پر جو ہماری طرف نازل ہوا، اور جو تمہاری طرف نازل ہوا، اور ہمارا اور تمہارا اللہ ایک ہی ہے، اور ہم اسی کو مانتے ہیں۔“ مولانا مین احسن اصلاحی علیہ الرحمۃ یاجناب غامدی صاحب کی بیان کردہ حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت میگی علیہ السلام کے قتل کی یہ روایات قرآن پاک سے صریحاً متناقض ہیں۔ قرآن پاک ان کی قطعاً تصدیق نہیں کرتا۔ اسرائیلی روایات کتنی مستند ہو سکتی ہیں اس کا اندازہ یہاں سے کیا جاسکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹوں میں سے ایک کے ذبح اللہ ہونے کا عقیدہ اہل کتاب اور مسلمانوں میں مشترک ہے۔ قرآن پاک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹوں میں سے کسی کا نام لئے بغیر اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔ (القرآن، 08-101:37) مسلمانوں کا ایمان ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام، ہی ذبح اللہ ہیں۔ یہ بات آیات قرآن کے سیاق و سبق سے اخذ بھی ہوتی ہے۔ واقعی شہادتیں، تعمیر کعبہ، مکہ شریف میں ایمین کا آباد ہونا وغیرہ، بھی سب اسی کے حق میں ہیں۔ اہل کتاب حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح اللہ ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ (Jacson n.d.) ہمیں اس بات میں ذرا بھی شک نہیں، کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح اللہ ہونے کا بیانیہ، اس کی تمام اسرائیلی روایات اور تفصیلات صریحاً اہل کتاب کی گھٹری ہوئی بات ہیں۔ اس عقیدہ کا تضاد خود انکی اپنی کتابوں کے اندر موجود ہے۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں: ”بانبل میں ایک جگہ لکھا ہے کہ اللہ نے ابراہیم سے کہا کہ اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی دے۔ گویا جس بیٹے کی قربانی دی وہ اکلوتے تھے۔ اس کے بعد ایک اور جگہ بانبل میں لکھا ہے کہ جب اسحاق پیدا ہو تو اسماعیل دس برس کا تھا اور وہ اس کے ساتھ ٹھٹھا کرتا تھا۔ (حوالہ کیلئے دیکھئے)

<http://www.catholic.org/encyclopedia/view.php?id=6197>

اس کا مطلب ہوا کہ اسے عیل پہلے پیدا ہوئے اور حضرت اسحاق سے دس سال بڑے تھے۔ ”(محاضات قرآنی، 236) حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت میکی علیہ السلام کے قتل کے جانے کی تمام روایات، تفصیلات اور بیانیہ بھی اسی طرح صریحاً اہل کتاب کی گھٹری ہوئی بات ہیں۔ جو صاحبان علم قرآنی تائید سے خالی حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت میکی علیہ السلام کے قتل کے بارے میں اسرائیلی روایات قبول کر رہے ہیں انھیں سوچنا چاہئے، کیا وہ حضرت اسحق علیہ السلام کے ذبح اللہ ہونے کے بارے میں اسرائیلی بیانیہ قبول کر سکتے ہیں؟ جناب ملک نہش الدین صاحب نے فرمایا: قرآن پاک کا اسلوب تقریری ہے، تحریری نہیں۔ تحریری پیغام سے قاری لغت، گرامر، اور اپنی فہم و فراست سے مفہوم تک پہنچتا ہے۔ تقریری پیغام میں ماحول کے حالات، واقعات، معاملات، کیفیات، وقت، مقام، مقدار وغیرہ کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے مقصود اہم ہوتا ہے۔ تقریری پیغام کا مطحح نظر خاطبین کو مقصود تک پہنچانا ہوتا ہے۔ تفسیر فاضلی جو ایک صاحب حال بزرگ حضرت فضل شاہ کے بیان پر مشتمل ہے، مفہوم کے بجائے کلام پاک کے مقصود کو واضح کرنے کی عالیشان مثال ہے۔

تفسیر بالروایت کی اہم صورت شان نزول کے ذریعے تفسیر بیان کرنا ہے۔ اس پر تفصیلی گفتگو ہم اصول تفسیر کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی آئندہ تصنیف میں کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، مختصر آئیہ کہا جا سکتا ہے کہ نبی پاک ﷺ کے فوری خاطبین آپ کی قوم کے لوگ ہی تھے، لیکن قرآن پاک کا پیغام داعی ہے۔ تمام انسانوں اور زمانوں کیلئے ہے۔ قرآن پاک کے بیان میں پیغام قرآن کے اس داعی پہلو کو ملحوظ رکھنا حق ہے، محدود کرنے کی کوشش حق نہیں ہے۔ (تفسیر فاضلی اول 1997ء) تفسیر بالروایت میں بالعموم اس داعی پہلو کو ملحوظ رکھنا ممکن نہیں رہتا۔ قرآن پاک اللہ کا فرمان ہے۔ روایت، فرمان الٰہی کی حضور ﷺ سے منسوب تاویل، تفسیر، تشریح یا تغییر کو بیان کرتی ہے۔ حکم داعی ہوتا ہے؛ تغییر حکم کا وقت، مقام اور مقدار کے مطابق ہونا لازم ہے۔ تفسیر بالروایت میں روایت کو قرآن پاک پر حکم بنادیا جاتا ہے، اس طرح فرمان الٰہی کا داعی پہلو پک پشت چلا جاتا ہے۔ بعض اوقات روایت میں بیان کردہ واقعہ، فرمان الٰہی کے منشاء کے یکسر خلاف ہوتا ہے، لیکن اسے حکم مان کر قرآن پاک کی تفسیر اس کے مطابق کی جاتی ہے۔ جس کی ایک مثال ہمارے مضمون ”وحدت الوجود، وحدت الشہود اور وحدت شاہدین“ میں سورہ عبس کی آیات نمبر 1-10 کی تفسیر کے حوالے سے ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

تحریری اور تقریری اسلوب میں فرق کا اظہار صیغہ واحد حاضر (تو) اور صیغہ واحد غائب (اس نے) کے استعمال میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ تقریری اسلوب میں صیغہ واحد حاضر میں خطاب کر کے متكلم یا مقرر بسا اوقات اپنے مخاطبین کے ایک ایک فرد کو مخاطب کرتا ہے۔ اس فرق کو ملحوظ نہ رکھ کر متوجہین نے ایسی باتیں منسوب کر دی ہیں حضور سے جو آپ کی شان سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتیں۔ اللہ تعالیٰ ستار العیوب ہے۔ اس نے برائی سے نفرت کرنا سکھایا ہے، بروں سے نفرت کئے جانے کو پسند نہیں فرمایا۔ سورہ عبس میں ستار العیوب نے صیغہ واحد غائب ”اس نے تیوری چڑھائی“ میں خطاب کر کے اپنے محبوب پاک کے کسی مانے والے کی اصلاح اور مبلغین کو تبیغ کا علم عطا فرمانا پسند فرمایا۔ لوگوں نے اپنی کم فہمی سے وہاں نام رکھ دیا۔ کیا یہ اللہ اور اسکے رسول سے تقدم نہ کرنے کے حکم کی خلاف ورزی نہیں! (القرآن، 1: 49) اور نام بھی اس ذات اقدس ﷺ کا جو معیار مطلق ہے حسن عمل کا، جو اللہ کا چیخا ہوا معیار ہدایت ہے۔ کیا یہ حضور کی تنظیم اور تو قیر ملحوظ رکھتے (القرآن، 9: 48) کے حکم الہی کی صریح خلاف ورزی نہیں! جس ذات اقدس کی اطاعت، اللہ کی اطاعت کی سند ہو، اس کا نام اس طرح لینا انتہائی خلاف ادب نہیں ہو گا کیا! قرآن پاک میں ارشاد ہے: إِنَّ الَّذِينَ يَكُفِّرُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَيَقُولُونَ تُؤْمِنُ بِعَصْمَهُ وَتُكَفِّرُ بِعَصْمِهِ وَمُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَلِكَتَهُمُ الْكَافِرُونَ حَتَّىٰ وَأَعْنَدُنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِمِّهِنَا ﴿١﴾ ”وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کا انکار کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اسکے رسول کے مابین تفریق کریں، ۔۔۔ یہی حقیقی کافر ہیں۔۔۔“ (القرآن، 51: 4-150) تحریری اور تقریری اسلوب میں فرق کا ادراک نہ کر سکنے کی وجہ سے بھی آیات قرآن کے منشاء کو سمجھنے میں لوگوں کو مغالط لگا ہے۔

آئیے اب متن قرآن کے تاظر میں جائزہ لیتے ہیں سورہ نور کی آیت نمبر 26 کے ترجمے کا جس طرح حضرت فضل شاہ نے کرنا پسند فرمایا ہے۔ آیت نمبر 26 سے پہلے کی آیات میں ایمان والوں میں غاشی کی اشاعت چاہئے والوں کو دنیا اور آخرت میں المناک عذاب کی، اور پاک دامن، انجان عورتوں پر عیب لگانے والوں کو دنیا اور آخرت میں لعنت کی و عید سنائی جا رہی ہے۔ خبیث لوگوں نے سیدنا حضرت عائشہؓ کے بارے میں خبیث باتیں کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں خبیث لوگوں کی خبیث بالوں سے آپ ﷺ کی بریت کا اعلان کر دیا۔ اس تاظر میں فرمایا جا رہا ہے کہ ”خبیث باتیں خبیث لوگوں کی ہوتی ہیں اور خبیث لوگ ہی خبیث باتیں کرتے ہیں۔ اسی طرح طیب باتیں طیب لوگوں کی ہوتی ہیں اور طیب لوگ ہی طیب باتیں کرتے ہیں۔ یہ جو [طیب] لوگ

ہیں مبرّ اہیں ان [خبیث] باتوں سے جو یہ [خبیث] لوگ ان کے بارے میں کرتے ہیں۔ ان [طیب] لوگوں کے لئے اللہ کی بارگاہ میں مغفرت ہے اور عزت والارزق ہے۔“

جن مفسرین کرام نے ”الْجَيِّنَاتُ لِلْخَيْثِينَ وَالْخَيْثُونَ لِلْخَيْثِاتِ ۚ وَالْطَّيِّبَاتُ لِلْطَّيِّبِينَ وَالْطَّيِّبَوْنَ لِلْطَّيِّبَاتِ ۚ“ کا مصدق خبیث اور طیب عورتیں اور مرد قرار دیا ہے، جو بات یہ مفسرین اخذ کرنا چاہتے ہیں اس کا مقام سورہ المتحہ 60 میں ہے جہاں فرمایا گیا ہے کہ:

”اے ایمان والو! جب تمہارے پاس ایمان والی مہاجر عورتیں آئیں، تو ان کا امتحان کرو۔ اللہ کو ان کے ایمان کا بڑا علم ہے۔ پھر اگر تمحیص وہ ایمان والی معلوم ہوں، تو انہیں کافروں کی طرف نہ لوٹاؤ۔ نہ یہ عورتیں انھیں حلال ہیں اور نہ وہ مردانھیں حلال ہیں۔۔۔“ (القرآن، ۱۰: 60)

یعنی کافر عورتوں اور مردوں اور ایمان والی عورتوں اور مردوں کے درمیان وقف لازم ہے۔ اگر یہ فرق ثابت ہو جائے تو ان کے درمیان وقف لازم کو ملحوظ رکھنے کا حکم ہے۔ لیکن عملی زندگی میں ایسی بہت سی صورتیں ہوتی ہیں جہاں خبیث اور طیب کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک ہدایت کا دروازہ کھلا ہوا ہے، جس کا علم صرف اللہ ہی کو ہے، خبیث کے طیب کے طبق ہو جانے کا امکان موجود ہوتا ہے۔ اسلئے سورہ نور کی مولہ بالا آیت میں ”الْجَيِّنَاتُ لِلْخَيْثِينَ وَالْخَيْثُونَ لِلْخَيْثِاتِ ۚ وَالْطَّيِّبَاتُ لِلْطَّيِّبِينَ وَالْطَّيِّبَوْنَ لِلْطَّيِّبَاتِ“ کا مصدق خبیث اور طیب عورتیں اور مرد قرار دینا درست نہیں۔

جناب طالب محسن صاحب، علامہ جاوید احمد غامدی صاحب کے شاگرد رشید ہیں۔ انکی کتاب ”دلیل راہ: پچھلے برسوں میں لکھی گئی تحریروں کا مجموعہ“ میں تفسیر فاضلی پر ۱۹۹۵ء میں چھپا ہوا تبصرہ ”قرآن فہمی کے اصول اور تفسیر فاضلی“ کے عنوان سے موجود ہے۔ تقدیم کی مسلمہ حدود میں رہتے ہوئے کسی علمی تحریر پر تبصرہ کرنا، بالخصوص جس تحریر سے آپ اختلاف کر رہے ہوں، بہت سمجھیدگی اور احتیاط کا متقاضی ہوتا ہے۔ طالب محسن صاحب تعریف کے مسختیں ہیں، انہوں نے ان حدود کا لحاظ رکھا ہے۔ اپنے مضمون میں انہوں نے اصول تفسیر پر جو گفتگو کی ہے اس کتاب میں اسکا تفصیلی جائزہ لینا ممکن نہیں ہو گا۔ وہ انشاء اللہ ہماری اگلی کتاب کا موضوع ہو گا۔

تفسیر قرآن سے متعلق چند اصولی مباحث [ان کے بقول] کے اجمالاً ذکر کے بعد، جناب طالب محسن صاحب ”تفسیر فاضلی“ کو ”تعبری تفسیر“ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ”یہ، علمی دنیا میں، در حقیقت، کوئی طریقہ تفسیر ہی نہیں ہے۔“ ان کے نزدیک درست تفسیر کو درج ذیل دو اصولوں پر لازماً پورا اترت ناچاہئے۔

”تفسیر سے مراد یہ ہے کہ ہم کلام کا مدعای اور معنی واضح کریں۔ یعنی، [1] اس کلام میں موجود لغوی، نحوی اور ادبی قرآن کے دائرے میں رہتے ہوئے، اس کا مفہوم متعین کریں اور [2] سیاق و سبق اور نظم کی دلائل کو نظر انداز کیے بغیر کلام میں موجود حقائق تک رسائی حاصل کریں۔“

اپنی بات کو واضح کرنے کیلئے وہ تفسیر فاضلی سے سورہ الفاتحہ کی آیت مبارکہ **إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينَ** کی تفسیر کو بطور مثال پیش کرتے ہیں۔ اور جذاب مولانا امین الحسن اصلاحی گی ”تدریب قرآن“ میں اسی آیت پاک کی تفسیر سے مقابل کر کے نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

”در حقیقت، تفسیر کا یہ چھوٹا سا مکمل اس بات کی غمازی کرتا ہے۔۔۔ کہ قرآن کی زبان، سورہ کا اسلوب اور طرز استدلال [مصنف تفسیر فاضلی] کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔“

ویسے تو سورہ البقرہ کی آیت نمبر 61 اور سورہ نور کی آیت نمبر 26 کے حوالے سے اوپر اسی تحریر میں، اور بعض اہم نکات کیوضاحت کیلئے سورہ البقرہ کی پہلی آیت مبارکہ **اللَّهُ**، اور سورہ عبس کی ابتدائی آیات کی ”تدریب قرآن“ اور چند دیگر تفاسیر میں کی گئی تفسیر کا ”تفسیر فاضلی“ سے علمی مقابل ہمارے مضمون ”وحدت الوجود، وحدت الشہود اور وحدت شاهدین“ میں شامل ہے، اور قارئین ان کے مطالعہ سے محسن طالب صاحب کے نقد و تبصرہ کی حقیقت جان سکتے ہیں، پوچھ کہ انہوں نے اپنے مضمون میں تفسیر فاضلی سے سورہ الفاتحہ کی آیت مبارکہ **إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينَ** کی تفسیر کو ”تفسیر فاضلی“ پر اپنے نقد و تبصرہ کے لئے بطور خاص منتخب کیا ہے، آئیے اس آیت مبارکہ کی تفسیر کا بھی جائزہ لے لیتے ہیں۔ ”تفسیر فاضلی“ میں یہ اس طرح بیان کی گئی ہے:

”**إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينَ** ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیری ہی اعانت چاہتے ہیں۔“

(القرآن، 1:4)

تفسیر: [1] ”رب العالمین کی بے حد مہربانی اور بے حد رحم کے اعتراف کے ساتھ، جزا کو اسی کی طرف سے سمجھنا بندے پر حق ہے۔ [2] اللہ کا نبی عبدہ اور اس کا حال عبودیت ہوتا ہے۔ عبودیت یہ ہے کہ عادتاً کوئی کام نہ ہو، اس لیے ہو کہ اللہ کے محبوب نے ویسے کیا ہے۔ [3] اللہ کی مدد اس لیے چاہتے ہیں کہ وہ ہمیں شاهدین میں لکھ لے، ہمیں تزکیہ عطا ہو اور فلاح عطا ہو۔

حاصل: عبدہ کا حال عبودیت کا معیار مطلق ہے۔ استعانت کی دعا اسلئے ہے کہ اللہ کے محبوب سے تزکیہ عطا ہو اور اطمینان عطا ہو۔“ (تفسیر فاضلی اول، 2)

حسن طالب صاحب نے تفسیر سے مراد ”کلام کا مدعا اور معنی واضح کرنا“ بیان کیا ہے اور پھر اس مقصد کے حصول کو دو اصولوں سے مشروط کر دیا ہے۔ پہلا اصول انہوں نے ”اس کلام میں موجود لغوی، نحوی اور ادبی قرآن کے دائرے میں رہتے ہوئے، اس کا مفہوم متعین کرنا“ تجویز کیا ہے۔ ان کے نزدیک ان ”لغوی، نحوی اور ادبی قرآن“ کا معیار نزول قرآن کے زمانے کی عربی زبان ہے۔ لیکن اس کے ساتھ قرآن پاک سے کسی اٹھارٹی کا حوالہ نہیں دیا! کیا قرآن پاک سے کوئی ایسی سند دکھائی جاسکتی ہے جس کی رو سے کسی کی تجویز کو یہ درجہ دیا جاسکتا ہو کہ اسے اللہ کے کلام کی تفسیر کیلئے اصول مان لیا جائے! ”تفسیر فاضلی منزل اول“ میں ”تعارف“ کے آخر میں ”تفسیر پاک کے بارے میں آپ کا فرمان ملاحظہ ہو“ کے عنوان سے جو دس اصول تفسیر، بیان کئے گئے ہیں، جن میں سے ہر ایک کے ساتھ قرآن پاک سے اسناد پیش کی جاسکتی ہیں، یہ بہتر نہ ہوتا کہ جناب حسن طالب صاحب سورہ فاتحہ کی ایک آیت کی تفسیر کا تقابلی جائزہ لینے کی بجائے ان ”أصول تفسیر“ کا تنقیدی اور ”تدبر قرآن“ کے اصول تفسیر سے تقابلی جائزہ لیتے۔ یہ یقیناً ایک بہت بڑا علمی کام ہوتا۔ ہم نے اپنی کتاب میں جہاں کسی آیت کی تفسیر کا جائزہ لیا ہے، جس تفسیر کو درست قرار دیا ہے اس کے ساتھ قرآن پاک کی سند کے ساتھ اس کا اصول بھی بیان کیا ہے۔

حسن طالب صاحب نے تفسیر فاضلی سے صرف ایک اصول کا حوالہ دینا پسند کیا ہے اور وہ یہ کہ ”[تفسیر] لغت اور گرامر کے تابع نہ ہو کہ حادث علم سے علم الہی کو جانچنا بے جا ہے۔“ اور اس اصول کا بھی ٹھیک اور اک کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ انھیں اعتراض ہے کہ ”کلام اللہ“ کو گرامر کے ”حادث علم“ (contingent knowledge) کے مقابل ”علم الہی“ [God-given knowledge] سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے۔ کیا قرآن پاک علم، ہدایت، بشارت و انذار کی کتاب نہیں ہے جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح القدس نے حق کے ساتھ نازل فرمایا ہے تاکہ ایمان والوں کو ثبات دے اور مسلمین کو ہدایت و بشارت ملے۔ (القرآن، 102:16)<sup>3</sup> ہم درج ذیل چند مزید اصولوں کا حوالہ دیکر جاننا پاہیں گے کیا وہ ان سے اتفاق کرتے ہیں، جو انہوں نے ان کا حوالہ دینا پسند نہیں فرمایا، یا ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔

”آیات قرآن پاک کے دوام کو ماننا حق ہے، محدود کرنے کی کوشش حق نہیں ہے۔“

بنی اسرائیل کی روایات کے حوالے سے تفسیر بیان کرنا وقف لازم کا عدم لحاظ ہو گا۔

”قرآن پاک میں تدبیر کی صورت یہ ہے کہ حکم خداوندی کو تضاد سے پاک مانا جائے۔۔۔“

اگر وہ حکم خداوندی کو واقعی تضاد سے پاک مانتے ہیں تو پھر ”تدبر قرآن“ اور ”البيان“ میں سورہ النور کی آیت نمبر 26 کا ترجمہ اور تفسیر، قرآن پاک ہی کی دیگر آیات سے متناقض کیوں ہے؟ حسن طالب اپنے

ضمون میں لکھتے ہیں کہ ”[قرآن پاک] تمام آسمانی مذاہب کا ناسخ اور ان میں موجود حق اور ناحق کی کسوٹی ہے۔ اس معاملے میں اسے حاکم مطلق کی حیثیت حاصل ہے۔ اس سے پہلے جو کچھ بیان ہوا، اور اس کے بعد جو کچھ کہا گیا ہے اور کہا جائے گا، وہ اگر اس کے مطابق نہیں ہے تو قبول نہیں کیا جائے گا۔ یہاں تک کہ نبی پاک ﷺ سے منسوب روایات کے حق اور ناحق کو جانے کا معیار بھی یہی ہے۔“ تدبر قرآن، اور ’البيان‘ سورہ المقرہ کی آیت نمبر 61 میں ”وَيَقُولُونَ الْبَيِّنَاتِ يَغْتَرِبُ الْحُكْمُ“ کی تفسیر میں تخصیص کے ساتھ حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل کے بارے میں بائبل کی روایات کی تصدیق کیوں کرتی ہیں؟ کیا کوئی ادنیٰ قرینہ قرآن پاک سے دکھایا جاسکتا ہے جو تخصیص کے ساتھ حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل کی درستگی کی تصدیق کرتا ہو؟ قرآن پاک کے صریح بیان کے مقابل وہ کون سی چیز ہے جو بائبل کی قرآن پاک سے متصادم روایات کو قبول کرنے پر مجبور کرتی ہو!

کیا ایسا نہیں ہے، کہ زمانہ نزول قرآن کی عربی زبان، الفاظ کے معنی، اسالیب بیان، محاوروں پر گرفت، تراکیب، تشبیہ و استعارے کے رنگ اور سب سے بڑھ کر صاحب تفسیر کا بزم خود اعلیٰ ادبی ذوق؛ پھر اسی پر بس نہیں اہل کتاب کی الہامی کتابوں، جن کے تحریف شدہ ہونے کی شہادت خود قرآن پاک کے اندر موجود ہے، پر بزم خود گہری نظر و غیرہ ملکر تفسیر قرآن کے وہ اصول تشكیل کرتی ہیں جن کے مطابق جناب محسن طالب صاحب کے مدد و حین کی تفاسیر درست اور دیگر تفاسیر، نادرست ٹھہرتی ہیں۔ ہم نے ایک سچے طالب علم کی حیثیت سے سخیدگی کے ساتھ جناب محسن طالب صاحب کے افکار پر غور کیا ہے، اور ہم انھیں بھی ایک سچا طالب علم سمجھتے ہوئے بھلانی اور خیر کے جذبہ کے ساتھ اپنے خیالات ان کے سخیدہ غور و فکر کے لئے پیش کر رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک محسن طالب صاحب جیسے وہ تمام اصحاب جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ کے فرمان کو سمجھنے اور عمل کرنے کیلئے وقف کیا ہوا ہے، نہایت قابل قدر لوگ ہیں۔ اللہ ان کے اخلاص کو قبول فرمائے اور بھول کو معاف فرمائے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ محسن طالب صاحب اس بات کو ٹھیک طرح سمجھنے نہیں سکے کہ ہر کلام کی پشت پر ایک ما بعد الطیعتاں، ایک وجودیات، اور علمیات بھی ہوتی ہے۔ کلام کے الفاظ، معنی، اسلوب بیان، محاوارے، تراکیب، تشبیہ و استعارہ اس کے رنگ میں رنگے ہوتے ہیں۔ اس کتاب میں شامل تمام مضامین میں یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی گئی کہ مسلم فکر کے ہمارے مطالعے میں آنے والے تمام مسائل کا ماغذہ قرآن پاک سے متناقض ما بعد الطیعتاں، وجودیات، کامیابی اور اخلاقیات پر مبنی اصطلاحات اور نظریات کو قرآن پاک کے مطالب کی وضاحت کیلئے قبول کرنے میں پایا جاتا ہے۔ مزید

وضاحت کیلئے سورہ الجاثیہ سے ایک مثال پیش کرنے سے پہلے جملہ مفترضہ کے طور پر خالص مذہبی پس منظر میں ایک اصطلاح ”نص“، کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

یہ لفظ نہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں کہیں ارشاد فرمایا ہے نہ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے ارشادات میں کہیں استعمال کیا ہے۔ یہ اصطلاح بعد کی صدیوں میں محمد شین، فقہا اور جدید علماء سمیت بہت سے لوگوں کی طرف سے اس طرح استعمال کی گئی ہے کہ یا تو قرآن پاک اور سنت مبارکہ، کی عبارتوں کو نص قرار دیا ہے اور حدیث پاک میں فرق کیا ہے یا قرآن، سنت اور احادیث، تینوں کو ”نص“، قرار دے کر مأخذ شریعت قرار دیا ہے۔ مثلاً مولانا امین حسن اصلاحیؒ آیات قرآن پاک اور صرف سنت رسول ﷺ کو بیان کرنے والی روایات کیلئے ”نص“، کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک حدیث اور سنت میں بنیادی طور فرق ہے اور دین میں دونوں کا مقام اور مرتبہ الگ الگ ہے۔ وہ قرآن پاک اور سنت کو مأخذ شریعت قرار دیتے ہیں۔ (مبادی تدریس حدیث، 19) جناب ڈاکٹر طاهر القادری قرآن و حدیث کی ظاہر عبارت کو ”نص“، قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نص کی بنیاد مغض و حی پر ہوتی ہے۔ (نص اور تعبیر نص، 5) ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ کے نزدیک ”نص“ سے مراد قرآن پاک اور سنت رسول کے Text یا عبارتیں ہیں۔ ”ان کے نزدیک ”حدیث اور سنت“۔ شریعت کا مأخذ ہے، قرآن مجید کی شارح ہے، وحی الہی کی تفسیر ہے۔“ (محاضرات حدیث، 83) مزید کہتے ہیں: ”قرآن مجید بنیاد ہے، سنت رسول اس بنیاد پر تعمیر ہونے والا ڈھانچہ ہے۔ قرآن مجید میں بنیادی اصول اور کلیات بیان کئے گئے ہیں، حدیث ان کلیات کی عملی تقطیق ہے۔ قرآن مجید کی جو عمومی ہدایات اور احکام ہیں حدیث اور سنت ان کی عملی، متفقہ اور متحده تشکیل ہے۔ (محاضرات حدیث، ماخوذ 67-68) جناب پیر کرم شاہ الازہریؒ کے نزدیک ”سنت رسول اللہ ﷺ“ جس کی اطاعت کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں بار بار حکم دیا ہے، اس سے مراد حضور ﷺ کے فقط وہ اقوال، افعال اور وہ تقریرات ہیں جن کا تعلق تشریع سے ہے۔ ان کے علاوہ جو اقوال و افعال انسانی طبیعت سے وابستہ ہیں وہ احکام تشریعیہ میں داخل نہیں۔“ (سنت خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام، 179) پیر صاحب نے اپنی اس کتاب میں ”نص“، کا لفظ قرآن پاک کی آیات کیلئے تو استعمال کیا ہے، البتہ سنت اور حدیث کیلئے کہیں استعمال نہیں کیا۔

قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ اللہ علیم مطلق ہے۔ علیم مطلق نے کلام اللہ کی عبارت متن کیلئے پورے قرآن پاک میں کہیں ”نص“، کا لفظ استعمال کرنا پسند نہیں فرمایا۔ اللہ کریم نے قرآن پاک کو ”حق“، (معیار حق) قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو فرمان الہی کی حکمت بھی عطا فرمائی ہے۔ وہ علم عطا

فرمایا جو کسی کو نہیں تھا اس سے پہلے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب پاک کو کیا کیا علم عطا فرمایا، اس کو صرف عطا فرمانے والا ہی جانتا ہے یا جسے عطا فرمایا گیا وہ جانتا ہے۔ کسی دوسرے کا یہ مقام نہیں کہ وہ اس کا احاطہ کر سکے۔ حضور ﷺ کے قول، عمل، علم اور اخلاق میں حق کے علاوہ ہو ہی نہیں سکتا کچھ۔ دائرة عبدیت میں آپ کو جو شان عطا ہوئی، اس سے بڑا کوئی درجہ نہیں۔ اللہ کے فرمان کا سب سے بڑا علم رکھنے والے اور اللہ کی عطا کی ہوئی حکموں کے سب سے بڑے جانے والے رسول اللہ ﷺ نے قرآن پاک کیلئے، اپنی سنت مبارکہ (یعنی فرمان الہی کے مطابق مناسک و عبادات اور معاملات زندگی کی عملی تشكیل) کے متون کیلئے، اپنی حدیث پاک (یعنی فرمان الہی میں بیان کردہ عقائد کی تاویل، تشریح، تفسیر اور احکام کی تفہیز) کی عبارتوں کیلئے (نص، کالفظ کہیں استعمال کرنا پسند نہیں فرمایا۔ بے شک اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت سے ہی اللہ کی اطاعت ثابت ہوتی ہے۔ بے شک اسوہ حسنہ ہی وہ روشن راستہ ہے، جس سے فرمان الہی پر عمل کے لئے تاقیامت استفادہ کیا جاتا رہے گا۔ اس سے یہ جواز کیسے نکلتا ہے کہ قرآن پاک اور احادیث صحیح پر مشتمل کتب، دونوں کے متون کو (نص، کی غیر قرآنی، برخلاف سنت، خود ساختہ اصطلاح سے تعبیر کر کے) احادیث صحیح پر مشتمل کتب، اور قرآن پاک کو ایک ہی نام (یعنی (نص،)) اور ایک ہی مقام (یعنی مأخذ شریعت ہونا) تقویض کر دیا جائے! قرآن پاک قول ہے اور مأخذ شریعت ہے، حدیث پاک عمل ہے اور احکام کی تشكیل اور عقائد کی تشریح و تفسیر ہے، اور فقط علم ہے۔ (نص، کی اصطلاح کے ذریعے مأخذ شریعت اور اسکی عملی تشكیل دونوں کو مأخذ شریعت قرار دے دینا، سہوایا مصلحتاً یا ادب و محبت کی بہت اعلیٰ نیت ہی سے ہے، کیا یہ اللہ اور اس کے رسول سے تقدم نہیں! غور فرمائیے، انکارِ حدیث کافته کہیں اسی تقدم اور غلوکا ہی نتیجہ تو نہیں! احادیث صحیح میں سب سے اعلیٰ درجہ احادیث قدسی کا سمجھا جاتا ہے۔ کیا آیات قرآنیہ کی طرح احادیث قدسی کی تلاوت کی جاتی ہے نماز میں! اس کتاب میں ایک حدیث قدسی کے حوالے سے مضمون ”کیا اللہ الدّھر ہے؟“ بھی شامل ہے، ہمارے موقف کی صحیح تفہیم کیلئے اسے ملاحظہ فرمایا جانا بہت مناسب ہو گا۔ جب آیاتِ محکمات سے صرفِ نظر کر کے قرآن پاک کی اپنی آیاتِ متشابہات کو مأخذ شریعت نہیں مانا جا سکتا، جب ان کی اپنی تاویل کے لئے لازم ہے کہ وہ ”احسن الحدیث“ کی محکمات کے ساتھ ہم آہنگ ہو، تو حدیث صحیح جو تشكیل ہے، تاویل ہے، تفسیر اور تفہیز ہے محکمات کی، اسے مأخذ شریعت قرار دینا کیسے درست قرار دیا جا سکتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”---بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور آیا اور کتاب مبین آئی۔“ (تفسیر فاضلی منزل دوام، آیت 15:5) اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول پاک نور

ہیں اور قرآن پاک کتاب مبنی ہے۔ نور وہ مقصود ہے، عبدیت کا وہ مطلق نمونہ ہے، جس کی طرف چنان ہے، اور روشن کتاب وہ شریعت ہے جس سے راستہ روشن ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”— ہم نے آپ پر ذکر نازل فرمایا کہ آپ روشن کر دیں، جو ان کی طرف بھیجا گیا ہے، تا کہ وہ تھکر کریں۔“ (القرآن: 16:44) قرآن پاک حکم ہے، حضور ﷺ اس کی مطابقت میں رضاۓ الہی کا مطلق نمونہ ہیں۔ اطاعت حکم کی ہوتی ہے، اتباع مستند نمونے کا ہوتا ہے۔ ذکر کو لوگوں پر روشن کرنار رسولؐ کی ذمہ داری ہے۔ جب تک آپ اس ذکر کو واضح نہ کریں، رضاۓ الہی معلوم نہیں ہو سکتی۔ جن کا قول فرمان الہی سے، جن کا حسن عمل حضورؐ کے اسوہ حسنہ سے روشن ہوا، جنہیں اپنے شاہد سے تزکیہ یافتہ ہونے کی سند عطا ہوئی، اب قیامت تک وہی اس ذکر کو روشن کرنے کا حقیقی ذریعہ ہیں۔ یہی لوگ علم حدیث کے امین ہیں۔ (تفیر فاضلی منزل سوم، آیت نمبر 44:16)

جب قرآن پاک میں ہرشے کی تفصیل موجود ہے (القرآن: 6:114)، ہرشے کا بیان موجود ہے (القرآن: 16:89)، تو کیا آپ کی کوئی سنت تشریعی ایسی ہو سکتی ہے، فرمان الہی جس کا مانذہ ہو۔ سنت تشریعی، احکام شریعت کی عملی تنکیل ہے۔ حکم کی تنکیل خود ماذد شریعت کیسے ہو سکتی ہے۔ جوں کے ساتھ اہل کتاب کا سامعامله کرنے، دیت کو مقتول کا ترکہ تسلیم کرتے ہوئے یہوہ کو اس سے حصہ دیا جانے، جنین کی دیت غرہ (دیت کا بیسواں حصہ) قرار دینے، شادی شدہ زانی وزانیہ کیلئے رحم کی سزا، اللہ اور اس کے رسولؐ سے جنگ کرنے اور ملک میں فساد پھیلانے والوں کو عبرتیاک قتل کی سزا دینے (جیسا کہ قبیلہ عکل / عرینہ کے افراد کے ساتھ کیا گیا جنہوں نے بیت المال کی اوٹیبوں کے محافظ کو قتل اور انھیں گرفتار کرنے کیلئے بھیجے گئے دستے کے ایک صحابی کو نہایت بہیانہ طریقے سے شہید کیا تھا)، غیر وارث کیلئے وصیت کی حد ثلث مال تک معین کرنے، جائز کام میں کسی کے پاس خاطر کیلئے قرعد اندازی سے فیصلہ کرنے وغیرہ کی سنن قرآن پاک میں موجود ہرشے کی تفصیل اور بیان کے مضرات اخذ کرنے کی مثالیں ہیں اور دیگر معاملات میں احکام الہی کی تعبیر کیلئے حکم نظائر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر رسول اللہ ﷺ نے ان معاملات میں رہنمائی نہ فرمادی ہوتی تو امت کیلئے محض اجتہاد کی بنیاد پر ان مناجتک پہنچنا مشکل ہوتا۔ امید ہے، اگلی کتاب میں اس موضوع کے دیگر پہلوؤں پر تفصیل سے گفتگو کی جاسکے گی۔

آئیے محسن طالب صاحب کے بیان کردہ اصول تعبیر کا جائزہ لینے کیلئے سورہ الجاثیہ (45:24) سے ایک مثال ملاحظہ کرتے ہیں۔ فرمان الہی ہے:

1۔ ”اور اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ خلق کیا ہے، تاکہ ہر نفس اپنے کسب کی جزا پائے، اور ان پر خلمنہ ہو گا۔“ (القرآن، 45:22)

2۔ اس کے مقابل مکنرین کا حال اس طرح بیان کیا گیا ہے:

”بِحَلَادِيَّكُو تو جس نے اپنی خواہش کو معبد بنالیا ہے اور اللہ نے اسے ایک علم پر گمراہ کر دیا ہے، اور اس کے کان اور دل پر مہر کر دی ہے اور اسکی آنکھ پر پر دہ دہاں دیا ہے، تو اللہ کے بعد اسے کون ہدایت دے سکتا ہے، تو کیا تم دھیان نہیں کرتے۔ (القرآن، 45:23)

اور کہتے ہیں وہ تو ہماری حیات دنیا ہی ہے کہ ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور زمانہ ہی ہمیں ہلاک کرتا ہے، اور انھیں اس کا علم نہیں۔ وہ تو حُسنِ خن میں پڑے ہوئے ہیں۔ (القرآن، 45:24)

کیا ایسے لوگوں کے کلام سے اخذ کردہ صرف و نحو، الفاظ، محاورے، اسلوب بیان، تشبیہ و استعارہ کی بنیاد پر، جو اللہ کو مانتے ہی نہیں، شرک کرتے ہیں، جنہوں نے خواہشات کو معبد بنالیا ہے، جنھیں ان کے علم کی وجہ سے اللہ نے گمراہ کر دیا ہے، جنھیں کائنات مقدمیت سے خالی دکھائی دیتی ہے، جو مقصد حیات کا انکار کرتے ہیں، جو حیات دنیا ہی کو مانتے ہیں اور آخرت کو نہیں مانتے، جو اللہ کی مشیت کا انکار کرتے ہیں اور عروج و زوال، رنج اور راحت کو زمانے کے الٹ پھیر سے منسوب کرتے ہیں، ہم اُس اللہ کے کلام کے مدعا کو پاسکتے ہیں، جس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ خلق فرمایا ہے کہ ہر نفس اپنے کسب کی جزا پائے۔ کیا یہ تفسیر میں وقف لازم کا عدم لحاظ نہیں! تلاوت میں تو وقف لازم ضروری سمجھا جائے اور تفسیر میں اس کا لحاظ نہ رکھا جائے، کیا یہ غیر مناسب نہیں۔ اللہ کے فرمان میں اپنی تجویز دا غل کرنا، یعنی فرمانِ الہی کی تعبیر یا عملی تشكیل اس طرح کرنا، کہ وہ بندے کی اپنی پسند اور ناپسند کے مطابق ہو جائے ’فسق‘ ہے۔ (سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے باز رہنے کے حکمِ الہی کی اپنی خواہشات کے مطابق تعبیر اور تشكیل کرنے کا فرمانی کرنے والوں کو اللہ نے ’فسق‘ کا مرکتب قرار دیا ہے۔) کیا نزولِ قرآن کے زمانے کی عربی لغت میں آپ کو ’فسق‘ کے یہ معنی مل سکتے ہیں! جس گرامر، صرف و نحو، لغت، محاورہ، حدیث اور اصولوں کا اتباع ’احسن الحدیث کتاب‘ کو متراقب بالذات ثابت کرتا ہو، جس سے ’حدیث اصدق‘ (4:87) میں خود تردیدی پیدا ہوتی ہو، کیا اسے تعبیرِ قرآن کی بنیاد بنا کا درست ہو سکتا ہے! کیا درست طریقہ یہ نہیں کہ قرآن پاک کی لغت، گرامر، صرف و نحو اور تعبیر کے اصول خود قرآن پاک کے اندر سے اخذ کئے جائیں! جس کی چند مثالیں ہم آیات نمبر 61:2 اور سورہ عبس کی تفسیر کے ضمن میں اوپر پیش بھی کر چکے ہیں۔

عربی زبان ہے اور زبان کو سمجھنے کیلئے زبان کے الفاظ، گرائمر، محاورے کا علم ہونا ضروری ہے۔ لیکن قرآن پاک کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے اسے عربیاء میں میں نازل فرمایا۔ جب تک کلام اللہ کی عربیاء میں کو کلام اللہ کو سمجھنے کیلئے معیار نہیں بنایا جائے گا، قرآن پاک کے مدعا کو پانा ممکن نہیں۔ (اسکی کچھ وضاحت ہم شہادت سیدنا حضرت امام حسین علیہ السلام کے حوالے سے کریں گے۔) تفسیر فاضلی پورے قرآن پاک کی اسی اصول پر تفسیر بالقرآن ہے۔ کسی نے حضرت فضل شاہ سے پوچھا: حضور! اللہ کو نسی زبان بولتا ہے۔ حضرت فضل شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ”ہر پاک زبان، اللہ کی زبان ہے۔“ جس طرح تلاوت قرآن پاک میں وقف لازم کا دھیان رکھنا ضروری ہے، اسی طرح، عمل اور علم میں بھی پاک اور ناپاک میں وقف لازم کا دھیان رکھنا ضروری ہے۔ کیا قرآن پاک میں فرمایا نہیں گیا: ﴿وَلَا تَلِّيْسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾۔ اور حق سے باطل کونہ ملا؟۔ (القرآن، 3:71، 2:42) قرآن پاک کے مدعا کو پانے کیلئے دور جاہلیت کے عربی ادب، مشرکانہ اور کافرانہ کلام یا غیر قرآنی فلسفیانہ اصطلاحات اور نظریات کو بنیاد بنا، تعبیر قرآن میں وقف لازم کا عدم لحاظ ہے، اور حق سے باطل کو ملانے والی بات ہے۔ تمثیل سے بات سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ”عمل“ میں وقف لازم کی وضاحت کیلئے، سند سے قطع نظر، ایک صحابی رسول رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منسوب روایت بطور مثال پیش کرتے ہیں:

”بیان کیا جاتا ہے کہ ایک موقع پر جب ایک صحابی رسول رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے مد مقابل کو زیر کر لیا اور اسکی گردن کاٹنے لگے تو اس نے آپ کے چہرہ انور پر ٹھوک دیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اسے چھوڑ دیا اور دوبارہ دعوت مبارزت دی۔ جب پوچھا گیا آپنے ایسا کیوں کیا، تو آپ نے فرمایا: پہلے اسے قتل کرنا صرف اللہ کی رضا کیلئے ہوتا، اب میری خواہش بھی یہی تھی۔ اپنی خواہش کو اللہ کی رضا سے الگ کرنے کیلئے میں نے اسے چھوڑ دیا۔“

یہ عمل میں وقف لازم کا دھیان رکھنے کی ایک مثال ہے۔ جس مقام پر اللہ کی رضا اور اپنی خواہش کا تقاضا ایک ہو جائے، وہاں ساکن ہو جانا متین کی طریقہ ہے۔

ہم نے تجزیاتی مقاصد کیلئے تفسیر فاضلی سے آیت زیر بحث کی تفسیر کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ محسن طالب صاحب کے مطابق تفسیر کی دوسری بنیادی خصوصیت ”سیاق و سابق اور نظم کی دلالتوں کو نظر انداز کیے بغیر کلام میں موجود حقائق تک رسائی حاصل کرنا ہے۔“ تفسیر فاضلی سے آیت زیر بحث کی تفسیر کا پہلا حصہ، اس آیت پاک سے پہلے کی تین آیات کے ساتھ اسکے ربط کو بیان کرتے ہوئے، دوسرے حصے میں

عبدت کے تصور کو بیان کرتا ہے۔ پھر تیسرا حصہ اس آیت مبارکہ میں بیان کی گئی استعانت کی دعا کو اگلی دو آیات کے ساتھ مربوط کر کے اس کے مقصد کو پورے قرآنی تناظر میں واضح کرتا ہے۔ اگر سیاق و سابق کی دلالت کا تصور جو اس آیت مبارکہ کی تفسیر کے حوالے سے ”تفسیر فاضلی“ میں بیان کیا گیا ہے، محسن طالب صاحب کے تصور سے مختلف ہے، تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس تفسیر میں اسے ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ اگر آپ ’عبدت‘ یا ’استعانت‘ کے اس تصور سے جو دوسرے اور تیسرے حصے میں بیان کیا گیا ہے، اتفاق نہیں کرتے، تو کیا یہ بہتر نہیں کہ اسے قارئین پر چھوڑ دیا جائے کہ ان کے نزدیک کونسی تفسیر ”کلام“ کے مدعا اور معنی کو واضح کرنے ”میں زیادہ کامیاب ہے۔

**محسن طالب صاحب فرماتے ہیں کہ**

”اس [تفسیر] میں ”عبدت“ کا جو مفہوم بیان کیا گیا ہے، اس کا لفظ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ مصنف کا خود ساختہ مفہوم ہے۔ [2] اس کے لیے جو استدلال پیش کیا گیا ہے، اس کا بھی اس استدلال سے کوئی تعلق نہیں۔ [3] اسی طرح ”استعانت“ کی غرض و غایت بھی مصنف نے اپنے بھی سے متعین کی ہے۔ اس کا بھی سورہ یا اس کے الفاظ سے، کسی طرح کا کوئی تعلق ثابت نہیں کیا جاتا۔“ (محسن 1995ء، ماخوذ)

ان اعتراضات کی صحت کا جائزہ لینے سے پہلے آئیے ”تفسیر فاضلی“ میں ”عبدت“ اور ”استعانت“ کے تصور کا جائزہ لیتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے درج ذیل آیات پر غور فرمائیں:

”فرماد مجھے، اگر تم اللہ کی حب رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو؛ اللہ تھیس جبیب بنالے گا، اور تمھارے گناہ بخش دے گا۔ اللہ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔“ (آل عمران: 31)

”جو اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کی اطاعت کرے، تو اسے ان لوگوں کی معیت حاصل ہوگی۔ جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا، کہ وہ نبین اور صد لقین اور شہداء اور صالحین ہیں۔ یہ کیسے اچھے رفیق ہیں۔“ (القرآن، 4:69)

آیت زیر بحث کی تفسیر کے حوالے سے تفسیر فاضلی میں عبدت کا جو تصور دیا گیا ہے، اسے اس طرح بیان کیا جاتا ہے:

”عبدت، اللہ کی بارگاہ میں اظہار عبدیت کی وہ طریقت ہے جو حضور نبی پاک ﷺ نے سکھائی ہے۔ حضور عبدہ ہیں۔ جو عبادت عبد کو ”عبدہ“ کے قریب نہ کرے وہ عادت یا رسم تو ہو سکتی ہے، عبادت نہیں ہو سکتی۔“

عبادت سے تقاضاء عبادت کی تکمیل اسی طرح ممکن ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی اطاعت اور اتباع مقصود ہو ہر مقام پر، اسلئے کہ اللہ کی اطاعت اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت اور اتباع ہی سے ثابت ہوتی ہے۔ جس کی اطاعت اور اتباع کیا جائے اس کا قرب نصیب ہو جانا لازم ہے۔ عبادت کا منشا حضورؐ کا قرب ہے۔ حضورؐ کے اتباع کی صورت میں کی جانے والی عبادت سے بندے کو اللہ کا حبیب بننا نصیب ہو جاتا ہے، حضورؐ کی اطاعت کی صورت میں کی جانے والی عبادت سے بندے کو انعام یافتہ بندوں کی صاف میں شامل ہو جانا نصیب ہو جاتا ہے۔ اللہ سے استعانت کی دعا کس چیز کیلئے مانگنی چاہئے! حضور ﷺ کی اطاعت اور اتباع کے ذریعے تزکیہ پانے نصیب ہو جائے، شاہدین کی معیت نصیب ہو جائے۔ اس سے اعلیٰ کیا چیز ہو سکتی ہے جس کیلئے اللہ سے استعانت کی دعا کی جائے۔ ”عبادت“ اور ”استعانت“ کا یہی تصور ہے جو ”تفسیر فاضل“ میں دیا گیا ہے اور یہ تصور گریب، صرف و خواہ جاہل ادب سے نہیں اخذ کی جاسکتا۔

کیا ”إِلَّا كُلَّ تَعْبُدُ وَإِلَّا كُلَّ نَسْعَيْنِ ﴿١﴾“ ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدماگتے ہیں۔“ کی تفسیر میں ”عبادت / بندگی“ کا تصور جو حضور ﷺ کے عبودیت کا معیار مطلق ہونے کے تصور سے خالی ہو، حضورؐ کے قرب کے اللہ کے قرب کی لازمی شرط ہونے کے ذکر سے خالی ہو، نہایت خضوع و خشوع اور عاجزی و فروتنی کے باوجود، قرب الہی کا باعث ہو سکتا ہے؟ اگلی آیات اهِدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا ہے، کو اس سے صراط مستقیم کی ہدایت کی دعا کی جائے، اور یہ بھی بتا دیا کہ اللہ کے محبوب پاک ﷺ کی اطاعت اور اتباع کے ذریعے تزکیہ پا کر انعام یافتہ صاف میں شمار ہونے والے صدقیین، شاہدین اور صالحین کے نقش قدم کا نام ہی صراط مستقیم ہے۔ خشوع و خضوع، عاجزی و فروتنی سے مانگی ہوئی اللہ کی استعانت کی دعا جو دنیا و آخرت میں انعام یافتہ بندوں کی معیت پانے کی التجا سے خالی ہو، وہ کیا دعا ہوگی۔ جو تفسیر ”عبادت“ کو ”اطاعت“ کے مترادف قرار دیکر اطاعت کو صرف اللہ کے لئے خاص کرتی ہو، جس ذات قدس ﷺ کے اتباع اور اطاعت سے اللہ کا حبیب ہونا اور انعام یافتہ بندوں کی صاف میں شمار ہونا نصیب ہوتا ہو، اسے اور اس کے قرب کی تغیر سے فیض یاب ہو چکے والوں کو ”غیر اللہ“ قرار دیتی ہو، کیا وہ اللہ کے کلام کے مدعاو معنی کو واضح کرنے کا فریضہ ادا کر سکتی ہے! اس بات کو ملحوظ رکھنا یہی ضروری ہے کہ اللہ کے دوست، اللہ کے مقابل والے (منْ دُوْنَ اللَّهِ) نہیں ہوتے، اور اللہ کے مقابل والے اللہ کے دوست نہیں ہوتے۔ اللہ کے دوستوں کو اس کے مقابل والے قرار دینا، اللہ اور اس کے دوستوں میں تفریق کرنا ہے جس کا ذکر اور پر آیت نمبر 150-51:4 کے حوالہ سے گذر چکا ہے۔

محسن طالب کہتے ہیں کہ ”صحابہ کرام، حضور ﷺ کے فیض تربیت، قرآن پاک کی زبان، زمانہ نزول کے حالات سے واقفیت کی بنا پر قرآن پاک کی تفسیر فطری اصولوں کے مطابق کرتے تھے۔ چونکہ اس زمانے میں کوئی باقاعدہ تفسیر نہیں لکھی گئی اس لئے اس کا بڑا حصہ ہمارے سامنے نہیں آسکا۔ اور جو کچھ موجود ہے وہ بھی آثار اور تفسیری اقوال کی صورت میں حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں بکھرا ہوا ہے۔“ اس کے بعد محسن طالب یا ان کے مدد حین کی تیاس آرائی کے مطابق تین مکاتب فکر وجود میں آئے جو سب تفسیر کے فطری اصولوں کی پیروی نہ کرنے کی وجہ سے غلطی پر تھے۔ چوتھا مکتب فکر جس سے محسن طالب صاحب کا تعلق ہے، تفسیر کے فطری اصولوں کی پیروی کی وجہ سے درست ہے۔ محسن طالب صاحب کہتے ہیں: ”ہمارا دین، ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے ملا ہے۔ آپ کا ہر وہ قول اور عمل، جس کا تعلق دین سے تھا، ہمارے لیے دین قرار پایا۔“ (محسن 1995) فرانش واجبات دین کی حد تک بات ٹھیک سمجھی جاسکتی ہے۔ لیکن آپ ﷺ اپنی پوری حیات طیبہ میں رضاۓ الہی کا کامل نمونہ بھی ہیں۔ آپ کی ذات اقدس میں امور دین اور امور دنیا کی تقسیم کرنا درست نہیں ہے۔ جناب محسن طالب صاحب جس مکتب فکر کی نمائندگی کر رہے ہیں، وہ رسالت کو حضور ﷺ کی حیات طیبہ کا ایک پہلو قرار دے کر صرف اسی حیثیت میں آپ کو واجب الاتباع و اطاعت سمجھتا ہے جیسا کہ خط کشیدہ جملے سے واضح ہے۔ اس حیثیت میں بھی یہ حضور ﷺ کے صرف اس ارشاد اور عمل کو واجب الاطاعت و اتباع سمجھتے ہیں جس کا تعلق ان کی دانست میں دین سے ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ امور دنیا میں کوئی شخص (معاذ اللہ) حضور سے بڑے علم والا ہو سکتا ہے۔ یہ شاخانہ ہے حضور ﷺ کی ذات اقدس کو حیثیت کل عبودیت / عبدیت کا معیار مطلق نہ ماننے کا۔ یہ ہے اس مکتب فکر کے فطری اصولوں کی بنیاد، جس کی بنیاد پر آپ کی تفسیر درست، حضور ﷺ کو عبدیت کا معیار مطلق اور اپنی پوری ذات اقدس اور اسوہ حسنة میں مرتع ادب اور کامل نمونہ ماننے والوں کی تفسیر نادرست قرار پاتی ہے۔ (تفصیل کلیلہ دیکھنے مضمون ”وحدث شاهدین“)

تفسیر فاضلی کے مطابق عبادت ایک جز ہے عبدیت کا۔ جب تذکیرہ یافتہ ہو کر، صرف اللہ کی رضا مقصود ہو جاتی ہے ہر مقام پر، تو یہ بہم و قبی عبادت ہے۔ نبی اے کریم ﷺ تمام بمنی آدم کیلئے عبدیت / عبودیت کا معیار مطلق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ”عبدہ“ اور ”عبدہ“ کہہ کر اسی کی تصدیق فرمائی ہے۔ (القرآن، 17:1، 25:1)

عبدیت صرف آپ ﷺ کے اتباع اور اطاعت کا نام ہے۔ آپ کا قرب ہی اللہ کا قرب ہے۔ انعامیافتہ صفات میں شمار ہونے کا شرف آپ کی اطاعت اور اتباع کی دین ہے۔ صراط مستقیم، انعامیافتہ بندوں ہی کے نقش قدم کا نام ہے۔ اللہ کے انعام یافتہ بندے ہی آپ کی سنت کے امین ہیں۔

قرآن پاک قول ہے۔ ترکیہ و تصدیق یافتوہ کا اتباع، عمل کا مقام ہے۔ عمل کے بعد حاصل ہونے والی کیفیت کا نام علم ہے۔ علم کے مقام سے بولنے کا حکم ہے۔ ارشاد باری ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذْ تَقُولُونَ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿١﴾ ”اے ایمان والو! وہ بات کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں۔ اللہ کے نزدیک یہ بڑی بیزاری کی بات ہے کہ تم وہ کہو جو تم کرتے نہیں۔“ (القرآن، ۳: ۶۱)

”تفسیر فاضلی“ علم کے مقام سے بیان کی گئی ہے۔ یہ فرمان الہی پر تصدیق یافتوہ کے عمل کا حاصل بیان کرتی ہے۔ ”جو لوگ قول میں حق اور ناحق کے مابین وقف رکھتے ہیں، عمل میں بھی وقف لازم پر پورا رہتے ہیں، علم میں بھی سند کا لحاظ رکھتے ہیں، اور اخلاق میں بھی یہ یقین رکھتے ہیں کہ مخصوصین کے نقوشِ قدم یقیناً صراطِ مستقیم ہیں، یہ لوگ اللہ کے حضور اس طرح حاضر رہتے ہیں کہ ایک دم کیلئے بھی غافل نہیں رہتے۔“ (تفسیر فاضلی منزل ہفتہ، ۱۵۴)

جناب محسن طالب صاحب اور ان کے بزرگ اپنے فہم اور طریقے کے مطابق اللہ کی رضا کو پانے میں لگے ہوئے ہیں۔ نیت کا حال صرف اللہ جانتا ہے۔ وہ اخلاق کی قدر کرتا ہے۔ ہم نے تفسیر فاضلی پر ان کے علمی اعتراضات کے جواب میں اس علم کی شان واضح کرنے کی کوشش کی ہے جو اس تفسیر پاک کا خاصا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے 'احسن الحدیث کتاب' کی آیات کو 'محکمات' اور 'متباہات' دو قسموں میں تقسیم فرمایا ہے۔

ارشاد باری ہے:

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ حُكْمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخْرُ مُتَشَابِهَاتٍ طَفَّالًا الَّذِينَ

فِي قُلُوبِهِمْ رَبِيعٌ نَّيَّنِيْعُونَ مَا تَنَاهَى بَهُ مِنْهُ إِيْنَعَاءُ الْفِتْنَةِ وَإِيْنَعَاءُ تَأْوِيلَهِ حَوْمَانَعَلَمٌ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ

وَاللَّهُ أَصْحُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَانَهُ لِكُلِّ مَنْ عَنِّيْلَهِ حَوْمَانَعَلَمٌ تَأْوِيلَهُ إِلَّا أَذْوَالُ الْأَلْبَابِ ﴿٢﴾ ”وہی ہے جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی۔ اسکی کچھ آیاتِ محکمات ہیں۔ وہ ام کتاب ہیں۔ اور دوسری متباہات ہیں۔ وہ جن کے قلوب میں بگی ہے متباہہ کے پیچھے پڑتے ہیں۔ فتنہ چاہنے کو اور اسکی تاویل چاہنے کو۔ اور اسکی تاویل کا علم تو اللہ ہی کو ہے۔ اور علم میں راسخ حضرات یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اس پر۔ سب ہمارے رب کے پاس سے ہے۔ اور نصیحت نہیں مانتے مگر عقل

والے۔“ (آل عمران، ۷: ۳)

محکمات بر اه راست احکام کی شکل میں ہوتی ہیں۔ یہ آیات نہایت واضح اور دو طوک ہوتی ہیں۔ مثاہدات وہ ہیں جن کو پڑھ لینے سے اور سن لینے سے اس بیان کے مطابق ہم پر حق عائد ہو جاتا ہے۔ ”محکمات“ ام الکتاب ہیں۔ آیات مثاہدات کی تعبیر کیلئے لازم ہے کہ وہ آیات محکمات سے ہم آہنگ ہو۔ جو دانستہ طور پر اس اصول کو نظر انداز کر کے مثاہدات کی تاویل کی طرف لپکتے ہیں، قرآن پاک شہادت دیتا ہے کہ ان کی سوچ اور نیت میں خرابی ہے، اور ان کا مقصد امت میں فتنہ پیدا کرنا ہے۔ نادانست ایسا ہو جائے، تو اچھے نتائج اس سے بھی پیدا نہیں ہوتے۔ امّت میں فکری الجھاؤ اس سے بھی پروان چڑھتا ہے۔ یہ بھی فتنہ ہے۔ اسکی ایک مثال ہمارے مضمون ”قرآن پاک اور فلسفہ و سائنس میں تعلق: اہن یینا، سرید احمد خان، ڈاکٹر محمد اقبال اور چند معاصر علماء کے نظریات کا تنقیدی جائزہ“ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ صاحبان علم کے اخلاف، اپنے واجب الاحترام اسلاف کے نظریات کی روایت تعبیر پر ڈوٹ جانے کی بجائے قرآن پاک کی مطابقت میں از سرنو تعییر کریں تو بہت سے فکری الجھاؤ دور ہو سکتے ہیں۔

بعض صاحبان علم کا خیال ہے کہ تعبیر قرآن کے درج بالا اصول کو ملحوظ رکھنے کے ساتھ ساتھ آیات کے ناسخ اور منسوخ، ہونے کا لحاظ رکھا جانا بھی ضروری ہے تبھی کسی آیت پاک کے صحیح منشاء تک پہنچا جاسکتا ہے۔ آئیے اس تجویز کا جائزہ لیتے ہیں۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

ما نَسْخَ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُذِيرَهَا نَأْتُ بِعَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثِيلًا طَالَمَ تَغْلَمَ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ  
قَدِيرٌ<sup>▪</sup> جب ہم کوئی آیت منسوخ فرمائیں یا بھلا دیں، تو اس کی مثل یا اس سے بہتر لے آتے ہیں۔ کیا تھیں علم نہیں کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے۔ (القرآن، 106:2)

دنیخ، کے مستعمل اور راجح معنی فتح کرنا، کا عدم قرار دینا، تنتیخ کرنا، کینسل کرنا ہی ہیں۔ اس کے انگریزی مترادف abrogation کے بھی بہی معانی ہیں۔ اس آیت کریمہ کے منشاء کا تعین کرنے کیلئے ضروری ہے کہ دیکھا جائے، یہ آیت کریمہ مثاہدات میں سے ہے یا محکمات میں سے۔ اگر مثاہدات میں سے ہے تو پھر محکمات کی بنیاد پر اس کے منشا کا تعین کیا جائے۔ یہ بیان کسی حکم پر مشتمل نہیں۔ لہذا یہ آیت پاک، مثاہدات میں سے ہے۔ جو آیت (02:106) خود محکمات میں سے نہ ہو، اسے محکم آیات پر حکم بناتے ہوئے کچھ محکمات کو ناسخ اور منسوخ میں تقسیم کرنا، ان کیلئے ناسخ اور منسوخ، کی اصطلاح استعمال کرنا آیت مبارک آل عمران، 3:7 کے منشاء کے قطعاً خلاف ہے، بلکہ اسے الٹ دینے والی بات ہے۔ اللہ نے قرآن پاک کے احسن الحدیث کتاب ہونے کی سند نازل فرمائی ہے۔ اس میں تضاد بھی نہیں ہے، اختلاف بھی نہیں ہے۔ احسن الحدیث کتاب کی آیات ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں، مطابقت رکھتی ہیں، تصریح کرتی

ہیں، تنقیح نہیں کرتیں، متناقض نہیں ہوتیں۔ تنقیح کا حواز تب پیدا ہوتا ہے جب دو آیات کی آپس میں تطبیق نہ ہوتی ہو۔ قرآن پاک تو ہے ہی تضاد سے پاک کلام۔ چنانچہ ہم حضرت فضل شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس موقف سے اتفاق کرتے ہیں کہ ”قرآن پاک کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہے۔“ قرآن پاک کی کچھ آیات ناسخ ضرور ہیں لیکن صرف کتب سابقہ کی بعض آیات کی حد تک۔ کتب سابقہ میں اللہ تعالیٰ نے جو ارشاد فرمایا، اہل کتاب نے اسے اپنی خواہش کے مطابق بنانے کی کوشش میں اس میں تحریف کی اور حال کی تصدیق کے بجائے اس شہادت کو چھپایا جوان کے ذمے تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے کتب سابقہ میں سے جو منسوخ کرنا چاہا، منسوخ کر دیا، جو بھلانا چاہا بھلا دیا، اور قرآن پاک کی آیات کی صورت میں اس سے بہتر یا اس کی مثل عطا فرمادیا۔ (تفسیر فاضل اول 1997ء، 55-56)<sup>4</sup>

یہ کہنا غیر درست نہیں ہے کہ قرآن پاک کی بعد میں نازل ہونے والی کسی آیت نے کسی سابقہ نازل شدہ آیت میں مضر حکم کی توضیح یا تصریح کر دی، یا یہ کہ سابقہ آیت میں مضر حکم کو بعد میں نازل ہونے والی آیت میں مضر حکم کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے گا۔ البته یہ کہنا کہ قرآن پاک میں موجود سابقہ آیت منسوخ ہے اور بعد میں نازل ہونے والی آیت سابقہ آیت کی ناسخ ہے، قطعاً قرآن پاک کے منشاء کے خلاف ہے، کیونکہ ”نحو“ سے متعلق آیت مبارک 106:02 کے بیان کا تعلق ہے ہی کتب سابقہ کے ساتھ، جیسا کہ سورہ الحج کی آیت نمبر 52 سے بھی واضح ہے اور سورہ النحل کی آیات 52-54 سے بھی۔ سورہ الحج میں فرمایا گیا ہے۔

وَمَا أَنْهَسْلَنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا تَرَيِّي إِلَّا ذَا تَمَنَّى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أَمْبَيَتِهِ فَيَنْسُخُ اللَّهُمَّ مَا يُلْقِي

الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُلْجِئُكُمُ اللَّهُ أَيَّاهُ وَاللَّهُ عَلَيْمٌ حَكِيمٌ ﴿٢﴾“ اور ہم نے آپ سے قبل جو رسول بھیجا تو

جب بھی اس نے تمباکی، شیطان نے اس میں خلل ڈالا۔ پھر اللہ شیطان کے وسوسوں کو مٹا دیتا

ہے، پھر اپنی آیات کو محکم فرمادیتا ہے۔ اور اللہ علم والا ہے۔” (القرآن، 22:52)

درجن بالا آیت مبارک میں یہ صراحت موجود ہے کہ یہ بیان آپ ﷺ سے قبل بھیجے گئے رسولوں کے بارے میں ہے۔ کسی رسول پاک کی تمباکی کے علاوہ ہو ہی کیا سکتی تھی کہ لوگ حق کو ما نیں اور فلاح پا جائیں۔ شیطان کے فرمان الہی میں خلل ڈالنے کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں: لفظی تحریف یا معنوی تحریف۔ معنوی تحریف کی صورت یہ ہوتی ہے کہ انھیں حکم الہی پر عمل کی صورت کو اپنی خواہشات کے مطابق بنانے کی ترغیب دے، جیسے سبتوں کے معاملے میں شیطان کی ترغیب سے بنی اسرائیل نے کیا۔ یہ فتنہ ہے۔ فاسق جب کچھ اجاتا ہے تو اس کا انجام عبرت ناک ہوتا ہے۔ اللہ فاسق کو مٹا کر فتنہ کو مٹاتا ہے اور اپنی

آیات کو محکم فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کتب سابقہ میں سے جو منسونخ کرنا چاہا، منسونخ کر دیا، جو بھلانا چاہا بھلا دیا، اور قرآن پاک کی آیات کی صورت میں اس سے بہتر یا اس کی مثل عطا فرمائے، لفظی تحریف کی صورت میں شیطان کے خلل اور وسوسوں کو مٹا کر ہمیشہ کیلئے اپنی آیات کو محکم فرمادیا۔ اللہ کا ہر کام علم سے ہوتا ہے، حکمت سے ہوتا ہے۔ (القرآن، 54:52-22:52) اللہ کے قرآن پاک کی حفاظت کا ذمہ لینے کی وجہ سے قرآن پاک میں لفظی تحریف ہونا کبھی ممکن ہی نہیں تھا، اس لئے اس حوالے سے کسی آیت کی تفسیخ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سورہ الحلق میں فرمایا گیا ہے:

**إِذَا يَدَّلُنَا آيَةً لَّا إِلَهَ أَغْلَمُ بِهَا يُنَزِّلُنَا قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مُفْتَرٌ طَبْلُ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٦﴾** اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدلتے ہیں، اور اللہ کو سب سے بڑا علم

ہے جو وہ نازل فرماتا ہے، کہتے ہیں تم تو بنالاتے ہو۔ بلکہ وہ اکثر لا علم ہیں۔ (القرآن، 16:101)

جب اللہ تعالیٰ ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدلتے ہیں تو ظاہر ہے مسلمان تو یہ نہیں کہ سکتے کہ آپ ”بنالاتے ہیں۔“ منافق جلوٹ میں تو آپ ﷺ کو ماننے کا اقرار کر رہا ہوتا ہے، دل میں اپنی منافقت کو وہ بھی چھپا کر ہی رکھتا ہے، اس لئے ایسا وہ بھی نہیں کہہ سکتا۔ یہ یہود و نصاری ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ اس کے دو مقام ہو سکتے ہیں: جب کتب سابقہ کی بعض آیات کو منسونخ کیا جاتا ہے؛ یا جب قرآن پاک کے کسی حکم کے نزول میں تدریج کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہاں ”تبديل آیات“ کتب سابقہ کی بعض آیات کی حد تک ”نسخ“ کے معنی میں ہے۔ سابقہ شریعتوں کی نوعیت و قتنی تھی۔ وہ تمام بنی نوع انسان کیلئے نہیں تھیں۔ ان میں وقتنی نوعیت کے احکام پر مشتمل آیات کو قرآن پاک کی دائیگی احکام پر مشتمل آیات سے بدل دیا گیا ہے۔ (تفیر فاضلی سوم، 302 ص، آیت 101:16) قرآن پاک کی کوئی آیت مبارکہ منسونخ نہیں ہے۔ قرآن پاک کے بعض احکام کے نزول میں تدریجی تکمیل کے باوجود قرآن پاک کی تمام آیات تضاد سے پاک ہیں۔ اس مسئلہ پر تفصیلی تحقیق انشاء اللہ ہم اپنی الگی کتاب میں پیش کریں گے اور دکھائیں گے کہ ناخ۔ منسونخ قرار دئے بغیر ان میں مطابقت ثابت کی جاسکتی ہے۔ ابھی ہم چند مشاہیں ملاحظہ کر کے دیکھیں گے کہ قرآن پاک کی کسی آیت پاک پر ”منسونخ“ کی اصطلاح عائد کرنا قطعاً درست نہیں۔

## جہاد کے بارے میں تخفیف

”اے نبی ﷺ مؤمنین کو جہاد پر راغب کیجئے۔ اگر تمہارے بیس صابر ہوں تو دوسو پر غالب ہوں گے اور اگر تمہارے سو ہوں تو ہزار کافروں پر غالب ہوں گے۔ اس لئے کہ وہ لوگ سمجھ نہیں رکھتے۔“ (القرآن، 8:65) ”اب اللہ نے تم پر تخفیف فرمائی اور اسے علم ہے کہ تم میں ضعف ہے۔ تو اگر تمہارے سو صابر ہوں تو دوسو پر غالب ہوں گے۔ اور اگر تمہارے ہزار ہوں گے تو اللہ کے اذن سے دو ہزار پر غالب ہوں گے۔ اور اللہ صابرین کے ساتھ ہے۔“ (القرآن، 8:66)

اس رعایت سے پہلا درجہ منسون خ نہیں ہو گیا، وہ بھی موجود ہے اور موجود رہے گا۔ مؤمنین سو ہوں تو دوسو پر غالب ہوں گے، کا یہ مطلب نہیں کہ سو سے کم ہوں تو دوسو پر غالب نہیں ہوں گے یا ہزار سے کم ہوں تو دو ہزار پر غالب نہیں ہوں گے۔ لہذا بیس مؤمنین کے دوسو کے مقابل اور سو کے ہزار کے مقابل لڑنے کے حکم پر مشتمل آیت منسون خ نہیں ہے۔

## تحمیل قبلہ

”...اور ہم نے وہ قبلہ جس پر تم تھے اسی لئے ٹھہرایا تھا کہ دیکھیں کون رسول کا اتباع کرتا ہے، اور کون اللہ پاک پھر جاتا ہے... تو اپنا رخ مسجد حرام کی طرف پھیر دیجئے، اور تم جہاں بھی ہو اپنا رخ اسی طرف کرو...“ (القرآن، 44:143-02)

بیت المقدس کو قبلہ ٹھہرانا اسی علیم مطلق کے علم سے تھا جس نے کعبۃ اللہ کو قبلہ ٹھہرانے کا حکم نازل فرمایا ہے۔ دیکھنا یہ مقصود تھا کہ کون صاحب مقام کے ساتھ ہے اور کون مقام کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ بیت المقدس اب بھی ہمارے لئے مقدس ہے۔ سابقہ حکم کا منتشر پورا ہو گیا تو اسے اس آیت پاک کی صورت میں دائیگی حکم سے بدل دیا گیا۔ سابقہ حکم قرآن پاک کی کسی آیت کی صورت میں نہیں تھا جسے اس آیت کے حوالے سے ”منسون“ قرار دیا جاسکے۔

## وصیت اور ورثہ کی تقسیم

”تم پر فرض ہوا کہ جب تم میں سے کسی کو موت آئے، اگر وہ کچھ ترکہ چھوڑے، تو والدین اور اقریبین کیلئے وصیت کر جائے بھلانی سے۔ یہ مقتین پر حق ہے۔“ (القرآن، 2:180)

اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت والدین اور اقربا کی شان برقرار رکھنے کیلئے، ان کے حقوق کی احسن ادائیگی کے لئے وصیت کرنا پر ہیز گاروں کی شان ہے۔ ورثہ کی تقسیم کا تعین موجود ہے، وصیت کا تعین

نہیں۔ وصیت حال سے تعلق رکھتی ہے اسلئے حال کے مطابق ہوتی ہے۔ سورہ النساء کی آیات 7، 8، 11، 12، 133 اور 176 میں والدین، اور اقرباء میں سے ترکے کے حق داروں، کو مع ان کے حصص کے واضح فرمادیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حصص کے تعین کے بعد حصہ داروں میں سے کسی کے بارے میں مزید وصیت اللہ تعالیٰ سے تقدم ہو گا۔ اگر کسی کی مدد مقصود ہو اور اس سے وعدہ کیا جا چکا ہو تو اسے دے دینا ضروری ہے اور اگر وہ حال پر موجود نہ ہو تو اس کیلئے وصیت کر دینی چاہئے۔ وصی نے رضائے الہی کیلئے جن امور کو شروع کر کھا ہو، اور وہ زیرِ حکمکیل ہوں، فرد کی بھلائی کیلئے ہوں یا جماعت کی بھلائی کیلئے، ان آیات کے مطابق ان امور میں وصی کی وصیت کو بڑی اہمیت دینی چاہئے۔ وصیت کرتے وقت یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حصہ داروں کا استحقاق مجبور نہ ہو۔ ترکہ کی تقسیم کے وقت غیر حصہ دار قربا، یتاما اور مسَاکین بھی آجاتے ہیں، ترکہ میں سے انہیں بھی دینے کا حکم ہے۔ یہ فرمایا گیا ہے کہ ترکہ کی تقسیم وصی کی وصیت یا ادائے قرضہ کے بعد کی جائے گی۔ سورہ النساء کی درج بالا آیات میں ترکہ کی تقسیم کے تعین اور دیگر ہدایات نے تقسیم ترکہ کے بارے میں آیت وصیت (180:02) کے حکم کی حدود کی توضیح کر دی ہے۔ دونوں نوعیت کی آیات میں تطبیق ہے، تضاد نہیں۔ آیت وصیت کی تنفس نہیں ہوئی، نہ ہی تقسیم ترکہ کی آیات کے ذریعے آیت وصیت کو بدل گیا (replace) ہے۔ دونوں احکام یک وقت قابل عمل ہیں۔ (تفسیر فاضلی اول، 180، 181، 182 اور سورہ النساء، 8، 7، 11، 12، 176)

### ماہ صیام کی راتوں میں مقاربت کی اباحت

”روزوں کی راتوں میں اپنی عورتوں کے پاس جانا تمہارے لئے حلال ہوا۔ وہ تمہارا اور تم ان کا لباس ہو۔ اللہ کو علم ہے کہ تم اپنی جانوں کو خیانت میں ڈالتے تھے۔ تو اس نے تم پر توجہ فرمائی اور تحسیں معاف فرمایا۔“ (اقرآن، 187:02)

اس آیت پاک کے نزول سے پہلے روزوں کی راتوں میں اپنی عورتوں سے مقاربت کی ممانعت، کا حکم شرعی ہونا، اسی آیت پاک سے ثابت ہے۔ اس سابقہ حکم کی، بعد میں نازل شدہ داعیٰ حکم پر مشتمل آیت کے ذریعے اباحت فرمادی گئی۔ روزوں کی راتوں میں اپنی ازواج سے مقاربت سے ممانعت کا سابقہ حکم، قرآن پاک کی آیت کی صورت میں نہیں تھا۔ اس لئے اس آیت مبارک کے نزول سے قرآن پاک کی کسی سابقہ نازل شدہ آیت کی تنفس نہیں ہوئی۔

## یوم عاشورہ کے روزہ کی فرضیت

روایت ہے کہ پہلے یوم عاشورہ کا روزہ فرض تھا، جو ماہ صیام کی فرضیت پر مشتمل آیت 183:02 کے نزول سے منسوب ہو گیا۔ قرآن پاک میں ایسی کوئی سابقہ آیت موجود نہیں جس میں یوم عاشورہ کے روزہ کی فرضیت کا حکم ہو، اور جو ماہ صیام کی فرضیت پر مشتمل آیت سے منسوب ٹھہری ہو۔ اگر ایسا کوئی حکم شرعی تھا تو وہ آیت پاک کی صورت میں نہیں تھا اور قرآن پاک سے ثابت بھی نہیں ہے۔ قرآن پاک میں یوم عاشورہ کا روزہ رکھنے کی ممانعت بھی نہیں ہے۔

ناجح۔ منسوب آیات کے مسئلے پر یہ چند مثالیں ہیں۔ اس مسئلے کا تفصیلی جائزہ ہم انشاء اللہ ”تفسیر کے قرآنی اصول“ پر مشتمل اپنی اگلی اردو یا انگریزی کتاب میں لینے کا رادہ رکھتے ہیں۔ محقر آہما راموقف یہ ہے کہ ”سورہ البقرہ کی آیت نمبر 106 میں بیان کردہ ‘ناجح‘ کا تعلق قرآن پاک کی آیات سے قطعاً نہیں ہے۔ شریعتِ محمدیہ میں بعض و قبی شرعی احکام کا ہونا مثلاً ”روزوں کی راتوں میں مقابہت کی ممانعت“ یا بیت المقدس کے قبلہ ٹھہرائے جانے کے حکم“ کا ہونا قرآن پاک سے ثابت ہے۔ لیکن ان احکام پر مشتمل آیات کا قرآن پاک میں ہونا ثابت نہیں ہے جو دامنی احکام پر مشتمل آیات کے نزول سے منسوب ہوئی ہوں۔ جب و قبی شرعی احکام کا منتشر پورا ہو گیا، تو انہیں قرآن پاک کے دامنی احکام پر مشتمل آیات سے بدل دیا گیا۔ دامنی احکام پر مشتمل قرآن پاک کی آیات ہی شریعت کا مأخذ ہیں۔ قرآن پاک کی کوئی آیت منسوب نہیں ہے۔ قرآن پاک کی کسی آیت کیلئے کسی بھی مفہوم میں ”منسوب“ کی اصطلاح استعمال کرنا قطعاً منشاء قرآنی کے خلاف ہے۔

اگر ”احسن العدیث کتاب“ کی آیات تشابهات کی تاویل (elaboration) کیلئے لازم ہے کہ وہ آیات مکملات سے ہم آہنگ ہو تو یہ بات عقائد کی تاویل سے متعلق احادیث کے لئے از بس لازم ہے کہ وہ بھی مکملات سے ہم آہنگ ہوں، تناقض یا متصادم نہ ہوں۔ حضور ﷺ سے منسوب حدیث کی تعبیر جو احسن الحدیث کتاب سے تصدیق نہ پاسکے، مستند نہیں ہو سکتی۔ ہمارے ایک مضمون کیا اللہ الدھر ہے؟ میں عقائد سے متعلق احادیث کی تعبیر کو قرآن پاک کی سند پر جانچنے کی مثال ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

واقعات بالخصوص حضور نبی کریم ﷺ سے منسوب واقعات کے بارے میں روایات کو بھی قرآن پاک کی سند پر پرکھنا از بس لازم ہے۔ اس کی ایک مثال ہمارے مضمون ”حدت الوجود، حدت الشہود اور حدت شاہدین، میں سورہ عبس کی آیات نمبر 10-1 کی تفسیر کے حوالے سے ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

قرآن پاک کے بارے میں ارشاد ہے: وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَاهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا۔۔۔ ﷺ ”اور اسی طرح ہم نے یہ عربی حکم نازل فرمایا۔۔۔“ (القرآن، 13:37) اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن پاک حکم کا درجہ رکھتا ہے اور عربی زبان میں ہے۔ احادیث مبارکہ، اس ’عربی حکم‘ کی تفہیض اور عقائد کی تاویل (elaboration) وقت، مقام، اور مقدار کے مطابق ہوتی ہے۔ کاپیان ہیں۔ حکم دائیٰ ہے، تفہیض حکم (implementation) وقت، مقام، اور مقدار کے مطابق ہوتی ہے۔ حدیث پاک، قیامت تک کیلئے تفہیض حکم کی نظیر (precedent) کا درجہ رکھتی ہے جسے ملحوظ رکھا جانا ضروری ہے۔ اس پر تفصیلی گفتگو ہمارے مضامین ’مسئلہ تقدیر‘، اور ’وحدت الوجود، وحدت الشہود اور وحدت شاہدین‘، میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

قرآن پاک قول ہے، حدیث مبارکہ عمل ہے اور فقه علم ہے۔ قرآن پاک حکم ہے اور شریعت، احکام، اصول، خوابط، بدایت، انذار و تبیشر، اور تعلیمات پر مشتمل ہے۔ جب تک حدیث پاک کو نفاذِ حکم کی نظیر نہیں مانا جائے گا، یہ نہیں مانا جائے گا کہ نفاذِ حکم، وقت، مقام اور مقدار کے مطابق ہوتا ہے، فقة یعنی علم پروان نہیں چڑھ سکتا۔ اسلامی نظریات کو نسل فقه کی ترقی کیلئے بہت اعلیٰ تصور ہے لیکن سرکاری سرپرستی اداروں سے آزادی چھین لیتی ہے۔ مذہبی علم اور جدید علم میں راشخ حضرات پر مشتمل پرائیویٹ ادارے وجود میں آنے چاہئیں جو یہ طے کر کے کام شروع کریں کہ وہ کبھی بھی سرکار سے مالی مدد قبول نہیں کریں گے، فرقہ وارانہ تعصب اور غرض و غایت سے پاک ہو کر تدبیر کریں گے، اگر ضروری معلوم ہو تو اپنے اسلاف کے نظریات کی بھی تعبیر نہ کریں گے اور اپنے اجتہاد کو شائع کریں گے تاکہ صاحبان علم ان کے کام کی خوبیوں کا جائزہ لیکر کام کو آگے بڑھا سکیں۔ اس سارے کام کا مشنا معاشرتی اکائی کی حفاظت کے ذریعے حسن معاشرت کو بڑھانا، لوگوں کو آسانیاں مہیا کرنا ہو گا تو اس سے نور پھیل گا اور اللہ انہیں قدر و منزالت سے نوازے گا۔

---

کلام الٰہی (revelation) کی صورت میں حاصل ہونے والے علم کو اگر علم الٰہی (God-given knowledge) سے تعبیر کیا جائے اور انسانی فکر اور تحقیق و تجربہ سے حاصل شدہ علم کو علم کسب کہا جائے، تو کیا قرآن پاک ہمیں علم کسب کو علم الٰہی سے مطابقت دینے کے کوئی اصول دیتا ہے یا پھر علم کسب کو یکسر مسترد کر دینے کا حکم ہے قرآن پاک میں! اللہ تعالیٰ نے تبدعت (innovation) کے اصول کی صورت میں ہمیں علم کسب کو (انسانی فکر و تجربہ اور فلسفہ و سائنس کے حالات کو) علم الٰہی کے تابع رکھتے ہوئے استعمال میں لانے کا علم عنایت فرمایا تھا۔ اس اصول کی وجہ سے علم الٰہی میں تاقیامت قابل عمل رہنے کی

صلاحیت رکھی گئی ہے۔ لیکن مسلم فکر کی تاریخ میں بدعت کے اصول کی اہمیت کو کبھی اس طرح سمجھا ہی نہیں گیا۔ جس طرح صدیوں ہم یہ سمجھتے رہے کہ اجتہاد کے دروازے بند ہو چکے ہیں، اسی طرح آج بھی ہم بے ہمدرد ہیں اس بات سے کہ بدعت وہ قرآنی اصول ہے جو اجتہاد کے تصور کو بنیاد مہیا کرتا ہے تاکہ دین کے دائرے میں رہتے ہوئے زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ سفر جاری رکھ سکیں۔ عقلی علوم میں مسلمانوں کے ترقی نہ کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ اہم بھی ہے۔ ہم نے اس کتاب میں شامل اپنے مضمون ”وحدت الوجود، وحدت الشہود اور وحدت شاہدین“ میں ”بدعت: علم کسب کو علم الہی سے مطابقت دینے کا قرآنی اصول“ کے عنوان کے تحت قرآن پاک سے مثالوں اور حوالوں کے ساتھ اس کی اہمیت اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

”بدعت“ کے لغوی معنی ”ہر نیا کام“ ہوتے ہیں۔ بدعت لغوی سے مراد ہر وہ نیا کام ہے جو دین کے اساسی عقائد کے خلاف نہ ہو۔ اس معنی میں بدعت نہ صرف جائز بلکہ اصول دین ہے۔ ”بدعت شرعیہ“ وہ نیا کام ہے جس کی دین میں کوئی اصل ہی نہ ہو۔ جو محکمات سے متضاد ہو۔ محکماتِ قرآنیہ سے جس کی تصدیق نہ حاصل کی جاسکتی ہو۔ یہی وہ ”بدعت“ ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ”ہر بدعت مگر اہی ہے۔“ یہ حدیث پاک کا صرف ایک حصہ ہے، پوری حدیث اس طرح ہے:

حضرت ارباب بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ ”رسول اللہ ﷺ ایک دن ہمارے درمیان خطبہ دینے کھڑے ہوئے اور ہمیں بہت عمدہ نصیحت فرمائی، جس سے لوگوں کے دل لرز اٹھے اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ لوگوں نے عرض کیا! یا رسول اللہ ﷺ: آپ نے ایسی نصیحت فرمائی ہے جیسے کوئی کسی کو رخصت کر رہا ہو۔ آپ ہم سے کوئی عہد و بیان لے بیجھ۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا! تم اللہ کے خوف، امیر کا حکم سننے اور اطاعت کرنے کو اپنے اوپر لازم سمجھ لوچا ہے تمہارا امیر ایک جبھی غلام ہی کیوں نہ ہو۔ تم میرے بعد بہت اختلاف دیکھو گے۔ تم میری سنت اور خلفاء راشدین المہدیین کی سنت کو لازم پکڑ لینا اور ان کے طریقے کو مضبوطی کے ساتھ دانتوں میں پکڑ لینا (یعنی اس پر مجھے رہنا) اور امور محدثات سے گریز کرنا (وایا کم والامور المحدثات)، کیوں کہ ہر بدعت مگر اہی ہے (فان کل بدعة ضلالۃ)۔“

اس حدیث پاک کا پس منظر ہی خلفاء راشدین کے دور میں پیدا ہونے والے محدثات (ئئے نئے واقعات) ہیں۔ اور آپ ﷺ نے وصیت فرمائی کہ ان فتنوں کے دوران میری اور خلفاء راشدین المہدیین

کی سنت کو مضبوطی سے پکڑ لینا اور امور محدثات سے گریز کرنا، اس لئے کہ ہر بدعت گمراہی ہے۔ کیا اس سے بدعت کا وہ مفہوم نکلتا ہے جو مسلمانوں میں پھیلا دیا گیا ہے! (كتاب البدعات)<sup>5</sup>

دینی تاریخ کے واقعات پر بھی سند سے بات کرنا ممکن ہے۔ بے سند روایات کو اہمیت دیکر سوچ کے دروازے بند کر لئے جائیں، کتابوں میں لکھے ہوئے واقعات کو تقدس کا درج دے کر دماغ بند کر لیا جائے تو پھر ایسا کرنا ممکن نہیں رہتا۔ یزید بن معاویہ، سیدنا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے بیعت اطاعت کا مطالبه کر رہا تھا۔ اسے یہ احساس دلایا گیا تھا کہ سیدنا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے بیعت اطاعت کر لینے کی صورت میں کوئی خطرہ لاحق نہیں رہے گا تمہارے اقتدار کو۔ کوئی چیز نہیں کر سکے گا تمہاری بادشاہت کو۔ چنانچہ اس نے مختلف ذرائع سے آپ رضی اللہ عنہ کو بیعت اطاعت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ تفصیلات سے قطع نظر، انجام یہ ہوا کہ میدان کربلا میں سیدنا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے، خانوادہ رسول کی پاک یہیوں (رضوان اللہ تعالیٰ عنہما یعنیں) کے بے آسرارہ جانے کی بھی پروانہ کرتے ہوئے، اپنے جانشوروں اور اپنے خاندان کے نو خیز نوجوانوں سمیت شہید ہو جانے کو ترجیح دی یزید کی بیعت اطاعت کے مقابلے میں۔ اگر اقتدار کی طلب آپ کا مقصد ہوتی، تو کیا یہ قیمت پر اپنی اور افرادِ خاندان کی جانوں کی حفاظت ہی اوپرین ترجیح نہ ہوتی آپ کیلئے؟ اللہ کے کسی فرمان کی اطاعت کے علاوہ، جو مانع تھا یزید کی بیعت اطاعت میں، اور کیا تو جیہہ ہو سکتی ہے جناب سیدنا حضرت امام حسین علیہ السلام کے اس عمل کی کہ آپ نے اپنے خاندان کے نو خیز جوانوں سمیت اپنی جان قربان کر دینا قبول کر لیا لیکن یزید کی بیعت کرنا قبول نہیں کیا! آپ کو یہ منثور تھا کہ سب کچھ قربان ہوتا ہے تو ہو جائے لیکن اللہ کے فرمان کی خلاف ورزی نہ ہو۔ متقی لوگوں کا طریقہ یہی ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے فرمان کو پیش نظر رکھتے ہیں عمل کے ہر مقام پر۔ قرآن پاک کی سورہ الکہف میں ایک حکم ہے جو آپ کے اس عمل کی تشریح کرتا ہے۔ سورہ الکہف میں ارشاد ہے:۔۔۔وَلَا تُنْطِعْ مِنْ أَخْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذُكْرِنَا وَأَتْبَعْ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرْطًا ﴿۲۸﴾ ”اور اس کی اطاعت نہ کر جس کے قلب کو ہم نے اپنے ذکر سے بہت غافل کر دیا، اور اس نے اپنی خواہشات کا اتباع کیا، اور اس کا کام حد سے گزر گیا۔“ (القرآن، ۲۸:28) سیدنا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے یزید کی بیعت اطاعت کے مقابلے میں اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے فیصلے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کو پورا یقین تھا کہ یزید میں یہ تینوں منفی صفات موجود ہیں جس کی بنابر اسکی اطاعت کرنا اللہ کے اس فرمان کی خلاف ورزی ہو گی۔ کیا اس آیت کریمہ کا علم سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے والوں کو نہیں تھا۔ جناب ملک شمس الدین صاحب اس کی وضاحت اس طرح فرماتے ہیں کہ

‘مفہوم’ اور ‘مقصد’ والوں کے درمیان لڑائی تھی۔ اُن لوگوں کو اس آیت مبارکہ کے مفہوم کا بہت پتہ تھا۔ عربی ان کی مادری زبان تھی۔ وہ عربی زبان و ادب کے بڑے ماہر تھے۔ زمانہ نزول قرآن کی زبان، الفاظ کے معنی، اسالیب بیان، تراکیب، شبیہ و استعارے کے رنگ اور محاوروں پر آج کے علماء کی نسبت بڑی گرفت رکھتے تھے۔ ادبی ذوق کا یہ حال تھا کہ عرب شعراء کا بہت سا کلام یاد تھا انھیں جو موقعہ محل کی مناسبت سے پڑھ سکتے تھے، اور خود اشعار کہنے کی الیت رکھتے تھے، لیکن حال پر اس آیت مبارکہ کے منشاء اور تفہیم کا علم سیدنا امام حسین علیہ السلام اور آپ کے ذریعے آپ کے ساتھیوں ہی کو تھا۔

یہ قرآن پاک کی سند کے ساتھ تشریح ہے سیدنا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے یزید کی بیعت سے انکار کے عمل کی، جو منقح ہوتا ہے کہ بلا میں آپ اور آپ کے ساتھیوں کی شہادت پر۔ اگر کوئی صاحب اس سے بہتر جواز پیش کر سکیں سیدنا حضرت امام حسینؑ کے اس عمل کا، قرآن پاک کی سند کے ساتھ، ہم شکر گزار ہو گئے انکی اس کاوش کیلئے۔ اگر سند کے ساتھ واقعات کو دیکھنے کا اسلوب اپنالیا جائے تو قول، عمل اور علم میں قیاس آرائیوں کے اندر ہیرے چھپت جائیں گے اور حق روشن ہو جائے گا۔ غور طلب بات ہے کہ کیوں ذکر نہیں کیا کبھی کسی سنی یا شیعہ عالم نے اس چیز کا! کیا اس کی وجہ یہ نہیں کہ پھر سیدنا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی محبت کا، واقعہ کر بلایا کرنے کا تقاضا یہ ہو گا، کہ نظر کھان پڑے گی اہل سنت کو بھی اور اہل تشیع کو بھی، ہر ہر فرد کو بھی اور جماعت کو بھی، کہ اللہ کا فرمان شاہد ہو ہمارے قول، عمل اور علم کے ہر مقام پر۔ قیاس آرائیوں کی بجائے، حق کی سند پر استوار کرنا ضروری تھا ہر ہمارے لئے اپنے قول، عمل اور علم کو۔ آیات قرآن پاک کے ‘مفہوم’ کے بجائے ‘منشاء’ اور ‘مقصد’ پر توجہ مرکوز کرنی ہوگی۔

اس واقعہ کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ جہاد حکم الٰہی ہے۔ خلیفہ کے حکم پر مجاہدین محض رضاۓ الٰہی کے حصول کے لئے جہاد میں شریک ہوتے تھے۔ ذاتی منفعت کہیں مقصود نہیں ہوتی تھی۔ سلطنت اسلامیہ کی وسعت، مختلف محاذوں پر جنگی کارروائیوں کی طوات، سلطنت اسلامیہ کی داخلی اور خارجی سرحدوں کی حفاظت کے حوالے سے جہاد کے ادارہ کی تنظیم وجود میں آرہی تھی، اور مجاہدین کی ذاتی ضروریات، اہل خانہ کے ساتھ رابطے، مجاہدین اور شہداء کے اہل خانہ کی معاشری کفالت اور معاشرتی حفاظت کے لئے اصلاحات متعارف کروائی جا رہی تھیں، اور اگر خلافت راشدہ کا ادارہ مزید قائم رہتا تو اسلامی تصور جہاد کی روح کے مطابق ایک ایسی مستقل، تربیت یافتہ، سینیٹنگ آرمی وجود میں آتی جو جذبہ جہاد سے تو سرشار ہوتی لیکن حکمرانوں کی آلہ کا رقیعہ ہوتی، یا لازمی فوجی تربیت کا ایسا نظام وجود میں آتا جس کے مطابق تربیت یافتہ اور منظم مجاہدین، جدید اسلحہ، گھوڑے، جنگی ساز و سامان سمیت، سلطنت کے ہر حصے میں فوری بلا وے پر جہاد

کلیئے لیک کہنے کیلئے تیار ہوتے، اور انکے اہل خانہ کی معاشری اور معاشرتی حفاظت کا ایک باقاعدہ نظام وجود میں آتا۔ مسلمانوں میں حکمرانوں کے ذاتی مفادات کی محافظت تجوہ دار فوج کا تصور، خلافت کے ملوکیت میں تبدیل ہونے کے فوراً بعد آیا۔ اس تبدیلی نے ہر سماجی اور سیاسی ادارے کی طرح، جہاد کے ادارے کی، اسلامی روح کے مطابق تشكیل کو بھی شدید مجروم کیا۔ جذبہ شہادت سے سرشار ہو کر رضاۓ الہی کیلئے جہاد کرنے والا یہ ادارہ، حکمرانوں کے مفادات کا تحفظ کرنے والی تجوہ دار فوج میں بدلتا چلا گیا۔ اگر سیدنا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے م مقابلی زیزید کی تجوہ دار فوج نہ ہوتی تو واقعہ کربلا جیسا سانحہ کبھی رونما نہ ہوا ہوتا۔ صدیوں تک ہم ملوکیت اور خاندانی بادشاہتوں کا شکار رہے۔ خلافت سے ملوکیت میں تبدیلی کے نتیجے میں وجود میں آنے والی تجوہ دار فوج، تبدیلی اقتدار کے ہر موقع پر ایک یادو سرے مدعاء اقتدار کی حمایت میں خون ریزی کرتی رہی۔ ہمیں شکر گزار ہونا چاہئے ریاست کے اس جدید تصور کا جس نے موروٹی بادشاہت کی جگہ لی، گورنمنٹ، عدالیہ، پارلیمنٹ اور پر امن تبدیلی اقتدار کا ایک ایسا نظام متعارف کرایا، جس میں فوج کا ادارہ تجوہ دار ہونے کے باوجود صاحبان اقتدار کا غلام نہیں رہا۔ اشتمضورت ہے اس بات کی کہ بدعت کے اصول کو فریضہ دین سمجھتے ہوئے، حدیث پاک کو تنفیذ حکم کی نظر سمجھتے ہوئے، انسانی فکر و تجربہ کے حاصلات کو نظر میں رکھتے ہوئے سماجی، سیاسی، معاشری، انتظامی، تعلیمی، عدالتی، عسکری غرض تمام اداروں کی قرآن پاک کے دائیٰ اصولوں کے مطابق تشكیل نوکی جائے تاکہ ہم خود بھی اسلام کی دائیٰ برکات سے بہرہ ور ہوں اور اسلام کو سب ادیان سے زیادہ ترقی یافتہ دین کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا جاسکے۔

---

کرپشن بہت بڑا مسئلہ ہے ہمارے معاشرے کا۔ ہماری نظر میں دونیادی اسباب ہیں اس کے: (1) سرکاری اور غیر سرکاری، سیاسی اور مذہبی، فرقہ وارانہ، نسلی اور لسانی جماعتوں، تنظیموں اور ایجنسیوں کی طرف سے طلبہ تنظیموں کی پشت پناہی اور تعلیمی اداروں میں مداخلت؛ (2) ایکشن میں غیر شفافیت اور سرمائے پر انحراف۔ پہلی چیز تعلیمی اداروں میں سیاست داخل کر کے، تعلیم نظام کو کمزور اور تعلیمی ڈگری کو بے وقار کرتی ہے۔ اپنے درجے کی کم از کم مطلوبہ الہیت نارکھنے والے ڈگری ہو لذرز کے ذریعے سیاست بازی اور کرپشن کا کلچر نیچے سے اوپر تک ہر ادارے میں سراحت کر جاتا ہے۔ ایکشن کے قانون میں خامیاں، فوری انصاف کی فراہمی میں ناکامی، مردم شماری، حلقة بندوں اور ایکشن میں عدم شفافیت، انہیں علمی اور اخلاقی طور پر نااہل لوگوں کو کرپشن سے حاصل کردہ سرمائے کے زور پر تخت اقتدار پر بٹھادیتی ہے۔ نااہلیت اور کرپشن کا

کلچر، اختیار کی طاقت سے مسلح ہو کر، پورے نظام کو آلاودہ کر دیتا ہے۔ ہمارے فہم و بصیرت کے مطابق اسباب کو منقطع کئے بغیر اصلاح کی کوشش اور اس سے ثبت اور دیرپا تائج کی توقع سراب کے سوا کچھ نہیں۔

جب تک قوی سطح پر ان اسباب کے تدارک کا عزم اور انتظام نہیں کیا جاتا، تعلیمی اداروں کے سر برہ، تعلیمی اداروں میں طلباء کی مشکلات کم کرنے اور انکے حقیقی مسائل کے حل کا ایسا باعزت بندوبست کریں کہ طلباء کو درخواست کرنا پڑے نہ احتیاج۔ طالب علم کو ہر ضروری سہولت، بغیر کسی مطالبے کے، نہایت عزت کے ساتھ از خود مہیا کی جائے۔ تین بنیادی حصہ دار ہوتے ہیں تعلیمی ادارے میں: طلباء، اساتذہ، اور انتظامیہ۔ یہ وزن اساتذہ اور انتظامیہ کے پیش نظر ہنچا ہے کہ سب سے اہم سٹیک ہو لڈر طالب علم ہے۔ اگر طالب علم نہ ہو، تو اس تاد ہو گا اور نہ انتظامیہ۔ ہر مینگ، پالیسی، رول، ڈسپلن اور طریق کار اس وزن کی بنیاد پر تشکیل پائے تو تعلیمی ادارہ اپنے مقصد کی طرف سلامتی سے گامز نہ ہو گا، ہر قسم کی منفی پشت پناہی بہت حد تک بے اثر ہو سکے گی، کرپشن کی جڑیں کمزور ہوں گی، اور حسن معاشرت کو فروع حاصل ہو گا۔

اس سے پہلے 2016 میں ہماری کتاب The Qur'anic Theology, Philosophy and Spirituality شائع ہوئی ہے جو ستہ مضامین پر مشتمل ہے۔ ان کی لست کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ شامل کردی گئی ہے۔ موجودہ کتاب کے نو مضامین مماثل موضوعات پر اضافی حوالوں، تفصیلات اور نئی تحقیق کے ساتھ اردو میں شائع کئے جا رہے ہیں۔ دونوں کتابوں میں قرآن پاک، حدیث مبارکہ، الہیات، فلسفہ، سائنس اور روحانیت سے متعلق مسائل کے مأخذ اور مضررات کا قرآن پاک کے تناظر میں جائزہ لیتے ہوئے ان غیر قرآنی اصطلاحات، نظریات، کوئی تصورات، اصولوں، روایات، قیاس، وجود اور تعبیر وغیرہ کی نشاندہی کی گئی ہے جو اللہ کے نازل کردہ 'الحق' (قرآن پاک) سے مناسب نہیں رکھتے اور جن کا ادراک نہ کر سکنے کی وجہ سے وہ مسائل پیدا ہوئے۔ قرآنی تناظر میں ان مسائل کی از سرنو تکمیل کر کے ان مسائل کا حل پیش کیا گیا ہے اور دکھایا گیا ہے کہ ہماری دانست میں علمی مسائل میں سند کے ساتھ بات کرنے کا طریقہ کیا ہو سکتا ہے۔ قرآن پاک کی تفسیر کے قرآنی اصول، حدیث پاک کے قرآن پاک سے تعلق اور انہی تعبیر کے قرآنی اصول، انسانی فکر و تجربہ سے حاصل ہونے والے علوم یعنی فلسفہ و سائنس کو قرآن پاک سے مربوط کرنے کے قرآنی اصول 'پیش لفظ' کا موضوع ہیں۔ انہی کو 'مسلم فکر کی قرآنی جہات' سے معنون کیا گیا ہے۔ تمام مضامین میں مسائل پر انہی کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔

یہ مضامین، اپنے اپنے موضوع پر ریسرچ آرٹیکل کے طور پر لکھے گئے ہیں۔ آٹھ آرٹیکل جدید تحقیق اور حوالوں کے ساتھ اپڈیٹ کرنے سے پہلے مختلف تحقیقی رسالوں میں چھپ بھی چکے ہیں، اس لئے کئی مقامات پر تکرار کا احساس ہو سکتا ہے، لیکن اس کے کچھ فوائد بھی ہیں۔ ”قرآن پاک اور فلسفہ و سائنس میں تعلق—ابن سینا، سر سید احمد خان، ڈاکٹر محمد اقبال اور چند معاصر علماء اور مکاتب فکر کے نظریات کا تقیدی جائزہ“ اس کتاب میں شامل آخری سے پہلا مضمون ہے۔ اس مضمون میں شیخ ارکیس ابن سینا، سر سید احمد خان اور حضرت علامہ محمد اقبال اور معاصر علماء اور مکاتب فکر کی اپنے اپنے زمانے کے سائنسی اور فلسفیانہ نظریات کو اسلام سے نسبت دینے کی کوششوں کا تقیدی جائزہ لیتے ہوئے کسی بھی زمانے کے فلسفہ و سائنس کو قرآن پاک سے مربوط کرنے کے قرآنی اصولوں کو منضبط کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ سائنسی نظریہ کائنات اور فلسفیانہ نظریات کی ہر تبدیلی کے ساتھ یہی کوشش از سر نو نہ کرنی پڑے۔ اس کتاب کا آخری مضمون ”قرآن پاک اور سائنس—اویزش یا آہنگ“ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ پروفیسر ہود بھائی نے اپنی کتاب *Islam and Science: Religious Orthodoxy and the Battle for Rationality* میں کہا ہے کہ اسلام اور سائنس تعلق کے حوالے سے اصل مسئلہ قوانین نظرت کے تحت چلنے والی کائنات کے مداخلت کار خدا سے مطابقت کا مسئلہ ہے۔ (The Dilemma of an interventionist deity.) اس آرٹیکل میں اس معضلہ (Dilemma) کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کتاب میں شامل سب سے پہلا مضمون ”ذات و صفات باری میں تعلق کی نوعیت“ کے مسئلہ سے متعلق ہے۔ یہ مسلم فکر کے بالکل آغاز میں پیدا ہونے والے الہیاتی مسائل میں سے ہے۔ ہمارا پختہ احساس ہے کہ مسلم فکر کے ان تمام مسائل کی طرح جن پر ہمیں آج تک غور و فکر اور تحقیق کا موقعہ ملا ہے، اس مسئلہ کی بنیادیں بھی خود مسلم فکر کے آخذ میں موجودہ تھیں۔ دیگر مسائل کی طرح یہ مسئلہ بھی، یونانی یا عیسائی فلسفہ کے زیر اثر غیر قرآنی فلسفیانہ اصطلاحات، منطق یا المابعد الطبيعیاتی اصولوں، مفروضوں، وجودیات اور کاسمو لو جی کو قبول کر لینے میں نظر آئے گا۔ یہ صرف اراضی کی بات نہیں، حال پر بھی اسی طرح ہے۔ صرف مسلم فلسفہ ہی نہیں، تمام علوم میں ہم ایسا ہی کر رہے ہیں۔ خالص مذہبی علوم میں بھی ہم ان اثرات سے نہ اراضی میں نچے کے اور نہ حال پر نچے پار رہے ہیں۔ ہمارے آباء کے زمانے میں یونانی اور عیسائی فلسفہ تھا، اب جدید مغربی فکر و فلسفہ اور سائنسی علوم ہیں جن کے ہم اثرات قبول کر رہے ہیں۔ یہ علمی روشن

ہمارے لئے ایسے مسائل پیدا کرتی ہے جو حقیقی نہیں ہوتے، لیکن ہم انھیں حقیقی سمجھ کر اس طرح الجھ جاتے ہیں کہ ہمارے بہترین دماغ ان کے حل کے لئے مددوں بلکہ صدیوں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کرتے رہتے ہیں۔ مثال سے بات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ایک جدید مدہبی سکالر جناب ڈاکٹر محمود احمد غازی علیہ الرحمۃ اپنی کتاب محاضرات حدیث میں لکھتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ کی ذات قدیم ہے۔۔۔ اذنی اور ابدی ہے۔ اس لئے اس کا کلام بھی ابدی ہے۔ قرآن مجید کلام قدیم ہے۔“<sup>6</sup> (محاضرات حدیث, 19)

”قدیم، انگریزی لفظ‘eternal’، کامتر ادف ہے۔ یہ ازلیت کے مفہوم میں ایک اصطلاح ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ‘ازلیت’ یا ‘قدم’ کو کہیں اپنی شان یا صفت کے طور پر بیان نہیں کیا۔ ”قدیم، یا اذنی، اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنی میں بھی شامل نہیں۔ قرآن پاک اپنے لئے بھی ”قدم“ کی اصطلاح استعمال نہیں کرتا۔“ eternity فلسفیانہ اصطلاح ہے جسے عیسائیت نے یونانیوں سے اخذ کر کے صفات باری میں شامل کیا۔ (Swinburne 1977, 217) وہاں سے یہ تصور مسلم فکر میں آیا۔ معتزلہ اور اشاعرہ نے دیگر اصطلاحات کی طرح یہ اصطلاح بھی بلا ادنیٰ تاہل قبول کر لی اور مسلم فاسنے میں ”قدم“ کا لفظ اللہ اور کلام اللہ کی صفت کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ ”قدم، یا اذنیت“ کا یہا مفہوم ہے اور ذات باری کے ساتھ اس کے اتصاف کے کیا مضمرات ہیں، اس کے بجائے ہماری دانست میں کونسا لفظ کس مفہوم میں ذات باری کیلئے استعمال کیا جانا مناسب ہے، اس کتاب میں شامل ہمارے مضمون ”قرآن: خلق یا امر“ اور ہماری انگریزی کتاب کے کئی مضامین میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

انسانی فکر و تجربہ کے حوصلات کے مطالعہ کو اخاد یا سکیولر ازم قرار دے کر چھوڑ دینا اس کا حل نہیں ہو سکتا۔ علوم کے آگے اس طرح کے بند باندھے بھی نہیں جاسکتے۔ مسائل کا تجزیہ کر کے، ان غیر قرآنی اصطلاحات اور تصورات کو دریافت کر کے جو کسی مسئلہ زیر بحث میں علمی الجھاؤ کا باعث ہیں، ہم نے قرآن پاک کی روشنی میں ان مسائل کی از سر نو تشكیل اور حل کا نمونہ پیش کیا ہے۔ اگر اس میں خوبی نظر آئے تو اپنے اپنے دائرہ علم میں اس وژن سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر کے اس کام کو مزید آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ بھول نادانستہ تو ہو ہی جاتی ہے، دانستہ بھی ہو جاتی ہے۔ اپنے لئے بارگاہ الہی میں مغفرت کے طلبگار ہیں۔ جن سے ہم نے حق کے حوالے سے اختلاف کیا ہے، ان کی بھول کو نادانستگی اور کمی علم پر محمول کرتے ہوئے ان کے لئے بھی اللہ کی بارگاہ میں مغفرت کے طلبگار ہیں۔ ہمارے کسی جملے سے کسی کی دلآلزاری کا پہلو نکلتا ہو، تو ان سے معافی کے خواستگار ہیں۔ حتمیت کا کوئی دعویٰ نہیں۔ قرآن پاک کو معیار حق مانتے ہوئے

سند کے ساتھ بات کرنے کی کوشش کی ہے، اگر کوئی محترم قاری کسی سہو کی نشاندہی کر سکیں، کوئی بہتر نظریہ، اصول یا قاعدہ کلیہ عنایت فرمائیں تو ان کی بات پر سمجھی گی سے غور کیا جائے گا۔

ہم شکر گزار ہیں چیز پر سن شعبہ فلسفہ جامعہ پنجاب، تمام اساتذہ کرام، لاپسر ری سٹاف، ایڈ منٹری ٹاؤن و میگر سٹاف کے جنہوں نے ہمیں ریٹائرمنٹ کے بعد شعبہ میں پہلے سے بھی زیادہ عزت، احترام سے نوازا اور تدریسی اور تحقیقی کام کیلئے بہترین سہولیات مہیا کئے رکھیں۔ دنیا بھر میں ایسی انجمنیں، ادارے اور جماعتیں جو اساتذہ کرام کو تدریس سے ریٹائرمنٹ کے بعد عزت اور آسانی مہیا کرتے ہیں تاکہ وہ مالی تفکرات سے آزاد رہ کر تخلیق علم کا فریضہ سرانجام دے سکیں۔ لیکن یہ کام وہی کر سکتے ہیں جو علم اور صاحب علم کی قدر جانتے ہوں۔ ہم نہایت شکر گزار ہیں جناب ڈاکٹر جاہد کارمان، سابق واکس چانسلر جامعہ پنجاب کے۔ اگر انہوں نے عزت اور فراغی کے ساتھ کنٹریکٹ کی صورت میں تخلیق علم کے کام میں آسانی مہیا نہ کی ہوتی تو سابقہ اور موجودہ کتاب کا وجود میں آنا بہت مشکل ضرور ہوتا۔ ہم نہایت شکر گزار ہیں محترم پروفیسر منصور ناصر صاحب، عزیز مکرم آصف صاحب اور اپنے دوست اور سابق شاگرد آصف علی صاحب کے جن کے مالی اور عملی تعاون کے بغیر کتاب شائع کرنا اور قارئین تک پہنچانا یقیناً کاردار ہوتا۔ عزیز مسلم سراج الحسن نے ہماری کتاب ”The Qur’anic Theology, Philosophy and Spirituality“ کا تائیل اتنا خوبصورت ڈیزائن کیا، کہ جس نے دیکھا تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اسی ڈیزائن پر موجودہ کتاب کا تائیل بھی انہیں نے بنایا ہے۔ کتاب کی اشاعت میں یہ بھی ایک اہم مرحلہ ہوتا ہے، جس میں عزیز مسلم سراج الحسن کی وجہ سے ہمیں بہت آسانی ہوئی۔ ایڈنگ میں بھی سراج الحسن صاحب کا ہر مقام پر تعاون حاصل رہا۔ ہم شکر یہ ادا کرتے ہیں ان تمام صاحبان کا جنہوں نے کسی بھی صورت میں ہمارے ساتھ معاونت کی اور آسانی مہیا کی۔ ہم شکر گزار ہیں اپنی اہلیہ محترمہ اور بچوں کے جنہوں نے ہمیں گھر میں سکھ، سکون اور پیار محبت کا ماحول مہیا کئے رکھا۔

### عبد الحفیظ قادری

پروفیسر ڈاکٹر عبد الحفیظ قادری فاضلی

پارہ ریچ الائیل، 1439ھ

کیم دسمبر، 2017ء

[hafeez.fazli@gmail.com](mailto:hafeez.fazli@gmail.com)

+92 300 4550698

## ذات و صفات باری میں تعلق کی نوعیت

قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس کے علاوہ اس کے بہت سے اسماء الحسنی بھی بیان کرتا ہے جنہیں مسلم لکھر میں اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے اور بعض روایات کے حوالے سے انہیں کم از کم ننانوے ضرور مانا جاتا ہے۔ مسلمانوں کا ہمیشہ اس بات پر ایمان رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنی اللہ تعالیٰ کی حقیقی صفات کی طرف اشارہ کرتے ہیں، لیکن کبھی بھی اس قسم کا سوال پیدا نہیں ہوا کہ اتنی صفات کے ہونے سے توحید باری کے عقیدے پر کوئی حرف تو نہیں آتا۔ مسلمان ہمیشہ اپنے آپ کو عقیدہ توحید کے سچے علمبردار سمجھتے رہے۔ پھر یہ ہوا کہ آٹھویں صدی عیسوی کے پہلے نصف میں مسلمان علماء میں یہ مسئلہ زیر بحث آنے لگا کہ

”کیا ذات باری اور صفات باری ایک ہی ہیں، یا صفات باری ذات باری سے الگ طور پر حقیقی ہیں۔“

اگر صفات باری، ذات باری سے الگ طور پر حقیقی یعنی زائد از ذات (superadded to the

Being of God) ہیں تو کیا ازالی ہستیاں ایک سے زیادہ نہیں ہو جاتیں۔

کیا ایک سے زیادہ ہستیوں کو ازالی ماننا عقیدہ توحید کے منافی نہیں۔

اور اگر ذات باری، اور صفات باری میں عینیت کا تعلق ہے تو پھر صفات باری حقیقی کیسے ہیں۔

کیا یہ عقیدہ انکار صفات کے مترادف نہیں۔“

پہلا نقطہ نظر اختیار کرنے والے مسلم الہیات / کلام کی تاریخ میں صفاتیہ جبکہ دوسرا نقطہ نظر اختیار کرنے والے ”مکنرین صفات“ کہلاتے۔ بعد میں جب انفرادی کلامی مسائل پر اختلافی نقطہ نظر رکھنے والے علماء دوڑے مکاتب فکر متعزلہ اور اشاعرہ کی صورت میں ختم ہوئے تو ذات و صفات باری میں تعلق کی نوعیت پر صفاتیہ کا نقطہ نظر اشاعرہ اور مکنرین صفات کا نقطہ نظر متعزلہ نے اپنایا۔ (History of Muslim Vol.1) بعد کی صدیوں میں جب مسلم فلسفے کا آغاز ہوا تو الکندی، الفارابی، ابن سینا اور ابن رشد متعزلی مکتب فکر کے نمائندہ اور امام غزالی، الجوینی، باقیانی اشاعرہ مکتب فکر کے ساتھ ملحق ہونے والوں میں سے ہوئے۔) صفاتیہ یعنی اشاعرہ کے لئے مسئلہ یہ تھا کہ ذات و صفات باری میں تعلق کی ایسی تعبیر کر سکیں جس میں صفات الہی کو ذات باری سے الگ طور پر حقیقی اور زائد از ذات ماننے کے باوجود تعدد قدماء کے الزام سے بھی پنج سکلیں، یعنی اللہ کی وحدانیت پر حرف نہ آئے۔ جبکہ صفات باری کو ذات باری سے الگ

طور پر حقیقی اور زائد از ذات نہ ماننے والوں کیلئے مسئلہ یہ تھا کہ ذات و صفات باری میں تعلق کی وضاحت اس طرح کر سکیں کہ ان پر انکار صفات کا الزام بھی نہ آئے۔ یہ مسئلہ دیگر کلامی (الہیاتی) مسائل مشاً مسئلہ خلق قرآن، جبر و قدر، علم مطلق اور انسانی آزادی، قدرت مطلق اور انسانی آزادی، رزق کا مقدر ہونا اور انسانی آزادی، اجل مسمی اور انسانی آزادی، رویت باری، ایمان اور عمل میں تعلق وغیرہ کی طرح آج بھی اسی طرح چلا آ رہا ہے۔ معتزلہ اور اشاعرہ کے حامی اپنے اپنے مکتب فکر کی حمایت اور دوسرے کی مخالفت میں دے جانے والے دلائل کو صدیوں سے دہراتے یا نے تناظر میں اظہار نحیا کرتے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن کسی نے اس پہلو سے غور نہیں کیا کہ کیا اسلامی تعلیمات میں جائز طور پر اس مسئلہ کے پیدا ہونے کی بنیادیں موجود بھی ہیں۔ زیر نظر مضمون اس مسئلہ پر قرآن پاک کی روشنی میں حق تک پہنچنے کی ایک کوشش ہے۔ اس کتاب کے تمام مضامین میں اپنی علمی استطاعت کی حد تک قرآن پاک کی سند کے ساتھ حق کو روشن کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

‘صفت’ عربی کا لفظ ہے اور ‘ص-ف-ت’ کے مادے سے تعلق رکھتا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پاک کے بارے میں علم عطا فرماتے ہوئے نہ تو کہیں ‘صفت’ کا لفظ استعمال فرمایا اور نہ ہی کہیں اپنی صفات کے بارے میں گفتگو فرمائی۔ اس مادے کا صرف ایک لفظ یعنی ‘صفون’، قرآن پاک میں استعمال ہوا ہے وہ بھی ذات باری کو ان صفات سے پاک قرار دینے کیلئے جن سے مشرکین اسے منصف کرتے تھے۔ (القرآن، 37:180) اس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کو ‘ذات’ اور ‘صفات’ میں تقسیم کر کے ان کے درمیان تعلق کی نوعیت پر گفتگو کرنے کی بنیادیں قرآن پاک میں موجود نہیں تھیں۔ سوال یہ ہے کہ ‘ذات’ اور ‘صفات’ کی یہ تقسیم مسلم فکر میں (1) کہاں سے، اور (2) کیسے داخل ہوئی۔ پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ یہ تقسیم مشہور یونانی فلسفی ارسطو کی مابعد الطیعت سے، جو شتویاتی (dualistic) ہے، مسلم فکر میں داخل ہوئی۔ کائنات کے بنیادی اصول جن سے پوری کائنات کی تشریح کی جاسکے، فلسفے میں وجودیات (ontology) کہلاتا ہے اور انھیں دریافت کرنا (doing ontology) یا ما بعد الطیعت (metaphysics) کے (matter) کہلاتا ہے۔ ارسطو کا فلسفہ، ہستی کو صورت (Form) اور مادے (Matter) کے دو مطلق، ازلی اصولوں پر مشتمل قرار دیتا ہے۔ ارسطو کے فلسفے کا ایک اصول یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس کا آپ اور اک کر سکتے ہیں، وہ حقیقی ہے۔ (What is rational is real.)

اصولوں کے اعتراض پر مشتمل ہے۔ شویاتی ما بعد الطبيعات پر مشتمل ارسطو کی منطق ہر چیز کو اسکی ذات (essence) اور صفات (attributes) میں تقسیم کرتی ہے، صفات کو ذات سے ممیز طور پر حقیقی اور زائد از ذات قرار دیتی ہے، اور صفات کے ذات کے ساتھ تعلق کا اثبات یا انکار کرتی ہے۔ اس طرح ارسطو کی منطق کا بنیادی تضییہ (proposition) وجود میں آتا ہے جس سے استدلال (argument) تشکیل پاتا ہے۔ ارسطو کی شویاتی ما بعد الطبيعات سے یکسر نابلد ہوتے ہوئے، یا اس کا منکر ہوتے ہوئے بھی، ارسطو کے منضبط کئے ہوئے منطقی اصولوں کو صدیوں سے مادی اشیاء کے بارے میں جائز طور پر عقلی معیار استدلال کے طور پر استعمال میں لایا اور مانا جا رہا ہے اور ضروری صحیح کے ساتھ مانا جاتا رہا گا۔ لیکن کیا اس منطق کو جو اشیاء کو انکی ذات اور صفات میں تقسیم کر کے ہی اور اک کر سکتی ہے، جائز طور پر اللہ تعالیٰ پر گفتگو کیلئے استعمال میں لایا جاسکتا تھا جبکہ اسلام میں خدا کا تصور یہ ہے کہ کوئی شےء اسکے مثل نہیں! اگر ارسطو کی ما بعد الطبيعات اور منطق پر مشتمل ذات و صفات کی اصطلاحات مسلم فکر میں داخل نہ ہوئی ہو تو اُنہیں غیر شعوری طور پر ہستی باری تعالیٰ پر مکالمہ کیلئے قبول نہ کر لیا گیا ہوتا تو ذات و صفات باری میں تعلق، کامسلکہ کبھی پیدا نہ ہو سکتا۔ اب سوال یہ ہے کہ ارسطو کے فلسفے کی یہ اصطلاحات مسلم فکر میں کیسے در آئیں۔

## عقیدہ تثییث پر ہونے والے مباحث

ہیری آسٹرین ولفسان (Herry Austrian Wolfson 1887-1974) <sup>7</sup> اپنی کتاب "The Philosophy of the Kalam" میں ایک عیسائی سکالر John of Damascus (d.ca.754) کی "Disputatio Christiani et Sasaceni" کے حوالے سے بیان کرتا ہے کہ مسلمانوں کے شام کی فتح کے بعد مسلمانوں اور عیسائیوں میں عقیدہ تثییث کے حوالے سے مباحث ہوتے رہتے تھے۔

قرآن پاک میں اہل کتاب کے عقیدہ تثییث کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ:

”اے اہل کتاب اپنے دین میں غلوت نہ کرو۔ اور اللہ کے بارے میں نہ کہو مگر حق۔ بے شک مسیح عیسیٰ ابن مریم، اللہ کے رسول اور اس کا ملمہ ہیں، کہ مریم علیہ السلام کی طرف القافر مایا، اور اس کے ہاں کی روح۔ تو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاو۔ اور تمین نہ کہو! اپنے بھلے کو باز رہو۔ بے شک اللہ تو الہ واحد ہی ہے۔ پاکی ہے اسے اس سے کہ اس کی کوئی اولاد ہو۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور اللہ کافی ہے وکیل۔“ (القرآن، 4:171)

لوگ جو کہتے ہیں بے شک اللہ تین میں کا تیسرا ہے۔ اور معبد تو نہیں مگر وہی معبد واحد۔ اور اگر اپنی بات سے بازدہ آئے تو ان میں سے کافروں کو المناک عذاب پہنچے گا۔” (القرآن، 5:73)

اور جب اللہ فرمائے گا اے عیسیٰ ابن مریم کیا تم نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ اللہ کے مقابل مجھے اور میری ماں کو معبد ٹھہر او۔ عرض کریں گے: پاکی ہے تجھے۔ مجھے لاق نہیں کہ وہ بات کہوں جس کا مجھے حق نہیں۔“ (القرآن، 5:116)

ان اور دیگر آیات کی بنابر مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام اور حضرت مریم علیہ السلام کو الوہیت میں شریک کرنا یا خدا، عیسیٰ اور روح القدس پر مشتمل تثییث کی صورت میں اللہ کو تین میں کا تیسرا کہنا شرک ہے۔ کیتوں لک انسان گلوبیڈیا میں عقیدہ تثییث کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

“The Trinity is the term employed to signify the central doctrine of the Christian religion — the truth that in the unity of the Godhead there are Three Persons, the Father, the Son, and the Holy Spirit, these Three Persons being truly distinct one from another. Thus, in the words of the Athanasian Creed: “the Father is God, the Son is God, and the Holy Spirit is God, and yet there are not three Gods but one God.” In this Trinity of Persons the Son is begotten of the Father by an eternal generation, and the Holy Spirit proceeds by an eternal procession from the Father and the Son. Yet, notwithstanding this difference as to origin, the Persons are co-eternal and co-equal: all alike are uncreated and omnipotent. This, the Church teaches, is the revelation regarding God’s nature which Jesus Christ, the Son of God, came upon earth to deliver to the world: and which she proposes to man as the foundation of her whole dogmatic system.” (The Catholic Encyclopaedia: The Dogma of the Trinity n.d.)

اس عقیدہ کے مطابق خدا تعالیٰ، عیسیٰ علیہ السلام اور روح القدس اپنے طور پر حقیقی اور ممیز ہونے کے باوجود تینوں ملکر ایک ہیں۔ اور جسے مسلمان خدا پکارتے ہیں وہ اس تثییث کے مطابق تین میں کا تیسرا ہے۔ مباحثت کے دوران ان تینوں کے اپنے طور پر حقیقی اور ممیز ہونے کے باوجود تینوں کے ملکر ایک ہونے کو

کسی مطلق سے ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا اور مسلمان انہیں مشرک قرار دیتے تھے۔ عیسائیوں کیلئے اپنادفاع تلاش کرنا ازبس ضروری تھا۔ ولفساں کہتا ہے کہ ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ اس صورت میں عیسائیوں نے کیا دفاع تلاش کیا ہو گا۔ انہوں نے کہا ہم تو خداے واحد کو مانتے ہیں۔ کرائٹ اور روح القدس تو دراصل دو الوہی صفات 'کلام' (Wisdom) اور 'قدرت' (Power) کے مخصوص نام ہیں۔ ہم ان صفات باری کو قدیم، جو ہر ذات سے الگ طور پر میز، اور حقیقی مانتے ہیں۔ ہمارا عقیدہ تو یہی ہے کہ خدا کی ذات، بھی حقیقی ہے اور یہ دو صفات 'کلام' اور 'قدرت'، بھی حقیقی ہیں اور ہمیشہ سے اسکی ذات کے ساتھ ہیں۔ جوابی اعتراض میں انہوں نے مسلمانوں سے پوچھا: کیا آپ خدا کی صفات کو حقیقی اور ارزی نہیں مانتے۔ مسلمانوں نے کہا کہ ہم خدا کی صفات کو حقیقی بھی مانتے ہیں اور ارزی بھی۔ عیسائیوں نے کہا: تم اسکی صفات کو اسکی ذات سے الگ طور پر حقیقی اور زائد ذات سمجھتے ہو یا خدا کی ذات اور صفات، دونوں کو ایک ہی سمجھتے ہو۔ پہلا موقف اختیار کرنے والوں کے جواب میں عیسائیوں نے کہا کہ ہم تو خدا کی صرف دو صفات کو حقیقی اور زائد ذات مان کر مشرک ہو گئے اور تم خدا کی ناوے صفات کو حقیقی اور زائد ذات مان کر بھی موحد ہونے کے دعے دار ہو۔ جنہوں نے یہ کہا کہ ہم خدا کی صفات کو مانتے ہیں لیکن انہیں اسکی ذات سے الگ طور پر حقیقی اور زائد ذات نہیں مانتے، اس کے جواب میں انہوں نے کہا پھر تم خدا کی صفات کو مانتے ہی کیسے ہو۔ اگر خدا کی صفات اسکی ذات سے الگ طور پر حقیقی نہیں تو پھر ذات اور صفات ایک ہی ہو گئیں۔ یہ تو انکار صفات ہے اور تم ممکنہیں صفات ہو۔

مسلم کلام میں 'مسئلہ ذات و صفات' کے آغاز کا جواہتمالی نقشہ ولفساں نے کھینچا ہے وہ بالکل قرین قیاس ہے۔ صفاتیہ کو خود اپنے لئے دفاع تلاش کرنا ضروری ہو گیا کہ عیسائیوں سے کہیں زیادہ صفات باری کو حقیقی مان کرو وہ موحد کیسے ہیں، مشرک کیوں نہیں، اور ممکنہیں صفات کو اپنادفاع تلاش کرنا ضروری ہو گیا کہ صفات باری کو ذات باری سے الگ طور پر حقیقی نہ مان کرو انکار صفات کے الزام سے کیسے نجسکتے ہیں۔

## امثال کی درون ذات اور بیرون ذات تعبیر

بعد کی صدیوں میں جب یونانی فلسفے کی کتابیں ترجمہ ہو کر مسلمانوں تک پہنچیں تو مسئلہ ذات و صفات افلاطون کے نظریہ امثال کی درون ہستی باری تعبیر سے جڑ گیا۔ سقراط کا شاگرد، ارسطو کا استاد، عظیم یونانی فلسفی افلاطون کائنات کے وجود میں آنے کی فلسفیانہ تشریح کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس دنیا کے

علاوہ ایک خالق خدا اور ایک غیر زمانی غیر مکانی عالم امثال (non-spatial non-temporal world of ideas) کا ہونا بھی لازم ہے۔ عالم امثال میں ہر شے، خیال، احساس، ربط، نسبت، کیفیت صفت وغیرہ کے مقابل امثال (مثالی تصورات) موجود ہیں۔ امثال، مجرداً ازی تصورات یا سانچے وہ نمونے ہیں جنکے نقش پر اشیائے کائنات کی تخلیق ہوتی ہے۔ ان امثال کی حقیقت کیا ہے، افلاطون کے فلسفے کے شارحین دو مکاتب فلکر میں تقسیم ہو گئے۔ ایک مکتب فلکرنے کہا کہ یہ امثال خدا کے ذہن میں پائے جانے والے ازی تصورات ہیں۔ یہ درون ذات باری (intradical) ہیں۔ ان میں سے بعض نے کہا خدا ان کا خالق ہے، خدا نے ہمیشہ سے ہی انہیں تخلیق کر دیا تھا۔ بعض نے کہا افلاطون کے نزدیک خدا ان کا خالق نہیں، لیکن یہ ہمیشہ سے خدا کے ذہن میں پائے جاتے ہیں۔ دوسرا مکتب فلکرنے کہا کہ خدا امثال کا خالق نہیں، عالم امثال، بیرون ذات باری (extra-dical) خدا کے متوازی ہمیشہ سے موجود ہے۔ خدا نے ان امثال کے نمونے پر کائنات کو تخلیق کیا۔ مادہ یا عدم محض بھی ہمیشہ سے خدا کے ساتھ موجود ہے۔ مادہ ان تصورات کے عکس کو قبول کرنے کی استعداد کا نام ہے۔ خدا کے ایک طرف عالم امثال ہے اور دوسری طرف مادہ۔ خدا ان تصورات کے عکس کو مادے پر ثابت کرتا ہے تو اشیاء تخلیق ہوتی ہیں۔ تمام اشیاء انہیں تصورات میں سے کسی کی نقل ہیں۔ ہر تصور اپنی نوع کا کامل تصور ہوتا ہے، اشیا اسکی ناقص نقل ہوتی ہیں۔ (تاریخ فلسفہ یونان، 122)

فلو (philo) پہلی صدی عیسوی کا ایک یہودی سکالر ہے جس نے امثال اور خدا کے تعلق کی ان دو تشریحات کو تطبیق دیکر یہودی مذہب کی عقلی تشكیل کی۔ بعد میں عیسائیوں نے اس سے متاثر ہو کر عیسائیت کی عقلی تشكیل کیلئے یہی انداز اپنایا اور اس طرح تثبیث کا نظریہ وجود میں آیا۔ (HAW6149) (کمالی، ماہیت خود آگبی اور خودی کی تشكیل 1963) اپنے زمانے میں مسلمان بھی اس سے بہت متاثر ہوئے۔ ان کے وحدت الوجودی تصور خدا پر اس کے گھرے اثرات ہیں۔ ہر دور کے مذہبی علماء کو یہ مسئلہ درپیش ہوتا ہے کہ وہ اپنے مذہبی عقائد اور تعلیمات کی عقلی تشكیل کر کے ثابت کریں کہ ان کے مذہبی عقائد اور تعلیمات عقل کے راجح وقت معیار کے عین مطابق ہیں۔ تاریخ فلسفہ مذہب کے مطابق فلو سب سے پہلا شخص ہے جس نے مذہبی فلسفہ کی بنیاد رکھی۔ فلو کے نزدیک یہودی مذہبی فلکر کی عقلی تشكیل کا معیار یہ تھا کہ ثابت کیا جائے کہ یہودی مذہب کے عقائد صداقت یا حقيقة مطلق کا جو تصور پیش کرتے ہیں وہ اس تصور سے ہم آہنگ ہے جسے تین سو سال پہلے افلاطون اور ارسطو جیسے فلسفیوں نے خالص فلسفیانہ انداز میں دریافت کیا اور اس منطق

کے مطابق ہے جس کے اصول ارسٹونے منضبط کئے۔ جب مذہب کی عقلی تشكیل کا مسئلہ عیسائی علماء کو درپیش ہوا تو ان کے پاس فلوکی کاوش کی صورت میں ایک نمونہ موجود تھا۔ انہوں نے اس معاملے میں فلوہی کا اتباع کیا۔ فلو نے جب اپنی مذہبی تعلیمات کو افلاطون کے فلسفے سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی تو اس نے افلاطون کے نظریہ امثال کو اپنی توجہ کامراز کر زینا یا اور خدا اور امثال کے آپس میں تعلق کی دو باظاہر متضاد تشریحات کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ کرتے ہوئے استدلال کیا کہ پہلے مرحلے پر مطلق مجرد تصورت یعنی امثال خدا کے ذہن میں پائے جاتے تھے چنانچہ وہ درون ذات باری (Intradeical) تھے (Wolfson 1961)۔ خدا کے ذہن کے لئے فلولوگوس (عقل) کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ خدا نے پہلے مرحلے میں امثال سے ایک عالم معقول (Intelligible World) کو تخلیق کیا اور اسے لوگوس کے اندر رکھ دیا۔ اس کے بعد اس نے لوگوس کو اپنے سے الگ، ایک محسوس صورت (Visible Form) میں تخلیق کیا۔ یہ لوگوس کی بیرون ذات باری (Extradeical) سمجھ تھی۔ مطلق تصورات جو لوگوس کے اندر رکھے گئے تھے اس طرح ان کا بھی خارجی اشیا میں اظہار ہوا۔ معقول تصورات کے محسوس صورت اختیار کرنے سے کائنات وجود پذیر ہوئی۔ فلو نے استدلال کیا کہ یہودی مذہبی عقائد اور افلاطون کا نظریہ امثال اور نظریہ تخلیق آپس میں ہم آہنگ ہیں، لہذا یہ عقائد ریشنل ہیں۔ (Wolfson 1961, 31-32)

## عیسائی مذہب کی عقلی تشكیل

فلو نے یہودی مذہب کی عقلی تشكیل کا جو مائل پیش کیا، جب وہ عیسائی علماء تک پہنچا تو وہ اس سے بہت متأثر ہوئے اور عیسائیت کی عقلی تشكیل کے لئے اسی نیج پر چل پڑے۔ فلو نے جس حقیقت کے لئے لوگوس کا لفظ استعمال کیا تھا، عیسائیوں نے اس کیلئے کرائست (Christ) کا لفظ استعمال کیا اور یہ دعویٰ کیا کہ کرائست ہمیشہ سے خدا کے ساتھ موجود تھا۔ فلو نے کہا کہ خدا نے لوگوس کو معقول صورت (Intelligible Form) دی اور دیگر تمام تصورات کو اس کے اندر رکھ دیا، عیسائی متكلمین نے کہا کہ کرائست جواز سے خدا کے ساتھ تھا، خدا نے اسے معقول و مدرک کرائست کی صورت دی اور ازالی تصورات کو اس کے اندر رکھ دیا۔ فلو نے کہا تھا کہ خدا نے مدرک لوگوس کو محسوس لوگوس کی صورت میں تخلیق کیا، عیسائی متكلمین نے کہا کہ خدا نے مدرک کرائست کو محسوس کرائست کی صورت دی۔ چونکہ ذہن باری کے ازالی تصورات کرائست کے اندر موجود تھے، وہ بھی اس کے ساتھ ہی محسوس صورت اختیار کر گئے اور کائنات وجود پذیر ہوئی۔

کراںٹ روح کا نات ہے۔ عیسائیوں میں اس عقیدے کو روای حاصل ہوا کہ عیسیٰ ہمیشہ سے خدا کے ساتھ تھے اس لیے وہ خدا تھے۔ اس طور کے فلسفے میں انہیں ایک اصول نظر آیا جس میں اس نے کہا تھا کہ ہر شے اپنی نوع کے فرد کو جنم دیتی ہے، (Wolfson 1961, 42) عیسائیوں نے کہا کہ کراںٹ خدا کے ساتھ تھا، خدا نے اس کو انسانی شکل میں بھیجا، لہذا وہ خدا کا بیٹا ہے۔ اس طرح عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہنے کی فلسفیانہ تشریح مہیا کی گئی۔ وہ اس بات کے بھی قائل تھے کہ عیسیٰ خدا کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے وجود اُ حقیقی ہونے کے باوجود خدا سے الگ بھی نہیں تھے۔ عیسائیت میں ابتدائی دور سے روح القدس (Holy Spirit) کا ایک تصور بھی چلا آ رہا تھا۔ اگرچہ ابتداء میں یہ واضح نہیں تھا کہ روح القدس اور کراںٹ ایک ہی ہیں یا الگ الگ۔ چوتھی صدی عیسوی میں عیسائی متکلمین میں بالآخر یہ طے کر لیا گیا کہ روح القدس، کراںٹ سے الگ حقیقت ہے اور ازل سے خدا کے ساتھ ہے۔ اس طرح خدا (باپ)، کراںٹ (بیٹا) اور روح القدس پر مشتمل اُلوہیت کا وہ تصور پیدا ہوا جو عیسائی دنیا میں نظریہ تثلیث (trinity) کے نام سے مرон عقیدہ ہے۔

(Wolfson 1961, 42-43)

عیسائی بے شک اپنی الہامی کتابوں سے حوالے تلاش کر کے، نظریہ تثلیث کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن ہماری دانست میں اس کی بنیادیں اصلاً درج بالا فلسفیانہ کاوش میں ہی ہیں۔ مسلمان اپنی الہیات، فلسفہ اور روحانیت پر افلاطون کے نظریہ امثال کی اس تشریح کے اثرات کا، جسے ”دون ذات باری تعبیر“ کا نام دیا جاتا ہے، پڑے انکار کریں (کمال، مانیت خود آگئی اور خودی کی تشکیل 1963) لیکن ہماری دانست میں مسلم فلسفہ و کلام اور روحانیت پر اس کے بہت گہرے اثرات ہیں۔

قرآن پاک میں خدا کے لئے اللہ، کا لفظ اسم ذات کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جبکہ دیگر بہت سے نام اسمائے صفات کی حیثیت سے بیان کئے گئے ہیں مثلاً القادر، الحليم، الغفور، الباری، الودود وغیرہ۔ قرآن پاک ان اسماء کے لئے اسماء الحسنی کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ قرآن پاک میں کہیں بھی اسماء الحسنی کے لئے، یا اللہ تعالیٰ کی ذات کے بیان کیلئے، صفت یا صفات کے الفاظ استعمال نہیں کئے گئے۔ قرآن پاک میں اگر 'ص۔ ف۔ ت' مادہ کا لفظ یَصِفُونَ استعمال کیا گیا ہے تو وہاں بھی ذات باری کو ان صفات سے پاک قرار دینے کے لئے استعمال کیا گیا ہے جن کا اتصاف مشرکین اس کے لئے کرتے ہیں۔ ارشاد ہے: سُبْحَانَ رَبِّكُمْ رَبِّ الْعَزَّةِ

عَمَّا يَصِفُونَ ﴿القرآن، 180:37﴾ لیکن عملاء ہو ایہ کہ مسلم متکلمین اور حکماء عیسائیوں سے مباحثت کے دوران فلسفیانہ اصطلاحات کے جال میں پھنس گئے اور اسماء کے بجائے صفات کی اصطلاح کو اپنایا اور 'صفت' کے لفظ کو فلسفہ ارسطو کی ایک اہم اصطلاح attribute کے مترادف استعمال کیا حالانکہ 'اسم' اور 'صفت' کی منطق بھی مختلف تھی، مابعد الطبیعتات بھی یکسر مختلف تھی۔ نتیجتاً ہماری الہیات کا وہ اہم مسئلہ پیدا ہوا جسے ہم 'مسئلہ ذات و صفات باری' کے نام سے جانتے ہیں۔ مسلم کلام کی تاریخ سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ قرآن کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کا مسئلہ جس نے ہماری سیاسی تاریخ کو شدت سے متاثر کیا، اس مسئلہ پر ہونے والے کلامی مباحثت ہی سے پیدا ہوا تھا۔ مسئلہ ذات و صفات مخصوص اسلامی تاریخ کی ابتدائی صدیوں کے اشاعت ہر اور معتزلہ متکلمین کے مباحثت تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ ہمارے فلاسفہ الفارابی، ابن سینا، الغزالی اور ابن رشد اور ہمارے صوفیاء کے مابین بھی شدت سے زیر بحث آیا۔ ہمارے صوفیانے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے نظریات کی تشریح و توضیح کے ضمن میں مراتب وجود پر مباحثت کے حوالے سے تشییہ کامل، تشییہ مع التنزیہ، اور معدوم الوجود معلوم الاثار، یا ثبوت الوجود کی اصطلاحات میں اسی مسئلہ پر اظہار خیال کیا۔ (کمالی، مقولہ صفات اور تصور اسماء، 1964: 5-13) یہ مسئلہ ہے کیا! مسلم فکر میں اس مسئلہ کے پیدا ہونے کے اسباب کیا تھے، اور اصل میں ہمیں کیا کرنا چاہیے تھا، اس موضوع پر ہم اظہار خیال کر چکے ہیں۔ اب یہ دیکھیں گے کہ غیر قرآنی اصطلاحات اور تصورات کو قبول کر لینے کے بعد مسلم علماء میں اس مسئلہ پر صدیوں پر پھیلے ہوئے غیر ضروری مباحثت نے کیا کیا شکل اختیار کی، اور اگر ابتداء ہی میں غلطی کا شعور ہو گیا ہو تو ہمارے بہترین دماغوں کی بہترین صلاحیتیں بہتر استعمال میں آسکتیں۔

کیا صفات الہی، ذات الہی سے ممیز، حقیقی اور جو ہر ذات پر زائد (superadded) ہیں یا صرف ذات باری ہی حقیقی ہے اور صفات باری مخصوص انداز بیان؟ اگر صفات باری جو ہر ذات پر زائد ہیں تو جو ہر ذات سے ان کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ ذات باری صفات باری ہی کی کلیت کا نام ہے تو یہ ذات و صفات کے مسئلہ پر تشییہ عینی کا نظریہ کھلاتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ذات باری مخصوص صفات کی کلیت ہی پر مشتمل نہیں بلکہ اس سے ماوراء بھی ہے تو یہ تشییہ مع التنزیہ کا موقف کھلاتا ہے۔ منکرین صفات نے یا تو صفات باری کے حقیقی ہونے سے یکسر انکار کیا یا ان کی تشریح منقی پیرائے میں کرنے کی کوشش کی۔ بعض متکلمین نے صفات کے ذات باری کے احوال (modes) ہونے کا نظریہ بھی پیش کیا۔

اس مسئلے کا انسانی پہلو بھی ہے۔ جب یکساں الفاظ خدا اور انسان کی صفات کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں تو ان کے معنی میں فرق و اختلاف کا تعین کیسے کیا جائے گا؟ کیا ان میں محض درجہ کمال ہی کا فرق ہے یا باعتبار ماہیت بھی یہ یکسر مختلف ہیں! اگر پہلی صورت کو اختیار کیا جائے تو خدا کی ماورائیت متاثر ہوتی ہے اور ارشاد یہ ہے کہ ”کوئی شے اس کے مثل نہیں۔“ جبکہ دوسرا نقطہ نظر تسلیم کرنے کی صورت میں صفات الہی اور صفات انسانی میں تعلق کو واضح کرنا پڑے گا کیونکہ انسانی صفات کو الہی اساس کی ضرورت ہے۔ ارشاد باری ہے: ”اللہ کارنگ۔ اور اللہ سے احسن رنگ کس کا!“ (القرآن، 138:2)

اشاعرہ نے تعدد قدماء اور تعدد فی الذات کے اعتراض سے بچنے کیلئے ذات باری کی تزییہ (transcendence) کے اصول کی صورت میں اپنا دفاع تلاش کیا۔ ذات باری کے بے مثل ہونے کا تقاضا ہے کہ اسے ہر قسم کے انسانی حوالے سے منزہ مانا جائے۔ ذات الہی اور صفات الہی میں تعلق کی نوعیت کو حواہ کے تجربے یا حوالے سے سمجھنا ممکن نہیں۔ اسے اشاعرہ کا مخالف للحواردش کا نظریہ بھی کہا جاتا ہے جو ان کے اصول تزییہ ہی سے اخذ ہوتا ہے۔ انہوں نے استدلال کیا کہ صفات کے حقیقی اور زائد ذات الہی ہونے کے باوجود ذات الہی میں تکثیر یا تعدد قدماء کا اعتراض درست نہیں کیونکہ انسانی کو انف یا انسانی رشتہوں کی منطق ذات و صفات باری پر عائد نہیں کی جاسکتی۔ تعدد فی الذات اور تعدد قدماء کے اعتراض کو رفع کرنے کیلئے اشاعرہ نے ’لایین ولا غیر‘، کے اصول کو بھی پیش کیا اور بیان کیا کہ صفات باری اپنے مرتبہ میں ایسی ہیں کہ ’نہ تو وہ میں ذات ہیں نہ غیر ذات‘، لیکن جو عینیت میں شمار ہونہ غیریت میں وہ ہے کیا! (کمالی 14, 1964) صفات الہی اور صفات انسانی میں فرق کی نوعیت کے بارے میں انہوں نے ” بلا کیف ولا تشبیه“ کا اصول پیش کیا۔ یہ بھی اصول تزییہ ہی سے اخذ ہوتا ہے۔ اس کی رو سے صفات الہی، صفات انسانی سے اپنی نوعیت کے اعتبار سے یکسر مختلف ہیں۔ چنانچہ کسی صفت انسانی کو بیان کرنے والی حد جب صفت خداوندی کے لئے استعمال کی جائے تو اس کے معنی پہلے معنی سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔ (Sheikh 1974, 22)

معزز لہ اپنے آپ کو عقیدہ توحید کا سب سے بڑا علمبردار سمجھتے تھے۔ وہ ویسے بھی عقلیت پسند تھے۔ وہ یہ کے مطابق عقل ہونے کے قائل تھے اور عقیدہ رکھتے تھے کہ عقائد دین کی عقلی تشریح کرنا ممکن ہے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ذات الہی کا ہر وہ تصور جس سے تعدد قدماء یا ترکیب کا اشتباہ پیدا ہو، توحید الہی کے خلاف اور نظریہ اسلام سے متصادم ہے۔ لہذا صفات باری کی تصریح ایسے انداز میں کرنی چاہیے جس سے خدا کی

وحدائیت کا تصور متاثر نہ ہو۔ اس مکتبہ فکر نے صفات باری کے حقیقی ہونے سے یکسر انکار کیا یا ان کی تشرع منفی پیرائے میں کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی صفت علم کا مطلب یہ ہے کہ وہ بے خبر نہیں ہے، قادر ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ بے سکت نہیں ہے، ’الحی‘ کا مطلب یہ ہے کہ وہ مردہ نہیں ہے وغیرہ۔ ان میں سے بعض نے صفات کے ذات باری کے احوال (modes of activity) ہونے کا نظریہ بھی پیش کیا جسے درج بالا دونوں مکاتب فکر نے استعمال کیا۔ (سرسید احمد خان بھی اس مسئلہ پر یہی موقف اختیار کرتے ہیں) (Muhammad Khalid Masud 2007)

(theory of created attributes) کے ذریعے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی۔ 1976ء میں معتزلہ کے انکار صفات کے نظریے کی بنیاد ان کے ”ازلیت“ اور ”توحید“ کے مخصوص تصورات پر تھی۔ ان کے نزد یہ ازلیت صرف خدا کے ساتھ مخصوص ہے اور ازلیت اور خدالازم و ملزم تھے۔ ذات باری کی توحید کو وہ مطلق اور ہر قسم کے شائبه کثرت سے پاک سمجھتے تھے۔ صفاتیہ کو یہ اصول بولنے تھے۔ انہوں نے ازلیت کو صرف خدا کے لئے لازم قرار دینے کو ثبوت سے غالی قرار دیتے ہوئے صفات کی بھی ازلیت کا دعویٰ کیا۔ جوازی ہے وہ مخلوق نہیں ہو سکتا۔ اشاعرہ نے قرآن پاک کو خدا کی ازلى صفت کلام کا مظہر قرار دیتے ہوئے، قرآن پاک کو ازلى اور غیر مخلوق کلام الہی قرار دیا۔ معتزلہ نے ازلیت کو صرف اللہ تعالیٰ کیلئے مخصوص کرتے ہوئے قرآن پاک کو حادث اور مخلوق قرار دیا۔ اس طرح غیر قرآنی اصطلاحات اور تصورات کی بنیاد پر پیدا ہونے والے مسئلہ ذات و صفات سے خلق قرآن کا ایک اور مسئلہ پیدا ہوا۔ معتزلہ اور اشاعرہ نے ایک دوسرے کے تصور توحید کو بھی مسترد کیا اور توحید باری کا ایک دوسرے سے مختلف تصور دیا۔

منکرین صفات میں سے بعض نے صفات کو حقیقی اور ازلى قرار دینے کے بر عکس حقیقی (real) اور حادث (created) قرار دے کر مسئلہ کا حل پیش کرنے کی کوشش کی۔ یہ تین صفات جنہیں حقیقی اور حادث قرار دیا گیا علم، ارادہ، اور کلام ہیں۔ غور کرنے سے پتچلتا ہے کہ اس قسم کے نظریے کی قرآن پاک میں کہیں بنیاد نہیں ہو سکتی۔ جہنم صفوں اور ابوالهدیل اس نظریے کے حامی تھے۔ ولو فسان نے بجا طور پر کہا ہے کہ یہ نظریہ نو افلاطونی تعلیمات کے زیر اثر پیدا ہوا۔ رافزیہ اور کراتئیہ نے اس کے مماثل صفات

حادث کا نظریہ (theory of created attributes) پیش کیا۔ اس نظریے کے مطابق خدا میں ازل سے صرف ایک ہی قوت 'خالقیت' موجود ہے۔ یہ صفت خدا میں اس وقت بھی موجود تھی جب اس نے کچھ بھی تخلیق نہیں کیا تھا۔ باقی تمام صفات اسی صفت خالقیت کے زیر اثر پیدا ہوئی ہیں۔ آٹھویں صدی کے پہلے نصف میں بعض مذکورین صفات نے اپنا انکار صفات کا نظریہ خدا کی صفات علم، حیات، قدرت، ارادہ اور کلام کے انکار کی صورت میں پیش کیا (Wolfson 1976, 43-45)۔

مذکورین صفات میں سے کچھ نے صفات کے حقیقی ہونے سے انکار کے ساتھ اس بات سے بھی انکار کیا کہ یہ محض نام ہیں۔ چنانچہ انہوں نے نظریہ احوال کے ذریعے ان کی تشریح کرنے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں ابوہاشم کا نام زیادہ مشہور ہے۔<sup>8</sup> اس نے یہ نظریہ حدود قابلِ الحمل کے عمومی نظریے کے طور پر تشكیل دیا تھا جسے بعد میں ذات و صفات باری کے مسئلے پر استعمال کیا اور ایسے نتیجے پر پہنچا جو بیک وقت اشاعتہ اور معتزلہ کے عمومی نظریات سے مختلف تھا۔ ابوہاشم نے ایک ایسے واحد حال (Single Mode) کا نظریہ پیش کیا جو دیگر احوال کی علت ہو سکتا ہے۔ وہ خدا تعالیٰ کے لئے جس واحد صفت کو حقیقی مانتا ہے وہ الہیہ (God-hood) ہے۔ یہ وہ واحد صفت ہے جو صرف خدا میں پائی جاتی ہے۔ شہرتانی کے مطابق یہ واحد صفت لازماً چار دیگر احوال 1- حیات، 2- علم، 3- وجود، 4- قدرت، کو وجود میں لاتی ہے۔

ابوہاشم نے ان دیگر احوال کے بارے میں یہ نظریہ اختیار کیا کہ وہ نہ موجود ہیں اور نہ غیر موجود، وہ صرف احوال ہیں۔ ابوہاشم نے یہ بھی کہا کہ یہ احوال ذات باری سے اس طرح متعلق ہیں جس طرح معلوم اپنی علت سے ہوتا ہے۔ یہ نظریہ، صفات کو حقیقی ماننے والوں کے نظریے سے مختلف تھا کیونکہ وہ صفات کو ذات باری پر زائد، ازلي اور حقیقی قرار دینے کی بنابر ذات و صفات کے مابین علتی رشتہ کو مناسب نہیں نہ کرتے تھے۔ نظریہ احوال جو کہ معتزلہ کے انکار صفات کے نظریے کی ایک متوازن اور معتدل صورت کے طور پر سامنے آیا، اسے بعض اشعری مفکرین نے بھی اثبات صفات کے ایک معتدل نظریہ کے طور پر قبول کیا، ان میں سے دو مشہور مفکرین باقیلانی اور جوینی ہیں۔ باقیلانی نے اپنے صفات حقیقی کے نظریے کو نظریہ کیا، اور صفات حقیقی کے نظریے کو قائم رکھتے ہوئے نیا نظریہ احوال پیش کیا۔

## ‘اسم’ اور ‘صفت’ کی منطق میں فرق۔۔۔ پروفیسر عبدالحمید کمالی

پروفیسر عبدالحمید کمالی نے اپنے سلسلہ مضامین میں جو تین مضامین کی صورت میں اقبال رویویو کے جولائی 1963ء، جنوری 1964ء اور جولائی 1964ء کے شماروں میں شائع ہوئے، یونانی فلسفہ اور اسلام کے اساسی وجدان اور تصور و جوہ کا تقابی جائزہ لیتے ہوئے اپنے تیسرا مضمون میں مسئلہ ذات و صفات باری کے ماغذہ کی بہت درست نشاندہی کی ہے اور صحیح خطوط پر اس کا نظریہ تشکیل دینے کی کوشش کی۔ مسلم فلسفہ والہیات میں بہت ہی کم لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی کہ ذات باری کی معرفت کے حوالے سے قرآن پاک کی بنیادی اصطلاح ‘سماء’ ہے نہ کہ ‘صفات’۔ صفات سے یہاں مراد ارسطو کی منطق کی اصطلاح attributes کا متراود لفظ ہے جس کی بنیاد ارسطو کی ما بعد الطبعیات پر ہے جوہر شے کو صورت اور مادہ یا ماہیت اور صفات میں تقسیم کر کے ہی اداکرتی ہے۔ ارسطو کے فلسفے کا ایک بنیادی اصول ‘علم اور وجود کی عینیت’ ہے۔ علم سے مراد تعین ہے۔ جس کی تعین حدود ممکن نہیں، محض عدم ہے۔ ”وہ جو بے شرط ہے، نہیں ہے۔ وہ جس کی کوئی نہایت نہ ہو کچھ نہیں ہے۔“ اس کے بر عکس قرآنی تصور، ”وجود کی علم پر ماورائیت کا اصول ہے۔“ (کمالی 1963، 4) ذات باری تعین سے پاک ہے۔ مقام احادیث پر تو تعینات وجود ہی نہیں رکھتے اور علم ممکن ہی نہیں۔ لیکن جب تخلیق کائنات کا عنوان رکھا گیا اور مقام وحدت پر تعینات ظہور پذیر ہوئے، ذات باری پھر بھی تعین سے ماوراء ہے۔ وہ تمام اشیاء کی خالق ہے اور کوئی شے اس کے مثل نہیں۔ وہ ”منقلع الاشارہ ہے، کوئی نسبت اس کی طرف درست نہیں۔ کوئی توصیف اس کی تفسیر نہیں کر سکتی۔“ (کمالی 1963، 6) لیکن اسلام میں جب عقائد کی عقلی تشکیل کار جان پیدا ہوا تو تعلقات اور منطق کے جس نظام کو استعمال کیا گیا وہ اسلامی وجدان سے بالکل مطابقت نہ رکھتا تھا۔ ذات باری کی ماورائیت کا اثبات یونانی منطق کی بنابر ممکن نہ تھا۔ مسلم متكلمین قرآنی بصیرت سے متصادم اس منطق کو رد بھی نہ کر سکے۔ چنانچہ اسلامی عقائد کی عقلی تشکیل یونانی وجدان کے مطابق کرنے پر مجبور ہوئے۔ یونانی منطق نہ صرف وجود کو اس کی ایک شکل یعنی ”ذات و صفات“، ”جوہ و عرض“ یا ”موضوع اور محمول“ کا ہی عین قرار دیتی ہے بلکہ دائرہ عقل میں ذات کو صفات، جوہ کو عرض، اور موضوع کو محمول سے الگ طور پر حقیقی بھی مانتی ہے۔ اشیا کی ماہیت کے بارے میں بھی اس وجدان کی صحت محل نظر ہے، لیکن اسے فی الوقت درست مان بھی لیا جائے تو بھی اس کا ذات باری پر اطلاق کسی طور ممکن نہیں۔ اساسی اسلامی وجدان کے مطابق کوئی شے ذات باری کی مثل

نہیں۔ ذات باری تمام اشیاء، احوال و اعمال، تصورات، کیفیات اور روابط کی خالق اور مبداء ہے لیکن خود تمام حوالوں سے ماوراء ہے۔ مسلم متکلمین یونانی منطق کو ذات باری پر عائد کر کے مسائل میں الجھ گئے۔ چنانچہ بلا کیف ولا تشیبیہ، مخالف للحوادث، نظریہ احوال اور لاعین و لاغیر کے اصول انہوں نے ان خود ساختہ مسائل سے نجات حاصل کرنے کے لئے متعارف کروائے۔ مسلم متکلمین یہ جان ہی نہ سکے کہ اس منطق کی ما بعد الطبیعتیات قرآن کی ما بعد الطبیعتیات سے بکسر مختلف ہے۔

پروفیسر عبد الحمید کمالی کے مطابق 'اسم' کی منطق 'صفت' کی منطق سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ منطق طور پر 'اسم' ذات سے جدا امر ہے۔ ممکنی اپنے وجود کے ہر پہلو اور اپنی ذات کی جملہ تفصیل کے ساتھ ہمیشہ 'اسم' سے ماوراء ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے ایک فرد ذی شعور کسی اور شے کے علم کا اثبات کر کے اسکے وجود یا عدم پر گواہ ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر ذات ممکنی زندہ، بیدار اور خود آگاہ ہو تو وہ اس اسم سے باخبر ہو سکتی ہے جس سے دوسرے اسے موسوم کرتے ہیں۔ نام ذات کے ساتھ اس طور پر متعلق ہو جاتا ہے کہ نام کے ساتھ ہی ذات ممکنی متوجہ ہو جاتی ہے۔ یہ نسبت ہر گز صفت اور موصوف یا ظاہر و باطن کی نسبت کی طرح نہیں۔ صفت جزو ذات ہوتی ہے جبکہ ممکنی ہمیشہ اس کے تزییہ ذات کا حال ہوتا ہے۔ عبد الحمید کمالی کے مطابق 'اسم' اور 'صفت' کی منطق میں مزید فرق یہ ہے کہ اسم تابع الوجود ہوتا ہے جبکہ صفت تبع الوجود ہوتی ہے۔ اسی طرح اسم مؤخر بالوجود ہوتا ہے جبکہ صفت متقدم بالوجود ہوتی ہے۔ اسم پر کوئی منطقی تحدید بھی ممکن نہیں۔ ہر امر کا ایک اسم ممکن ہے۔ اس اصول پر جملہ حقیقت عالم اسماء کے نظام کی صورت میں ظاہر ہو سکتی ہے۔ اس کے بر عکس اقرار صفات سے ہمیشہ تحدید وجود لازم آتا ہے اس لئے کہ ذات سے وہی ظاہر ہوتا ہے جو صفت کے تعین میں موجود ہوتا ہے۔ (کمالی 1964، 9-11)

عبد الحمید کمالی صاحب نے اسماء کی درجہ بندی کرتے ہوئے اس ذات اور اسمائے تو صیفی کے فرق کی بھی وضاحت کی ہے۔ جب اس کسی وجود 'من حیث وجود' کی علامت ہو تو وہ اسم ذات ہے۔ جوز ندہ یا خود آگاہ نہ ہو اسے دوسرے اس کے موسوم کرتے ہیں جو اس کی ذات کیلئے قائم مقام ہوتا ہے جبکہ ذات خود آگاہ اپنی خود شعوری میں اپنے آپ کو ایک اسم سے موسوم کرتی ہے۔ اس ذات چونکہ خود ذات کا اسم ہوتا ہے اس لئے اس میں ذات کے کسی حال کی دلالت نہیں پائی جاتی، کسی فعل کی طرف اشارہ نہیں ہوتا اور اس کے کسی اثر سے التفات خاص نہیں ہوتا، ذات من حیث ذات اس کا مفہوم ومصدقہ ہوتی ہے۔ اسمائے تو صیفی کے

بارے میں کمالی صاحب کا نظریہ ہے کہ ذات باری کا ایک وجود ان تو اسم ذات کے ذریعے ہوتا ہے جبکہ دوسرا وجود ان اس کی فعلیت کا احساس ہے۔ اسم ذات کے مساواجتنے اسماء الہی ہیں ان کا سرچشمہ یہی وجود ان ہے۔ کمالی صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ ذات باری کے بے شمار نام اس کے وجود کی فعلیت سے ظہور میں آتے ہیں مگر ہم انسانوں کو صرف تھوڑے سے ناموں کا علم ہے اس لئے کہ ہمارے دائرة تجربہ میں کم و بیش سو سے کم نوعیت کے کام آتے ہیں۔ کمالی صاحب کا نظریہ ہے کہ اسمائے صفات دراصل اسمائے بیانیہ ہیں۔ ہر فعل الہی سے اسکے اسم فاعل کی حیثیت سے اسمائے بیانیہ اخذ کئے جاسکتے ہیں (مقولہ صفات اور تصور اسماء، 9-11)۔<sup>9</sup> ہمارے خیال میں تمام اسمائے بیانیہ کو اسماء الحسنی نہیں کہا جاسکتا۔ صرف وہی اسمائے بیانیہ اسماء الحسنی کہلانے کے مستحق ہوں گے جنہیں خود خدا نے بیان کیا ہو یا فرمان الہی سے مکملات کی تصدیق پر اخذ کیا گیا ہو۔ بعض صوفیا کے حوالے سے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ”دہر“ یا ”دہور“ کو اسمائے الہی جانتے تھے اور معتقدین کو ذکر کی تلقین کرتے تھے۔ لیکن یہ الفاظ اسماء الحسنی نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ قرآن پاک سے ثابت نہیں ہوتے۔ مکملات اس کی تصدیق نہیں کرتیں۔ جس روایت سے انہیں اخذ کیا گیا ہے، ہم نے اسی مجموعہ میں شامل اپنے مضمون ”کیا اللہ الدھر ہے؟“ میں تفصیل سے اسکا جائزہ لیا ہے۔

## کیا ”الحق“، اسماء الحسنی میں شامل ہے؟

”الحق“ کا مطلب ہوتا ہے ”معيارِ حق“۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو ”الحق“ کہا ہے۔ مثلاً فرمایا گیا ہے: ”اس الحق کی تنزیل تمہارے رب کی طرف سے ہے۔“ (cf. 5:83, 84, 11:120, 13:01, 19)“

21:55.)

”--- اور جو کچھ آپ کی طرف آپ کے رب سے نازل ہوا ”الحق“ ہے، مگر اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔“ (القرآن، 13:1)

”اور فرمائیے ”الحق“ تمہارے رب کی طرف سے ہے۔ تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے ---“ (القرآن، 18:29)

”قول اسی کا ”الحق“ ہے۔“ (القرآن، 6:74)

”الحق“ تمہارے رب ہی کی طرف سے ہے، تو شو شک لانے والوں میں سے نہ ہو۔“ (القرآن، 2:147)“ --- ”حکم اللہ ہی کا ہے۔ حق بیان فرماتا ہے۔“ (القرآن، 6:57)

”جب ان کے پاس الحق آیا، کہنے لگے یہ تو سحر ہے اور ہم اسکا انکار کرتے ہیں۔“ (القرآن، 43:30)

”اور جب ان سے فرمایا جائے ایمان لاو جو اللہ نے نازل فرمایا، کہتے ہیں: ہم تو اس پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر نازل ہوا، اور باقی سے انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ الحق ہے۔ اس کا مصدق ہے جو ان کے پاس ہے۔۔۔“ (القرآن، 91:2)

”اور وزن اس دن الحق سے ہو گا۔ پھر جن کے وزن بھاری ہوئے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔ اور جن کے تول ہلکے ہوئے تو وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جانوں کو خسارے میں ڈالا۔۔۔“ (القرآن، 9:8)

”اس میں کچھ شک نہیں کہ اس کتاب کی تنزیل رب العالمین کی طرف سے ہے۔ کیا یہ کہتے ہیں کہ آپ کا افتری ہے! بلکہ وہ آپ کے رب کی طرف سے الحق ہے۔۔۔“ (القرآن، 32:2)

”اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور صالح عمل کئے اور اس پر ایمان لائے جو محمد ﷺ پر نازل ہوا، اور وہی ان کے رب کی طرف سے الحق ہے۔۔۔“ (القرآن، 47:2)

اس موضوع پر ایک بسی طریق کیلئے دیکھنے ہمارے مضامین

(A. H. Fazli, Is 'al-Haqq' one of al-Asma' al-Husna!, 2016)

(A. H. Fazli, The Qur'anic ontology and status of al-Haqq, 2016)

ان آیات سے پتا چلتا ہے کہ قرآن پاک 'الحق' (The truth) ہے اور اللہ "الحق کا نازل فرمانے والا" (The Descender of the truth) ہے۔ "الحق کا نازل فرمانے والا" اور 'الحق'، ایک نہیں ہو سکتے۔ 'الحق' اللہ کا نام نہیں۔ ہم حضرت فضل شاہؒ کے مؤقف سے اتفاق کرتے ہیں کہ 'الحق ہونا' قرآن پاک کا مقام ہے۔ تفسیر فاضلی 'الحق' کو اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنی میں شامل نہیں کرتی۔ اللہ کی شان یہ ہے کہ اس کا نازل فرمایا ہوا کلام 'الحق' کا درجہ رکھتا ہے۔ مسلمانوں میں صدیوں سے یہ عقیدہ روان پاچکا ہے کہ وہ اللہ کو بھی 'الحق' کہتے ہیں اور قرآن پاک کو بھی، جبکہ یہ درست نہیں۔ اس عقیدے کے فروع کے درج ذیل اسباب ہمیں نظر آئے ہیں:

- 1- اسطوکی منطق کے زیر اثر صفاتیہ / اشاعرہ نے صفات الہی کو ذات الہی سے الگ طور پر حقیقی قرار دیا۔ چنانچہ انہوں نے اللہ کی صفت کلام کو ذات باری سے الگ طور پر حقیقی قرار دیتے ہوئے یہ مؤقف اختیار کیا کہ کلام کرنا اللہ کی صفت ہے جو ہمیشہ سے اللہ کے ساتھ ہے۔ کلام الہی (قرآن پاک) اسی صفت کا مظہر ہے۔ کلام لفظی کی صورت اختیار کرنے سے پہلے، یہ کلام نفسی کی صورت میں ہمیشہ سے

اللہ کی صفت کلام میں مضمرا تھا اور ہمیشہ سے اللہ کے ساتھ تھا۔ اسلئے کلام اللہ / قرآن پاک غیر مخلوق اور قدیم ہے۔ الحق کا لفظ اپنے مختلف مشتقات کی صورت میں قرآن میں 227 مرتبہ آیا ہے جس کی چند مثالیں اوپر دی گئیں ہیں۔ ایک آیت کی غلط تعبیر سے یہ نتیجہ نکلا جاتا ہے کہ اللہ 'الحق' ہے۔ اشارہ کے قبل نزول قرآن پاک کو 'کلام نفسی'، قرار دیکر ازی قرار دینے کے زیر اثر اس موقف کو تقویت ملتی ہے کہ اللہ اور قرآن پاک دونوں کو 'الحق'، قرار دیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ 'الحق'، کو اللہ تعالیٰ کا اسم پاک قرار دینے اور اللہ اور قرآن پاک دونوں کو 'الحق'، قرار دینے کی بنیاد پڑی۔ تفصیل کیلئے دیکھئے ہمارا مضمون (The Qur'an: Creation or Command) اور (قرآن: خلق یا امر!) (چند حوالوں کیلئے دیکھئے ص 182)

2- یونانی فلسفہ، خدا کیلئے فلسفیانہ اصطلاح / The Reality / The Absolute Reality استعمال کرتا ہے۔ وحی والہام کی مدد کے بغیر فلسفیانہ اصطلاحات اور فلسفہ آرائی، اللہ کے اس تصور کی عقلی تشکیل تک نہیں پہنچ سکتی جسے قرآن پاک میں "لیس کمثہ شیء" فرمایا گیا ہے۔ اللہ کے بارے یونانی اصطلاحات کا ترجمہ مسلم فلسفیوں نے 'حقیقت' یا 'حقیقت مطلق' کی اصطلاحات میں کیا۔ یہاں سے بھی اللہ کو 'الحق'، کہنے اور 'الحق' کو اللہ کے اسماء الحسنی میں شامل کرنے کی بنیاد پیدا ہوئی۔

3- جب تصور میں غلطی آجائی ہے تو پھر اس کے مضرات بھی الجھاؤ کو بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ خدا کو 'حقیقت مطلق'، کہنے سے کائنات کو 'حقیقت'، کہنے کی بنیاد فراہم ہوئی اور 'حقیقت' اور 'حقیقت مطلق'، میں تعلق کی نوعیت کے بارے میں سوال پیدا ہوا۔ یا تو خدا ہی 'حقیقت' ہے، اور باقی سب کچھ 'بے حقیقت' ہے۔ یا خدا 'حقیقت مطلق' (Absolute Reality) اور کائنات حقیقت مطلق کے اختیار کئے ہوئے عارضی تعینات یعنی اضافی حقیقت (relative reality) ہے۔ بھی وحدت الوجود کے دونیادی مفروضوں میں سے ایک ہے۔ وہ 'الحق'، کو خدا کے خصوصی نام کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور وہاں سے وحدت الوجود کا نظریہ تشکیل دیتے ہیں۔ (وضاحت کیلئے دیکھئے ہمارا مضمون 'وحدت الوجود، وحدت الشہود اور وحدت شاہدین')۔

ایک موقع پر یہ نفرہ بھی لگایا گیا کہ رام اور رحمان ایک۔ اللہ کے الہامی کلام میں 'الرحمان' کے اسماء الحسنی میں سے ہونے کی سند موجود ہے۔ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کے الہامی ہونے کی کوئی سند نہیں۔ خود ہندوؤں کا یہ دعویٰ بھی نہیں۔ رام کو ہندو خدا کا او تار (incarnation) مانتے ہیں۔ خدا کا کوئی او تار ہو، اسلام اسے شرک قرار دیتا ہے۔ 'الرحمان' کی شان یہ ہے کہ اس نے محمد ﷺ کو اپنا آخری نبی اور رسول بنا کر بھیجا، جس نے قرآن پاک کو اپنی آخری کتاب بنانے کا اعلان کیا۔ کیا 'رام' کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے؟ اگر ایسا ہے، تو ہم رام اور رحمان ایک، مان سکتے ہیں، ورنہ اس قسم کی تلقیق قرآن پاک کے مطابق اللہ کے ناموں میں الخاد ہے اور اللہ نے اس سے منع فرمایا ہے۔

یہودیوں کے مطابق خدا نے ان پر اپنا ذاتی نام جہوا (Jehovah) الہام فرمایا۔ عبرانی زبان میں اسکے معنی "وجو کہ ہے۔" ہے۔ یہ نا مکمل جملہ ہے۔ یہودی اور عیسائی اہل کتاب ہیں۔ قرآن پاک یہودیوں کے اس دعوے کے بارے میں خاموش ہے۔ لہذا یہی کہنا درست ہے کہ 'جو اللہ نے فرمایا، ہی حق ہے۔' یہودیوں کے دعویٰ کی نہ تصدیق درست ہے نہ تردید۔ اور جہوا، اور اللہ میں عینیت قائم کرنا بے سند ہے۔ بے سند بات سے کنفیوژن کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

## ذات باری کی ماورائیت

عیسائی علم الکلام ذات باری کو وراء سخن (Ineffable) قرار دینے کے علاوہ لا محدودیت (Infinity)، تغیر ناپذیری (Immutability) اور ازیمت / قدم (Eternity) کو اس کی صفات قرار دیتا ہے۔ ہمارے نقطہ نظر سے ذات باری کو ان صفات سے متصف کرنا درست نہیں۔ ذات باری نے اپنے نام الہام فرمائے ہیں اس لئے وہ 'وراء سخن' نہیں۔ ذات باری کو ان ناموں سے موسوم کر کے بالکل بات کی جاسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اسماء الحسنی کی صورت میں اپنی صفات (خلق، امر، قدرت، سمع، بصر، کلام، علم، ارادہ، ربوبیت وغیرہ) بیان فرمائی ہیں۔ ان کے حوالے سے ذات باری پر بات کی جاسکتی ہے۔ ذات باری نے اپنی سنت کا بیان بھی فرمایا ہے۔ اس کے حوالے سے ذات باری پر بات ہو سکتی ہے۔ ذات باری کو لا محدود اور ناقابل تغیر کہنا بھی ویسے ہی غیر درست ہے جیسے اسے محدود اور تغیر پذیر قرار دینا۔ یہ مخلوق کی صفات ہیں۔ اشیاء کائنات اور افراد کو محدود اور متغیر سمجھا جاتا ہے لیکن کائنات میں لا محدودیت کے صورات بھی ملتے ہیں مثلاً اتدرتی اعداد، طاقت و جفت اعداد وغیرہ۔ کائنات کی زمانی و مکانی حدود کا حتیٰ تعین بھی انسان نہیں

کر سکا۔ محدود اشیا اور لا محدود تصورات کا خالق خود ان سے ماوراء ہے۔ تمام تغیرات اور غیر متغیر قوانین یا اصولوں کا خالق تغیر اور عدم تغیر کے انسانی تصورات سے وراء الوراء ہے۔ ازیت / قدم کا لفظ زمانی تسلسل کی موثر بہ ماضی لا محدودیت (everlastingness) کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور زمان سے ماورائیت (Timelessness) کے معنی میں بھی۔ جواز لی ہوا س کا بدبی ہونا بھی لازم ہے۔ زمان و مکان کا خالق زمان و مکان اور تمام زمانی و مکانی تصورات و تخیلات سے ماوراء ہی ہو سکتا ہے۔

## اُلوہی اور انسانی صفات میں تعلق

ذات باری کی ماورائیت کا اثبات کرنے سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر خدا اور کائنات میں کیا رشتہ ہے اور صفات باری اور صفات انسانی میں کیا تعلق ہے۔ قرآن پاک کائنات کو حقیقت قرار دیتا ہے۔ مثلاً ”اوَّلَهُ نَعْلَمُ اَنَّا نَحْنُ مَوْلَانَا وَرَبُّنَا وَرَبُّ الْعَالَمِينَ“ (45:22) خدا خالق حقیقت (Creator of Reality) ہے۔ ماوازیان و مکان حستی زمان و مکان کی خالق ہے۔ وہی اسے قائم رکھنے والا (Sustainer) ہے۔ وہ اپنے علم اور قدرت میں تمام حقیقت کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہے لیکن کائنات میں سریانی (Immanent) نہیں جیسے روح جسم میں یا آگ لو ہے میں سریانی ہوتی ہے۔ وہ سریانیت سے پاک ہے۔ تخلیق اپنے خالق کی نشانیوں سے بھری ہوتی ہے لیکن خالق کی ذات میں شریک نہیں ہوتی، اس کی ذات کا حصہ نہیں ہوتی۔ کائنات کو حقیقت (Reality) قرار دینا درست لیکن خالق حقیقت کو حقیقت مطلق (Ultimate Reality) کہنا، نادرست ہے، اگر یہ اصطلاح ”حقیقت“ اور ”خالق حقیقت“ میں نوعیت کے فرق کی نفی کر کے صرف محدودیت اور لا محدودیت کا اثبات کرتی ہو۔ ذات باری معبود اور انسان اس کے عبد ہیں۔ ”معبود“ انسانی صفات یا انسان کے صفاتی ناموں کا مصداق ہونے سے ماوراء ہے۔ ذات باری کی شان ہے کہ وہ خواہش سے پاک ہے۔ یہی اس کی صفات کارنگ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے : ”اللَّهُ أَكْرَنَگُ اللَّهُ كَرَنَگُ سَمَّى اللَّهُ كَرَنَگُ كَسْ كَا!“ جب انسان کو خواہش سے پاک ہونے کا شرف ہو جاتا ہے، اس کی صفات محض اللہ کی رضا کے لئے اپنا اظہار کرتی ہیں تو اس کی ذات و صفات اللہ کے رنگ میں رنگ جاتی ہیں۔ دائرة عبدیت میں اللہ کے رسول ﷺ کی ذات اقدس اکمل طور پر اور شاہدین کی ذات اپنے اپنے درجے میں کامل طور پر اللہ کے رنگ میں رنگی ہوئی ہوتی ہے۔ صفات باری اور صفات انسانی میں مماثلت صرف رنگ کے اعتبار سے ممکن ہے۔ شاہدین کے اتباع سے بنہ اللہ کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ تاہم یہ

بات ہمیشہ ملحوظ رہتی چاہیے کہ بندہ عبد ہی رہتا ہے، اور دائرہ عبادیت میں اعلیٰ ترین مقام حضور نبی کریم ﷺ کو حاصل ہے۔

سینٹ خامس اکوئنس نے صفات باری اور انسانی صفات میں ممائیت کا جو اصول پیش کیا ہے وہ درست نہیں۔ سینٹ خامس اکوئنس نے کہا ہے کہ

”ہم پالتوکتے کے بعض افعال کو انسانی افعال پر قیاس کر کے کتے میں وفاداری کی صفت کا اثبات کرتے ہیں حالانکہ کتنے کاشوری درجہ، انسان کے شوری درجے سے بہت کم اور بہت مختلف ہے اور ہمیں قطعاً علم نہیں کہ وہ افعال جنہیں ہم کتنے کی وفاداری پر محمول کرتے ہیں سرانجام دیتے وقت کتنے کا فہم اور احساسات کیا ہوتے ہیں۔ سینٹ خامس کہتے ہیں اسی طرح جب ہم انسان میں کسی صفت کا اثبات کرتے ہیں (مثلاً یہ کہ فلاں عادل ہے) اور ذات باری کے لئے بھی اسی صفت کو بیان کرتے ہیں تو اس صفت کے محدود انسانی فہم کو لا محدود درجے میں قیاس کر کے ذات باری سے منسوب کرتے ہیں۔ سینٹ خامس اکوئنس یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ قیاس کی پہلی صورت میں برتر سطح سے اپنے سے کم تر فہم و ادراک والی ہستی کے بارے میں ممائیت کا ادراک کرتے ہیں جبکہ دوسری صورت میں ہم اپنے فہم و ادراک سے لا محدود برتر ہستی کو اپنے تجربے کی ممائیت پر قیاس کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔“ (Aquinas 2008)

خدا نہ محدود ہے نہ غیر محدود۔ ذو قطبی تصورات (Polar concepts) صرف ایسی ہستیوں پر قابل اطلاق ہیں جو نوعیت کے اعتبار سے یکساں ہوں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ خدا اور انسان کی صفات کے لئے استعمال ہونے والے یکساں الفاظ یکسر مختلف المعنی ہوتے ہیں۔ جب انسان اللہ کے رنگ میں رنگ جاتا ہے تو بندے کی بات خدا کی بات، بندے کا عمل خدا کا عمل، بندے کا فیصلہ خدا کا فیصلہ اور بندے کی عطا خدا کی عطا ہو جاتی ہے۔ (فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ ص وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَى وَلَيَعْلَمُ الْمُؤْمِنُونَ مِنْهُ بِلَا كَحْسَنَأَنَّطْ ”۔ تو تم نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے انہیں قتل کیا، اور آپ نے وہ مٹھی نہیں پھینکی تھی لیکن اللہ نے پھینکی تاکہ مومنین پر اپنی طرف سے احسان کرے۔“ (القرآن، ۱۷:8)

## اللہ تعالیٰ کی سات بنیادی صفات۔۔۔ امام غزالی

امام غزالی صاحب نے اپنی کتاب 'الاقتصاد فی الاعتقاد' میں اللہ تعالیٰ کے لئے سات بنیادی صفات: قدرت، علم، حیات، ارادہ، سمع و بصر اور کلام کو ثابت کیا ہے۔ (الاقتصاد فی الاعتقاد) غزالی صفات باری کو حقیقی اور ذات باری سے ممیز اور زائد سمجھتے ہیں۔ مثلاً ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ علم خدا ہے، یا حیات یا کلام خدا ہے۔ یہ ذات باری سے ممیز تصورات ہیں۔ لیکن ذات باری سے الگ کسی ذاتی معنویت یا حقیقت کا حامل قرار دینا امام غزالی کا منشاء نہیں جیسے ارسطو کی منطق کی اصطلاح صفت (attribute) اور ماہیت (essence) میں منتصور ہے۔ یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ذات باری کی بنیادی صفات کو سات متصور کرنا درست نہیں ہو سکتا۔ انسان اپنے محدود شعور کے مطابق ہی صفات باری کا ادراک کر سکتا ہے۔ ذات باری یا صفات باری کا احاطہ کر سکنا ممکن ہی نہیں۔ صفات باری حقیقی ہیں لیکن ارسطو کی منطق ذات و صفات باری پر عائد کرنا غیر قرآنی تصورات عائد کرنے کے مترادف ہے۔ صفات باری مرتبہ احادیث میں بھی ذات باری کے ساتھ ہیں، لیکن تعین سے موارعہ۔ مرتبہ وحدت پر اسماء الحسنی کا ظہور ہوتا ہے۔ ذات و صفات باری ہمیشہ تعین سے موارعہ ہیں۔ اسماء الحسنی ہی ذات و صفات باری کی معرفت کا درست اسلوب مہیا کرتے ہیں کہ خالق اور مخلوق کے رشتہوں کا تعین ان سے ہوتا ہے۔



## قرآن: خلق یا امر\*

اسلام بھی دین ہے اور کفر بھی دین۔ اسلام وہ دین ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کیلئے پسند کیا ہے۔ (5:03) کفروہ ادیان ہیں جو بندوں کی خواہشات سے تشکیل پذیر ہوئے ہیں۔ پہلی امتوں پر اسلام جس جس صورت میں نازل ہوتا رہا وہ اپنے اپنے حال پر کامل تھا، حضرت محمد ﷺ کی امت پر اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اکمل کر دیا۔ (5:03) یہ کہنا کہ اسلام بمقابلہ کفر ایک مکمل ضابطہ حیات ہے، بات کرنے کا وہ انداز ہے جو قرآن پاک نے اختیار کرنا پسند نہیں کیا۔ فہم دین کا حوالہ ایک نہ رہے تو اختلاف ہو جانا لازم ہے۔ قرآن پاک ہی فہم دین کا وہ حوالہ ہے جس کو اللہ نے 'الحق' فرمایا ہے۔ (2:147; 3:60; 32:2-3) جبھو رامت کی رائے سے مطابقت کسی نظریے کی صحت کا معیار نہیں ہوتی۔ 'قول' کی صورت میں معیار حق ہونے کا مرتبہ صرف قرآن پاک کو حاصل ہے۔ (6:73) اللہ سے زیادہ سچی بات کس کی! (4:87) کسی کی نہیں! کسی بھی انفرادی یا اجتماعی رائے کی قرآن پاک سے مطابقت ہی اس کی صحت کا ثبوت ہے۔ دین میں اکراہ نہیں، کا حکم یاد رہے تو کسی پر اپنے نظریات مسلط نہ کئے جائیں گے۔ اپنے مذہبی نظریات کے مطابق اس طرح زندگی بسر کی جائے گی کہ دوسروں کیلئے اپنے مذہبی نظریات کے مطابق زندگی گزارنے کے یکساں حق کو تسلیم کیا جائے گا۔ لیکن ہماری تاریخ میں ایسے موقع بارہا آئے جب مذہبی آزادی کے احترام کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ مسلمانوں کے شیعہ اور سُنّی میں تقسیم ہو جانے کے بعد سُنّی مسلمانوں کی فکری تاریخ میں ابتدأ جو مکاتب فکر وجود میں آئے وہ 'اشاعرہ' اور 'معزلہ' کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے درمیان جو مسائل مابہ الزّار عیسوی میں جب عباسی خلیفہ، معزلہ کا، ہم نواہو گیا تو یا سنتی قوت سے علماء کو خلق قرآن کے مسئلہ پر معزلہ عقائد اختیار کرنے پر مجبور کرنے کی کوشش کی گئی۔ مذہبی جبر و تشدد کا وہ بازار گرم ہوا جو آج بھی ہمارے لئے باعث نہ امانت ہے۔ ہم نے صرف ایک مسئلہ کا تجویز کر کے دکھانے کی کوشش کی ہے کہ قرآن پاک کی تعلیمات کے مطابق نہ اشاعرہ کا نظریہ درست تھا اور نہ معزلہ کا۔ امید ہے اس مضمون کے مطالعہ سے ان مسائل پر از سر نو غور کرنے کی تحریک ملے گی جن پر آج ہمارے علماء اور دانشوار جبر و تشدد اور عدم رواداری کی روشن کو اپنائے ہوئے ہیں۔ معزلہ کا عقیدہ تھا کہ قرآن پاک 'ملخوق'، اور 'حادث' (created and accident)

بعد از نزول قرآن متلو کی صورت اختیار کی، جبکہ اکثر اس کے زمانہ نزول میں تخلیق کرنے کے قابل تھے۔ قرآن مجید کے 'غیر مخلوق' اور 'قدیم' (uncreated and eternal) ہونے کے نظریہ کو وہ عقیدہ توحید سے متصادم سمجھتے تھے۔ وہ قرآن کے کلام الٰہی ہونے کے منکرنہ تھے لیکن اس کے غیر مخلوق ہونے اور قدیم (ازلی) ہونے کے منکر تھے۔ (Wolfson 1976, 263-74) اشاعرہ کا عقیدہ تھا کہ قرآن پاک 'کلام اللہ' ہے۔ (9:06) کلام اللہ، مخلوق نہیں ہو سکتا۔ ابو الحسن الاشرعی نے سورہ الاعراف آیت نمبر 54 میں اس فرمان الٰہی سے کہ 'سن لو! خلق بھی اسی کی ہے امر بھی اسی کا ہے۔' استدلال کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ 'خلق' اور 'امر' دو الگ کینٹیگریز ہیں۔ سورہ الرّوم کی آیت نمبر 25 میں اس فرمان الٰہی سے کہ 'اور اس کی نشانیوں سے ہے کہ زمین اور آسمان اسی کے امر سے قائم ہیں۔' استدلال کرتے ہوئے نتیجہ اخذ کیا کہ اللہ کافرمان (کلام) ہی اس کا 'امر' ہے، اللہ کی 'خلق' اس کے 'امر' سے قائم ہے۔ قرآن پاک 'کلام اللہ' ہے۔ اسلئے یہ 'خلق'، نہیں بلکہ 'امر' کی کینٹیگری سے تعلق رکھتا ہے۔ 'امر' کا 'خلق' سے پہلے ہونا لازم ہے۔ 'امر' سے پہلے کسی 'امر' کو مانا جائے تو کسی اور 'امر' کا اس سے بھی پہلے مانا لازم آئے گا۔ اس کو لامانا ہی طور پر بڑھانا منطقی طور پر ناقابل فہم ہے۔ اللہ کا 'امر'، اسکی صفت کلام میں مضمون ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ سے اللہ کے ساتھ تھا۔ اس طرح ابو الحسن الاشرعی کلام الٰہی کو (کلام نفسی کی صورت میں) اللہ کی صفت کلام کے اندر مضمون قرار دیکر استدلال کرتے ہیں کہ قرآن پاک قدیم ہے۔ 'غیر مخلوق کلام الٰہی'، ازل سے خدا کی صفت کلام کے طور پر خدا کے ساتھ تھا، جسے ابتدائے آفرینش سے ایک 'غیر مخلوق ازلي قرآن' (pre-existent Qur'an) کی صورت میں لوح محفوظ پر رکھ دیا گیا جہاں اپنے نزول تک یہ موجود رہا۔ (Al-

<sup>10</sup> Ash'ari 1940, 66,67,76)

کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں روایتی طور پر یہ عقیدہ راجح تھا کہ قرآن پاک غیر مخلوق ہے۔ (Wolfson 1976, 238) سوال یہ ہے کہ اس بات کے درست ہونے کی کیا سند ہے؟ اگر عام روایتی علماء سے مراد وہ لوگ ہیں جن میں ابھی فلسفیانہ اصطلاحات فروع نہیں پاسکی تھیں اور روایتی عقیدہ سے مراد وہ عقیدہ ہے جو ان اثرات سے متاثر ہوئے بغیر مسلمانوں میں وجود رکھتا تھا تو روایتی طور پر مسلمان یہی مان سکتے تھے کہ قرآن پاک اللہ کا کلام ہے جو اس نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے حضور نبی ﷺ کریم ﷺ کے قلب اطہر پر بتدریج نازل فرمایا۔ قرآن کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کے بارے میں کوئی

عقیدہ روایتی طور پر کیسے پایا جا سکتا تھا! مسلمانوں میں ایک قبل نزول قرآن کے موجود ہونے اور ایک آسمانی قرآن (Heavenly Qur'an) کی صورت میں کسی پوشیدہ کتاب یا لوح محفوظ یا ام الکتاب میں پائے جانے کا عقیدہ پیدا ہو جانے کے جواز میں تین ثبوت پیش کئے جاتے ہیں: قرآن پاک میں کہا گیا ہے کہ 1- یہ بڑی شان والا قرآن ہے لوح محفوظ پر۔ (85:22) 2- یہ عربی قرآن ہے جو ام الکتاب میں ہے۔ (4-43:03) 3- یہ قرآن مجید ہے اور ایک پوشیدہ کتاب (کتاب مکنوم) میں ہے۔ (56:78)

ان آیات کے باوجود، قرآن پاک کے کلام اللہ ہونے اور حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے حضور نبی ﷺ کریم ﷺ کے قلب اطہر پر بذریع نازل فرمائے جانے کے عقیدہ کے ہوتے ہوئے، ابتدائے آفرینش سے ایک غیر مخلوق یا مخلوق قرآن کے لوح محفوظ پر پائے جانے کا عقیدہ مسلمانوں یا روایتی علماء میں غیر اسلامی اثرات کے بغیر کیسے وجود میں آسکتا تھا جبکہ انہیں علم تھا کہ قرآن پاک مسلمانوں کو حضور ﷺ سے غیر ضروری سوال پوچھنے سے منع فرماتے ہوئے کہتا ہے: ”کہ اس وقت جب قرآن پاک نازل فرمایا جارہا ہے ایسی اشیا کے بارے میں سوال نہ کرو کہ تم پر ظاہر کردی جائیں تو تمھیں بری لگیں۔ لیکن اگر تم پوچھو گے تو تم پر ظاہر کردی جائیں گی“ (5:101) کیا اس آیت کے ہوتے ہوئے بھی تصور کیا جا سکتا تھا کہ کوئی پہلے سے لکھا لکھایا قرآن پاک موجود تھا جس میں سے بذریع آیات نازل فرمائی جا رہی تھیں! بنیادی بات یہ ہے کہ ’روایتی‘ اور ’غیر روایتی‘، ’مہم الفاظ ہیں۔ کسی عقیدہ کا مسلمانوں میں کسی بھی دور میں مبنیہ روایتی یا غیر روایتی طور پر پایا جانا کسی سند کا درجہ نہیں رکھتا۔ قول کی صورت میں معیار حق ہونے کا درجہ صرف قرآن کریم کو حاصل ہے۔ فہم قرآن کے حوالے سے درجات ہیں۔ فوّقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلَيْهِمْ۔ (6:76) یہودیوں کے ہاں پہلے سے قبل نزول تورات (pre-existent Turah) کا عقیدہ موجود تھا۔ (Wolfson 1976, 238) قبل نزول قرآن کے ہونے کا عقیدہ وہاں سے مسلم فکر میں داخل ہوا۔ عیسائی نظریہ ہستی (Ontology) میں مخلوق / غیر مخلوق کے علاوہ کسی اور کینٹیگری کا کوئی تصور نہیں تھا۔ مسئلہ ذات و صفات پر عیسائیوں سے مباحثت کے دوران یہ اصطلاحات مسلمانوں نے اپنائیں۔ اصطلاحات کبھی نیوٹرل نہیں ہوتیں۔ اصطلاحات کی پشت پر وہ نظریات لا زماں سوار ہوتے ہیں جہاں سے وہ لی جاتی ہیں۔ ’ناحق‘، ’کو‘، ’حق‘، میں ملانے سے خرابی ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ (2:42) جب معتزلہ نے قرآن پاک کے مخلوق ہونے کا نظریہ

پیش کیا تو مسلمانوں کے ہاں اسے روایتی عقیدہ (فاسفینہ اثرات سے پاک عقیدہ) کے خلاف ہونے کی بنا پر ناپسند کیا جانا بالکل قدرتی بات تھی۔ روایتی علماء بالخصوص امام احمد بن حنبل اور ان کے ہم نواوں نے اس پر شدید غم و غصے کا اظہار کیا۔ یہ علماء اگر قرآن پاک کی اسناد کی روشنی میں استدلال کرتے اور قرآنی اصطلاحات میں اپنا موقف پیش کرتے تو یہ بڑی خدمت ہوتی لیکن یہ بھی مخلوق / غیر مخلوق، اور حادث / قدیم کی غیر قرآنی فاسفینہ اصطلاحات کے جال میں پھنس گئے اور معززہ کے رو عمل کے طور پر اس نظریہ کی تبلیغ کی کہ قرآن پاک غیر مخلوق اور قدیم ہے۔ اس طرح دوسری انتہا کو جا پہنچ۔ بالعموم سمجھا جاتا ہے کہ اشاعرہ نے ان انتہا پسندانہ نظریات کے مابین اعتدال کی را اختیار کی، لیکن یہ بات بھی درست معلوم نہیں ہوتی۔ وہ بھی غیر قرآنی اصطلاحات کو اختیار کرنے کے مضرات کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ الفاظ کی صورت میں اظہار سے پہلے ذہن میں پائے جانے والے تصورات کیلئے اشعری نے 'کلام نفسی'، اور پیرا یہ اظہار کی صورت اختیار کرنے کے بعد 'کلام لفظی' کی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے کہا کہ نزول سے پہلے قرآن پاک کلام نفسی کی صورت میں اللہ کے ساتھ تھا اور نزول کے بعد اسے کلام لفظی کی صورت اختیار کی۔ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ غیر مخلوق ہے۔ اشعری کی 'کلام نفسی' اور 'کلام لفظی' کی اصطلاحات کا ماغذہ قرآن پاک نہیں۔ انکا ماغذہ بھی فلو (Philo) کے فلسفہ میں پایا جاتا ہے جسے بالآخر فلسفہ افلاطون کے امثال کی بیرون خدا تعییر مطابق امثال دراصل ذہن خداوندی میں پائے جانے والے ازلی خیالات / تصورات ہیں۔ جب خدا نے تخلیق کائنات کا ارادہ کیا تو ان ازلی تصورات نے محسوس صورت اختیار کر لی۔ (Wolfson 1961, 42)

اشاعرہ اور معززہ دونوں کے نظریات قرآن پاک کی تعییمات سے مطابقت نہیں رکھتے۔ اشاعرہ کا قرآن پاک کے قدیم ہونے کا نظریہ اسلئے قرآنی تعییمات سے مطابقت نہیں رکھتا کہ اس میں 'روح محفوظ' اور 'خدا کے علم' کا تصورو دیگر قرآنی تصورات مثلاً انسانی آزادی اور جوابدی، ہدایت و گمراہی کے اصول، اور ام الکتاب وغیرہ سے ہم آہنگ نہیں۔ مثلاً قرآن پاک کے مطابق ہر انسان ایسی فطرت پر پیدا ہوتا ہے کہ اس کی پیدائش سے پہلے یا پیدائش کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کا قطعاً فیصلہ نہیں فرمادیا جاتا کہ موت کے وقت وہ حالت کفر میں دنیا سے رخصت ہو گا۔<sup>11</sup> ایسے افراد جن کے حالت کفر میں دنیا سے رخصت ہونے کا قرآن پاک میں ذکر ہے مثلاً فرعون، ہامان، سامری اور بالخصوص ابو لهب اور اسکی بیوی کے

بارے میں بھی یہی بات درست ہے۔ یہ بات ممکن ہی نہیں کہ ان کی تذمیم پر مشتمل آیات ازل ہی سے لوح محفوظ پر لکھ دی جاتیں۔ ابتدائے آفرینش سے قرآن پاک کے غیر مخلوق کلام الٰہی کی صورت میں لوح محفوظ پر رکھے جانے یا بصورت دیگر لوح محفوظ پر تخلیق کئے جانے کے عقیدہ سے یہ لازم آئے گا کہ ازل ہی سے یا کم از کم ابتدائے آفرینش سے ابو لهب کا گنہگار ہونا اور اسی حال میں دنیا سے رخصت ہونا طے پا چکا تھا۔ یہ عقیدہ ایسی اخلاقی جبریت کو جنم دیتا ہے جو اسلامی عقائد بالخصوص اخلاقی آزادی اور اعمال کی جوابد ہی کے یکسر خلاف ہے۔ درج بالا عقیدے کو ماننے کی صورت میں اس نتیجے سے مفر ممکن بھی نہیں۔ انسان کو اخلاقی اعمال میں آزاد قرار دینے والوں کیلئے اسے مانا ممکن نہیں تھا۔ جب قدریہ (معترلہ) نے اس عقیدے کا انکار کرتے ہوئے قرآن کے بوقت نزول تخلیق کئے جانے کا نظریہ پیش کیا تو انھیں کلام اللہ، کو مخلوق قرار دینے کے اعتراض کا سامنا کرنا پڑا اور یہ اعتراض درست بھی تھا۔ اسکے علاوہ بھی یہ نظریہ درست نہیں تھا۔ آئیے قرآن پاک کی روشنی میں ان عقائد کا جائزہ لیتے ہیں:

1۔ اللہ تعالیٰ ہر شے کو ہستی عطا فرمانے والا ہے۔ ذات باری نے جن اشیاء کو ہستی عطا کی ہے قرآن پاک انھیں دو اقسام: امر، اور 'خلق' میں بیان فرماتا ہے۔ سن لو خلق بھی اسی کی ہے امر بھی اسی کا ہے۔ (۰۷:۵۴) یہ اللہ ہی ہے جس نے کسی شے کو خلق کیا ہے اور یہ وہی ہے جس کے امر سے وہ اپنے مقصد تخلیق کے حوالے سے متحرک ہے۔ (۳۰:۲۵)

2۔ آسمان، زمین اور جو کچھ ان کے مابین ہے یہاں تک کہ موت اور حیات بھی، 'خلق' کی کیمیگری سے تعلق رکھتے ہیں۔ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے مابین ہے، چھ دن میں خلق فرمایا... (۳۲:۰۴) ... وہ جس نے موت اور حیات کو خلق فرمایا... (۶۷:۰۲)

3۔ اللہ نے کسی شے کو بے مقصد تخلیق نہیں کیا۔ مقصد تخلیق کا تعین، تخلیق سے پہلے ہونا ضروری ہے۔ (۳۰:۰۸) اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے مابین ہے، حق کے ساتھ اور اجلِ مُمُٹی کے ساتھ خلق فرمایا ہے ... (۳۰:۰۸)

4۔ اللہ جس شے کو تخلیق فرمانے کا ارادہ فرماتا ہے، اللہ کا 'امر' ہی مقصد تخلیق کے حوالے سے اسے اس کے متعین دائرہ کار میں متحرک کرتا ہے۔ بے شک تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں خلق فرمایا، پھر عرش پر استوار فرمایا۔ رات، دن کو ایک دوسرے سے ڈھانپتا ہے کہ جلد ہی

ایک کے پیچھے دوسرا آ جاتا ہے، اور شمس و قمر اور نجوم اس کے امر سے مسخر ہیں۔ سن لو خلت بھی اسی کی ہے امر بھی اسی کا ہے۔... (07:54)

5۔ اگرچہ 'امر' کا تعین شے کی تخلیق سے پہلے ہونا ضروری ہے لیکن یہ جاری، صادر یا نازل اس وقت کیا جاتا ہے جب شے اسکو قبول کرنے کی استعداد پا لیتی ہے۔ یعنی 'امر' کا نزول حال پر ہوتا ہے۔ فرمایا، ہمارا رب وہ ہے جس نے ہرشے کو اس کی خلقت عطا کی، پھر اسے راہ سمجھائی۔ (20:50)

6۔ قرآن 'امر' کی کینیگری سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ 'خلق' کی کینیگری سے۔ یہ [قرآن] اللہ کا امر ہے جو اس نے تمہاری طرف نازل فرمایا ہے۔... (65:05)

7۔ قرآن شریعت کا مأخذ ہے اور شریعت بھی اللہ کا 'امر' ہے نہ کہ اسکی تخلیق۔ پھر ہم نے تمہیں امر سے شریعت پر ٹھہرایا، تو اسی کا اتباع کرو... (45:18)

8۔ اللہ کا 'امر' ہمیشہ نازل کیا جاتا ہے نہ کہ تخلیق۔ اللہ ہی ہے جس نے سات آسمان بنائے اور زمین سے انہی کی مثل۔ 'امر' ان کے ما بین نازل ہوتا ہے، تاکہ تمہیں علم ہو جائے کہ اللہ ہرشے پر قدرت رکھتا ہے اور اللہ کا علم ہرشے کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ (65:12) (65:12)

## نتقیدی جائزہ

1۔ قرآن پاک کے مخلوق / غیر مخلوق ہونے کے حوالے سے بحث کرنا بیدادی طور پر غلط تھا۔ قرآن پاک کے بارے میں جائز طور پر صرف یہ سوال اٹھایا جاسکتا تھا کہ قرآن پاک 'خلق' ہے یا 'امر'، اور اس کا صحیح جواب یہی ہو سکتا تھا کہ یہ 'امر' ہے۔ ابو الحسن الاشرفی نے قرآن پاک کو 'امر'، قرار دیکر یقیناً صحیح موقف اختیار کیا لیکن قرآن پاک کو 'کلام اللہ'، کی حیثیت سے اللہ کی صفت کلام کے ساتھ تطبیق دیکر اسے قدیم ثابت کرنے کی اسلام میں کوئی گنجائش نہ تھی۔ یہ دراصل اللہ کی صفت کلام کی تجسیم (incarnation) کے مترادف تھا۔ اس طرح تو قرآن خدا کے ساتھ ہم ازی (co-eternal) ہو جائے گا۔ اشاعرہ نے اس مسئلہ کے حل کیلئے کلام لفظی اور کلام نفسی میں تمیز کا جو راستہ اختیار کیا وہ بھی 'کلام اللہ' کو اللہ کے مترادف ٹھہرانے ہی کی ایک صورت تھی۔ (Khalil xvi(2), 11-12) قرآن پاک اللہ کا نازل کردہ کلام ہے اور اللہ اس کلام کا نازل فرمانے والا ہے، دونوں ایک نہیں ہو سکتے۔<sup>12</sup>

2۔ اللہ کلام پر قادر ہے اور اپنے بندوں یا اپنی مخلوق میں سے جس سے جب چاہے کلام کر سکتا ہے، ان آیات قرآنی سے واضح ہے، 44-44، 7:143، 4:164، 3:77۔ سورہ الشوریٰ (42) آیت نمبر 51 میں بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے کلام کرنے کی تین صورتوں کا ذکر ہے: اللہ کے کلام کی پہلی صورت بشكُل وحی ہے۔ یہ بلا واسطہ ہوتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ سے کلام کیا۔ اللہ کے کلام کی دوسری صورت حجاب کے پیچھے سے ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا۔ اللہ کے کلام کی تیسرا صورت وحی کی وہ صورت ہے جو بذریعہ فرشتہ ہو۔ اس صورت میں مقام نزول قلب ہوتا ہے، اور کلام روح الامین کے ساتھ نازل ہوتا ہے جیسے حضور نبی کریم ﷺ پر اللہ کا کلام نازل فرمایا گیا۔ قرآن پاک اپنے کو اور اپنے سے پیش نازل شدہ کتابوں کو کلام اللہ، کہہ کر پکارتا ہے۔ (15:275، 9:06، 48:15)

کلام کرنا صفت باری ہے جیسے خلق کرنا ہے۔ جس طرح ”خلق“، اور خالق کو ایک نہیں کہا جا سکتا، اسی طرح ”کلام اللہ“، اور ”اللہ“ دونوں کو ایک نہیں قرار دیا جا سکتا، دونوں کو ”الحق“، نہیں کہا جا سکتا۔

3۔ ایسا نہیں ہے کہ اللہ یکبارگی سب کچھ تخلیق کر کے فارغ ہو گیا بلکہ وہ حال پر بھی تخلیق کرتا ہے جو چاہے۔ ”... وہ خلق میں جو چاہے اضافہ کر دیتا ہے۔“ (35:01) ... اسی طرح ایسا نہیں تھا کہ اسے جو کلام کرنا تھا یکبارگی اس سے فارغ ہو گیا اور اسے لوح محفوظ پر رکھ کر مناسب وقت پر نازل کرتا رہا، اللہ جب چاہے اپنی مخلوق سے کلام پر قادر ہے۔ ”اور اللہ نے موسیٰ (علیہ السلام) سے کلام فرمایا، کلام فرمانا۔“ (40:164)

4۔ قرآن پاک کی آیات دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ جو برادر است احکام کی شکل میں ہیں، دوسری وہ ہیں جن کے پڑھ لینے یا سن لینے سے اس بیان کے مطابق حق عائد ہو جاتا ہے۔ پہلی مکملات ہیں اور دوسری تباہات ہیں۔ امّ الکتاب کا درجہ مکملات کو حاصل ہے، کہ ہر فیصلے میں معیار یہی مکملات ہیں۔ تباہات سے جو نتیجہ بھی اخذ کیا جائے، مکملات سے اس کی تصدیق ضروری ہے ورنہ اس نتیجے کی صحت کا کوئی ثبوت نہیں ہو گا۔ جن لوگوں کے قلوب میں کبھی ہوتی ہے ان کے سامنے احکام خداوندی کو ماننے کا کوئی معیار نہیں ہوتا۔ یہ لوگ مکملات، جو امّ الکتاب ہیں، کی پرواہ نہیں کرتے۔ تباہات کیلئے معنی متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اپنے نفس کی خوشی کے مطابق۔ یہ گناہ قتل سے زیادہ اشد ہے۔ تباہات کی تاویل کا علم تو اللہ تعالیٰ کو ہے۔ علم میں جن حضرات کو راخ ہونے کا شرف ہوتا ہے، وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے، یہ سب ہمارے

رب کی طرف سے ہے، اس لئے کہ رسول امین نے یہ فرمایا ہے، اور رسول ہی صراطِ مستقیم پر ہونے کی رو سے معیارِ مطلق ہے۔ (03:07) (تفیر فاضلی منزل اول 1992:194)

5۔ اللہ کے امر کی حیثیت سے قرآن پاک 'حکم' کا درجہ رکھتا ہے اور یہ عربی زبان میں ہے۔ (13:37)  
 قرآن پاک اللہ تعالیٰ کے پاس ام الکتاب کی صورت میں لوحِ محفوظ پر موجود ہے۔ (43:3-4, 85:21)  
 (22) قرآن پاک جلوت ہے اور ام الکتاب اسکی خلوت ہے، اور یہ لازم و ملزم ہیں۔ یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ حکمات ہی ام الکتاب ہیں۔ (03:07) ان سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ حکمات (ام الکتاب) قرآن پاک کی بنیاد ہیں۔ یہی (ام الکتاب) وہ معیار ہے جس کی بنیاد پر اللہ مٹاتا ہے جسے چاہے اور ثابت رکھتا ہے جسے چاہے۔ (13:39) یہ وہ اصول ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے علمِ مطلق اور بے پایاں حکمت سے کتب مقدسہ کی تنزیل سے پیشتر بنی آدم کی ہدایت و گمراہی اور افراد و اقوام کی تقدیر کا فیصلہ کرنے کیلئے طے فرمادیئے تھے۔ تقدیر انسانی کا فیصلہ کرنے والے ان اصولوں (ام الکتاب) کا حقیقی علم اللہ ہی کے پاس ہے اور اسی کے حکم سے یہ نافذ ہیں۔ (4-43:1; 13:39) 'آیاتِ حکمات' اور 'ام الکتاب' کی تطبیق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن پاک کی 'آیاتِ حکمات' انھیں اصولوں پر مشتمل ہیں۔ اس تطبیق سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ 'حکمات'، 'ہدایت و گمراہی' کے اصولوں کی حیثیت سے ابتداء آفرینش سے یا نزول قرآن سے پیشتر ہے کہ جس کا حقیقی علم صرف ذات باری ہی کو ہو سکتا ہے موجود ہی ہیں۔ لیکن 'متباہات' کے بارے میں یہ بات بلا شرط درست نہ ہو گی۔ وہ ام الکتاب نہیں۔ فرعون، هامان، سامری، ابو لہب اور اسکی بیوی سے متعلق آیاتِ حکمات نہیں۔ بہت محظا طریقہ ہتھے ہوئے اس بحث سے یہ بات ضرور اخذ کی جاسکتی ہے کہ یہ آیات ابتداء آفرینش سے وجود نہ رکھتی تھیں۔

6۔ سورہ الواقعہ کی آیات نمبر 77, 78, 79 میں فرمایا گیا ہے کہ بے شک یہ قرآن کریم ہے کتابِ مکنوم (محفوظ نوشت) میں۔ اس کو مطہر ہی مس کرتے ہیں۔ ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ نے قرآن پاک کی حفاظت کا خاص احتیام کر رکھا ہے۔ اسی حقیقت کو اس طرح بھی فرمایا گیا ہے: ہم نے یہی یہ ذکر نازل فرمایا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت فرمانے والے ہیں۔ (15:09)<sup>13</sup>

## حاصل بحث

مسلم الہیات کی تاریخ میں خلق قرآن / عدم خلق قرآن کا مسئلہ غیر قرآنی فلسفیانہ اصطلاحات کو اختیار کرنے سے پیدا ہوا۔ یہ اصطلاحات غیر قرآنی نظریہ ہستی (ontology) پر مبنی تھیں۔ قرآنی نظریہ ہستی (ontology) کے مطابق کائنات قدیم نہیں اور ذات باری نے جسے شرف ہستی سے نوازا ہے وہ 'خلق' ہے یا 'امر'۔ جو 'خلق' کی کینٹیگری سے تعلق نہیں رکھتا وہ یقیناً 'امر' کی کینٹیگری سے تعلق رکھے گا۔ قرآن پاک کی حیثیت کے تعین میں جائز قرآنی اصطلاحات صرف 'خلق' اور 'امر' ہو سکتی تھیں۔ اس اعتبار سے مفترضہ کا موقف کہ قرآن پاک مخلوق ہے اور اشاعرہ کا موقف کہ قرآن پاک غیر مخلوق ہے دونوں غلط ہیں۔ قرآن پاک 'امر' کا درجہ رکھتا ہے اور محکمات اور مثالبہات پر مشتمل ہے۔

قرآن کے بارے میں حادث / قدیم کی بحث بھی بالکل بے جا تھی۔ اللہ جس طرح اپنی خلق میں اضافہ کرنے پر قادر ہے اسی طرح اپنا امر صادر یا نازل کرنے پر بھی قادر ہے۔

اللہ اپنی ذات و صفات میں تعین سے پاک ہے کیونکہ وہ یکتا ہے اور ہر شے کو وجود عطا کرنے والا ہے۔ جس طرح اللہ کی صفت خالقیت کے تعین سے پاک ہونے سے کائنات کا تعین سے پاک ہونا اخذ نہیں ہوتا، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفت کلام کے تعین سے پاک ہونے سے اس کے نازل کردہ کلام کا یا اسکی امر صادر کرنے کی صفت کے تعین سے پاک ہونے سے اس کے نازل کردہ امر کا تعین سے پاک ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

اللہ تعین سے پاک ہونے میں یکتا ہے۔ (—لَيْسَ كُلُّ مُغْلِظٍ شَيْئٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴿42:11﴾)

اس بحث میں 'حادث' اور 'قدیم' کی اصطلاحات بھی غور طلب ہیں۔ 'حادث' فلسفیانہ اصطلاح accident / contingent کا عربی مترادف ہے۔ ہر واقعہ یا شے جس کا باعتبار زمانہ آغاز و انجمام ہونا متصور ہو حادث ہے۔ 'قدیم' فلسفیانہ اصطلاح eternity (یعنی ازلیت) کا مترادف ہے۔ فلسفے میں یہ اصطلاح ایسی ہستی کیلئے استعمال ہوتی ہے جس کا باعتبار زمانہ آغاز و انجمام نہ ہو۔ (عبد القادر 1994, 239) عیسائی الہیات میں 'قدم' کے نصویر کو دو انداز میں سمجھا گیا everlastingness یعنی زمانی تسلسل کی موثریہ ماضی لامحدودیت۔ اور timelessness یعنی زمان سے ماورائیت۔ (Pike 1970, ix-x) جو everlastingness کے مماثل ہی ہو سکتا ہے۔ ماورائیت زمانی کے اپنے مضمرات ہیں۔ جو وہ زمانی اعتبار سے شے کے مماثل ہی ہو سکتا ہے۔ ماورائیت زمانی کے اپنے مضمرات ہیں۔ جو timelessness کے مفہوم میں ماوراء ہوا اس کا واقعات زمانی سے تعلق ہی کیا ہو گا۔ 'eternity' فلسفیانہ

اصطلاح ہے جسے عیسائیت نے یونانیوں سے اخذ کر کے صفات باری میں شامل کر دی (Swinburne 1977, 217) اور وہاں سے یہ تصور مسلم فکر میں ڈ آیا۔ معزز لہ اور اشاعتہ نے دیگر اصطلاحات کی طرح یہ اصطلاح بھی بلا ادنیٰ تاصل عیسائیوں سے قبول کر لی اور مسلم فلسفے میں 'قدیم'، کالفاظ اللہ کی صفت کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ 'قدیم'، ق۔ د۔ م کے مادہ سے عربی زبان کا لفظ ہے اور قرآن پاک میں یہ لفظ تین مرتبہ استعمال بھی ہوا ہے لیکن کہیں بھی یہ اللہ تعالیٰ کی صفت کو بیان کرنے کیلئے استعمال نہیں ہوا، اور نہیں اللہ تعالیٰ کے صفاتی اسم کے طور پر آیا ہے۔ مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام کے قمیص کو ان کے حکم کے مطابق ان کے بھائی مصر سے لیکر روانہ ہوئے تو یعقوب علیہ السلام نے اپنے پاس والوں سے فرمایا: مجھے یوسف علیہ السلام کی خوشبو آرہی ہے اگر یہ نہ کہو کہ ستمھیا گیا ہوں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی ذریت سے جو لوگ آپ کے پاس تھے جنہوں نے یہ بات سنی: "کہنے لگے، خدا کی قسم، آپ اس پر اనے خط [صلی اللہ علیہ وسلم] میں پڑے ہوئے ہیں۔" (12:95) کافر جب ایمان نہیں لاتے تو قرآن پاک کے بارے میں کہتے ہیں: "۔۔۔ یہ تو قدیم جھوٹ [افک قدیم] ہے۔"

(46:11) اللہ نے چاند کیلئے منزلیں ٹھہرائیں ہیں، چاند گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ فرمایا: "اور قمر کے لئے منازل ٹھہرائیں حتیٰ کہ قدیم شاخ کی طرح ہو گیا۔" (36:39) جہاں یہ استعمال بھی ہوا ہے قطعاً ازیست (eternity) کے کسی بھی مفہوم میں استعمال نہیں ہوا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے ذات و صفات پر ایسی اصطلاحات کے اطلاق کا کیا جواز ہے! اس سے کتفیوزن اور اختلاف کے سوا کیا حاصل ہو سکتا تھا! قرآن پاک میں ارشاد ہے: "اور کوئی آدمی اللہ کے بارے میں ایسے ہی جھگڑتا ہے، بغیر علم کے، ہدایت کے، اور کتاب منیر کے۔" (22:8) اللہ تعالیٰ کے بارے میں بات کرتے وقت دیکھنا چاہئے کہ ہماری صداقت کا ثبوت موجود ہے! اسی طرح قرآن پاک میں ارشاد ہے: "۔۔۔ اللہ کو اسکے اسماء الحسنی ہی سے پکارو اور انہیں چھوڑ دو جو اسکے اسماء میں الحاد کرتے ہیں۔ وہ جلد ہی اپنے کئے کی جزا پائیں گے۔" (7:180)

## مسئلہ تقدیر

**خلاصہ:** مختصر الفاظ میں مسئلہ تقدیر کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

”آدم علیہ السلام کی تخلیق ہی سے ہر انسان کی تقدیر لوح محفوظ پر لکھ دی گئی ہے۔ کسی کے سعید یا شقی ہونے کا فیصلہ لوح محفوظ پر لوح محفوظ کی تخلیق کے وقت سے ہی تحریر کیا جا چکا ہے۔ ہمارے ارادے سے متعلق تمام افعال اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے ہاں اzel سے معلوم اور مقدر ہیں اور لوح محفوظ پر درج ہیں۔ بنده جو عمل بھی کرے تقدیر اس کے حق میں یا اس کے خلاف پہلے ہی سبقت لے گئی ہوتی ہے لیکن واجب ہے کہ تقدیر کے سبقت لے جانے کا مفہوم اکراہ یا خارجی جرمنہ سمجھا جائے۔“ یا

”کسی بھی فرد کے لئے اzel ہی سے شقی ہونا قطعاً مقدر نہیں کر دیا گیا۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے بندے کی تقدیر اور جو اعمال وہ کرے گا پہلے ہی سے کسی کتاب میں لکھ نہیں رکھے۔ فرد جب کوئی عمل کرتا ہے تو لکھا جاتا ہے۔ انسان نیت کرنے میں آزاد ہے، عطا کی گئی توفیق کے استعمال کا ذرخ اختیار کرنے میں آزاد ہے۔ توفیق کے استعمال سے ہی رزخ کا تعین ہوتا ہے۔ رزخ وہی ہیں۔ توفیق، انعام یافتہ کے اتباع میں استعمال ہو گئی تو رزخ ظلمات سے نور کی طرف ہو گا۔ توفیق خواہش کی پیروی میں استعمال ہو گئی تو رزخ خور سے ظلمات کی طرف ہو گا۔ توفیق کی حد تک ہی بندہ جو ابد ہے۔ نتائج اللہ کی قدرت کے تابع ہوتے ہیں۔ نتائج کو باذن اللہ ماننا ایمان کا جز ہے۔ شرع شعور پر ہی عائد ہوتی ہے۔ لا علی اللہ کے نزدیک قبلی معافی ہے۔“

پہلا نظریہ ترکی کے ایک ہم عصر مذہبی دانشور محمد فیض اللہ گلکان کا جو شی کردا ہے۔ اکثر و پیش روانی علماء اسی طرح کی بات کرتے ہیں۔ تبادل نظریہ ہم قرآن پاک سے اخذ کر کے پیش کر رہے ہیں۔ نیت کا حال صرف اللہ ہی جانتا ہے، اور حسن نیت، اللہ کی باد میں بہت قابل قدر ہے۔ کام اگر عالم اور ستہ ہو تو موقع نتائج کا برا آمد ہونا ممکن نہیں رہتا۔ نظریہ تقدیر پر لکھی گئی اکثر تحریروں میں اللہ کے علم مطلق، اللہ کی رضا، اللہ کی مشیت، انسان کی آزادی ارادہ، تصور زمان، لوح محفوظ کا تصور، معیار حق ہونے کے حوالے سے قرآن پاک کی حیثیت اور روایات پر مشتمل کتب کی حیثیت میں ابہام محسوس کیا گیا ہے۔ اس مضمون کا منشاء قرآن پاک کی روشنی میں مسئلہ تقدیر سے متعلق درج بالا تصورات کو قرآن پاک کی سند کے ساتھ بیان کر کے حق کو سند کے ساتھ روشن کرنے کے سوا کچھ اور نہیں۔ اگر کسی بات کو درست نہیں سمجھا گیا تو قرآن پاک کی سند سے واضح کیا گیا ہے کہ درست کیا ہے کیونکہ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ حِدْيَةً طَالِلَهُ سَاصْدِقُ حَدِيثَ كَسْ كَي۔ (القرآن: 48:7)

اہم الفاظ: تقدیر، اللہ کا علم مطلق، قدرت مطلق، نصیب، انسانی آزادی، مشیت، رضا، اzel، ابد فرمان الہی کے مطابق قرآن پاک قول ہے اور ”حق“ ہے۔ قرآن پاک کے حوالے سے بات کرنا سند (authority) کے ساتھ بات کرنا ہے۔ سند کے بغیر بات کرنا دراصل قیاس آرائی ہے، تجھیں و نظر ہے۔

تحقیق و نظر (conjecture) سے علم میں کچھ اضافہ نہیں ہوتا۔ 'الحق'، کے معنی ہیں 'معیارِ حق'، 'الحق' ہونے کا درجہ اللہ کے نازل کردہ فرمان کا ہے۔ مثلاً، **الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تُكُنْ كَمِنَ الظَّاهِرِيْنَ**۔ "حق تھارے رب کی طرف سے ہے۔ تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہونا۔" (القرآن، 3:60) **أَلْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تُكُنْ كَمِنَ الْمُمْتَرِيْنَ**۔ "حق تھارے رب ہی کی طرف سے ہے۔ تو شک لانے والوں میں سے نہ ہو۔" (القرآن، 2:147) **وَالَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الْحُقْقُ**۔ "اور جو کچھ آپ کی طرف آپ کے رب سے نازل ہوا، وہ حق ہے۔" (القرآن، 13:1) اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ 'الحق' کا نازل فرمانے والا ہے۔ ماضی میں اللہ کا نازل کردہ کلام بھی الحق تھا لیکن قرآن پاک شہادت دیتا ہے کہ ان میں تحریف کی جا چکی ہے۔ (القرآن، 13:5) اسلئے اسے سند کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا۔ فرمانِ الٰہی کے مطابق اہل کتاب کے کسی نظریے کی تردید یا تصدیق نہیں کرنی چاہئے، صرف یہ کہنا چاہئے کہ جو اللہ نے نازل فرمایا ہے وہ حق ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے: "اور اہل کتاب سے مجادلہ نہ کرو مگر بطریقِ احسن۔۔۔ اور کہو کہ ہم اس پر ایمان لائے جو ہماری طرف نازل ہوا اور جو تمہاری طرف نازل ہوا۔۔۔" (القرآن، 29:46)

حال پر صرف قرآن پاک ہی سند کا درجہ رکھتا ہے۔ کسی بھی نظریہ، اصول، عقیدہ، روایت، ارشاد، قول، گمان، خیال، احساس، وہم، قیاس، تصور، تجھیل، تاثیر، وجدان، واردات، حال، کشف، شہود، تشریح، تعبیر کی صداقت کا حقیقی معیار قرآن پاک ہی ہے۔ قرآن پاک جس کی تصدیق کرتا ہے وہ حق ہے، جس کو رد کرتا ہے وہ بغیر الحق ہے۔ (القرآن 154:21، 3:21، 2:61) قرآن پاک کے حوالے کے بغیر کی کوئی بات مغض رائے، قیاس، گمان یا ظن کا درجہ رکھتی ہے، اللہ کا فرمان ہے: "اور ظن کسی کو حق سے مستغنى نہیں کر سکتا۔" (القرآن، 10:36) فرمانِ الٰہی سے اخراجِ الضلال (گمراہی) ہے۔ فرمایا گیا ہے: "الحق کے بعد ہے ہی کیا مگر گمراہی۔" (القرآن، 10:32) قرآن پاک کے مقابل نظریات باطل ہیں۔ (القرآن، 21:18، 17:81) فرمانِ الٰہی ہے: "اور فرمادیجئے، کہ حق آیا اور باطل مٹ گیا، بے شک باطل کو مٹاہی تھا۔" (القرآن، 17:81) اللہ کے بارے میں بے سند بات کرنا اللہ پر افتخاری باندھنا (concoction) ہے، اور اس سے منع فرمایا گیا ہے۔ (القرآن، 17:4) فرمانِ الٰہی ہے: اور اس سے بڑھ کر ظالم کوں جو اللہ پر جھوٹ باندھے۔ وہ لوگ اپنے رب کے حضور پیش ہونگے، اور گواہی دینے والے کہیں گے، یہی ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ باندھا تھا۔ سن لو! ظالمین پر اللہ کی لعنت ہے۔ (القرآن، 18:11) حکمِ الٰہی ہے: "... اور اللہ

پر نہ کہو مگر حق...” (۱۷:۲) فرمانِ الٰہی کو اپنی خواہش کے مطابق بنانا فتنت ہے، اور اللہ فاسق ہی کو گمراہ کرتا ہے۔ (القرآن، 26:2) ارشاد ہے:

”اوْرَجَوَ اللَّهُ كَنَازِلَ فَرْمَائَهُ بَوْيَهُ كَمَطَابِقِ حَكْمِهِ كَرَهَ، تَوْهِي كَافِرِهِيں۔“ (القرآن، ۵:۴۴)

”...اوْرَجَوَ اللَّهُ كَنَازِلَ فَرْمَائَهُ بَوْيَهُ كَمَطَابِقِ حَكْمِهِ كَرَهَ، تَوْهِي ظَالِمِهِيں۔“ (القرآن، ۵:۴۵)

”...اوْرَجَوَ اللَّهُ كَنَازِلَ فَرْمَائَهُ بَوْيَهُ كَمَطَابِقِ حَكْمِهِ كَرَهَ، تَوْهِي فَاسِقِهِيں۔“ (القرآن، ۵:۴۷)

”...اوْرَبَ شَكَ لُوْگُوں میں سے كَثِيرَ فَاسِقِهِيں۔“ (القرآن، ۵:۴۹)

قرآن پاک اللہ کا نازل کردہ کلام ہے اور کتاب ہے۔ (ذکرِ الکتاب لَا هُدَى بِفِيهِ، ۲:۲) اللہ نے اس کی حفاظت کا ذمہ خود لیا ہے۔ (القرآن، ۹:۱۵) یہ آیات کی اس ترتیب اور سورتوں کے اس مجموعے کا نام ہے جس کی تصدیق حضور نبی پاک ﷺ نے فرمائی اور شاہدین جس کی تصدیق کرتے آئے ہیں۔ قرآن پاک ہی صداقت کا حتمی معیار ہے۔ (Is 'al-Haqq' one of al-Asma' al-Husna!, 2016) قرآن پاک احسن الحدیث کتاب ہے اور حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ حدیث مبارکہ، احکام قرآن کی تنفیذ اور عقائد کی تاویل (elaboration) ہیں۔ تنفیذ وقت، مقام، اور مقدار کے مطابق ہوتی ہے اور تاویل کا محکمات سے ہم آہنگ ہونا لازم ہے۔

## محمد فتح اللہ گلن

محمد فتح اللہ گلن جدید ترکی کے ایک مشہور سکالر ہیں۔ مسئلہ تقدیر پر محمد فتح اللہ گلن کے نظریات کی بنیاد چند روایات پر ہے۔ وہ قرآن پاک کی آیات کی تفسیر اس طرح کرتے ہیں کہ وہ ان روایات کے مطابق ہو جائیں۔ تقدیر پر اکے نظریات کیلئے محمد فتح اللہ گلن کی کتاب ”تقدیر۔ قرآن و سنت کی روشنی میں“ کو بنیاد بنا یا گیا ہے۔ (فتح اللہ گلن 2009) اپنی کتاب کے صفحہ 43 پر گلن صاحب لکھتے ہیں:

”منہد تقدیر وہ مسئلہ ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے اپنی توجہ کا زیادہ مرکز ٹھہرایا ہے۔ کتب ستہ اس طرح کی احادیث سے بھری ہوئی ہیں۔ لہذا ان احادیث کی روشنی میں تقدیر کے موضوع پر بحث کرنی چاہئے کیونکہ یہ موضوع اس بات کا مستحق ہے کہ اس بارے میں تفصیل سے بحث کی جائے، بلکہ یہ لازم ہے۔“

محمد فتح اللہ گلن کی کتاب ”مسئلہ تقدیر“ کے صفحہ 49 پر رقم ایک روایت

”عبداللہ بن عمر و بن عاصم روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور آپ کے ہاتھ میں دو کتابیں تھیں۔ آپ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو یہ دو کتابیں کیا ہیں؟ ہم نے عرض کیا، نہیں یا رسول اللہ ﷺ! ہم نہیں جانتے الایہ کہ آپ ہمیں ان کے بارے میں خبر دے دیں۔ آپ نے اس کتاب کے بارے میں فرمایا جو آپ کے دائیں ہاتھ میں تھی، کہ یہ رب العالمین کی طرف سے ایک کتاب ہے اور اس میں اہل جنت کے نام اور ان کے آباء اور قبیلوں کے نام ہیں اور پھر ان کے آخر میں مہر لگادی گئی ہے کہ اب ان میں کبھی کوئی اضافہ ہو گا اور نہ ان میں کوئی کمی کی جائے گی۔ پھر آپ نے اس کتاب کے بارے میں فرمایا جو آپ کے بائیں ہاتھ میں تھی کہ یہ کبھی رب العالمین کی طرف سے ایک کتاب ہے اور اس میں اہل دوزخ کے نام اور ان کے باپوں اور قبیلوں کے نام ہیں اور پھر ان کے آخر میں مہر لگادی گئی ہے کہ اب ان میں کبھی کوئی اضافہ ہو گا اور نہ ان میں کوئی کمی کی جائے گی۔ آپ ﷺ کے صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! اگر یہ ایسا معاملہ ہے جو لکھا جا چکا ہے تو پھر عمل کیوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: درست ہو جاؤ اور قریب ہو جاؤ کہ جنت والے کیلئے اہل جنت کے عمل کے مطابق مہر لگادی جائے گی خواہ اس نے کوئی بھی عمل کیا ہو اور اہل دوزخ کیلئے اہل دوزخ کے عمل کے مطابق مہر لگادی جائے گی خواہ اس نے کوئی بھی عمل کیا ہو۔ پھر رسول اللہ نے اپنے ہاتھوں میں پھونک ماری اور انھیں جھاڑ دیا اور پھر فرمایا کہ تم تھار ارب اپنے بندوں سے فارغ ہو گیا ہے۔ ایک گروہ جنت میں جائے گا اور ایک گروہ جہنم رسید ہو گا۔“ (الترمذی، القدر 8، المسند الاحم حنبل 2/127)

اس روایت کی تشریح کے ضمن میں محمد فتح اللہ گلن صاحب صفحہ 51 پر مقتراز ہیں:

”تفہیر اللہ تعالیٰ کا عالم بالا سے تمام امور کی طرف دیکھنا ہے جن کے ضمن میں ہمارا رادہ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ابتداء و انتہاء کی طرف دیکھنا حال کے دیکھنے ہی کی طرح ہے۔۔۔ ہمارے ارادے سے متعلق تمام افعال اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے ہاں معلوم اور مقدور ہیں۔“

اس تشریح میں گلن صاحب نے جو تصور زمان پیش کیا ہے، جیسے کہ ہم دیکھیں گے وہ قرآنی تصور خدا کے ساتھ بالکل مطابقت نہیں رکھتا۔ (عیسائیت میں ماورائیت زمان timelessness کا جو تصور ہے یہ اسی کی بازو گشت ہے۔) اس سلسلہ کی ایک اور روایت، آیت کریمہ الکشٹ بِرَبِّكُمْ کی وضاحت کے ضمن میں کتاب کے صفحہ 57 پر اس طرح مذکور ہے:

”حضرت عمرؓ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ: اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو پیدا فرمایا، پھر انکی پشت کو اپنے دائیں دست مبارک سے چھو اور اس سے ان کی اولاد کو نکالا اور فرمایا: کہ ان لوگوں کو میں نے جنت کیلئے پیدا کیا ہے۔ یہ اہل جنت جیسے عمل کریں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انکی پشت کو چھو اور اس سے ان کی اولاد کو نکالا اور فرمایا: کہ ان لوگوں کو میں نے جہنم کیلئے پیدا کیا ہے۔ یہ اہل دوزخ جیسے عمل کریں گے۔ ایک شخص نے

عرض کیا یا رسول اللہ پھر عمل کیوں! رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جب اپنے کسی بندے کو جنت کیلئے پیدا فرماتے ہیں تو اسے اہل جنت کے اعمال کی توفیق بھی فرمادیتے ہیں، حتیٰ کہ وہ جنتیوں کے اعمال میں سے کسی عمل پر فوت ہوتا ہے اور اسکی وجہ سے اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمادیتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو دوزخ کیلئے پیدا فرماتے ہیں تو اسے اہل دوزخ کے اعمال میں سے کسی عمل پر لاگادیتے ہیں، حتیٰ کہ وہ اہل دوزخ کے عمل کرنے کی وجہ سے جہنم رسید ہو جاتا ہے۔ (مند احمد بن حنبل، 1/ 272، تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر 2/ 503۔)

صفحہ 58 پر حضرت عبد اللہ بن مسعود اور حضرت ابو ہریرہؓ کے حوالے سے ایک اور روایت اس طرح بیان کی گئی ہے:

”بد بخت وہ ہے جو اپنی ماں کے پیٹ میں بد بخت ہے اور خوش بخت وہ ہے جو اپنی ماں کے پیٹ میں خوش بخت ہے۔ (مجموع الزوابد، بیشی، 7/ 193، المجمع الکبیر طبرانی، 3/ 176۔)“

گلن صاحب اس کی وضاحت میں فرماتے ہیں:

”بے شک سعید اور شقی وہی ہے جو اپنی ماں کے پیٹ میں سعید یا شقی تھا۔ لیکن کتاب میں لکھی ہوئی یہ تحریر انسان کے ارادے کے سوا اور کسی چیز سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ شقاوتو یا سعادت کی ہر بھت انسان کے ارادے ہی کی طرف لوٹتی ہے۔“

گلن صاحب صفحہ 79 پر نقطہ از ہیں:

”بات یہ ہو رہی تھی کہ کتابیں دو ہیں، ایک وہ جلوح محفوظ کی صورت میں لکھی ہوئی ہے، اور ہر چیز اپنے علمی وجود کے ساتھ لوح محفوظ میں موجود ہے، اور دوسرا کتاب وہ ہے جس میں خارجی وجود کی صورت میں پیش آنے والے مسلسل و متواتر واقعات کو درج کیا جاتا ہے اور ان میں سے جوارادی اعمال ہیں ان پر محاسبہ ہو گا۔ درج ذیل آیت کریمہ میں ان دونوں کتابوں کا ذکر ہے: ”إِنَّا نَحْنُ نُخْسِنُ الْكَوْنَى وَنَحْكِي مَا قَالَ مُؤْمِنٌ وَالْأَنَارُ هُمْ طَوْلَ شَيْءٍ أَخْحِذُنَاهُنَّ فِي إِيمَانٍ مُّبِينٍ۔“ بے شک ہم مردوں کو زندہ کریں گے اور جو کچھ وہ آگے بیجھ چکے اور (جو) ان کے نشان پیچھے رہ گئے، ہم ان کو قلمبند کر لیتے ہیں۔ اور ہر چیز کو ہم نے کتاب روشن (یعنی لوح محفوظ) میں لکھ دیا ہے۔“ (سورہ یسین آیت نمبر 12)

اس آیت میں إِيمَانٍ مُّبِينٍ سے لوح محفوظ لئے جانے کا کوئی قرینہ نہیں۔ چونکہ گلن صاحب نے مذکورہ بالاروایات کی بناء پر پہلے سے طے کر لیا ہوا ہے اس لئے وہ اس طرح تشریح کر رہے ہیں۔ اپنی کتاب کے صفحہ 80 پر گلن صاحب اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”ارادی افعال کی دوسری کتابت کے بارے میں حدیث شریف میں وارد ہے اور یہ کہ یہ پہلی تحریر کے بعد ہوتی ہے۔ حدیث شریف یہ ہے: اللہ تعالیٰ کی ذات پاک تھی اور اس کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی، اللہ کا عرش اس وقت پانی پر تھا اور اللہ نے کتابِ نصیحت میں سب کچھ لکھ دیا۔“ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”پس اب ہر چیز کو اس کے رونما ہونے کی ترتیب کے ساتھ لکھ دیا جاتا ہے، یہ تحریر تقدیر کا گویا دوسرا پرتو ہے۔“ غور طلب بات ہے، کتابِ نصیحت میں تو نصیحت لکھی ہوئی چاہئے نہ کہ انسانوں کے اعمال اور چیزوں کے رونما ہونے کی ترتیب! صفحہ 75-76 پر سورہ الانفطار آیت 11-12 ”کراما کا تین۔ جو تم کرتے ہو وہ اسے جانتے ہیں۔“ اور سورہ الاسراء آیت 13 ”اور ہم نے ہر انسان کے اعمال کو (بصورتِ کتاب) اس کے لگلے میں لیکا دیا ہے اور قیامت کے روز (وہ) کتاب اسے نکال (دکھائیں گے) جسے وہ کھلا دیکھے گا۔“ کا حوالہ دینے کے بعد لکھتے ہیں: ”یعنی ایک علمی تحریر بھی ہے جس کا کوئی خارجی وجود نہیں ہے اور جس پر ”لوحِ محفوظ“ کے نام کا اطلاق ہوتا ہے، اور ایک دوسری تحریر ہے جسے عالی مرتبت فرشتے لکھتے ہیں، اس کا خارجی وجود ہے۔ اس میں انسان کا ہر عمل درج کر لیا جاتا ہے اور حقیقت میں یہ دونوں تحریریں حرفاً مکمل طور پر ایک دوسرے کے مطابق ہوتی ہیں اور ان میں سر موافق نہیں ہوتا۔ یعنی ہر انسان صرف وہی عمل کرتا ہے جو پہلے سے اس کی تقدیر میں لکھا گیا ہوتا ہے، البتہ ہمارا رادہ اس کتاب کو جس کا علمی وجود ہوتا ہے، خارجی وجود بھی عطا کر دیتا ہے۔۔۔ [قیامت کو] عالی مرتبت فرشتے کے گا کہ اے میرے رب میں نے یہ لکھا ہے۔ رب جلیل دوسری کتاب کو ظاہر کر کے فرمائیں گے کہ میں نے بھی یہی لکھا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ انسان یہ کرے گا۔ ان میں سے ایک کتاب فرشتے کے ہاتھ میں ہو گی اور دوسری اللہ جل و شانہ کے دستِ مبارک میں۔۔۔“

یہ گلن صاحب کی اپنی گھٹری ہوئی بات ہے اور صریحاً قرآن پاک کے خلاف ہے۔ قرآن پاک اس کی قطعاً قدر ایق نہیں کرتا۔ مثلاً فرمایا گیا ہے:

”اور تم ہر امت کو دوز انو بیٹھے ہوئے دیکھو گے۔ ہر امت اپنی کتاب کی طرف بلائی جائے گی۔ آج تمھیں جزا دی جائے گی جو عمل تم کرتے تھے۔ ہماری یہ کتاب تم پر حق بولتی ہے، ہم لکھتے جاتے تھے جو عمل تم کرتے تھے۔“ (اقرآن، 29:45)

اسی طرح سورہ الاسراء (اس کا دوسرا نام سورہ بنی اسرائیل بھی ہے) میں فرمایا گیا ہے:

”اور ہر انسان کا نصیب ہم نے اس کے لگلے میں لگادیا۔ اور اس کیلئے قیامت کے دن ایک کتاب نکالیں گے، جسے کھلا ہو اپائے گا۔ پڑھ لے اپنی کتاب۔ آج تو خود ہی اپنا حساب کرنے کیلئے کافی ہے۔“ (اقرآن، 14:13-17)

## محمد فتح اللہ گلن کے نظریات کا خلاصہ

- تخلیق کائنات سے پہلے ہر انسان کی تقدیر لوح محفوظ پر لکھ دی گئی ہے۔
- کسی کے سعید یا شقی، ہونے کا فیصلہ لوح محفوظ پر تخلیق کائنات سے بھی پہلے تحریر کیا جا چکا ہے۔ اس حیثیت کے ساتھ تحریر کیا جا چکا ہے کہ جنتیوں کی کتاب میں ان کے نام، اور دوزخیوں کی کتاب میں ان کے نام، پوری تفصیل کے ساتھ درج کر دئے گئے ہیں اور آخر میں مہر لگادی گئی ہے۔ قیامت تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو گی۔
- بچہ اپنی ماں کے پیٹ، ہی میں شقی یا سعید ہوتا ہے۔
- ہمارے ارادے سے متعلق تمام افعال اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے ہاں ازل سے معلوم اور مقدر ہیں۔
- انسان صرف وہی عمل کرتا ہے جو پہلے سے اس کی تقدیر میں لکھ دیا گیا ہوتا ہے۔
- لوح محفوظ پر موجود تحریر علمی حیثیت رکھتی ہے، [یعنی سکرپٹ ہے۔] کراما کا تینیں کی لکھی ہوئی تحریر خارجی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اسوقت لکھی جاتی ہے جب انسان سکرپٹ کی مطابقت میں اعمال سرانجام دیتا ہے۔ ہمارا رادہ اس کتاب کو جس کا علمی وجود ہوتا ہے، خارجی وجود عطا کر دیتا ہے۔
- گلن صاحب کی سورہ الاسراء کی آیت شریفہ ”اور ہم نے ہر انسان کے اعمال کو (تصورت کتاب) اس کے گلے میں لٹکا دیا ہے اور قیامت کے روز (وہ) کتاب اسے نکال (دکھائیں گے) جسے وہ کھلا دیکھے گا۔“ کی تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ کائنات کی تخلیق سے بھی پچاس ہزار سال پہلے بنی آدم کی غیر جسمانی تخلیق ہوئی۔ تخلیق کے ساتھ ہی علم الہی میں یہ جان لیا گیا کہ دنیا میں پیدائش کے بعد کوئی شخص کیا کیا اعمال سرانجام دے گا اور کس حیثیت (مسلم یا مجرم) سے دنیا سے رخصت ہو گا۔ یہ تمام معلومات تجھی سے لوح محفوظ پر تحریر ہیں۔ بالفاظ دیگر ہر ایک کاروں علم الہی میں ازل سے معلوم ہو چکا ہے۔ اللہ کا علم ناقابل خطاط ہے، اسلئے یہ روں مقدر ہو چکا ہے۔ دنیا میں آتے وقت یہ روں لوح محفوظ سے لے کر فرد کے گلے میں لٹکا دیا جاتا ہے۔ روزِ جزا کراما کا تینیں کی تیار کی گئی تحریر کا گلے میں لٹکائی گئی تحریر سے تقابل کر کے دکھادیا جائے گا کہ تم نے اپنے آزاد ارادے سے بالکل وہی کیا جو پہلے سے ازی علم الہی کی بنیاد پر لوح محفوظ پر لکھ دیا گیا تھا۔

8۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ماضی، حال اور مستقبل کی کوئی تقسیم نہیں۔ وہ مستقبل کو بھی اسی طرح دیکھتا ہے جیسے ماضی اور حال کو۔ یعنی ازل سے ہی اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ قیامت تک پیدا ہونے کے بعد کوئی فرد بظاہر آزادی ارادہ کے ساتھ کیا اخلاقی افعال سرانجام دے گا اور کس حال میں دنیا سے رخصت ہو گا۔

9۔ درج بالا نکات کے ساتھ یہ بات بھی شامل کر لی جائے کہ اللہ کا علم مطلق، ناقابل خطا (infallible) ہے۔ اس میں کسی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں۔ دعا، ارجاع، مجذہ کے حوالے سے بھی وہی واقع ہوتا ہے جو پہلے سے علم الہی میں معلوم اور مقدر ہوتا ہے۔

## اللہ کے علم مطلق اور انسانی آزادی کا قرآنی تصور

محمد فتح اللہ گلن کے نظریہ تقدیر کے درج بالا نکات سے انسانی آزادی کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کے علم مطلق (Omniscience) کا جو تصور اخذ ہوتا ہے اسے یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

”اللہ تعالیٰ کو ازل ہی سے ہر ہرشے کا علم ہے۔ قیامت تک پیدا ہونے والے افراد کے آزاد اخلاقی اعمال کا ازلي علم (eternal knowledge) بھی اس میں شامل ہے۔ ہر ہرشے کے علم میں اس بات کا ازلي علم بھی شامل ہے کہ بندہ دنیا سے شقی کی حیثیت سے رخصت ہو گایا سعید کی حیثیت سے۔ اللہ کا علم مطلق، ناقابل خطا ہے۔“  
مسلمان روایتی طور پر علم الہی کے بارے میں یہی عقیدہ رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ عقیدہ عین قرآن پاک کے مطابق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالاعقیدہ قرآنی تعلیمات کے قطعاً بر عکس ہے۔ قارئین کو یہ جان کر حیرانی ہو گی کہ اللہ کے علم مطلق (Omniscience) کا جو نظریہ اور پیش کیا گیا ہے، اس میں اور سینٹ تھامس اکوئنس (1225-1274) کے فلسفیانہ طور پر تشكیل دئے گئے علم مطلق کے نظرے میں جو Traditional Doctrine of Omniscience کے نام سے مشہور ہے، کوئی فرق نہیں۔  
مسلمانوں میں اشاعتہ اور مترجمیہ نے بھی اپنے اپنے انداز میں علم الہی کو ازلی قرار دیا۔ الفارابی اور ابن سینا نے علم الہی کو اس طرح ازلی قرار دیا کہ اللہ تعالیٰ کیلئے حال پر علم جزئیات کی گنجائش ہی نہیں بچتی۔ (تجلیق، صدور اور ہم از لیت 1988) جیسے کہ قارئین دیکھیں گے قرآن پاک میں اللہ کے علم مطلق کے کسی ایسے عقیدے کیلئے قطعاً کوئی گنجائش موجود نہیں۔ آئیے دیکھتے ہیں کہ قرآن پاک سے اللہ تعالیٰ کے علم مطلق کا کیا تصور اخذ

ہوتا ہے۔ قرآن پاک انسانوں کو تین گروہوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک گروہ اس حال پر دنیا میں بھیجا جاتا ہے کہ علم الہی میں یہ بات طے ہوتی ہے کہ یہ لوگ پاک زندگی بسر کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوں گے۔ یہ حضراتِ گرامی بھیجے ہی نمونہ عہد ایت کی حیثیت سے جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ بات تمام انبیاء و رسول کے بارے میں درست ہے تاہم حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت مسیح علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، اور حضرت محمد ﷺ کا اس سلسلے میں خصوصی حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ (القرآن، 51:39)

ان انبیاء کرام کی پیدائش سے پہلے ان کا مقام اور شان بیان کردی گئی۔ یہ حضرات آزادی ارادہ کے حامل ہوتے ہیں، لیکن ان کے بارے میں یہ طے ہوتا ہے کہ یہ کبھی رضائے الہی کے خلاف نہیں کریں گے۔ بھول ہو سکتی ہے، لیکن ان کی بھول پھول بن جاتی ہے۔ جیسے حضرت یونس علیہ السلام کی بھول سے ان کی قوم پر آیا ہوا عذاب ٹل گیا، انھیں ایمان لانا نصیب ہوا۔ انھیں انتہائی مشکل مقامات سے گزارا جاتا ہے، جس سے ان کی فضیلتوں کا تعین ہوتا ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ انسان کو صرف نیکی اور بدی کا شعور دیکھ بھیجا گیا ہے، نیک اور بد بنا کر نہیں، (Ghamdi n.d.) ان کی بات اس حد تک ضرور غیر درست ہے کہ کچھ لوگوں کو صالحین ہی کی حیثیت سے بھیجا جاتا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا نہایت ضروری ہے کہ قرآن پاک کی تعلیمات کے مطابق ایک بھی شخص دنیا میں کبھی اس حال میں نہیں آیا اور نہ آئے گا جس کے متعلق علم الہی میں ازل سے طے ہو کہ وہ دنیا سے مجرم کی حیثیت سے رخصت ہو گا۔ یہاں تک کہ یہ بات اہمیں، فرعون اور ابوبہب کے بارے میں بھی درست ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے: وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَامٍ لِّلْعَبِيدِ۔ ”بے شک اللہ بندوں پر کبھی ظلم نہیں کرتا۔“ (القرآن، 18:3)

قرآنی تصور حیات کے مطابق، انسان کو زمین پر سزا کے طور پر نہیں بھیجا گیا۔ یہ دیکھنے کیلئے بھیجا گیا ہے کہ توفیق (ability to do) کا استعمال، اللہ کی ہدایت کے مطابق عمل میں لایا جاتا ہے یا خواہش کے تحت۔ توفیق استعمال ہوئے بغیرہ نہیں سکتی۔ توفیق کے استعمال سے رخ کا تعین ہوتا ہے۔ رخ اختیار کرنے میں بندہ آزاد ہے۔ انسان کو توفیق کے استعمال میں اختیار کئے گئے رخ (line of action) کی جزا ملتی ہے۔ فضیلت، عمل کو نہیں رخ کو ہے۔ نتیجہ تو بندے کے ہاتھ میں ہوتا ہی نہیں۔ نتیجہ وہ ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے۔ نتیجے پر اللہ کی قدرت ہی کا نام مشیت (Divine Will) ہے۔ حشر اور جزا کی طرح نتیجے کو باذن اللہ مانتا بھی ایمان کا لازمی جزو ہے۔ اسی حال کا مستقبل بننے والا ہے۔ پاک لوگوں کے اس گروہ کے علاوہ دیگر افراد اس حال پر دنیا میں آتے ہیں کہ ان کیلئے دونوں راستے کھلے

ہوتے ہیں۔ ہدایت بھینے اور حق کو روشن کرنے کی ذمہ داری خود اللہ نے لی ہے۔ کسی کو جو توفیق دی گئی ہے، اسے توفیق عطا فرمانے والے سے بہتر کوئی جانتا نہیں۔ اس سے بہتر کوئی جان نہیں سکتا کہ صداقت کا ثبوت دینے کیلئے کسی کو کس مقام سے گزارنا ہے۔ سورہ آل عمران میں ارشاد ہے: ”اور وہ جو (مصیبت) تمھیں پہنچی جس دن دونوں فوجیں ملی تھیں، تو وہ باذن اللہ تھی۔ اور اس لئے کہ مومن دیکھے جائیں، اور منافق بھی دیکھے جائیں۔۔۔“ (القرآن، 66:165) اس گروہ میں سے بعض افراد کو پاکیزگی پر استقلال کی بدولت اللہ، مخلصین کی صفائی شامل فرمایتا ہے، جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ شیطان انہیں بہکا نہیں سکتا۔ (القرآن، ۱۵:۳۰) اب علم الہی میں یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ یہ ہمیشہ صحیح رخ اختیار کریں گے۔ اسی طرح برائی اور فتن پر قائم ہو جانے کی بناء پر بعض لوگوں کو اللہ گمراہ کر دیتا ہے۔ یہ ہدایت کیلئے اپنی عدم الہیت کو ثابت کر دیتے ہیں۔ اب ان کے بارے میں علم الہی میں طے ہو جاتا ہے کہ یہ کبھی ہدایت کو اختیار نہیں کریں گے۔ (القرآن، 9:80; 2:26) لیکن ہوتا یہ سب حال پر ہے۔ ابو لهب اور اسکی بیوی کے بارے میں ازل سے یا ان کی پیدائش سے پہلے کبھی علم الہی میں متعین نہیں تھا کہ وہ مجرم کی حیثیت سے دنیا سے رخصت ہو گے۔ جب انھوں نے اللہ کے رسول کی خلافت پر قائم رہ کر اپنے لئے ہدایت کا دروازہ بند کر لیا تو انھیں مجرموں میں شامل کر دیا گیا اور ان کی مذمت پر مشتمل آیات نازل فرمائے کہ اس کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ یہ آیات بھی پہلے سے بنی بناۓ لوحِ محفوظ پر نہیں رکھی ہوئی تھیں۔ ابلیس کا بھی یہی معاملہ ہے۔ ازل سے ہی علم الہی میں ابلیس کے مردود ٹھہرائے جانے کا کوئی ثبوت قرآن پاک میں نہیں ہے۔ ارشادِ الہی ہے:۔۔۔ آبی وَسْتُكُبَدْ وَكَانَ مِنَ الْكَانِرِينَ ﴿٤﴾ ”مُنْكَرٌ ہوا، اور تکبیر کیا، اور کافرین سے ہو گیا۔“ (القرآن، 2:34) ایسا بھی نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کیلئے اس دشمن انسان کے بغیر دارالعمل وجود میں لانا ممکن ہوتا۔ یہ ضرور ہے کہ اس صورت میں دارالعمل کی شکل مختلف ہوتی۔ ارشاد باری ہے:۔۔۔ وَمَا رَبِّكَ بِظَلَامٍ لِلْعَيْنِ ﴿٥﴾ ”تیر ارب کبھی بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔“ (القرآن، 49:41)

## لوحِ محفوظ کا قرآنی تصور

علمِ مطلق کے بارے میں گمراہ کن نظریات کا ایک سبب لوحِ محفوظ کا غیر قرآنی تصور بھی ہے۔ اس غیر قرآنی تصور کے مطابق لوحِ محفوظ ایک کتاب ہے جس میں قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کے اخلاقی اعمال کا علم لوحِ محفوظ کی تخلیق کے وقت سے درج ہے۔ قرآن پاک لوحِ محفوظ کے اس تصور کی

تعدادیت نہیں کرتا۔ لوحِ محفوظ کا یہ تصور قرآن پاک میں بیان کئے گئے تصور سے متصادم ہے۔ قرآن پاک کے مطابق لوحِ محفوظ ایک کتاب ہے اللہ تعالیٰ کے پاس جو مشتمل ہے:

- 1) گزری ہوئی امتوں کے احوال پر کہ ان میں سے کون کس حال پر دنیا سے رخصت ہوا۔
- 2) زمین و آسمان اور جو کچھ اس میں ہے، کے علم پر۔ (القرآن، 22:70)
- 3) ام الکتاب یعنی ہدایت اور گمراہی کے ان اصولوں پر جن کے مطابق انسانی مقدر کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ (القرآن، 4:1-4; 43:39) (Free Will and Predestinarian Verses in the Quran 2016)

لوحِ محفوظ کا یہ تصور انسان کی آزادی ارادہ کے تصور سے تناقض ہے نہ ایمان کے کسی اور رکن کے ساتھ۔ کتاب جو گزری ہوئی امتوں کی تقدیر کے علم پر مشتمل ہو، اس پر ان امتوں، اور افراد کا علم کیوں نکر ہو سکتا ہے جن کی تقدیر (destiny)، کہ وہ شقی ہیں یا سعید، ابھی متعین ہونا باقی ہے! سورہ طلاق کی آیات 49-52 میں فرمایا گیا ہے:

”[فرعون] کہنے لگا: کون ہے تم دونوں کاربب اے موئی (علیہ السلام)۔ فرمایا: ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کی خلقت عطا کی، پھر راہ سمجھائی۔ کہنے لگا: قرون اولیٰ کا حال کیسا ہے۔ فرمایا: ان کا علم میرے رب کے پاس کتاب میں ہے۔ میرا رب نہ بہلتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔“

اس آیت کا مفہوم یہ بتتا ہے: ”فرعون کہنے لگا، قرون اولیٰ والوں نے بھی وہی کیا تھا جو ہم کر رہے ہیں یعنی وہ بھی بعثت بعد الموت اور جزا کے منکر تھے، ہم بھی اسکا انکار کر رہے ہیں۔ وہ اب کس حال میں ہیں۔“ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ”ان کا علم میرے رب کے پاس ہے، جو ان کے اعمال کی جزادی نے والا ہے۔ ان کی انفرادی زندگی کا ہر ہر عمل اس کتاب میں لکھا ہوا ہے، ان کی اجتماعی زندگی کا ہر ہر پہلو اس کتاب میں لکھا ہوا ہے۔“ گلن صاحب نے جس روایت کا ذکر کیا ہے کہ ”بچپن مال کے پیٹھی ہی میں شقی یا سعید ہوتا ہے۔“ قرآن پاک کی مطابقت میں اس روایت کا مطلب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ ہر بچہ جو دنیا میں آتا ہے، لازم ہے کہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت وہ شقی ہو گایا سعید۔ دیگر کئی روایات کی تشریح بالکل جائز طور پر اس طرح کی جا سکتی ہے جو اللہ کے علم مطلق، انسان کے آزادی ارادہ، اور دیگر ارکان ایمان سے قطعاً متصادم نہ ہو۔

سورہ البر وح (85) میں ارشاد ہے: بَلْ هُوَ فُرْزٌ آنِ مجِيدٌ ﴿فِي لَوْحٍ مَخْفُوظٍ﴾ ”بلکہ وہ قرآنِ مجید ہے، جو لوحِ محفوظ میں ہے۔“ (21-22) اس سے یہ کیسے اخذ ہوتا ہے کہ قرآنِ پاک ازل سے لوحِ محفوظ پر لکھ دیا گیا تھا جہاں سے یہ جستہ جستہ نازل فرمایا جاتا رہا۔ اگر فرعون، ہامان، نمرود، ابو لهب سے متعلق آیات ازل سے لکھ دی گئی تھیں لوحِ محفوظ پر تو پھر ہدایت اور ہادی بھیجے جانے اور بشارت و انذار کا کیا جواز رہ جاتا ہے؟ دعا کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔ روایات کو حکم مانے بغیر اور متن کے قریب رہتے ہوئے اسکی جو تشریع کی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآنِ مجید خلوت کے حوالے سے لوحِ محفوظ میں موجود ہے۔ یہ ایسی حفاظت ہے جس سے بہتر حفاظت ممکن ہی نہیں، کہ علیمِ مطلق کے علم سے یہ حفاظت ہو رہی ہے۔ (تفیر فاضلی منزل ہفتہم 307, 1998)

سورہ الحج میں ارشاد ہے: أَلَمْ تَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَإِنَّ ذَلِكَ فِي كِتَابٍ طَإِنَّ ذَلِكَ

عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ﴿کیا تم کو معلوم نہیں کہ اللہ کو علم ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے۔ یہ سب کتاب میں ہے۔ بے شک یہ اللہ پر آسان ہے۔﴾ (اقرآن، 70:22) اس آیت پاک سے بھی کہیں یہ اخذ نہیں ہوتا کہ تخلیق کائنات سے لیکر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ہر چیز جس میں انسان کے ارادی اعمال بھی شامل ہیں لوحِ محفوظ پر لکھ دی گئی ہے۔ اس سے جوبات بجا طور پر اخذ ہو سکتی ہے وہ تو یہ ہے کہ اللہ ہر شے کا خالق ہے۔ اس سے بڑھ کر ہر شے کا علم کسی کو نہیں ہو سکتا۔ اس نے ہر شے کی تخلیق میں ایک قدر رکھی ہے۔ ہر شے کا ایک مقصد تخلیق ہے۔ جن و انس کو شعور دیا گیا ہے۔ وہ اس شعور کو استعمال کرتے ہوئے حق کو مانتے ہیں یا حق کے خلاف کرتے ہیں، ہر ایک کا نامہ اعمال حال پر تیار ہو رہا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کیلئے آسان ہے۔ جو حق کو مان لے اس کا بھلا ہو جاتا ہے، جو حق کو نہ مانے وہ خلافِ حق کرنے سے فیض نہیں سکتا، یہ کتاب میں لکھا ہوا ہے (تفیر فاضلی چہارم، 258)۔

گلن صاحب نے اپنی کتاب میں ان آیات کا بھی حوالہ دیا ہے جن میں کتابِ میں، کاذکر ہے۔ آئیے دیکھتے ہیں قرآنِ پاک میں اس کا کہاں اور کس تناظر میں ذکر ہے۔

سورہ مائدہ میں ارشاد ہے:

—۔۔۔ قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَّ كِتَابٌ مُبِينٌ۔ (اقرآن، 5:15)  
اس آیت کریمہ میں کتابِ میں سے صریحاً قرآنِ پاک مراد ہے۔

سورہ الانعام میں ذکر ہے:

وَعِنْدَهُ مَقَاتِعُ الْقِيَبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْضِ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا كَبَةٌ فِي  
ظُلْمَاتِ الْأَرْضِ وَلَا رَطْبٌ وَلَا يَابِسٌ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ﴿١﴾ ”غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں، انہیں  
وہی جانتا ہے۔ اسے علم ہے جو بروجھر میں ہے۔ اور جو پتا گرتا ہے وہ اس کا علم رکھتا ہے، اور زمین کی  
اندھیریوں میں کوئی دانہ نہیں اور نہ کوئی رطب اور نہ کوئی یا مس جو کتابِ مبین میں نہ ہو۔“ (القرآن،  
6:59) اللہ تعالیٰ نے سورہ الحجر میں ارشاد فرمایا ہے: وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَرَائِثُهُ وَمَا نَنْهَاكُ إِلَّا بِقَدِيرٍ  
مَعْلُومٌ ﴿٢﴾ ”اور کوئی شے نہیں جس کے ہمارے پاس خزانے نہ ہوں اور ہم اسے ایک معلوم اندازے  
سے ہی اتارتے ہیں۔“ (القرآن، 15:21)

آسمانوں اور زمین کے خزانے سب اللہ کے ہیں۔ کس حال پر لوگوں کو معرفتِ الہی میں کیا آسانیاں  
عطا کرنی ہیں یہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اسے علم ہے جو خشکی میں ہے اور جو پانی میں ہے۔ پتا بھی اگر جھپڑتا ہے  
تو اس کا علم ہے۔ زمین کے اندر کوئی دانہ کہیں ہو اللہ کو اس کا علم ہے۔ کوئی تریاخشک ایسا نہیں جو کتابِ  
مبین میں نہ ہو۔ غیب کی کنجیاں علیم مطلق نے اپنے پاس رکھی ہی اس لئے ہیں کہ معرفتِ الہی میں لوگوں کو  
جو جو آسانیاں کسی حال پر عطا کرنا ضروری ہوں، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتی رہیں۔ اللہ کا علم ہر  
مقام پر انسان کی مدد کر سکتا ہے اور دوسرا کوئی علم ہر مقام پر کسی کا مدد گار نہیں ہو سکتا۔ (تفیر فاضلی منزل دوم  
117-118، 1996) سورہ یونس میں ارشاد ہے:

”... اور تم لوگ کوئی بھی عمل کرو ہم تم پر گواہ ہوتے ہیں، جب تم اس میں مصروف ہوتے ہو۔ اور تمہارے  
رب سے ذرہ بھی چھپا ہوانہیں، زمین میں اور آسمان میں، نہ اس سے چھوٹا اور نہ بڑا ملکر کتابِ مبین میں ہے۔“  
(القرآن، 10:61)

ہماری نیت بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے ہے، ہمارا عمل بھی اس کے سامنے ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے اور جہاں  
ہو رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے چھپا ہوانہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے زمین اور آسمان میں کوئی ذرہ بھی چھپا ہوانہیں،  
چھوٹی اور بڑی کوئی شے بھی اس سے مخفی نہیں، تو ملذیں کے احوال بھی اس کے سامنے ہیں۔ کتابِ مبین میں  
میں سب کچھ ہے۔ ماننے والوں کیلئے بشارت موجود ہے، نہ ماننے والوں کیلئے انذار موجود ہے۔ کتابِ مبین میں  
سب کچھ روشن کر دیا گیا ہے۔ کوئی فیض پاتا ہے یا نہیں پاتا، اپنے کئے کی جزا پائے گا۔ (تفیر فاضلی سوم 2010،  
32-33)

کیا ان آیات سے کتاب میں (لوح محفوظ) کا کوئی ایسا تصور اخذ ہوتا ہے جس میں تخلیق کائنات سے قیامت تک آنے والے انسانوں کا ہر ہر ارادی عمل، اور ہر ہر فرد کا انجام (destiny) ازل ہی سے اس حیثیت کے ساتھ درج ہو کہ تا قیامت کسی توبہ، انجام، کفارہ، عبادت، سخاوت یا خدمت سے اس میں تبدیلی کا مطلقاً کوئی امکان نہ ہو! آدم علیہ السلام کی لباس بشریت میں تخلیق سے پہلے ہی علم الہی نے ذریت آدم کے اس گروہ کو متعین کر لیا جسے پیدا ہی دوزخ کیلئے کیا گیا ہے! کیا ایسا کوئی تصور درج بالا آیات سے کہیں اخذ ہوتا ہے! (قطعانہیں۔) کیا یہ تصور اللہ کے اس فرمان "تیرارت اپنے بندوں پر قطعاً ظلم نہیں کرتا۔" سے صریحاً متصادم نہیں!

## رضا اور مشیت (Divine Pleasure & Divine Will)

اللہ کی رضا (Divine Pleasure) اور مشیت (Divine Will) میں فرق ہے۔ مسئلہ تقدیر اور بالخصوص اللہ کی قدرت مطلق (Omnipotence) اور انسانی آزادی (human freedom) میں توافق کے مسئلہ پر مباحثت میں بہت زیادہ ابہام اس فرق کو سمجھنے سکنے یا ملحوظ نہ رکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ وحی اہلی ہمیشہ سے رضا اہلی کو جانے کا ذریعہ اور انبیاء کرام اس کا عملی نمونہ رہے ہیں۔ چنانچہ اللہ کی رضا، ہمیشہ واضح، بیشگی طور پر معلوم اور متعین ہوتی ہے اور شاہدین کی صورت میں اسکا عملی نمونہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مقابل مشیت، نتائج پر اللہ کی مطلق قدرت کا نام ہے۔ انسان نیت کرنے میں آزاد ہوتا ہے۔ نیت، اللہ کی رضا کو پانے کی ہو سکتی ہے یا اپنی خواہش کی پیروی کی۔ توفیق (ability to do) کے استعمال سے رخ کا تعین ہوتا ہے، اور رخ اختیار کرنے کی آزادی ہونا لازم ہے۔ رخ دو ہی ہیں۔ رخ، نتائج کے بر عکس سے نور کی طرف ہوتا ہے یا سکے بر عکس۔ اگر توفیق شاہدین کے اتباع میں استعمال میں لائی جا رہی ہے تو اللہ کی رضا مقصود ہے اور رخ نتائج سے نور کی طرف ہے، اگر اپنی پسند اور ناپسند کو اہمیت دی گئی ہے تو رخ اسکے بر عکس ہے۔ زندگی، توفیق اور آزادی ارادہ حضن اللہ کی عطا (Bounty) ہیں، انسان ان میں سے کسی کا اکتساب نہیں کرتا۔ توفیق استعمال ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اللہ کی رضا کے مطابق رخ اختیار کرنا اس کا صحیح استعمال ہے اور اللہ کی رضا کا علم معلوم، معروف declared, determined, defined, and (well defined) ہوتا ہے۔ توفیق کے استعمال میں صحیح رخ اختیار کر کے انسان اپنی صداقت کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ یہی اکتساب ہے۔ نتائج باذن اللہ ہوتے ہیں۔ نتائج مطلق طور پر اللہ کی مشیت کے تابع ہوتے ہیں

اور مشیت معلوم ہوتی ہے نہ معروف اور نہ لازماً متعین۔ اللہ کی مشیت اسکا حکم نہیں ہوتی۔ اللہ کی قدرت انسانی آزادی کو محدود تو کر سکتی ہے اور معطل بھی، لیکن توفیق کی حد تک ہی حق عاید ہوتا ہے۔ سورہ الانسان (76) کی آیت نمبر 30 میں فرمایا گیا ہے **وَمَا أَشَأْنَاهُ إِلَّا أَن يَشَاءُ اللَّهُ طَإِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْهَا حَكِيمًا** "اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ بیشک اللہ علیم و حکیم ہے۔" اسی طرح سورہ التکویر (81) آیت نمبر 29 میں فرمایا گیا ہے: **وَمَا أَشَأْنَاهُ إِلَّا أَن يَشَاءُ اللَّهُ ربُّ الْعَالَمِينَ** "اور تم نہیں چاہو گے مگر وہ جو اللہ رب العالمین چاہے۔" چاہنے کا تعلق متاج سے ہوتا ہے۔ متاج وہ نہیں ہونگے جو بندہ چاہے گا، متاج وہ ہونگے جو اللہ چاہے گا۔ یہ دونوں آیات ایسے مقام پر ہیں جہاں ہدایت اور گمراہی کی بات ہو رہی ہو۔ سورہ الانسان میں محولہ بالا آیت سے پہلے فرمایا گیا ہے: "یہ قرآن پاک تو نذکر ہے تو جو چاہے اپنے رب کی طرف رہ لے۔" سورہ التکویر میں مذکورہ آیت سے پہلے فرمایا گیا ہے: "یہ قرآن پاک تو عالمین کے لیے نصیحت ہے، اس کے لئے جو صراط مستقیم کو اختیار کرنا چاہے۔" یہ آیات ہدایت کا راستہ اختیار کرنے کی نصیحت اور یاد ہانی پر مشتمل ہیں اور انسان ہدایت کا راستہ اختیار کرنے میں آزاد ہے۔ مگر یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ محض انسان کے چاہنے سے اسے ہدایت عطا نہیں ہو جاتی۔ ہدایت یافتہ ہونے کیلئے ضروری ہے کہ انسان طلب ہدایت رکھتا ہو۔ (یہ نیت ہے۔) اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع لانے والے کا اتباع کرے۔ (یہ توفیق کا استعمال ہے، اور توفیق کے استعمال سے رنج کا تعین ہوتا ہے۔ رنج کا درست ہونا نیت کی درستگی کو ثابت کرتا ہے۔) مگر وہ ہوتا ہے جو اپنی خواہش کی پیروی کرے اور فاسق ہو جائے۔ ہدایت و ضلالت متاج ہیں اور اللہ کی مشیت کے تابع ہیں، لیکن راستہ انسان اختیار کرتا ہے جو چاہے۔ اللہ تعالیٰ کا کام بڑے علم سے ہوتا ہے، بڑی حکمت سے ہوتا ہے۔

مسئلہ تقدیر پر اظہارِ خیال فرمانے والے اکثر حضرات رضاۓ الہی اور مشیتِ الہی میں فرق ملحوظ نہ رکھ سکنے کی وجہ سے سورہ الانسان اور سورہ التکویر کی درج بالا آیات کے ترجمہ اور تشریح میں درست متاج اخذ کرنے سے قاصر ہے ہیں۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ روایات کو حکم ماننے کی صورت میں مذکورہ بالا متن باہم آیات کی محکمات سے ہم آہنگ صحیح تشریح تک پہنچنا ممکن ہی نہیں۔ بعض اوقات کتابوں میں لکھا ہوتا ہے: ایک ذرہ بھی اللہ کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کرتا۔ بالعموم اسے قرآن پاک کی آیت کا ترجمہ سمجھ لیا جاتا ہے حالانکہ یہ بات درست نہیں۔ اس بات کو ماننے کی صورت میں احسن عمل اور فتح عمل میں فرق قائم رکھنا ممکن نہیں رہتا۔ قرآن پاک کی آیت کا ترجمہ اس طرح ہے: **وَعَنْدَهُ مَفَاتِحُ الْقُرْبَى لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ**

وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٌ فِي ظُلْمَاتِ الْأَرْضِ وَلَا هُطْبٌ وَلَا يَأْتِ إِلَيْهِ  
كِتَابٌ مُّدِينٌ ﴿۱﴾ ایک پتا بھی جو گرتا ہے، اللہ کو اس کا علم ہوتا ہے۔ (اقرآن، 6:59) ہر شے اللہ کے احاطہ  
علم میں بھی ہے اور احاطہ قدرت میں بھی، لیکن وہ معروف کامر کرتا ہے، اور مکر سے منع کرتا ہے۔ اللہ کی  
مشیت کا علم کسی کو اسی قدر ہو سکتا ہے جو اللہ کسی کو عطا کرنا چاہے، اللہ کی رضا کا علم عام ہے اور سب کیلئے  
ہے۔ سورہ الکھف (82:65-18) میں اللہ کے ایک بندے کا ذکر ہے جو مسلم روایت میں حضرت خضر علیہ  
السلام کے نام سے مشہور ہیں۔ فرمایا گیا ہے: ”ہمارے بندوں میں سے ایک بندے جسے ہم نے اپنی رحمت اور  
اپنے پاس سے ایک خاص علم (علوی لہٰنی) سے نوازا۔“ (18:65) حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی تھے، رضاۓ  
الہی کے علم کے حامل اور اس کا نمونہ تھے، جبکہ حضرت خضر علیہ السلام کو جس علم لہٰنی سے نوازا گیا تھا وہ مشیت  
الہی کا علم تھا۔ (Knowledge of Allah's Pleasure (Rada) and Knowledge of Allah's Will (Mashiyat))

## ازل اور ابد (Eternity and Everlastingness)

تقدیر سے متعلق مباحثت میں زمان کے تصورات بھی الجھاؤ کا باعث بنتے ہیں۔ ازليت یا قدم (eternity)  
(آنات اور لمحات میں تقسیم پذیر زمان کے اس تصور کیلئے بولا جاتا ہے جس کا کوئی مخصوص آغاز  
متصور نہ ہو۔ ابد (unending duration; everlastingness) اسی زمان کی نا اعتمتام پذیری کیلئے  
استعمال کیا جاتا ہے۔ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کیلئے ازلی / قدیم کا الفاظ استعمال کرتا ہے نہ ابدیت کا۔ ابد کا الفاظ  
بھی قرآن پاک میں انسانوں کے حوالے سے استعمال ہوا ہے۔ جب آپ اللہ تعالیٰ کیلئے ازلی یا قدیم علم کی  
غیر قرآنی اصطلاحات استعمال کریں گے تو لامال الجھاؤ میں سچن جائیں گے۔ بعض لوگ زمانِ الہی کو انسانی  
زمان سے میز کرنے کیلئے ’ابدی حال‘ (eternal now; pure duration) کے الفاظ استعمال کرتے  
ہیں جس میں لا محدود ماضی بھی موجود ہوتا ہے اور نامختتم پذیر مستقبل بھی اپنے لا محدود امکانات کی صورت  
میں موجود ہوتا ہے۔ بعض لوگ اللہ اور زمانے میں عینیت ثابت کرتے ہوئے اللہ کو زمانہ اور زمانے کو اللہ  
قرار دیتے ہیں۔ یہ تمام غیر قرآنی تصورات ہیں اور اللہ ان سے پاک اور ماوراء ہے۔ اکثر مفسرین، متكلّمین  
اور فلاسفہ کے اوپر بیان کئے گئے تصورات میں یہ الجھاؤ موجود ہے۔ محمد فتح اللہ گلن آغاز کائنات کو ماضی میں  
لا محدود نہیں سمجھتے، لیکن جب وہ خدا کیلئے ازلی یا قدیم علم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے ان کیا مراد

ہے! ایواہ ابن سینا کی طرح خدا کیلئے حال پر علمِ جزئیات سے انکار نہیں کر رہے! محمد فتح اللہ گلن کہتے ہیں خدا کیلئے ماضی، حال، مستقبل کی کوئی تقسیم نہیں۔ مستقبل بھی اسی طرح ہے جیسے ماضی۔ پیاری کی چوٹی پر بیٹھے ہوئے شخص کی مثال دی جاتی ہے کہ جو اسکے سامنے ہے اسے بھی وہ اسی طرح دیکھتا ہے جیسے جو اس کے پیچھے ہے۔ چوٹی پر بیٹھے ہوئے شخص کو نہ تو ماضی پر قدرت ہوتی ہے نہ مستقبل پر، وہ تو ایک ہمیشہ سے بنی بناۓ کائنات کو صرف دیکھتی ہے۔ اس سے بڑی جبریت اور کیا ہو سکتی ہے کہ اب اللہ بھی کچھ کر نہیں سکتا، جو کچھ اس سے ہونا تھا وہ ہمیشہ پہلے ہو چکا اور لکھا جا چکا۔ کیا یہ ہے خدا کا تصور اسلام میں! یہ تو deism ہے، اسلام کا تصورِ خدا تو یہ نہیں ہے۔ خدا کے بارے قرآن کا تصور یہ ہے کہ ”کوئی شی اسکی مثل نہیں۔“ شیئ کی حقیقت تعین ہے۔ خدا، زمان، مکان اور دیگر تمام تعینات کا خالق ہے اور خود تعینات کے ساتھ کسی بھی مماثلت سے پاک ہی ہو سکتا ہے۔ خدا کا تصور تو یہ ہے کہ یَسَأَلُهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ مُكَلِّفٌ نَّوْمٌ هُوَ فی شَأْنٍ ﴿۲۹﴾ وہ ہر روز نی شان سے جلوہ گر ہوتا ہے، ہر روز اسے نیا کام ہوتا ہے۔ (القرآن، ۵۵:۲۹)

## اللہ تعالیٰ کی صفتِ ارادہ اور صفتِ علم

صاحبِ ارادہ ہونا اللہ کی شان ہے۔ قرآن پاک سے صرف چند مقامات بطورِ حوالہ پیش ہیں۔ ارشاد ہے:

إِنَّ اللَّهَ يَعِظُ كُلَّ مَا يُرِيدُ ط (المائدہ، ۱:۵)

إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ط (الجُّنُون، ۱۴:۲۲)

إِنَّ رَبَّكَ فَعَالُ مَا يُرِيدُ ط (ھود، ۱۰۷:۱۱)

خدا کے علم کی کوئی ایسی تعریف جس کا حاصل یہ ہو کہ خدا نے ایک ہی بار ارادہ کر لیا جو بھی کرنا تھا، اور اس۔ تو یہ سیدھا سیدھا خدا کی صفتِ ارادہ سے انکار ہے۔ اسی طرح خدا کے علم کے بارے میں یہ کہنا کہ خدا نے ہمیشہ ہمیشہ سے یکبارگی جان لیا جو کچھ جانتا تھا اور اب ہمیشہ ہمیشہ اسی علم کے مطابق ہوتا رہے گا، یہ خدا کی صفتِ علم کا انکار اور اس کے تعطل کے مترادف ہے۔ ارشاد ہے: وَهُنَّ بَصِيرُوْنَ ط ”---بے شک نیت کی خبر رکھتا ہے، عمل کو دیکھتا ہے۔“ وہ یہ بھی فرماتا ہے: إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا تَعْمَلُونَ بَصِيرُوْنَ ط ”---بے شک اللہ دیکھ رہا ہے جو عمل تم کرتے ہو۔“ (ابقرہ، ۱10:2) وہ یہ بھی فرماتا ہے: ”اور تم لوگ کوئی بھی عمل کرو ہم تم پر گواہ ہوتے ہیں جب تم اس میں مصروف ہوتے ہو۔“ (سورہ یونس، 61:10) وہ یہ بھی فرماتا ہے:

”ایک پتا بھی جو گرتا ہے، اسے اس کا علم ہوتا ہے۔“ (سورہ الانعام، 6:59) وہ یہ بھی فرماتا ہے: ”اسے علم ہے جو کچھ زمین میں میں جاتا ہے اور جو کچھ اس میں سے نکلتا ہے، اور جو آسمان سے اترتا ہے اور جو اس میں چڑھتا ہے، اور وہی رحیم و غفور ہے۔۔۔ عالم الغیب جس سے ذرہ بھر بھی کچھ غائب نہیں آسمانوں میں اور نہ زمین میں، اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ اس سے بڑی جو کتابِ مبین میں نہ ہو۔“ (سورہ سا، 3:34) وہ ’عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ‘ ہے۔ (القرآن، 39:46) صرف غیب ہی کا نہیں، حاضر کا بھی علم رکھتا ہے۔ ’حاضر‘ ہی کے علم کو فلسفیانہ اصطلاح میں ’علم جزئیات‘ کہتے ہیں۔

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ خدا کے علم کو قدیم یا ازلی (eternal) کہنا بھی اس کی شان کے منافی ہے کیونکہ اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ خدا نے ہمیشہ ہمیشہ پہلے بس ایک ہی بار جان لیا جو جانا جا سکتا تھا، اور جو کچھ جان لیا وہ لوح محفوظ پر لکھ بھی دیا۔ ازل سے ابد تک اسکے جانے کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ یہی نظریہ خدا تعالیٰ کی صفتِ علم کے انکار پر مقتضی ہوتا ہے۔ خدا کے علم کا یہ نظریہ، اور خدا کے ارادے کا یہ نظریہ، دونوں قرآن پاک کی تعلیمات سے متناقض، اور خدا کی شان کے منافی ہیں۔ جناب محمد فیض اللہ گلن اور اس قبیل کے دیگر افراد مثلاً حضرت ابو الحسن الاشرفی، حضرت مولانا مودودی، ڈاکٹر اسرار احمد، علامہ جاوید احمد غامدی، ڈاکٹر ذاکر نائیک وغیرہ (عَلَيْهِ السَّلَامُ) اسی نظریہ کے حامی ہیں اور ہماری دانست میں اس تناقض کو سمجھ نہیں سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنی ذات یا صفات کیلئے کہیں قدیم کا لفظ استعمال کرنا پسند نہیں فرمایا۔ نہ ہی یہ اللہ تعالیٰ کے کسی اسم پاک کا ترجمہ ہے۔ ”قدیم“ کا لفظ قرآن پاک میں صرف تین مقالات پر آیا ہے۔ جب حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹوں سے فرماتے ہیں کہ مجھے یوسف (علیہ السلام) کی خوشبو آرہی ہے، اگر تم یہ نہ کہو کہ میں سٹھیا گیا ہوں۔ تو ان کے بیٹے کہتے ہیں۔ تَاللَّهِ إِنَّكَ لَفِي خَلْلِكَ الْقَدِيمٌ۔ خدا کی قسم! آپ اپنے اسی قدیم خط میں بتا ہیں۔ (سورہ یوسف، 12:95) دوسرا مقام وہ ہے جب چاند کی منزوں کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے: وَالْقَمَرَ قَدَّرَهُ نَكَنَّا زِلْخَنْتَى عَادَ كَالْعَرَجُونَ الْقَدِيمُ ﴿١﴾ اور قمر کیلئے منازل ٹھہرائیں، حتیٰ کہ کھجور کی قدیم شاخ کی مانند ہو گیا۔“ (سورہ لیہن، 36:39)

”قدیم“ / ”ازلی“ فلسفیانہ اصطلاح eternal کا ترجمہ ہے۔ اسکا حاصل خدا کے علم جزئیات سے انکار ہے۔ کمالِ مطلق (Absolute Perfection) بھی فلسفیانہ اصطلاح ہے جس کا حاصل خدا کی صفت ارادہ کا انکار ہے۔ قرآن پاک سے خدا تعالیٰ کیلئے ان تصورات کو اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ اشاعرہ، معزز، مسلم

فلسفی الفارابی، باخخصوص ابن سینا کے نظریات میں اللہ کے علم مطلق کے لئے ازلي / قديم علم کی اصطلاح اور کمال مطلق کی اصطلاح، اور 'ارادہ' کی تعریف ارسطو (322-384ق) سے مل گئی ہیں۔ ابن سینا (980ء-1037ء) نے تو اپنے فلسفے میں ارسطو کے نظریات کو قبول کرتے ہوئے خدا کی صفت ارادہ کو خدا کی صفت علم کے مترادف ٹھہراتے ہوئے خدا کی صفت ارادہ سے انکار کیا، جس سے اسلام کے تمام بنیادی عقائد پر زد پڑی۔ (ارسطو نے یہ کہا تھا ارادہ ہمیشہ کسی نفس کو دور کرنے کا ہوتا ہے یا کسی کمی کو پورا کرنے کا۔ کامل و اکمل ہستی کے بارے میں ایسا سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ الہ اصحاب ارادہ ہونا خدا کی شان کے منافی ہے۔) امام غزالی

صاحب نے فرمایا:

کہ دو مطلق طور پر یکساں تبادلات میں سے، بغیر کسی اصول ترجیح کے، کسی ایک تبادل کو اختیار کر لینے کی صفت کا نام ارادہ ہے۔ ذات باری کے سامنے یہ دو تبادل، کائنات کو تخلیق کیا جائے یا کائنات کو تخلیق نہ کیا جائے، مطلق یکساں طور پر موجود تھے۔ خدا کائنات کو تخلیق نہ کرتا، اس کی شان میں کوئی کمی نہ ہوتی، اس نے بنادیا، اس کی شان میں کوئی اضافہ نہیں ہو گیا۔ بغیر کسی اصول تخصیص کے اس نے چاہا اور دو تبادلات میں سے ایک کا انتخاب کر لیا۔ (نحوہ، تہذیف الفلاسفہ)

ابن سینا وغیرہ کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ اس نے تخلیق کائنات کے لئے ایک خاص لمحے کا انتخاب کس بنابر کیا۔ اس کا جواب بھی یہی ہے کہ تمام لمحے اس کی صفت ارادہ کیلئے مطلق طور پر یکساں تھے، اس نے جس لمحے کا چاہا، بغیر کسی وجہ کے انتخاب کر لیا۔ (Hourani, 184-85)

ارسطو سے تقریباً چودہ سو سال بعد امام غزالی (1111-1058ء) نے ارسطو کی ارادہ الہی کی تعریف کو مضبوط دلائل کے ساتھ رکر کے ارادہ الہی کی قرآن پاک سے مطابقت رکھتی ہوئی ایسی تعریف دی جس سے خدا کی صفت ارادہ کا انکار ممکن نہیں رہتا۔ اس طرح اس نے ابن سینا کے نظریات کا بھی استرداد کیا۔ لیکن اس بات کا کیا کیا جائے کہ تقریباً مزید نو صدیاں گذر جانے کے باوجود مسلمان علماء ابھی تک ارسطو کے اثر سے باہر نہیں آ سکے اور نادانستہ طور پر ازلى علم یا قدیم علم کی اصطلاحات استعمال کر کے، علم الہی کی وہی تعریف قبول کرنے چلے آ رہے ہیں جو اللہ کی صفت ارادہ کے عمل انکار کے مترادف ہے۔ جس سے نہ خدا آزاد رہتا ہے نا انسان۔ محمد فتح اللہ گلن (ڈاکر نائیک، جاوید احمد غامدی، ڈاکٹر اسرار احمد و دیگر بہت سے لوگ) روایات کی بنیاد پر یا انکے بغیر آج بھی انھیں نظریات کا برچار کرتے چلے آ رہے ہیں۔ روایات کی کتب

کو صحابِ شَّتَّی کا نام دیکھ بظاہر روایات کو قرآن پاک پر حکم بنادیا جاتا ہے، غور کرنا چاہئے کہ ان پر کس تدریج گھرے غیر اسلامی اثرات مرتب ہیں۔ اپنے ایک مضمون میں ہم نے صحابِ شَّتَّی میں شامل ایک روایت ”لَا تَسْبُّو الدَّهْرَ فَلَنَّ اللَّهُ هُوَ الدَّهْرُ۔ (زمانے کو برانہ کہو کہ اللہ ہی زمانہ ہے۔) کا جائزہ لیا ہے جسے حضرت علامہ اقبال جیسے جید سکالرنے اپنی کتاب ”*تشکیل جدید الہیات اسلامیہ*“ میں اپنے خودی مطلق کے تصور کی بنیاد بنا یا ہے جو ان کے فلسفیانہ فکر کی بنیادی اینٹ ہے۔ ہم نے اپنے مذکورہ مضمون میں استدلال کیا ہے کہ یہ حدیث اپنی لفظی تعبیر میں قرآن پاک میں خدا کے تصور سے صریحاً متصادم ہے۔ لازم ہے کہ اس کی ایسی تعبیر کی جائے جو ”محکمات“ سے ہم آہنگ ہو۔ (کیا اللہ الدھر ہے! 2009)

دنیٰ موضوعات پر کام کرنے والوں کو اس بات کا بہت دھیان رکھنا چاہئے کہ کوئی اصطلاح نیوٹرل نہیں ہوتی۔ جس نظام فکر سے آپ کوئی اصطلاح قبول کرتے ہیں اسکی مابعد الطبیعت اس کے ساتھ موجود ہوتی ہے۔ ہم نے اس بات کو اپنے کسی دوسرے مضمون میں اس طرح بیان کیا ہے:

“Ideas thrive upon terms and travel in history. If the selection of terms is inappropriate, these false ideas go on colouring the understanding and interpretation of other ideas. At times it takes centuries for someone to identify them and straighten them.”

H. A. Wolfson states the same thing as: “Ideas ride on the back of terms ....”  
(Fâzli, Introduction 2016)

ہمارے جدید اور قدیم علماء، نیز جدید تعلیمیافہ اور مذہبی علوم کے ماہرین دونوں میں اکثر اس شعور کا سخت فقدان دکھائی دیتا ہے۔ محمد فتح اللہ گلن کے بارے میں بھی یہ بات بالکل درست ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ ان کے ذہن میں کہیں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ خدا کو حال پر انسانی اعمال کا علم ہوتا ہے، انسان کا نصیب حال پر فرد کے عمل کے بعد اللہ کے علم میں آتا ہے، تو اس سے خدا کے علم کے انکریمنٹل (incremental) ہونے کو مانتا پڑے گا، یعنی یہ کہ خدا کے علم میں اضافہ بھی ممکن ہے، اور یہ بات انھیں خدا کے کمال مطلق اور علم الہی کی ازلیت کے تصور کے منافی نظر آتی ہے۔ حالانکہ ارسطو کا کمال مطلق، اور ‘علم الہی کی ازلیت’ کا تصور ہی درست نہیں۔ جس طرح حضرت علامہ محمد اقبال، برگسماں کے تصورِ زمانِ دوران (pure duration) سے متاثر ہوئے، اور انہیں یہ قرآنی تصور زمان کے بہت قریب

نظر آیا، قرآن پاک میں اس کا کوئی جواز نہ پاتے ہوئے حدیث کی طرف متوجہ ہوئے، خدا اور زمانے کے تعلق کے موضوع پر ایک ہی راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی پانچ متناقض روایات میں سے اس کا انتخاب کیا جو صریحًا قرآن پاک سے متصادم ہے، اسی طرح گلن صاحب نادانستہ طور عیسائی مدرسی مفکرین یا یونانی فلسفیوں کے خدا کے علم، ارادہ، زمان، ازلیت، ابدیت، کمال مطلق، عدم تغیر اور دیگر تصورات سے شدید طور پر متنازع ہیں، اور انھیں اسلام کے تصورِ حیات سے صریحًا متصادم پاتے ہوئے بھی، بالکل خلافِ عقل دیکھتے ہوئے بھی، احادیث کی بنیاد پر عین اسلام کے مطابق ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ (A. H. Fazli, Christian View of Omniscience and Human Freedom) (Swinburne 1977, 217)

اس اپروپج میں وہ اکیلے نہیں ہیں۔ ماضی میں بھی ایسے بہت تھے، حال پر بہت ہیں۔ ماضی میں گلن صاحب کے پیشروں سے ایک مثال پیش کرتا ہوں تاکہ محمد فتح اللہ گلن صاحب کی پوزیشن سمجھنے میں آسانی ہو۔

## قرآن پاک کے قدیم یا حادث ہونے کا مسئلہ

اسلام کی بالکل ابتدائی صدیوں میں عیسائیوں سے مباحثت کے دوران ارسطو کی مابعد الطیعتات پر مبنی بعض اصطلاحات غیر شعوری طور پر قبول کر لینے سے مسلم علم الکلام میں ذات و صفاتِ باری کے تعلق کا مسئلہ پیدا ہوا۔ اشاعرہ اپنے مؤقف کی بناء پر صفاتیہ، اور معتزلہ، متنکرین صفات کہلائے۔ اسی سے ضمناً قرآن پاک قدیم ہے یا حادث، غیر مخلوق ہے یا مخلوق، کامسئلہ پیدا ہوا۔ معتزلہ نے قرآن پاک کے مخلوق اور حادث ہونے، اور اشاعرہ نے غیر مخلوق اور قدیم ہونے کا مؤقف اختیار کیا۔ ہماری تحقیق کے مطابق یہ تمام بحث غیر قرآنی فلسفیانہ وجودیات (ontology) اور اسکی اصطلاحات کو قبول کرنے سے پیدا ہوئی تھی۔ اس وقت ہمیں اس کے اس حصے سے تعریض ہے جس کا تعلق مسئلہ تقدیر سے بتا ہے۔ الفاظ کی صورت میں اظہار سے پہلے ذہن میں پائے جانے والے تصورات کیلئے اشعری نے 'کلام نفسی' (latent speech) اور پیرا یہ اظہار کی صورت اختیار کرنے کے بعد 'کلام لفظی' (articulated speech) کی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے کہا کہ قرآن پاک 'کلام نفسی' کی صورت میں ہمیشہ سے اللہ کے ساتھ تھا، پھر اسے لوح محفوظ پر رکھ دیا گیا، نزول کے بعد اسے 'کلام لفظی' کی صورت اختیار کی۔ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ غیر مخلوق ہے اور اذلی ہے۔

قرآن پاک کے مطابق ہر انسان ایسی نظرت پر پیدا ہوتا ہے کہ اس کی پیدائش سے پہلے یا پیدائش کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کا قطعاً فیصلہ نہیں فرمادیا جاتا کہ موت کے وقت وہ حالت کفر میں دنیا سے رخصت ہو گا۔ ایسے افراد جن کے حالت کفر میں دنیا سے رخصت ہونے کا قرآن پاک میں ذکر ہے مثلاً فرعون، ہامان، سامری اور بالخصوص ابوالہب اور اسکی بیوی کے بارے میں بھی یہی بات درست ہے۔<sup>14</sup> کلام نفسی اور کلام لفظی کی درج بالا تفہیم کو قبول کرنے سے یہ ماننا لازم آئے گا کہ ان کی تذمیر پر مشتمل آیات پہلے کلام نفسی کی صورت میں ہمیشہ سے خدا کے ساتھ تھیں۔ (ذہن میں رہنا چاہئے کہ اللہ کی یہیشگی ہمارے تمام زمانی تصورات اور حدود سے ماوراء ہے۔) تخلیق کائنات کے بعد انہیں لوح محفوظ پر رکھ دیا گیا۔ نزول کے وقت انہیں کلام لفظی کی صورت دے دی گئی۔ یہ عقیدہ ایسی اخلاقی جبریت کو جنم دیتا ہے جو اسلامی عقائد بالخصوص اخلاقی آزادی اور اعمال کی جوابد ہی کے یکسر خلاف ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اس تمام بحث، اشاعرہ اور مغزلہ کے موقف، اور 'کلام نفسی' اور 'کلام لفظی' کی اصطلاحات کا مأخذ قرآن پاک نہیں، قرآن پاک سے منقاد فلسفیانہ نظریات ہیں۔ مغزلہ اور اشاعرہ یہ اصطلاحات قبول کرنے پر اس لئے مجبور ہوئے کیونکہ انہوں نے افلاؤن اور ارسطو کے زیر اثر اس بات کو قبول کر لیا تھا کہ وجود یا تلقی اصول صرف دو ہیں: قدیم (contingent)، اور حادث (eternal & uncreated)۔ لہذا قرآن پاک قدیم ہے یا حادث۔ اشاعرہ نے موقف اختیار کیا کہ قرآن پاک قدیم ہے، مغزلہ نے موقف اختیار کیا کہ قرآن پاک حادث ہے۔ لَهُ الْحُكْمُ وَالْأَمْرُ (القرآن، ۷:۵۴) کے ذریعے قرآن پاک تین اصولوں 'خدا، خلق اور امر' پر مشتمل وجودیات پیش کرتا ہے۔ قرآن پاک کی وجودیات کو ماننے کی صورت میں اگر مغزلہ موقف اختیار کرتے کہ قرآن پاک خلق کی کینٹگری سے تعلق رکھتا ہے تو اشاعرہ کہہ سکتے تھے کہ یہ امر کی کینٹگری سے تعلق رکھتا ہے۔ اس طرح 'کلام نفسی' اور 'کلام لفظی' کی غیر قرآنی اصطلاحات کے ذریعے قرآن پاک کی ذاتِ باری کے ساتھ عینیت ثابت کرنے کی ضرورت نہ رہتی۔ (The Qur'an: Creation or Command 2012) اسی قسم کے طرز فکر کی ایک اور مثال سورہ الصافات کی آیت نمبر ۹۶ کی تشریح ہے۔ انسانی اخلاقی آزادی ثابت کرنے کیلئے مغزلہ کو ضروری محسوس ہوا کہ اللہ کی قدرت کو محدود ثابت کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے موقف اختیار کیا کہ انسان اپنے اخلاقی افعال کا خود خالق ہے۔ یہ انسان کی اخلاقی آزادی کو ثابت کرنے کیلئے بے سند بات ہے۔ یہ اخلاقی فعل میں نتائج کو شامل سمجھتے ہیں، جو کہ اللہ کی مشیت کا انکار ہے۔ ان

کے بر عکس اشاعرہ فرقے کے بانی ابو الحسن الاشعری نے موقف اختیار کیا کہ ہر شے کی طرح انسان کے آزاد اخلاقی عمل کا بھی اللہ ہی خالق ہے۔ انسان اس کا صرف اکتساب کرتا ہے۔ اس دعوے کی دلیل کے طور پر ابو الحسن الاشعری قرآن پاک کی آیت 'وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ۔ (القرآن، 37:96) پیش کرتے ہیں۔ ابو الحسن الاشعری اس آیت کی تشریح اس طرح کرتے ہیں: اللہ نے ہی خلق کیا ہے تم کو اور جو تم بناتے ہو / جو عمل تم کرتے ہو۔ (Allah has created you and what you make/do.)۔ محمد فتح اللہ گلن بھی ابو الحسن الاشعری کے موقف کی تائید کرتے ہیں۔ (فتح اللہ گلن 2009، 106) ہمارے فہم کے مطابق اس آیت پاک کی یہ تعبیر درست نہیں اور یہ نظریہ اخلاقی آزادی کا ایک مجہول (vague) تصور پیش کرتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام مشرکین کے بتوں کو توڑ دیتے ہیں۔ جب مشرکین کو علم ہوتا ہے تو وہ گھبرائے ہوئے آپ کی طرف آتے ہیں۔ آپ انہیں فرماتے ہیں: قَالَ أَنْتَ عَبْدُنَا وَمَا تَنْهَىٰنَا كیا تم اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوؤں کی عبادت کرتے ہو۔ (37:95) وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ ﴿۹۶﴾ اور اللہ ہی نے تم کو اور جن چیزوں کو تم کام میں لاتے ہو خلق کیا ہے۔ (37:96) مذکورہ آیت کی جو تشریح ابو الحسن الاشعری نے اختیار کی، درست نہیں کہی جاسکتی۔ قرآن پاک کہیں اسے سپورٹ نہیں کرتا۔ قرآن پاک میں لفظ 'خلق'، اور 'عمل'، کہیں مترادف نہیں آئے۔ عام فہم بات ہے کہ اللہ بتوں کا خالق نہیں، لیکن اس توفیق کا خالق ضرور ہے جس سے انسان بنت بناتے ہیں اور اس مادے کا خالق بھی ہے جسے اس مقصد کیلئے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ اسلئے اس آیت کا صحیح ترین ترجمہ Allah has created you and what you make use of. ہی ہو سکتا ہے۔ (قدرت مطلق اور انسانی آزادی 2000)

## علم مطلق اور اس کے مضمرات

مسئلہ تقدیر کے کئی پہلو ہیں۔ ابتدائی صدیوں میں ہی ان مسائل پر مسلمان قدریہ (Libertarian) اور جبریہ (Predestinarian) گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ اشاعرہ نے بزعم خود ایک درمیانی پوزیشن اختیار کرنے کی کوشش کی۔ اللہ کے علم مطلق کے حوالے سے اشاعرہ نے موقف اختیار کیا کہ گو اللہ کا علم از لی ہے، اور ہر شے پر محیط ہے، ناقابل خطابی ہے، تاہم یہ انسان کے ارادی افعال کو صرف بیان کرتا ہے، متعین نہیں کرتا۔ (Knowledge is descriptive but not determinative or

(Qur'anic View of Omniscience causative.) انسان جو بھی کرتے ہیں، اس میں وہ آزاد ہیں۔

آج بھی گلن صاحب، غامدی صاحب، ڈاکٹر ڈاکر نائیک اور ان کے ہم and Human Freedom 2016 خیال یہی نظریہ پیش کر رہے ہیں۔<sup>15</sup> (Ghamdi n.d.) انسانی ڈراموں میں رول ادا کرنے والے کو پتہ ہوتا ہے کہ سکرپٹ رائٹر نے اس کے لئے کیا کردار تخلیق کیا ہے، وہ آزادی ارادہ کے ساتھ اس رول کو قبول کرتا ہے۔ اس رول کو قبول کرنا، نہ کرنا، درمیان میں کہیں چھوڑ دینا اس کے اختیار میں ہوتا ہے۔ وہ شعور کے ساتھ اپنے آپ کو اس کردار میں ڈھالتا ہے۔ اسے پتا ہوتا ہے ڈرامہ کا انجمام کیا ہو گا۔ اسے پتا ہوتا ہے کہ یہ ڈرامہ ہے، تخلیق نہیں۔ وہ اس میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ڈرامہ ختم ہونے کے بعد، وہ رول اس کی فطرت نہیں بن جاتا۔ یہ رول تفویض ہونے کے سبب وہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے شقی یا سعید نہیں ٹھہرایا جاتا۔ روایات کی بنیاد پر تقدیر کے جس عقیدے کا پرچار کیا جا رہا ہے، اس کے مطابق اللہ نے انسان کو تخلیق کیا (تخلیق کرتے وہ جانتا تھا کہ وہ اسے جنت کیلئے تخلیق کر رہا ہے یا دوزخ کیلئے) اور تخلیق کے ساتھ ہی علم الہی نے معلوم کر لیا کہ وہ دنیا کی زندگی میں پیدا کئے جانے کے بعد خدا کی عطا کی گئی توفیق کو کیسے استعمال میں لائے گا اور ہمیشہ کیلئے شقی کی حیثیت میں دنیا سے رخصت ہو گا یا سعید کی حیثیت سے۔ جس کے بارے میں علم الہی نے اسکی تخلیق کے ساتھ ہی معلوم کر لیا کہ وہ شقی کی حیثیت میں دنیا سے رخصت ہو گا تو کیا اس کا لزام تخلیق کرنے والے پر نہیں آئے گا! تخلیق کئے جانے کے ساتھ ہی کو ناصور اس سے ہو گیا کہ علم الہی میں ازل سے اسے ایسا رول مقدر ہو گیا، اور لوحِ محفوظ پر اس طرح لکھ بھی دیا گیا۔ اگر وہ اپنے ازل سے معلوم کئے گئے کورس اور نتیجہ کو قطعاً تبدیل کر ہی نہیں سکتا، تو پھر علم الہی بیانیہ کس طرح ہے اور جریہ کیوں نہیں! جبراں کیا ہوتا ہے۔ محض اپنے انجمام سے لاعلم رکھے جانے سے کیا واقعی آزادی ارادہ کا ثبوت مل جاتا ہے! درج بالا نظریہ، اللہ کو (معاذ اللہ) ایک سکرپٹ رائٹر بنادیتا ہے۔ ابتداء سے انتہا تک ہر چیز اس سکرپٹ میں ازل سے علامتیں ہو چکی ہے۔ سکرپٹ میں ابد تک کبھی بھی کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ نہ خدا آزاد رہتا ہے اور نہ انسان۔ عیسائیت میں یہ سب حاصل ہے فلسفیانہ اصطلاحات کے ذریعے اللہ کی صفات کا احاطہ کرنے کی کوشش کا۔ مسلمانوں میں یہ حاصل ہے روایات کی کتب کو 'الحق' (قرآن پاک) اور 'روایت' کو 'آیت' پر حکم بنانے، اور قرآن کی مابعد الطیعت سے متناقض فلسفیانہ اصطلاحات اختیار کرنے کا۔

”اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہر شے کا علم رکھتا ہے اور ہمارے ارادے سے متعلق تمام افعال بھی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے ہاں ازل سے معلوم اور مقدر ہیں، نیز علم الہی ناقابلٰ خطاء ہے۔“ مسلمان روایتی طور پر علم الہی کے بارے میں یہی عقیدہ رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ عقیدہ عین قرآن پاک کے مطابق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالاعقیدہ قرآنی تعلیمات کے قطعائے عکس ہے۔ قارئین کو یہ جان کر حیرانی ہو گی کہ اللہ کے علم مطلق (Omniscience) کا جو نظر یہ اوپر بیان کیا گیا ہے، اس میں اور سینٹ خامس اکوانسنس (1225-1274) کے تشکیل دئے گئے Omniceience کے نظر یہ میں کوئی فرق نہیں۔ یہ اسی نظر یہ کا جو عیسائیت میں مشہور ہے، آسان الفاظ میں بیان کے نام سے مشہور ہے، Traditional Doctrine of Omniscience ہے۔ مسلمانوں میں اشاعرہ اور ماتریدیہ نے بھی اپنے انداز میں علم الہی کو ازالی قرار دیا۔ الفارابی اور ابن سینا نے علم الہی کو اس طرح ازالی قرار دیا کہ اللہ تعالیٰ کیلئے حال پر علم جزئیات کی گنجائش ہی نہیں بچت۔ قرآن پاک میں اللہ کے علم مطلق کے کسی ایسے عقیدے کیلئے قطعاً کوئی گنجائش موجود نہیں۔

## مسئلہ تقدیر کے چند دیگر پہلو

افعال دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک وہ جو انسان کے ساتھ و قوع پذیر ہوتے ہیں۔ دوسرے جو وہ سرانجام دیتا ہے۔ جو انسان کے ساتھ و قوع پذیر ہوتے ہیں ان کے بارے میں یہ یقین رکھنا کہ وہ اللہ کی مشیت کے تابع ہیں ایمان کا حصہ ہے۔ جبکہ وہ افعال جو انسان سرانجام دیتا ہے، اس کی نیت میں وہ آزاد ہوتا ہے، خدا کی دی گئی توفیق کے استعمال کا رخ اختیار کرنے میں وہ آزاد ہے۔ نتیجہ اللہ کی قدرت کے تابع ہوتا ہے اور اسی کا نام مشیت ہے۔ نتیجہ کو باذن اللہ مانے یا نامانے میں بھی وہ آزاد ہے۔ نتیجہ کو باذن اللہ ماننا ایمان کا لازمی حصہ ہے۔ یہی ہے جسے تقدیر پر ایمان کہتے ہیں۔ یہ قطعاً لازم نہیں کہ اللہ کی مشیت پہلے سے طے ہو۔ وہ حال پر جو چاہے کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ ارشاد باری ہے: يَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَلْحَةُ يَعْمَلُ مَا يُؤْتَ فِي شَانٍ۔ ”اسی سے سوال کرتے ہیں جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ اس کی جلوہ گری ہر روز نئی شان میں ہوتی ہے۔“ (القرآن، 55:29) خلق کی طرف سے اپنی احتیاج کے حوالے سے سوال کا ہونا ضروری ہے۔ خالق کل ہی ہر احتیاج کو پورا کرنے کی شان کا مالک ہے۔۔۔ تخلیق کے بعد اس کا کام ختم نہیں ہو گیا۔ عبد کو اپنے معبدوں کے عرفان کیلئے حال پر جو کچھ درکار ہوتا ہے، معبدوں کی جلوہ گری اسی شان میں ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہو تو انتہام جلت ہو ہی نہیں سکتا، اور انتہام جنت اللہ کی سُت ہے۔ (تفیر فاضلی منزل ہفتہ، ص 164) ”اللہ کا امر آ

سماں میں نازل ہوتا ہے، تاکہ تمھیں علم ہو جائے کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے۔” (القرآن، 65:12) ”اللہ ہی آسمانوں اور زمین کو تحفے ہوئے ہے کہ وہ ٹل نہ جائیں۔“ (القرآن، 35:41) قرآن پاک ایک منظم اور ایڈ منشر ڈ کائنات کا تصور دیتا ہے۔ ایک میکا لگنی کائنات کا تصور نہیں دیتا۔ قوانین فطرت اللہ کی قدرت کے تابع ہیں، اللہ کی قدرت ان کے تابع نہیں۔ وہ حال پر اپنی تخلیق میں اضافہ کرنے پر قادر ہے جو چاہے۔ (القرآن، 1:35) **الَّذِي خَلَقَ الْمُوْتَ وَالْحَيَاةَ لِبَيْلُوْكُمْ أَيْكُمْ أَخْسَنُ عَمَلًاً وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ** ”اس نے موت اور حیات کو خلق کیا ہے، یہ دیکھنے کیلئے کہ تم میں اچھے عمل کون کرتا ہے۔“ (القرآن، 67:2) یہ نظریہ کہ ’شقی ہونا یا سعید ہونا دراصل میں آنے اور حیات دنیا کی مہلت ملنے سے پہلے طے پا چکا ہے‘ کیا قرآن پاک کی اس آیت سے متصادم نہیں! موت کو تخلیق کرنے والا، موت کو موخر بھی کر سکتا ہے اور حیات کو تخلیق کرنے والا مہلتِ حیات کو کم یا زیادہ بھی کر سکتا ہے۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ: **مُلْ نَفْسٍ ذَاقَةَ الْمُوْتَ** ہر نفس کو موت آئے گی۔ (القرآن، 21:35; 3:185) پیدائش سے موت تک اللہ نے ہر ایک کیلئے عمل کی ایک مہلت (respite) مقرر کر کھی ہے۔ اسی کو قرآن پاک میں اجلِ مسمی (appointed term) کہا گیا ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے کہ: ”اللہ سے استغفار کرو، اور اسکی طرف رجوع لاو؛ وہ تمھیں اجلِ مسمی کنہا گیا ہے۔“ (القرآن، 11:3) اسی طرح فرمایا ہے: ”اللہ تمھیں بلا تا ہے کہ تمھارے تک احسن رزق عطا کرے گا۔“ (القرآن، 14:10) صرف ان لوگوں کے گناہ معاف کرے، اور تمھیں اجلِ مسمی تک مہلت دے۔“ (القرآن، 14:10) زندگی کے بارے میں فرمایا گیا ہے جنہیں موت کے وقت احساس ہوتا ہے کہ جن حقائق کا انکار کرتے ہوئے انہوں نے زندگی گزار دی، وہ تو حقیقت ہیں، اس وقت وہ التجاکرتے ہیں: یا اللہ ہمیں مہلت عطا کرتا کہ ہم صاحبِ اعمال کریں۔ اس وقت انہیں کہا جاتا ہے کہ اجلِ مسمی (appointed term) پوری ہو چکی، صداقت کا ثبوت دینے کیلئے مہلت ختم ہو چکی، ”اب ایک لمحہ کی تقدیم یا تاخیر نہیں ہو سکتی۔“ تمام لوگوں کے بارے میں اجلِ مسمی امثل (inexorable) نہیں ہوتی۔ (القرآن، 16:61) اللہ زندگی بڑھاتا بھی ہے جس کیلئے چاہے، کم بھی کرتا ہے جس کے لئے چاہے۔ رزق مقدر ہے کامفہوم بھی ہے کہ: ”کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو۔“ (القرآن، 11:6) اللہ ہر ایک کو پالتا ہے اور علم سے پالتا ہے: ”وہ رزق قبض کر دیتا ہے جس کا چاہتا ہے، اور بسط کر دیتا ہے جس کا چاہتا ہے، اور جسے چاہے بے حساب رزق دے۔“ (القرآن، 39:52; 36:34-36; 30:37; 29:62; 28:82; 17:30; 13:26)

پر لکھ دی گئی ہے تو پھر رزق قبض کر دینا، بسط کر دینا، یا بے حساب دینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جہاں تک رزق کو کسب کرنے کا تعلق ہے ”اللہ کا فضل تلاش کرنے کا حکم ہے۔“ (القرآن، 62:10-11; 198:2) وہی پاک رزق اللہ کا فضل ہے جو اللہ کی مقرر کردہ حدود کا احترام کرتے ہوئے عطا ہو، جو رزق اللہ کی مقرر کردہ حدود کی خلاف ورزی کرتے ہوئے حاصل ہو وہ اللہ کا فضل نہیں ہے، پاک نہیں ہے، اللہ کا دیا ہوا نہیں ہے، ملتا وہ بھی اللہ کی مشیت سے ہے، رضا اور مشیت کا فرق ہم واضح کر چکے ہیں۔

### تقریر اور تدبیر

تدبیر کرنا حق ہے اور تدبیر کا منشاء بھی اللہ کی مشیت کو بدلتا نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان پر تدبیر کرنے کا حق عائد کیا گیا ہے، اسی لئے اللہ کی رضا کو انسان پر واضح کیا گیا ہے۔ تدبیر یہی ہے کہ حق کی احسن ادائیگی کیلئے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ توفیق کی اس طرح حفاظت کی جائے، کہ وہ رضائے الہی کے مطابق صحیح محل پر استعمال ہو۔ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی کو ساتھ لیکر مصیر روانہ ہوتے ہیں، اور وہ ایک گروہ تھے، تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو نصیحت فرمائی کہ ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا، بلکہ کئی دروازوں سے داخل ہونا۔ مشایہ تھا کہ ان لوگوں کا شہر میں داخل ہونا، بڑی خبر نہ بنے اور اس خبر کا جو متفق رہ عمل ہو سکتا ہے، اس سے یہ لوگ بچ جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں فرمایا ہے: اور بے شک وہ ضرور علم والے تھے جو علم ہم نے انھیں عطا کیا۔ (القرآن، 12:68) حضرت یعقوب علیہ السلام کو اپنے بچوں کی سلامتی کی طلب تھی۔ لیکن اللہ کی مشیت کو روکا نہیں جا سکتا تھا۔ اسی لئے آپ نے پہلے ہی یہ فرمادیا تھا: إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ (12:67) رضائے الہی کے خلاف کرنے والے خواہشات کی پیروی کے حوالے سے جو کچھ کرتے ہیں اسے قرآن پاک میں مکر کہا گیا ہے۔ ‘مکر’ کا لفظ ثابت معانی بھی استعمال ہوا ہے، فرمان الہی ہے: وَاللَّهُ عَلَيْهِ الْمَأْكُرُينَ۔ ”اللہ خفیہ تدبیر کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے۔“ (سورہ آل عمران، 3:54؛ سورہ الانفال، 8:30) اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائی کو اپنے پاس روک لینا چاہتے تھے، لیکن ملکی قانون کے مطابق وہ ایسا کرنے کا حق نہیں رکھتے تھے۔ آپ نے اللہ کی سکھائی ہوئی تدبیر سے یہ کیا کہ بھائیوں سے ان کے دستور کو بیان کروایا اور اسی دستور کے مطابق جس سے پیالہ برآمد ہوا سے خدمت کے لئے روک لیا۔ تدبیر علمی برتری کو ثابت کرتی ہے۔ اللہ جسے چاہے

علمی برتری عطا کرتا ہے (تفسیر فاضلی چہارم، ماخوذ سورہ یوسف آیات 67، 76)۔ صاف ظاہر ہے کہ تدبیر کا کوئی اتضاد انسان کی آزادی ارادہ کے ساتھ نہیں۔

## قضاء اور قدر

‘قضاء’ کا تعلق تخلیق سے بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ جب کسی شے کو تخلیق کرنے کا ارادہ فرمائے، اسکے لئے امر فرماتا ہے، اسکے ارکان فوراً حاضر ہو جاتے ہیں، جبھی وہ ہو جاتی ہے۔ (القرآن، 2:117) جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی امر کا عنوان رکھ دیا جاتا ہے، تو ارکان جمع ہونے لگتے ہیں اور صورت بننے لگتی ہے۔ (آل عمران 3:47) ارشاد ہے: ”وَهِيَ الَّتِي جَاءَنَا بِالْحِكْمَةِ وَرَحْمَةً أَجَلُهَا مُؤْكَدٌ لَّهُ أَعْلَمُ بِأَجَلِهِ“ پھر اجل مقرر کی۔ اور اس کے نزدیک اجل، مسمی ہے، پھر بھی تم شک کرتے ہو۔ ” (سورہ الانعام 6:2) اللہ نے ہمیں مٹی سے پیدا کیا ہے۔ پھر اس نے ہر زندگی کی ایک حد مقرر کی ہے، یہ اجل ہے۔ اور عمل کے لئے دئے گئے وقت کا کلی خاتمه اجل مسمی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے پاس ہرشے کے خزانے ہیں۔ ان خزانوں کی پیدائش اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ ہرشے کو اس مقدار میں لوگوں کے سامنے لانا کہ وہ نظام کائنات کے اعتدال پر رکھنے میں مدد ہو، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسکا تدریم معلوم کے ساتھ نزول ہے۔ ‘قدر’ کا مفہوم مشیت بھی ہوتا ہے۔ ”کئی سال مدین میں رہنے کے بعد تقدير سے آپ یہاں آئے اے موی علیہ السلام۔“ (سورہ طہ 40:20) وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِيْ قَدَرًا مَقْدُورًا ط ”اللہ کا امر ٹھیک اور پورا ہوتا ہے۔“ (القرآن، 33:38) اللہ کا امر بالکل موزوں وقت پر اور بالکل موزوں طریقے سے ہوتا ہے، کیونکہ علیم مطلق کا امر ہوتا ہے۔ ارشاد ہے: ”اگر وہ اپنے تمام بندوں کے رزق میں بسط فرمادیتا ضرور زمین میں بغاوت کرتے، وَلَكِنْ يُنْزَلُ بِقَدَرِ هَمَا يَشَاءُ ط“ ولیکن وہ جس قدر چاہے نازل کرتا ہے۔ پیشک وہ اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا، دیکھنے والا ہے۔“ (القرآن، 42:27) اللہ تعالیٰ جس قدر چاہے دیتا ہے، اس کا دینابڑے علم سے ہوتا ہے۔ بسط بھی اس کے علم سے ہوتی ہے، قبض بھی اس کے علم سے ہوتی ہے۔ قرآن پاک سے ثابت ہے کہ ‘قضاء و قدر’ کا کوئی تعلق انسان کی آزادی ارادہ سے نہیں، نہ یہ اس کی آزادی ارادہ کو متاثر کرتے ہیں۔ ان کا تعلق اللہ کی مشیت سے ہے اور اس کی مشیت اس کے علم سے ہوتی ہے۔

## حاصل بحث

مسئلہ تقدیر پر مفسرین، متكلمین، اور فلاسفہ کے نظریات سے واضح ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر کے ہاں اللہ کے علم مطلق، اللہ کی رضا، اللہ کی مشیت، انسان کی آزادی ارادہ، توفیق، تصور زمان، لوح محفوظ، قضاو قدر، تدبیر، الحق ہونے کے حوالے سے قرآن پاک کی حیثیت اور روایات پر مشتمل کتب کی حیثیت میں ابہام پایا جاتا ہے۔ قرآن پاک کی سند سے اس ابہام کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ انسان نیت کرنے میں آزاد ہے، عطا کی گئی توفیق کے استعمال کا رخ اختیار کرنے میں آزاد ہے۔ توفیق کے استعمال سے ہی رخ کا تعین ہوتا ہے۔ رخ کے درست ہونے سے نیت کے درست ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ نتائج اللہ کی مشیت کے تابع ہوتے ہیں۔ نتائج کو باذن اللہ ماننا ایمان کا رکن ہے۔ یہی تقدیر پر ایمان ہے۔ انسان توفیق کے استعمال کیلئے اللہ کی بارگاہ میں مسول ہے۔ لوح محفوظ پر صرف ہدایت اور گمراہی کو متعین کرنے والے اصول درج ہیں، جن کے مطابق انسان کے رخ کے درست یا غلط ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ لوح محفوظ پر صرف ان لوگوں کی تقدیر درج ہے جو دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں کہ وہ دنیا سے شقی کی حیثیت سے رخصت ہوئے یا سعید کی حیثیت سے۔ انسانوں کے اعمال اور شقی ہونے کا علم الہی میں تعین انسان کو توفیق دیکردار العمل میں بھیجنے کے بعد ہوتا ہے۔ منکرین حق اور اکنے معبدوں جن سلکر بھی کسی کو بہکانے کی استطاعت نہیں رکھتے (سوائے اسکے جو بہکنے کیلئے تیار ہو)، یہی لوگ ہیں جو بھڑکتی آگ میں جانے والے ہیں، جیسے کہ ان آیات کریمہ میں فرمایا گیا ہے: مَا آتَنَّاهُ عَلَيْهِ يَرْفَأَتِينَ ﴿الْأَمْنُ هُوَ حَالُ الْجَيْمِ﴾ (الحاثۃ 63: 162-37) انسان کا نصیب پہلے سے لکھا ہوا نہیں ہوتا، عمل کے بعد لکھا جاتا ہے۔ 'ازلی علم' یا 'قدیم علم' کی اصطلاحات غیر قرآنی ہیں اور عملاً اللہ تعالیٰ کی صفت ارادہ، اور اسکے عالم باشہادت ہونے کے انکار پر منتج ہوتی ہیں۔ یہی اصطلاحات انسان کی آزادی ارادہ و اختیار کے انکار کیلئے بنیاد فراہم کرتی ہیں۔ اللہ 'الدھر' نہیں ہے، نہ ہی 'الدھر' اللہ ہے۔ خدا کو اوزی یا قدیم (eternal) کہنا اسے زمانی ہستی (temporal being) بنا دیتا ہے، جو اس کی شان کے منافی ہے۔ زمان الہی کو ابدی حال (eternal now) کہنا بھی اس کی شان کے منافی ہے۔ کسی کی فلسفہ آرائی ذات باری کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ اللہ زمان و مکان کے انسانی تصورات سے ماوراء ہے۔ زمان و مکان سے اللہ کی ماورائیت (timelessness) پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھے ہوئے شخص کی مانند نہیں۔ وہ علیم مطلق (Omniscient) ہے، زمین کی گہرائیوں یا آسمان کی پہنائیوں میں ایک ذرہ بھی اس کے

علم سے باہر نہیں۔ وہ قادرِ مطلق (Omnipotent) ہے؛ تمام نتائجِ اسکی مشیت کے تابع ہیں۔ مساواہ اللہ اسکی 'تخلیق' ہے یا اسکا 'امر'۔ 'خلق' اور 'امر' دونوں اسکی قدرت کے تابع ہیں۔ ان میں سے کوئی اسکی اوہیت میں شریک نہیں۔ اسکا علم 'خلق' اور 'امر' دونوں پر محیط ہے۔ صاحبِ ارادہ ہونا اس کی شان ہے۔ وہ فَعَالٌ لِمَا يُرِيدُ (القرآن، 16:85; 11:107) ہے۔ حال پر کسی شے کا ارادہ کرنے سے اسکی شان میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔ وہ روزئی شان سے جلوہ گر ہوتا ہے۔ اگر اس جلوہ گری کی صورت ازل سے معین ہو تو نئی نہیں ہو سکتی۔ اللہ انسان کا خالق ہے، اس کو دی گئی توفیق کا خالق ہے، اس مادے کا خالق ہے جسے توفیق کے استعمال میں وہ کام میں لاتے ہیں۔ لیکن اللہ کو انسانی اعمال کا خالق کہنا بے سند ہے۔ وہ تغیر یا عدم تغیر کے انسانی تصورات سے ماوراء ہے۔ صورت کی حقیقت تعین ہے۔ تمام صورتوں کے خالق کی حیثیت سے خدا کی ماورائیت، اسکا تعینات سے ماوراء ہونا ہے۔ اللہ کی رضا اور اللہ کی مشیت میں فرق ہے۔ رضا، معلوم اور معین ہوتی ہے۔ مشیت کیلئے ایسا ہونا ضروری نہیں۔ مغربی مفکرین صدیوں سے اسلام پر جبریت پسندی (predestinarianism) کا الزام لگاتے چلے آ رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام میں قدریہ نظریات (libertarianism) عیسائی مفکرین ہی کی خوشہ چینی کا حاصل ہیں۔ یہ اسلام کے اپنے نظریات نہیں ہیں۔ مسلم مفکرین قرآن پاک کی تعلیمات کو پس پشت ڈال کر، خلافِ قرآن فلسفیانہ اصطلاحات استعمال کر کے، اور روایات کو قرآن پاک پر حکم بناؤ کر ان کے ان الزمات کو بنیاد فراہم کر رہے ہیں۔ ذاتی تقوی اور خلوص نیت اپنی جگہ، اسلام کے حوالے سے بات وہی درست ہے جس کی قرآن پاک سے تصدیق ہو۔ حال پر صرف قرآن پاک ہی سند کا درجہ رکھتا ہے۔ کسی بھی نظریہ، اصول، عقیدہ، روایت، ارشاد، قول، گمان، خیال، احساس، وہم، قیاس، تصور، تخيیل، تاثر، وجود ان، واردات، حال، کشف، شہود، تشریح، تعبیر کی صداقت کا حصہ میعاد قرآن پاک ہی ہے۔ 'الحق' ہونے کا درجہ صرف قرآن پاک کا ہے۔ اللہ کے نازل فرمائے ہوئے کے مطابق حکم نہ کرنا کفر ہے۔ اللہ کے نازل فرمائے ہوئے کے مطابق حکم نہ کرنا ظلم ہے۔ اللہ کے نازل فرمائے ہوئے کے مطابق حکم نہ کرنا فتنت ہے۔ ارشاد باری ہے: وَمَنْ أَصْدَقَ مِنَ اللَّهِ حَدِيثًا ﴿٤﴾ "الله سے اصدق حديث کس کی۔" (النساء 4:87) حدیثِ اصدق کے مقابل حديث یا اسکی تاویل سچی نہیں ہو سکتی۔

## اللہ تعالیٰ کی قدرت اور انسانی آزادی میں توافق

دین اسلام کے بنیادی عقائد میں توحید اور رسالت پر ایمان کے بعد اعمال کی جزا کا تصور اہم ترین ہے۔ حیات دنیا میں بھی انسانی اعمال کے نتائج اللہ کی مشیت کے تحت ہی رونما ہوتے ہیں، انسان کی حیات آخرت کا تو تمام تراخصار اسی زندگی میں کیے گئے اعمال پر ہے۔ یہی تصور انسانی زندگی کو مقصدیت عطا کرتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام ہر زمانے میں بشارت اور انذار کے ذریعے انسان کی توجہ اس طرف مبذول کرواتے رہے ہیں کہ اسی حال کا مستقبل بننے والا ہے، اور اپنی حیات طیبہ کی صورت میں اس پاک زندگی کا اکمل نمونہ پیش کرتے رہے ہیں جو ان عقائد پر ایمان لانے سے وجود میں آ سکتا تھا۔ اگر انسان اپنے اعمال سرانجام دینے، اللہ کے بھیجے ہوئے اکمل نمونے کی پیروی کرنے میں آزاد نہ ہو تو جزا کا تصور بے معنی ہو جاتا ہے۔ ”لاتتحرک ذرۃ الا باذن اللہ“ (ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کرتا مگر اللہ کے اذن سے۔) نہ قرآن پاک کی آیت ہے نہ اس کا حصہ، بلکہ قرآن پاک سے قطعاً متصادم کلام ہے۔ قرآن پاک میں ’ح۔ ر۔ ک‘ مادہ کا صرف ایک لفظ ’ثحرُك‘، استعمال ہوا ہے اور وہ بھی صرف ایک ہی مرتبہ سورہ **القیامہ** میں۔ (القرآن، 75:16) درست بات یہ ہے کہ ہر شے کو خلق بھی خدا نے کیا ہے اور ہر شے اسی کے امر کی تعمیل میں لگی ہوئی ہے۔ (القرآن، 65:12; 41:11; 7:54) 1) اسی طرح ”ایک پتا بھی نہیں گرتا مگر اللہ کے حکم سے۔“ کسی آیت شریفہ کا ترجمہ نہیں، بلکہ اللہ کے فرمان کے بالکل خلاف بات ہے۔ اللہ کا فرمان تو یہ ہے: **وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا۔** ”اور جو پتا بھی گرتا ہے وہ اس کا علم رکھتا ہے۔“ (القرآن، 6:59) اللہ علموں کو دیکھتا ہے، نیت کی خبر رکھتا ہے۔ اچھا یا برا عمل، بے شک وہ ایک ذرے سے بھی کم حیثیت رکھتا ہو، اللہ کے علم سے باہر نہیں ہوتا۔ (القرآن، 31:16) انجیاء کرام اور آپ کے ماننے والوں کی زندگیاں اس بات پر شاہد ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو اپنے اعمال میں آزاد اور جوابدہ سمجھا۔ قرآن پاک اللہ کا فرمان ہے اور صداقت کو معلوم کرنے کا حقیقی ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو ”الحق“ (The Truth) فرمایا ہے۔ (القرآن، 2:26) 2) قول کی صورت میں، کسی عقیدے کی صحت کا حقیقی معیار قرآن پاک سے مطابقت ہی ہو سکتا ہے۔ قرآن پاک کی کچھ آیات مکملات ہیں اور کچھ تشاہرات۔ آیات مکملات، ام الکتاب ہیں۔ تشاہرات کی وہی تشریح درست ہو گی، جو مکملات کی مطابقت میں ہو۔ جن لوگوں کے قلب میں شہرت اور امتیاز حاصل کرنے

کا مرض ہوتا ہے (distinction oriented people) محکمات کو چھوڑ کر متابہات کی تحریک کی طرف لپکتے ہیں، فتنہ چاہنے کے لئے۔ (القرآن، 7:3) احسن الحدیث کتاب میں تضاد کا پایا جانا ممکن ہی نہیں۔ (القرآن، 39:23) اگر کہیں ایسا احساس ہو تو 'ہل ذکر' سے سوال کرنے کا حکم ہے۔ (القرآن، 16:43) قرآن پاک میں تحریف ممکن نہیں کہ اللہ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ (القرآن، 15:9) اللہ کے کلام میں اپنی کو پسند داخل کرنا یعنی حق کو اپنی خواہش کے مطابق بنانا فتنہ ہے۔ (القرآن، 7:163, 165; 2:59; 2:108, 5:26) انسان سے کوتاہی دانستہ بھی ہو جاتی ہے اور نادانستہ بھی۔ نیت درست ہو تو کم علمی کی بنیاد پر کوتاہی ہو جانا اللہ کے نزدیک قبل معاف ہے۔۔۔ *بِرَبِّنَا لَا تُؤْخِذْنَا إِنْ نَسِيَّنَا أَوْ أَخْطَلْنَا ح— وَاغْفِرْ لَنَا دَقْهٖ وَإِنْ حَمَنَا دَقْهٖ—* (القرآن، 2:286) قرآن پاک انسان کو اس کے اعمال میں آزاد قرار دیتے ہوئے ' وعدہ ' اور ' عید ' کی صورت سے بشارت اور انذار پر مشتمل ہے۔ اس کے باوجود متكلمین اور فلاسفہ میں اسلام کی بالکل ابتدائی صدیوں میں یہ عقیدہ کہ انسان آزاد ہے یا مجبور، متنازعہ مسئلہ کی صورت اختیار کر گیا۔ کہیں انسانی آزادی اور اللہ تعالیٰ کی قدرت (Omnipotence) میں عدم مطابقت کا دعویٰ کیا گیا، تو کہیں اسے اللہ کے علم مطلق (Omniscience) سے متصادم قرار دیا گیا۔ کبھی اجل مسمیٰ کے قرآنی تصور کو انسانی آزادی کے تصور سے غیر ہم آہنگ گردانا گیا۔ جابر حکام کو ظلم و جبر قائم رکھنے کے لئے اپنے دفاع میں ایسے نظریات کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ مسائل، فلسفیانہ / غیر قرآنی نظریات سے متاثر ہو کر اپنی تجویز قرآن پاک میں داخل کرنے، قرآنی الفاظ کو فلسفیانہ / غیر قرآنی اصطلاحات میں ترجمہ کرنے، عقائد پر غیر قرآنی یا غیر متعلق تصورات میں بحث کرنے یا ظالم و جابر حکام کو دفاع مہیا کرنے جیسے معاملات سے پیدا ہوئے۔ آئیے اللہ تعالیٰ کی قدرت مطلق اور انسانی آزادی میں توافق / عدم توافق کے مسئلے پر متكلمین کے مباحث جائزہ لیتے ہیں۔

## مسئلہ اور اس کے حل

یہ مسئلہ بالعموم اس طرح پیش کیا جاتا ہے:

اگر اللہ تعالیٰ کی قدرت ہر شے پر محیط اور لا محدود ہے تو دو اخلاقی افعال میں انتخاب کی انسانی

آزادی محال ہے؛

اور اگر دو اخلاقی افعال میں سے انتخاب کرنے میں انسان آزاد ہے، تو ذات باری کا دائرہ قدرت اسے محیط نہیں۔

پس دونوں تصورات آپس میں ہم آہنگ نہیں۔

اس سلسلہ میں درج ذیل تین حل پوش کئے گئے:

عام معترزلہ کا نظریہ تھا کہ اللہ نے انسان کو بعض معاملات میں اختیار اور آزادی دی ہے۔ اللہ کبھی ان معاملات میں اپنی قدرت استعمال نہیں کرتا۔ ان کا نظریہ تھا کہ ان معاملات میں اللہ کی قدرت کا اثبات ان ناممکنات میں سے ہے۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی بے پایاں حکمت سے خود ٹھہرایا ہے۔ لیکن پھر اللہ کی قدرت ہر شے پر محیط کیسے ہے؟ ضرار اور نجارتے اس مسئلے کا حل بر تن ساز اور خریدار کی تمثیل کے ذریعے پوش کرنے کی کوشش کی۔ یہ دونوں معترزلی تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ اللہ افعال کا 'خالق'، اور انسان ان کا 'کاسب' ہے۔ ضرار کا نظریہ تھا کہ 'اکتساب'، ایک صلاحیت ہے جو پیدائش کے ساتھ ہی انسان کو ودیعت نہیں کی جاتی بلکہ جب اخلاقی فعل کے انتخاب کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے، اللہ انسان میں یہ قوت اور اس سے مطابقت رکھتا ہوا فعل تخلیق کر دیتا ہے۔ ضرار کا نظریہ تھا کہ افعال متولدہ (generated effects) کا اکتساب بھی انسان کے ذمے ہے۔ جبکہ نجارتے اسی خیال تھا کہ افعال متولدہ کا اکتساب انسان نہیں کرتا۔

(Shahrastani 1994, 75-6) (The Philosophy of the Kalam, 736) ضرار اور نجارتے نظریات کو معترزلہ کے حلے میں تو قبولیت حاصل نہ ہو سکی تاہم اشاعرہ فرقے کے بانی حضرت ابوالحسن الاشعربی نے نجارتے کے نظریے میں جبراً اور قدر کے مابین ایک درمیانی راستہ اختیار کر سکنے کا امکان محسوس کیا۔ وہ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ اس نے اپنے نظریے کی بنیاد نجارتے کے خیالات پر رکھی۔ (Benthmann 1953, 67)

## معترزلہ کا آفیشل نظریہ

شہام بھی معترزلہ ہے۔ اس نے انسان کے اخلاقی فعل کے بیان کے لئے قدریہ کی ابتدائی اصطلاح 'اکتساب' کو برقرار رکھا۔ اس کا نظریہ ہے کہ اللہ کی قدرت ہر شے پر محیط ہے۔ نہ صرف وہ انسان کو افعال کے اکتساب کی قوت عطا کرتا ہے بلکہ اس قوت کو سلب کر سکنے پر بھی قادر ہے۔ (Wolfson 1976, 736) اگر اللہ کسی سے یہ قوت سلب کر لے تو انسانی افعال جبراً کے تحت ہوں گے ورنہ آزاد ہوں گے۔ انسان صرف آزاد افعال کا ہی اکتساب کرتا ہے۔ معترزلہ فرقے کی صرف ایک جماعت میں اس نظریے کو قبولیت حاصل

ہوئی۔ شہام کا نظریہ اس کے شاگرد الجبائی نے اختیار کیا۔ (Wolfson 1976, 737) خدا کو انسانی افعال کا 'خالق' اور انسان کو صرف مکاسب، قرار دینا معمز لہ کے مزاج سے ہم آہنگ نہ تھا۔ وہ اخلاقی معاملات میں کمل انسانی آزادی کے قائل اور انسان کو اپنے آزاد افعال کا خالق قرار دینے کی طرف مائل تھے۔ الجبائی نے آزاد انسانی فعل کیلئے 'اكتساب'، کی اصطلاح کو رد کر کے 'تحلیق'، کی اصطلاح کو اختیار کیا اور کہا کہ انسان اپنے آزاد افعال کا خود خالق ہوتا ہے۔ (Wolfson 1976, 693-95) اس نظریے نے معمز لہ کے آفیشل نظریے کی حیثیت اختیار کر لی۔

اعشری نے نجار کے زیر اثر اس بات کا اثبات کیا کہ 'اكتساب'، ایک قوت ہے، اور اللہ اس قوت کو انسان میں تخلیق کرتا ہے۔ تاہم اس نے کہا کہ اللہ انسان کو اس قوت کے اسکی مشیت کے مطابق استعمال پر مجبور کرنے پر بھی قادر ہے۔ اگر اللہ انسان کو کسی فعل کے اكتساب پر مجبور کرنے پر بھی قادر ہے تو پھر اس قوت اكتساب کے انسان میں تخلیق کئے جانے کا کیا مطلب ہے؟ جب 'اكتساب'، اپنے معروض پر موثر ہو تو یہ 'قوت' کیسے ہو گی اور انسان سے اس کا انتساب کیا معنی رکھتا ہے؟ باقیلانی جو وینی اور امام غزالی نے اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی۔

## اشاعرہ کا نظریہ

باقیلانی تسلیم کرتا ہے کہ اعمال کا خالق اللہ ہے اور انسان اعمال کا اكتساب کرتا ہے۔ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ 'اكتساب'، ایک 'قوت' ہے جو خدا انسان میں تخلیق کرتا ہے۔ وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ 'قوت'، اپنے معروض پر موثر ہوتی ہے۔ وہ 'عمل' (act in itself) اور اسکے 'احوال' (mode of operation) میں تیز کرتا ہے اور کہتا ہے کہ عمل کا خالق تو اللہ ہے لیکن اسکے موجہ، یا حال کا تعین انسان اللہ کی تخلیق کی ہوئی قوت سے کرتا ہے۔ اللہ، عمل کے موڈ کو براہ راست تخلیق نہیں کرتا۔ اسی انسانی آزادی کو 'اكتساب' کہا جائے گا۔ جو وینی سمجھتا ہے کہ یہ نظریہ ایک خاص پہلو سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا انکار کرتا ہے۔ وہ اسے اسلام کے بنیادی مذہبی عقائد سے متصادم قرار دیتا ہے۔ جو وینی، باقیلانی کے 'عمل' کے موڈ پر قوت اكتساب کے موثر ہونے، کے تصور کو بھی بدف تلقید بنا تھا۔ 'حال' (mode) کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ یہ 'موجود ہے اور نہ غیر موجود'۔ باقیلانی عمل کے موڈ پر قوت اكتساب کے موثر ہونے کا جو پیرایہ اختیار کرتا ہے وہ اسے بالکل ناقابل فہم بنادیتا ہے۔ جو وینی سمجھتا ہے کہ یہ اكتساب کے قوت ہونے سے انکار

ہی کی ایک صورت ہے۔ وہ اشعری پر بھی تنقید کرتا ہے کہ وہ اکتساب، کی قوت سے ہی انکار کرتے ہیں جو عقل اور تجربے، دونوں کے خلاف ہے۔ جوئی، اشعری کے نظریہ، اکتساب کی تعبیر نوکر کے اپنا نظریہ پیش کرتا ہے۔ وہ اللہ کو انسانی اعمال کا خالق قرار دیتا ہے اور ان کا اکتساب انسان سے منسوب کرتا ہے۔ لیکن وہ 'اکتساب' کو 'قوت' کی بجائے 'ارادہ' کے مفہوم میں لیکر منسلکے حال پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ارادے کا اپنے معروض پر اثر پذیر ہونا ارادے کے تصور میں مضر نہیں ہوتا جس طرح علم اپنے معروض کو وجود میں لانے کا سبب نہیں کہا جاسکتا۔

## امام غزالی کا نظریہ

امام غزالی کا نظریہ ہے کہ انسان کو آزادی ارادہ حاصل ہے۔ امام غزالی یہ بھی مانتے ہیں کہ خدا ہی بر شے کا خالق ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہر دو عقائد میں تناقض نہیں۔ اللہ جب انسان میں ارادے کو تخلیق کرتا ہے تو اس کے ساتھ اس فعل کو وجود میں لانے کی قوت بھی تخلیق کرتا ہے۔ اشیاء میں ایک دوسرے سے مطابقت اختیار کرنے کی فطرت بھی اسی نے رکھی ہے۔ اعمال کو وجود میں لانے والا (اجنبی) بھی وہی ہے۔ انسان میں تخلیق کی گئی قوت اکتساب (Power of Acquistion) کا معروض ہونا ضروری نہیں۔ تخلیق کائنات سے پہلے بھی خدا میں تخلیق کی قوت تھی لیکن اس کا معروض کوئی نہیں تھا۔ اسی طرح قوت اکتساب بھی معروض (Object of Influence) کے بغیر ہو سکتی ہے۔ امام غزالی کا خیال ہے کہ 'اکتساب'، جزو اختیار کے امتحان کا ایک معتدل نظریہ ہے۔ (Wolfson 1976, 702)

## 'کسب' اور 'خلق'

'کسب' اور 'خلق'، قرآنی تصورات ہیں اور معتزلہ اور اشاعرہ دونوں مفکرین نے قدرت مطلق اور انسانی آزادی میں ہم آہنگی کے مسئلے پر اپنے نظریات ان تصورات میں پیش کئے۔ نظریات اکتساب، پر ہونے والے مباحث کی صحت کا تعین کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ قرآن پاک میں یہ الفاظ کن معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ 'کسب' اور 'اکتساب' کے الفاظ ک۔ س۔ ب، کے مادہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس مادے کے مشتقات (Derivatives) قرآن پاک میں کئی مقامات پر آئے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

کسب (القرآن 81:02; 52:21)، کسباً (القرآن 38:05)، کسبت (القرآن 134:02; 41:14; 51:02)

کسبیم (القرآن 141:134, 64:02)، کسیو (القرآن 27:10; 48:39)، تکسیو (القرآن 111:04)، یکسب (القرآن 79:02)، یکسبوں (القرآن 164:06)، تکسیبونا (القرآن 39:07)، اکتسیبا (القرآن 11:11)۔

قرآن پاک میں یہ الفاظ صرف اور صرف انسان کے اخلاقی عمل، اسکی سرانجام دہی، یا اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی رضاہ الہی یا نارا ضگی، یا خیر و شر کے معنی میں ہی استعمال ہوئے ہیں۔ کہیں بھی ان میں سے کوئی لفظ اللہ تعالیٰ کی تخلیقی فعالیت کو بیان کرنے کے لئے استعمال نہیں ہوا۔ یہ الفاظ ذات باری کی صفت تخلیق کے مقابل کسی ایسی انسانی صفت کو بیان کرنے کے لئے بھی استعمال نہیں ہوئے جو اس کے مخالف ہو یا معاون (complementary)۔

## ابوالحسن اشعری۔۔۔ انسان کا اخلاقی عمل بھی اللہ کی تخلیق ہے

اسی طرح 'خ۔۔۔ ق' مادے کے الفاظ بھی ذات باری کے بے جان اشیاء کی تخلیق کیلئے استعمال ہوئے ہیں (القرآن، 03:16، 20:05، 35:12) اور موت و حیات کی تخلیق کے تناظر میں بھی (القرآن، 35:52)۔ یہ الفاظ عدم سے تخلیق (creation not out of something) کیلئے بھی استعمال ہوئے ہیں (القرآن، 17:61، 35:52) اور موجود سے تخلیق (creation out of something) کیلئے بھی (القرآن، 14:23، 26:15، 26:14)۔ موجود سے تخلیق کے معنی میں تو خالق کا لفظ انسان کیلئے بھی آیا ہے۔ ایک ملد بھی تخلیق کار ہو سکتا ہے۔ ذات باری کی خلائقیت، اخلاقی تصورات سے ماوراء ہے۔ وہ ہر حال میں احسن الخلقین ہے۔ (القرآن، 14:23) انسان کا موجود مادے سے کچھ تخلیق کرنا 'عمل' ہے۔ توفیق کے استعمال میں نیت اور رخ کے حوالے سے وہ جواب دہے۔ انسان جس مادے کو کام میں لا کر تخلیق کرتا ہے وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کا خلق کیا ہوا ہے اور جس توفیق کو استعمال میں لاتا ہے وہ بھی اسی کی عطا ہے۔ لیکن تخلیق کا 'عمل' اور 'حاصل' اللہ تعالیٰ سے منسوب کرنا غلاف حق اور خلاف عقل ہے۔ اشاعرہ فرقہ کے بنی ابوالحسن الاشعری نے اپنے اس دعوے کہ 'انسان کے عمل / اکتساب کی تخلیق خدا کا کام ہے'، کی دلیل کے طور پر قرآن پاک کی آیت "وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ ﴿٣٧﴾" (القرآن، 96:37) پیش کی اور دعویٰ کیا کہ "اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں

انسانوں کے ساتھ ان کے اعمال کو بھی اپنی تخلیق قرار دیا ہے۔ ”ابو الحسن الاشتری اس آیت کی تشریح اس طرح کرتے ہیں: Allah has created you and what you make/do. مکار ہمیں اس ترجمہ کو درست سمجھتا ہے۔ ہی خلق کیا ہے تم کو اور جو تم بناتے ہو / جو عمل تم کرتے ہو۔)۔ پکتھاں، محمد اسد، اور مولانا ابوالاعلیٰ (Al-Ash'ari, Abu'l Hasan ali b. Is-ma'il 1953, 53) مودودی بھی اس کے ہمنوا ہیں۔ شیخ الاسلام ڈاکٹر طاہر القادری لکھتے ہیں: ”حالانکہ اللہ نے تمھیں اور تمھارے (سارے) کاموں کو خلق فرمایا ہے۔ Whilst Allah has created you and (all) your doings.” (عرفان القرآن، 96:37) مولانا امین الحسن اصلحی بھی اگرچہ ترجمہ کے الفاظ کی حد تک ان سے مختلف نہیں تاہم اس ترجمہ کے مضرات کا پورا شعور رکھتے ہیں اور انہوں نے وضاحت کر دی ہے کہ ’ومَا تَعْمَلُونَ‘ کی تفسیر میں وہ ابوالحسن الاشتری کے مکتب خیال سے اتفاق نہیں کرتے۔<sup>16</sup> تفسیر فاضلی میں اس کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے: ”اور اللہ ہی نے تم کو اور جن چیزوں کو تم کام میں لاتے ہو خلق کیا ہے۔“ (تفسیر فاضلی منزل ششم 1997، 36) بلاشبہ یہ ترجمہ الفاظ اور معنویت، دونوں اعتبار سے فرمان خداوندی کے منشاء قریب ترین ہے۔ آئیے الاشتریؒ کے دعوے کا جائزہ لیتے ہیں۔

”وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ“، قرآن پاک کی واحد آیت ہے جس میں ’خَلَقَكُمْ‘ کے ساتھ ’تَعْمَلُونَ‘ کا انتساب بھی ذات باری سے کیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام مشرکین کے بتوں کو توڑ دیتے ہیں۔ جب مشرکین کو علم ہوتا ہے تو وہ بھرائے ہوئے آپ کی طرف آتے ہیں۔ آپ انہیں فرماتے ہیں: ”لیکن اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوؤں کی عبادت کرتے ہو۔ اور اللہ ہی نے تم کو اور جن چیزوں کو تم کام میں لاتے ہو خلق کیا ہے۔“ (القرآن، 6-95:37) (تفسیر فاضلی منزل ششم 1997) مذکورہ آیت کی جو تشریح ابو الحسن الاشتری نے اختیار کی، درست نہیں کی جاسکتی۔ قرآن پاک کہیں اسے سپورٹ نہیں کرتا۔ قرآن پاک میں ’خ۔ل۔ق‘، مادے کا کوئی لفظ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی انسانی عمل کی تخلیق کا انتساب نہیں کرتا، نہ ہی انسان کے اپنے اخلاقی عمل کو وجود میں لانے کیلئے اس کے مشتقات میں سے کوئی استعمال ہوا ہے۔ قرآن پاک میں لفظ ’خالق‘ اور ’عمل‘ کہیں مترادف نہیں آئے۔

قرآن پاک میں تین دیگر الفاظ ’بَجَعَلَ‘، ’فَعَلَ‘ اور ’صَنَعَ‘ ذات باری اور انسان دونوں کیلئے یکساں استعمال ہوئے ہیں، لیکن جہاں کہیں یہ انسان کیلئے استعمال ہوئے، عمل (اخلاقی فعل) سراجِ حرام دینے کے

معنی میں، اس مفہوم سے بالکل معرا استعمال ہوئے ہیں جس میں یہ اللہ تعالیٰ کیلئے استعمال ہوئے ہیں۔  
(القرآن، 40:64; 39:6; 30:39, 41)

معترض ابتدأ انسانی اعمال کو اکتساب قرار دینے کے بعد مکمل اخلاقی آزادی و اختیار ثابت کرنے کیلئے انسان کو اپنے اعمال کا خالق قرار دینا ضروری صحیح ہے، اور اس طرح کسب اور تخلیق کو مترادف بنادیتے ہیں جو کہ درست نہیں۔ اشاعرہ انسانی اعمال کو اکتساب قرار دینے ہیں لیکن اکتساب کے قوت ہونے کا بھی دعویٰ کرتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ انسان میں تخلیق کرتا ہے اور انسان کو اس کے استعمال پر مجبور بھی کر سکتا ہے۔ لہذا تخلیق اور اکتساب کو اخلاقی فعل کے دو معاون (complementary) پہلو بناتے ہوئے اللہ کو اعمال کا خالق اور انسان کو کاسب ٹھہراتے ہیں، جو کہ درست نہیں۔ اشاعرہ اللہ کی مشیت اور اسکی رضا کے تصورات کے خلط مجھ کا بھی ارتکاب کرتے ہیں۔ زندگی، توفیق اور آزادی ارادہ محض اللہ کا فضل (Bounty) ہیں، انسان ان میں سے کسی کا اکتساب نہیں کرتا۔ توفیق استعمال ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اللہ کی رضا کے مطابق توفیق کے استعمال کا رخ اختیار کرنا اس کا صحیح استعمال ہے اور اللہ کی رضا کا علم معلوم، معروف اور معین (declared, determined, defined, and well-defined) ہوتا ہے۔ توفیق کے استعمال میں صحیح رخ اختیار کر کے انسان اپنی صداقت کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ یہی اکتساب ہے۔ نتائج پر اللہ کی قدرت کا نام مشیت ہے۔ (وَلَوْ شَاءَ رَبُّكُمْ لَا مَنِ في الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا جً "اور اگر تمہارا رب چاہتا، زمین میں تمام لوگ ایمان لے آتے۔") (تفہیم فاضل منزل دوم 1996ء، 59) نتائج باذن اللہ ہوتے ہیں۔ نتائج مطلق طور پر اللہ کی مشیت کے تابع ہوتے ہیں اور مشیت معلوم ہوتی ہے نہ معروف اور معین۔ اللہ کی مشیت اسکا حکم نہیں ہوتی۔ اللہ کی قدرت انسانی آزادی کو محدود تو کر سکتی ہے اور محظل بھی، لیکن توفیق کی حد تک ہی حق عاید ہوتا ہے۔ سورہ الانسان (76) کی آیت نمبر 30 میں فرمایا گیا ہے وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ طِإِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْمًا حَكِيمًا ﴿٣٠﴾ "اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ بیشک اللہ علیم و حکیم ہے۔" (تفہیم فاضل منزل ہفتمن، 336) اسی طرح سورہ التکویر (81) آیت نمبر 29 میں فرمایا گیا ہے: وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿٢٩﴾ "اور تم نہیں چاہو گے مگر وہ جو اللہ رب العالمین چاہے۔" (تفہیم فاضل منزل ہفتمن، 348)<sup>17</sup> چاہنے کا تعلق نتائج سے ہوتا ہے۔ نتائج وہ نہیں ہوں گے جو بندہ چاہے گا، نتائج وہ ہوں گے جو اللہ چاہے گا۔ یہ دونوں آیات ایسے مقام پر ہیں جہاں بدایت اور گمراہی کی بات ہو رہی ہو۔ سورہ

الانسان میں مولہ بالا آیت سے پہلے فرمایا گیا ہے کہ یہ قرآن پاک تو نذکر ہے تو جو چاہے اپنے رب کی طرف رہ لے۔ سورہ التکویر میں مذکورہ آیت سے پہلے فرمایا گیا ہے کہ یہ قرآن پاک تو عالمین کے لیے نصیحت ہے، اس کے لئے جو صراطِ مستقیم کو اختیار کرنا چاہے۔ (سورہ مزم میں بھی یہی بات فرمائی گئی ہے کہ ”یہ تو نذکر ہے تو چاہے اپنے رب کی راہ لے۔“) (اقرآن، 73:19) بعض لوگ ان آیات کو ہدایت کاراستہ اختیار کرنے کی صحیحت اور یاد ہانی پر مشتمل سمجھتے ہیں اور انسان ہدایت کاراستہ اختیار کرنے میں آزاد ہے۔ مگر یہ بھی تادیا گیا ہے کہ محض انسان کے چاہنے سے اسے ہدایت عطا نہیں ہو جاتی۔ ہدایت یافتہ ہونے کیلئے ضروری ہے کہ انسان طلب ہدایت رکھتا ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع لانے والے کا اتباع کرے۔ (اقرآن، 73:19) مگر اس وہ ہوتا ہے جو اپنی خواہش کی بیرونی کرے اور فاسق ہو جائے۔ ہدایت و ضلالت نتائج ہیں اور اللہ کی مشیت کے نتائج ہیں، لیکن راستہ انسان اختیار کرتا ہے جو چاہے۔ اللہ تعالیٰ کا کام بڑے علم سے ہوتا ہے، بڑی حکمت سے ہوتا ہے۔

---



## کیا اللہ الدّھر، ہے!

خلاصہ: معاملات دین میں سند (authority) کا درجہ صرف اور صرف قرآن پاک کو حاصل ہے۔ (القرآن، ۲:۳۲؛ ۲:۷۳) کسی بھی نظریہ، اصول، عقیدہ، روایت، ارشاد، قول، مگان، خیال، احساس، وہم، قیاس، تصور، تخلیق، تاثیر، وجدان، واردات، حال، کشف، شہود، تشریح، تعبیر کی صداقت کا حقیقی معیار قرآن پاک ہی ہے۔ قرآن پاک جس کی تصدیق کرتا ہے وہ حق ہے، جس کو رد کرتا ہے وہ بغیر الحق ہے۔ (القرآن، 3:21؛ 2:61) قرآن پاک کے حوالے کے بغیر کی گئی بات مغض رائے، قیاس، مگان یا ظن کا درجہ رکھتی ہے، اور ظن کسی کو حق سے مستغفی نہیں کر سکتا۔ (القرآن، 10:36، 53:28) فرمانِ الٰہی سے انحرافِ اضلال (گمراہی) ہے۔ فرمایا گیا ہے: الحق کے بعد ہے ہی کیا گمراہی۔ (القرآن، 10:32) قرآن پاک کے مقابل نظریات باطل ہیں۔ (القرآن، 18:21؛ 17:81) اللہ کے بارے میں بے سند بات کرنا اللہ پر افتری باندھنا (concoction) ہے، اور اس سے منع فرمایا گیا ہے۔ (القرآن، 11:18) فرمانِ الٰہی کو اپنی خواہش کے مطابق بنانا فتن ہے، اور اللہ فاسق ہی کو گراہ کرتا ہے۔ (القرآن، 4:71) قرآن پاک حدیث اصدق ہے۔ جو روایات قرآن پاک کے ساتھ ہم آہنگ ہیں وہ یقیناً حدیث رسول ہیں۔ حضور ﷺ سے منسوب جو روایت، حدیث اصدق سے ہم آہنگ نہ ہو، وہ حضور ﷺ کی فرمائی ہوئی بات نہیں ہو سکتی۔ ”الدّھر“ (یعنی زمانہ) اللہ نہیں ہے اور نہ ہی اللہ ”الدّھر“ ہے۔ ”الدّھر“ یا ”الدّھور“ اسماء الحسنی نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ قرآن پاک میں صرف دو مقامات سورہ الجاثیہ اور سورہ الانسان میں ”الدّھر“ کا لفظ آیا ہے اور کسی بھی جگہ اس سے اللہ مراد لینا ممکن نہیں۔ صحاباؓ علم کا کام سند کے ساتھ حق کروشن کرنا ہونا چاہئے نہ کہ بے سند باتوں کو جواز مہیا کرنا۔ قرآن پاک کی سند کے ساتھ بات کرنے والے ہر زمانے میں رہے ہیں اور رہیں گے۔ انہوں نے کبھی ”زمانے کو اللہ“ یا ”اللہ“ کو زمانہ“ نہیں کہا۔ علامہ محمد اقبال، اور باسط بلال کوش زمانے کو خدامانتے ہیں، امام غزالی صاحب زمانے کو اللہ کی تخلیق قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں زمانہ اور کائنات ایک ساتھ تخلیق ہوئے۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ زمانہ ”خلق“ ہے یا ”امر“، لیکن خدا نہیں ہو سکتا۔ ذات و صفات باری کے بارے میں وہی تصور، خیال، احساس، تشبیہ، تعبیر، روحانی تجربہ روایت، ظن، قیاس، نظریہ، فلسفہ درست ہو گا جو قرآن پاک کی سند کے ساتھ بیان کیا جاسکے۔ بندے کی نیت کا علم اللہ سے بڑھ کر کسی اور کو نہیں ہو سکتا۔ کس سے در گزر کرنا ہے یہ کبھی اللہ ہی جانتا ہے۔ علم کی حد تک کسی بھی نظریے کے درست ہونے کیلئے اسکا قرآن پاک سے مطابقت رکھنا ضروری ہے۔

کتاب و شنید صرف قول، ہوتے ہیں۔ ارشاد اگر کتاب و شنید پر مبنی ہو، تو وہ قول ہے۔ عمل کے بعد علم عطا ہوتا ہے۔ ارشاد اگر علم کے مقام سے ہو تو بھی دوسروں کیلئے وہ قول ہی کا درجہ رکھتا ہے اور جب تک پڑھنے یا سننے والا اس کے نتائج پر شاہد ہو کر اپنے حاصلات عمل کو بیان نہیں کرتا، یہ قول ہی رہتا ہے اور

فرمانِ الٰہی ہے کہ ”اے ایمان والو! وہ بات کیوں کہتے ہو جس پر تم خود عمل نہیں کرتے؟ اللہ کے نزدیک یہ نہایت قابل نفرت بات ہے کہ تم وہ کہو جس پر تم خود عمل نہیں کرتے۔“ (القرآن، 3:61) جس قول کا تعلق عقیدے سے ہے اسکا قرآنِ پاک کی سند پر استوار ہونا ضروری ہے ورنہ وہ بے سند ہو گا سلسلے کہ قرآنِ پاک کا درجہ ’الحق‘ ہونے کا ہے۔ احادیث کے مجموعوں کے محترم مرتبین کے خلوص و تقویٰ کے اعتراض کے باوجود دیہ کہنے میں کوئی امر مانع نہیں کہ انہیں مرتب کرتے وقت قرآنِ پاک کے مذکورہ بالا فرمان کو کما حقہ ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ قرآنِ پاک کو معیارِ حق (الحق) ہونے، ہر قسم کی تحریف سے پاک ہونے کی سند اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے۔ احادیث کے مجموعوں کو صحاحِ ستہ (Six Most Correct Compilations) ہونے کی سند اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں دی گئی اور نہ ہی ان کے محترم مرتبین میں سے کسی کو معصوم عن الخطأ ہونے کا درجہ حاصل تھا۔ اپنے زمانے کے پاکباز محققین تھے۔ ان کے خلوص و تقویٰ کے اعتراض کے باوجود ان کے اصول تحقیق اور حاصل تحقیق کو علمی تقدیم کے معیار پر پر کھاجانے میں کوئی شرعی امر مانع نہیں۔ صحاحِ ستہ میں شامل ایک حدیث قارئین کے تدبیر کیلئے پیش ہے۔

## صحاحِ ستہ میں شامل ایک حدیث

”حضرت ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَا تَنْهَيُوا الدّهْرَ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الدّهْرُ۔ الدّهْرُ یعنی زمانے کو برانہ کہو کہ بیشک اللہ ہی زمانہ ہے۔“ ایک حدیث ہے جو صحیح مسلم شریف اور صحاحِ ستہ کی دیگر کتب میں بیان ہوئی ہے۔ ڈاکٹر باسط بلاں کوشل نے اسے ابن حنبل کی مسنند (Musnad, V, 299 and 311) کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ علامہ محمد اقبال اپنی مشہور فلسفیانہ تصنیف of “The Reconstruction of Religious Thought in Islam” کے پہلے خطبہ میں اس حدیث کا حوالہ ان الفاظ میں دیتے ہیں۔

The Prophet said: Do not villify time, for time is God  
 شک الدّهْرِ ہی خدا ہے۔) اور پھر تیرے خطبہ میں اسی روایت کے حوالے سے زمان اور خدا میں عینیت  
 (identity) کے نظریہ کو حضور نبی پاک ﷺ کی ذاتِ اقدس سے منسوب کرتے ہیں۔ (Iqbal n.d., 8, 58)

Muhammad Iqbal's Reconstruction of the Philosophical Arguments for the Existence of God میں اسکو موضوع بحث

بناتے ہیں۔ (Koshal 2012, 110) یہ روایت معمولی اختلاف کے ساتھ درج ذیل پانچ مختلف صورتوں میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مردی ہے۔

## حدیث 'لَا تَسْبِّحُ الدَّهْرَ' کی پانچ صورتوں میں روایت

1۔ "میں نے سنار رسول اللہ ﷺ سے۔ آپ فرماتے تھے: بُرا، آدمی کہتا ہے زمانے کو، حالانکہ زمانہ میرے ہاتھ میں ہے، رات اور دن میرے اختیار میں ہیں۔"

2۔ "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: آدمی مجھے ایذا دیتا ہے، بُرا کہتا ہے زمانے کو اور میں خود زمانہ ہوں، پلتا ہوں رات اور دن کو۔"

3۔ "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ جل جلالہ نے ارشاد فرمایا: تکلیف دیتا ہے مجھ کو آدمی، کہتا ہے ہائے کم بختی زمانے کی! تو کوئی تم میں سے یوں نہ کہے ہائے کم بختی زمانے کی! اس لئے کہ زمانہ میں ہوں، رات اور دن میں لاتا ہوں، جب میں چاہوں گا تورات اور دن موقوف کر دوں گا۔"

4۔ "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی تم میں سے یوں نہ کہے، اے کم بختی زمانے کی! اس واسطے کہ زمانہ تواللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔"

5۔ "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لَا تَسْبِّحُ الدَّهْرَ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الدَّهْرُ مَا تَرَكَ كہ کوئی تم میں سے الدھر (یعنی زمانے) کو اس واسطے کے اللہ تعالیٰ خود 'الدھر' ہے۔" (مسلم 1995, 421-22)

آخری روایت سے اگر صریحیّاً ثابت ہوتا ہے کہ اللہ اور الدھر (زمانہ) ایک دوسرے کا عین ہیں، تو پہلی اور چوتھی روایت سے اس کے بالکل متضاد نتیجہ اخذ ہوتا ہے یعنی یہ کہ اللہ اور الدھر (زمانہ) ایک دوسرے کا عین نہیں ہیں۔ اگر پہلی اور چوتھی روایت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فرمائی ہوئی ہیں تو پھر آخری یعنی پانچویں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فرمائی ہوئی نہیں ہو سکتی۔ دوسری اور تیسرا روایت کی تاویل دونوں طرح کی جاسکتی ہے۔

## مذہبی فکر کی تشكیل جدید کا مفہوم

اس حدیث کو علامہ محمد اقبال (1877-1938) نے اپنے مشہور خطبات بعنوان "تشكیل جدید الہیات اسلامیہ" کے پہلے خطبہ میں بیان کیا ہے۔ علامہ محمد اقبال کا زیادہ تر کام اردو اور فارسی شاعری کی صورت میں

ہے۔ ان کے فلسفیانہ نظری کاموں میں سب سے اہم یہ خطبات ہیں جو انکی وفات سے چند سال پہلے شائع ہوئے۔ اپنے زمانے کی سائنسی اور فلسفیانہ فکر کے حاصلات کو معیارِ عقل (standard of rationality) کے بنا پر عقائد اور تعلیمات کو مر وجہ سائنسی اور فلسفیانہ اصطلاحات میں یہ ثابت کرنے کیلئے بیان کرنا کہ وہ راجح الوقت معیارِ عقل کے عین مطابق ہیں، اس مذہبی فکر کی تشکیل جدید (reconstruction of religious thought) کہلاتا ہے۔

## مذہبی فکر کی سائنسی تشکیل

علامہ صاحب کو مذہب اسلام کی تشکیل جدید کا جو طریقہ موزوں نظر آیا اسے انہوں نے اپنی کتاب ”تشکیل جدید الہیات اسلامیہ“ کے مقدمہ میں scientific form of religious knowledge کا نام دیا ہے اور انکی کتاب مذہبی فکر کی سائنسی تشکیل ہی کی کاؤش پر مشتمل ہے۔ معلوم تاریخ میں ایک یہودی عالم، فلو (Philo) پہلا شخص تھا جس نے افلاطون کے فلسفیانہ فکر کو معیارِ عقل مانتے ہوئے یہودیت کو اس کے ساتھ ہم آہنگ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ فلو کی اس کاؤش کو ہم مذہبی فکر کی فلسفیانہ تشکیل کی کاؤش کا نام دے سکتے ہیں۔<sup>18</sup> عیسائیوں نے بھی اس کی تقلید کی، جس سے تثییث کا عقیدہ وجود میں آیا۔ مسلم الہیات میں مسئلہ ذات و صفات باری، مسئلہ خلق قرآن اور دیگر کئی مسائل دانستہ یادداشتہ طور پر اسی طرزِ فکر کے زیر اثر پیدا ہوئے (مسئلہ ذات و صفات جولائی۔ ستمبر 1999)۔ الفارابی اور ابن سینا نے بطیموس کے تصور کائنات کو جو نو آسمانوں پر مشتمل تھا جن کے مرکز میں زمین واقع تھی، اور چند سورج اور معلوم سیاروں کو مختلف افلک پر ظاہر کیا گیا تھا، اپنے زمانے کے سائنسی نظریہ کی حیثیت سے اور افلاطون اور ارسطو کے فلسفیانہ نظاموں کو معیارِ عقل (standard of rationality) کے طور پر قبول کر لیا اور اسلامی عقائد کو ان کے مطابق ڈھال کر اسلام کی مذہبی فکر کی تشکیل جدید کی اور اس کو شش میں تمام بنیادی عقائد کا حلیہ بگاڑ دیا۔ امام غزالی صاحب نے اپنی کتاب ”تهافتۃ الفلسفہ“ کے ذریعے فلکِ اسلامی کو پہنچنے والے اس شدید نقصان کا ازالہ کیا۔ (Ibn Sina, al-Ghazali and Ibn Taymiyyah on the Origination of the World, 19-30)

بر صغیر پاک و ہند پر انگریزوں کے قبضے کی صورت میں مسلمانوں کو دیگر نقصانات کے ساتھ ایک بہت بڑے فکری چینچن کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ اب نیوٹن کا تصورِ کائنات بطیموسی سائنس کی جگہ لے چکا تھا۔ کائنات کو ایک مشین (closed machine) کی طرح تصور کیا گیا جس میں تمام واقعات قوانین

فطرت کے مطابق وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ کوئی چیز اس کے اندر داخل ہوتی ہے نہ اس سے باہر خارج ہوتی ہے۔ اس کے زیر اثر نیچرل ازم کے فاسنے کو فروغ حاصل ہوا۔ قوانین فطرت سے ماوراء کسی واقعہ کا ظہور محال ٹھہرا۔ وحی والہام، اور مجرمات کو ناممکن ٹھہرا گیا۔ اس کائناتی مثیں کوپہلی حرکت دینے والے کی حیثیت سے خدا کو مانا ضروری تھا، ورنہ نیوٹن کے تصورِ کائنات میں خدا کا کوئی رول نہیں تھا۔ کائنات اپنے قوانین فطرت کے مطابق ہمیشہ کیلئے از خود رواں دواں تھی (The Physics of the Universe: n.d).

اس فلسفہ و سائنس کو مانے والے حاکم بن چکے تھے اور مکملوں کے نظریات و عقائد کو چیلنج لیا جا رہا تھا۔ ان حالات میں سر سید احمد خاں نے قرآن پاک کی تعبیر کی جو نیچرل ازم سے ہم آہنگ ہو۔ ظاہر ہے جب قدرتِ الہی کو قوانین فطرت کے تابع کر دیا جائے گا تو بہت سے عقائد پر زد تو پڑے گی۔ انسیوں صدی کے اختتام پر آئنے والے کائنات کے نظریہ اضافیت نے نیوٹن کے تصور کائنات کی جگہ لے لی۔ اس تصورِ کائنات کے مطابق کائنات محدود تو تھی لیکن اسکی سرحدیں معین نہیں تھیں۔ یہ نہایت تیز رفتاری سے پھیلتی ہوئی کائنات تھی۔ کائنات کا سب سے چھوٹا یونٹ یعنی ایٹم بھی نہایت تیز رفتاری سے حرکت کرتی ہوئی از جی کی اہروں (یعنی الیکٹرون، پروٹان وغیرہ) پر مشتمل تحرک حقیقت تھا۔ ایک مسلسل پھیلتی ہوئی کائنات میں کچھ بھی مستقل نہیں رہتا۔ ایسی کائنات میں شی کی مستقل حیثیت کا تصور برقرار نہیں رہتا، اب شے ایک واقعہ بن جاتی ہے۔ مسلسل تبدیل ہوتی ہوئی حقیقت میں واقعے کو زمان کے بغیر متصور نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ سے العادی کائنات کی جگہ چہار ابعادی کائنات کا تصور پیدا ہوا جس میں زمان کائنات کی ایک بعد متصور کیا گیا۔ تمام مقداریں (حتیٰ کہ فاصلے، رفتاریں، اور زمان بھی) جو نیوٹن کے نظریہ میں مستقل تھیں اب اضافی قرار پائیں۔<sup>19</sup> نفسیات کی سائنس نئی نئی ڈیلپ ہو رہی تھی۔ فلسفے میں تجربیت پسندی، ہیگل، نیشنے اور جیمز وارڈ لوگوں کو متاثر کر رہے تھے۔ علامہ محمد اقبال کا وطن یہ تھا کہ جدید فلسفہ و سائنس اسی تصورِ کائنات کے اثبات کی طرف بڑھ رہے ہیں جو اسلام نے دیا ہے۔ انہوں نے خیال کیا کہ اگر قرآن کی سائنسی اور فلسفیائیہ تعبیر، اور فلسفہ و سائنس کی مذہبی تعبیر، کے ذریعے انھیں ایک دوسرے کے قریب لا یا جائے تو ایک بہت بڑی خدمت ہو گی۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ اسلام کے بنیادی تصورات کو جدید فلسفہ اور سائنسی علوم کی اصطلاحات میں بیان کیا جائے۔ اقبال اپنی کتاب ”تشکیل جدید الہیات اسلامیہ“ کے پہلے خطبہ میں استدلال کرتے ہیں کہ وحی والہام اور وجد ان جن پر مذہبی علم استوار ہے اسی

طرحِ حقیقی ذریعہ علم ہیں جس طرحِ حسی تجربہ اور عقل میں جو سائنسی اور فلسفیانہ علوم کی بنیاد ہیں۔ مزید استدلال کرتے ہیں کہ یہ تمام ظاہر مبانی ذرائع علم دراصل ایک برتر ذریعہ علم، جسے وہ 'فکر' کا نام دیتے ہیں، کے مختلف درجات اور پہلو ہیں اور آپس میں ہم آہنگ ہیں۔ بعد ازاں اقبال استدلال کرتے ہیں کہ فکر اور حیات ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزم ہیں۔ نظریہ اضافیت نے زمان کو حقیقت (کائنات) کی چوتھی جہت منصور کرتے ہوئے چهار ابعادی کائنات کا تصور پیش کیا۔ اقبال انسانی تجربہ کے درجات، تخلیق کے معنی، حیات اور فکر کی اولیت، حقیقت کی مقصدیت، اور ذاتِ باری کے حوالے سے غائبیت کا مفہوم وغیرہ مسائل پر فلسفیانہ بحث و تقدیم کرتے ہوئے زمان (Time) اور خدا کا فلسفیانہ تصور پیش کرتے ہیں۔

## خدا اور زمان میں عینیت

علامہ صاحب کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ اسلام کے تصویرِ خدا اور تصویرِ کائنات میں 'زمان'، کو کہاں جگہ دی جائے۔ زمان کو وہ زمانِ دوراں (Pure Duration) اور زمانِ مسلسل (Serial time) کی صورت میں منصور کرتے ہیں۔ زمانِ دوراں ماضی، حال اور مستقبل کی تقسیم سے ماوراء ایک ابدی حال ہے۔ وہ خدا اور زمانِ دوراں کو ایک قرار دیتے ہیں۔ مکان (Space) کو زمانِ مسلسل میں خدا کی فعلیت کے اظہار سے تعіیر کرتے ہیں۔ وہ کائنات کو حقیقت (reality) اور خدا کو حقیقتِ مطلق (Ultimate Reality) کہتے ہیں۔ وہ خدا کو حقیقتِ کل (the Whole of Reality) بھی کہتے ہیں۔ جب وہ خدا اور کائنات دونوں کی طرف بیک وقت اشارہ کرنا چاہتے ہیں تو وہ The Reality کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اقبال اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ خدا کا تصور ہمہ اوستی انداز میں کرنا فلسفیانہ فکر کی مجبوری ہے، تاہم اپنی ذات پر قیاس کرنے سے پہنچتا ہے کہ حقیقتِ مطلق ایک خودی ہے۔ قرآن پاک، خدا کو ایک ذات منصور کرتے ہوئے اسم ذات 'اللہ' سے موسوم کرتا ہے۔ علامہ صاحب سورہ اخلاص کا حوالہ دیکر اللہ کی ماورائیت (Incomparable Uniqueness) کا اثبات کرتے ہوئے اپنے فلسفیانہ تصورِ خدا (یعنی خودی مطلق یا حقیقتِ مطلق)، اور قرآنی تصورِ خدا (یعنی اللہ) کو ایک قرار دیتے ہیں۔ اس مقصد کیلئے ضروری تھا کہ خودی مطلق کی فلسفیانہ طور پر اخذ کردہ صفات اور قرآن پاک میں اسماء الحسنی سے اخذ ہونے والی صفات باری میں عینیت ثابت کی جائے۔ تیسرا خطبہ میں حضرت علامہ محمد اقبال فلسفیانہ استدلال کے ذریعے مطلق خودی کی صفات اخذ کرتے ہیں اور انہیں اللہ کی صفات کے عین قرار دیتے ہیں یا صفاتِ باری کی

فلسفیانہ تغیر کر کے خودی مطلق کی صفات کے ساتھ انکا اطباق کرتے ہیں۔ مگرِ اسلامی کی تشکیل جدید کے ذریعے وہ جدید دور کے انسان کیلئے مذہب کے حقیقی ہونے کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اقبال اس کوشش میں اپنے پیشوؤں کی طرح ناکام ہوئے ہیں یا کامیاب رہے، پر کوئی تبصرہ کئے بغیر جس بات کی طرف یہاں توجہ دلانا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ اقبال کے اس تصورِ خودی میں تصور زمان (concept of time) کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ وہ 'زمان' کا خودی مطلق کی لازمی صفت (essential feature) کے طور پر اور اس کرتے ہیں۔ 'خودی مطلق' (اقبال کے فلسفیانہ تصور خدا) اور 'اللہ' کی عینیت کا تقاضا تھا کہ اللہ اور زمانے (Time) کو ایک ثابت کیا جائے۔ قرآن پاک سے انکا یہ مقصد پورا نہیں ہوتا تھا۔ قرآن پاک میں یہ بات کسی بھی آیت سے اخذ نہیں ہوتی تھی۔ اس مقصد کیلئے علامہ صاحب نے صحاح شیۃ میں سے ایک حدیث تلاش کی جو اور پر بیان کی جا چکی ہے۔ علامہ صاحب نے اسکا پانچواں ورشن قبول کیا جو اس طرح ہے: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لَا تَسْبُو الدَّهْرَ فَلَمَّا كَوَرَ اللَّهُ الْدَّهْرَ ط (زمانے کو برانہ کہو، بے شک اللہ ہی زمانہ ہے۔) 'زمانے اور اللہ کی عینیت' کے اپنے نظریے کو تقویت دینے کیلئے اقبال یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مسلم روایت میں 'الدھر'، کو اسماء الحسنی میں شامل سمجھنے کی مثالیں موجود ہیں۔ ایک مشہور صوفی محبی الدین ابن عربی (1165-1240) کے حوالے سے کہتے ہیں کہ وہ 'الدھر'، کو اسماء الحسنی میں شامل سمجھتے تھے۔ امام فخر الدین رازی (1209-1149) کے حوالے سے مزید کہا کہ انہوں نے اپنی تفسیر قرآن میں بیان کیا ہے کہ بعض مسلم صوفیاء نے انھیں 'دھر'، 'دیہوڑ'، اور 'دیہاڑ' کے الفاظ کا ذکر تلقین کیا (Iqbal n.d., 44-49, 58, 243)۔ آئیے دیکھتے ہیں کہ قرآن پاک اس بارے میں کیا رہنمائی عنایت فرماتا ہے۔

## قرآن پاک میں لفظ 'الدھر' کے مقامات

قرآن پاک میں لفظ 'الدھر' صرف دو مقامات پر آیا ہے۔ جنہوں نے اپنی خواہشات کو معبد بنالیا ہے، جن کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی گئی ہے اور آنکھوں پر پردہ ہے، ان کے بارے میں سورہ الجاثیہ میں فرمایا گیا ہے:

”وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حِيَاتُنَا الدُّنْيَا أَتَهُوَتُ وَتَحْيَا وَمَا يَهِي لَكُنَا إِلَّا اللَّهُمَّ جَوَّبْنَا مِنْ عَلِيُّجٍ إِنْ هُنَّ إِلَّا يُطْهَونَ ﴿٤٥﴾“ اور کہتے ہیں، وہ تو ہماری حیات دنیا ہی ہے کہ ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور زمانہ [الدھر] ہی ہمیں ہلاک کرتا ہے۔ اور انہیں اس کا علم نہیں وہ تو محض ظن میں پڑے ہوئے ہیں۔“ (اقرآن، 24:45)

منکرین حق یہ کہتے ہیں کہ حیات دنیا ہی ہمارے مشاہدے میں آتی ہے، حیات آخرت کو ہم نہیں مانتے۔ موت و حیات کو ہم دیکھتے ہیں، اور اس کے پیچے کسی کی قدرت کو ہم نہیں دیکھتے۔ مشاہدہ ہمارا یہ بتاتا ہے کہ ایک وقت میں ایک شے اپیدا ہوتی ہے، پھر بڑھتے بڑھتے عروج پر پہنچتی ہے اور پھر زوال پذیر ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔ اس طرح یہ سب زمانے کا چکر ہے اور زمانہ ہی ہمیں ہلاک کر دیتا ہے۔ منکرین حق یہ بتائیں کسی علم کی بناء پر نہیں کرتے، یہ بتائیں وہ محض اپنے گمان کی بناء پر کرتے ہیں (تفسیر فاضلی منزل ششم 1997، 18-317)۔ سورہ الدھر بھی کہا جاتا ہے، میں انسان کو دعوت فکر دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ذرا اپنی ابتداؤ کو بھی دیکھ لو :

هَلْ أَنَى عَلَى الْإِنْسَانِ جِنْ وَمِنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَذْكُورًا ﴿١﴾ ”لیا انسان پر ایک ایسا وقت نہیں گزرا ہے کہ وہ زمانے (الدھر) میں کوئی قبل ذکر شے نہیں تھا!“ (اقرآن، 1:76)

رحم مادر میں احساس حمل سے پہلے یعنی نطفے سے لیکر حمل کی ابتدائیک پہلے تین مہینے میں انسان کوئی قبل ذکر شے نہیں ہوتا۔ (تفسیر فاضلی منزل هفتم، 328)

کیا ان مقامات میں سے کسی میں بھی الدھر سے ’اللہ‘، مراد لینے کا کوئی قرینہ موجود ہے! ہرگز نہیں! ان دو کے علاوہ کوئی تیسرا مقام ایسا ہے نہیں جہاں یہ لفظ آیا ہو۔ چنانچہ پہلی اور چوتھی روایت عین قرآن پاک کے مطابق ہیں، جبکہ پانچویں روایت کی لفظی معنوں میں تاویل کی جائے تو صریحاً قرآن پاک سے تناقض ہیں۔ کیا الدھر کو اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنی میں شامل کرنے کا کوئی ادنیٰ جواز قرآن پاک سے ملتا ہے! اللہ سے زیادہ کون اُس کی ذات عالیٰ کو جان سکتا ہے! جب اللہ نے اپنے لئے ’الدھر‘ کا لفظ استعمال کرنا پسند نہیں کیا تو کوئی دوسرا کس اتحارٹی پر اللہ کو ’الدھر‘ (زمان، Time) کے ساتھ عین قرار دے سکتا ہے، کس اتحارٹی پر کوئی اسے اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنی میں شامل کر سکتا ہے! اگر اللہ ’الدھر‘ ہوتا تو سورہ الجاثیہ میں اس عقیدے کو کہ ’الدھر‘ ہی ہمیں ہلاک کرتا ہے۔ ”کافرانہ عقیدہ قرار نہ دیا جاتا! اللہ کے بارے میں بے سند بات کرنا اللہ پر افتری باندھنا (concoction) ہے، اور اس سے منع فرمایا گیا ہے۔ حکم الہی ہے: ”... اور اللہ پر نہ کہو مگر حق...“ (اقرآن، 171:4) ہمیں نہ ماضی کے علمائے کرام، بزرگان دین، محدثین

عقلام یا مفسرین کرام کے اخلاص پر کوئی شک ہے، ناحال کے علماء کرام کے اخلاص پر۔ جو سکالر قرآن پاک کی آیات اور صحابہ میں شامل احادیث پر 'نص' کی خود ساختہ اصطلاح عائد کر کے، یا اشاعرہ کی مکالم لفظی، (قرآن پاک) کے مقابل مکالم نفسی، کی خلاف قرآن اصطلاح کی طرح وحی جلی (قرآن پاک) کے مقابل 'وحی خفی' کے تصور کی ایک خود ساختہ تعبیر کر کے قرآن پاک سے صریحاً متصادم احادیث کو قرآن پاک کے ساتھ مأخذ شریعت ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، انہیں اس تضاد فکر پر نظر کرنی چاہئے۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ ہمارے اخلاص کو بھی شک کی نظر سے نہیں دیکھا جائے گا۔

علامہ صاحب نے پانچ مختلف طریقوں سے روایت کی گئی اس حدیث کی شکلوں میں سے اس کا انتخاب کیا جسکی تصدیق قرآن پاک سے نہیں ہوتی۔ اپنے موقف کی تائید ابن عربی صاحب کے اس قول سے حاصل کرنے کی کوشش کی جواہر پر انتہائی بے سند ہے۔ علامہ صاحب نے خود یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان کے کلام میں کوئی بات قرآن پاک کے خلاف نہیں ہے۔ کئی لوگ اسی بنیاد پر یقین کر لیتے ہیں کہ ان کی ہربات عنین قرآن پاک کے مطابق ہے۔ سوچنے والی بات ہے، کیا دعویٰ کو ثبوتِ دعویٰ قرار دیا جاسکتا ہے؟! اللہ سے اس کے بندوں میں سے ڈرتے وہی ہیں جو علم والے ہیں۔" (القرآن، 35:28) علم والوں کو بھی بات زیب دیتی ہے کہ وہ کہتے ہیں: یا اللہ! اپنا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ کوتاہی نادانستہ تو ہوتی ہی ہے، دانستہ بھی ہو جاتی ہے۔ تو اگر معاف کر دے تو تجھے کوئی پوچھنے والا نہیں۔

## آیاتِ مشابہات کی تاویل کا قرآنی اصول اور تاویل احادیث پر اسکا انطباق

سورہ آل عمران میں فرمایا گیا ہے:

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأَخْرُ مُتَشَابِهَاتٍ طَّاغِيَّا الَّذِينَ  
فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَسْتَعِونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ إِبْيَاعَةُ الْفِتْنَةِ وَإِبْيَاعَةُ تَأْوِيلِهِ ۝ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلُهُ إِلَّا اللَّهُ۝  
وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ لِكُلِّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۝ وَمَا يَدْرِي كَذَّ إِلَّا أُوْلُو الْأَلْبَابِ ۝ "وہی ہے  
جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی۔ اس کی کچھ آیاتِ مکالمات ہیں۔ وہ اُمُّ الکتاب ہیں۔ اور دوسری  
مشابہات ہیں۔ وہ جن کے قلوب میں بھی ہے، مشابہ کے پیچھے پڑتے ہیں، فتنہ چاہئے کو اور اسکی  
تاویل چاہئے کو۔ اور اسکی تاویل کا علم تو اللہ ہی کو ہے۔ اور علم میں راخی حضرات یہ کہتے ہیں کہ ہم

ایمان لائے اس پر۔ سب ہمارے رب کے پاس سے ہے۔ اور نصیحت نہیں مانتے مگر عقل والے۔” (آل عمران، 7:3)

تفسیر فاضلی اس آیت کی تفسیر اس طرح بیان کرتی ہے:

”یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل فرمائی گئی ہے۔ اس میں ہدایت ہے، شفاف ہے، رحمت ہے، حکمت ہے، اور نصیحت ہے، مگر ہے یہ سب عقل و اول کیلئے۔ کتاب کی آیات دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ ہیں جو بر اہ راست احکام کی شکل میں ہیں۔ دوسری وہ ہیں جن کے پڑھ لینے سے اور سن لینے سے اس بیان کے مطابق ہم پر حق عاید ہو جاتا ہے۔ پہلی مکملات ہیں، اور دوسری تثابہات۔ اتم الکتاب کا درجہ مکملات کو حاصل ہے، کہ ہر فیصلے میں معیار یہی مکملات ہیں۔ تثابہات سے جو نتیجہ بھی اخذ کیا جائے، مکملات سے اس کی تصدیق ضروری ہے۔ ورنہ اس نتیجے کی صحت کا کوئی ثبوت نہیں ہو گا۔ جن لوگوں کے قلوب میں بھی ہوتی ہے وہ۔۔۔ مکملات جو اتم الکتاب ہیں کی پرواہ نہیں کرتے۔ تثابہات کیلئے معنی کا تعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اپنے نفس کی خوشی کے مطابق۔ یہ گناہ قتل سے زیادہ اشد ہے۔ تثابہات کی تاویل کا علم تو اللہ تعالیٰ کو ہے۔۔۔ علم میں جن حضرات کو رائخ ہونے کا شرف ہوتا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے۔ یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے، اس لئے کہ رسول امین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمایا ہے اور رسول ہی صراط مستقیم پر ہونے کی رو سے معیار مطلق ہے۔

(تفسیر فاضلی منزل اول 1992ء، 176)

اس آیت پاک سے تاویل کا جواصول اخذ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ تثابہات کی وہی تشریح درست ہو گی جس کی بنیاد مکملات پر ہو۔ قرآن پاک کی آیات اور سورتوں کی ترتیب بھی بالکل ویسے ہی تو قیفی ہے جیسے خود متن قرآن الہامی ہے۔ متن قرآن اور اسکی ترتیب کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔ قرآن پاک آیات کے اس مجموعے اور سورتوں کی اس ترتیب کا نام ہے جسکی شہادت حضور نبی ﷺ کریم ﷺ نے دی ہے اور قیامت تک شاہدین اسکی شہادت دیتے رہیں گے۔ پوری دنیا میں قرآن پاک کا صرف ایک ہی متن، آیات اور سورتوں کی ایک ہی ترتیب کے ساتھ موجود ہے جس پر تمام امت مسلمہ متفق ہے۔ کسی آیہ کریمہ کے متن قرآن ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں اختلاف قطعاً ممکن نہیں۔ تثابہات بھی آیات قرآن ہونے کے اعتبار سے اسی طرح کلام الہی ہیں جس طرح مکملات۔ اس کے باوجود خود قرآن پاک مکملات کو نظر انداز کر کے تثابہات کی مانی تاویل کی طرف لپکنے والے لوگوں کو فتنہ جو قرار دیتا ہے۔

تمام ترزید و تقویٰ اور واجب الاحترام محدثین کرام کی ظاہری اور باطنی وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے تدوین حدیث کی تمام ترسیع جیلہ کے باوجود متن حدیث کی روایت میں اس درجہ کا تیقین ممکن نہیں

جس درجہ کا تین متن قرآن کا ہے۔ محدثین کرام صلی اللہ علیہ وسلم نے حضور نبی ﷺ کے ارشادات عالیہ کو آنے والی نسلوں کیلئے محفوظ رکھنے اور انہیں ہر قسم کی تحریف سے پاک کرنے میں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کرتے ہوئے عمریں گزار دیں۔ لیکن محترم محدثین کرام نبی نہیں تھے۔ انہوں نے تدوین حدیث کے جو اصول متعین فرمائے وہ الہامی نہیں ہیں۔ اصولی طور پر اس بات کو تسلیم کیا جانا چاہیے کہ دائرة ادب میں رہتے ہوئے تدوین حدیث کی صحت کا جائزہ ہر زمانے میں لیا جاسکتا ہے اور اس کے اصولوں کو بہتر بنانے کی کوشش کرنا قطعاً خلاف ادب نہیں۔ اس ضمن میں مصنف اس بات کی طرف توجہ مبذول کروانا بھی ضروری سمجھتا ہے کہ اس بات پر غور کیا جائے کہ جو اصول ”احسن الحدیث“ کی متشابہات کی تاویل پر عائد ہوتا ہے وہ ’حدیث پاک‘ پر لا گو کیوں نہیں ہوتا۔ کیا یہ لازم نہیں کہ روایت اور اسکی تشریح قرآن پاک کی مکملات کے ساتھ مطابقت رکھتی ہو! اس مضمون میں زیر بحث روایت کا جو ورشن زیر بحث ہے کیا وہ قرآن پاک کی مکملات کے ساتھ ہم آہنگ ہے! بقیناً اسی نہیں ہے تو کیا اس کی تشریح اس طرح نہیں کی جانی چاہیے تھی کہ وہ مکملات کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی۔ کیا تدوین حدیث کے ان اصولوں کا از سر نو جائزہ لیا جانا از بس ضروری نہیں جن کی بناء پر اس روایت کے قرآن پاک سے صریحاً مقصود، اور متقاضی ورشن احادیث کی معروف ترین کتابوں میں بار پاسکے!

**باستبلال کو شل اپنے محو لہ بالا مضمون میں لکھتے ہیں :**

“For Iqbal time cannot be nothing and do nothing for the simple reason that Nature’s passage in time is perhaps the most significant aspect of experience which the Quran especially emphasizes and which... offers the best clue to the ultimate nature of Reality” (Iqbal 36). At this point Iqbal reminds the readers of three passages from the Quran that he has already mentioned (3:190-1; 2:164; 24:44) and cites five more (10:6; 25:62; 31:29; 39:5; 23:80) to point out that the Quran considers time to be one of the greatest symbols of God. The intimacy of the relationship between time and God is summarily conveyed by a Hadith that Iqbal quotes in which “the Prophet said: Do not villify time, for time is God” (Iqbal, 8) . The characteristics that are most relevant at this point are dynamism, creativity, and freedom---to the degree

that these are characteristics of time they are also the characteristics of God. And it is with this Quranic-scientific conception of time in mind that Iqbal offers an alternative description of teleology” (Koshal 2012, 110).

آئیے درج بالا اقتباس کا تجزیہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر باسط بلاں کو شل، علامہ صاحب کے الفاظ کا حوالہ دیتے ہوئے (i) نیچر کے زمان کے اندر گذران کو اہم ترین انسانی تجربہ قرار دیتے ہیں، جس پر، ان کے بقول، (ii) قرآنِ پاک خصوصی زور دیتا ہے، (iii) اور جس سے کہ حقیقت کی مطلق نوعیت کی طرف بہترین رہنمائی میسر آتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا نیچر، اور ’زمان‘، دو الگ الگ حقیقتیں ہیں اور نیچر زمان کے اندر سفر کرتی ہے یا یہ کہ زمان نیچر کی ایک لازمی خصوصیت کے طور پر نیچر کے اندر شامل ہے! کسی تجربہ کو اہم ترین کہنے کا کیا معیار ہے! ہمارے علم اور یقین کے مطابق قرآنِ پاک کہیں بھی نیچر، اور ’زمان‘، کو دو الگ حقیقتیں قرار نہیں دیتا۔ اس سے یہ بات بھی غلط ثابت ہو جاتی ہے کہ قرآنِ پاک اس پر کوئی خصوصی زور دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے دن کو آنکھیں کھولنے والا اور رات کو آرام کیلئے بنایا۔ یہ بھی فرماتا ہے کہ اگر ہم ہمیشہ رات ہی ٹھہر ادیتے تو کون ہے جو تمہیں دن لاد دیا ہمیشہ دن ٹھہر ادیتے تو کون ہے جو تمہیں رات لاد دیتا۔ قرآنِ پاک انسانی ہدایت اور رہنمائی کیلئے اور بھی کئی باتوں کو دہراتا ہے۔ مثلاً کئی مقامات پر فرمایا گیا ہے کہ ”زمین مردہ ہو جاتی ہے، تو اللہ آسمان سے بارش بر سار کر اسے زندہ کر دیتا ہے، اسی طرح وہ مردوں کو بھی جزا کیلئے زندہ کرے گا۔“

## خدا اور زمان کی عینیت کے حوالے سے قرآنِ پاک کے آٹھ مقامات کا

### جاگزہ

باستطہ بلاں کو شل صاحب فرماتے ہیں کہ اقبال یہ ثابت کرنے کیلئے کہ قرآنِ پاک ’زمان‘، کو خدا کی عظیم ترین علامت (symbol) قرار دیتا ہے، قرآنِ پاک کے تین مقامات سے حوالے دیتے ہیں، پھر اسے پانچ مرید حوالوں سے اسکی تائید کرتے ہیں۔ باسط بلاں صاحب کہتے ہیں کہ ان آیات سے خدا اور زمان کا جو تعلق سامنے آتا ہے اسے اقبال ایک حدیث کے ذریعے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ”زمان ہی

خدا ہے۔ ”آئیے قرآنِ پاک کے ان آٹھ مقامات کا جائزہ لے کر دیکھتے ہیں کہ کیا واقعی خدا اور زمان کی عینیت، کاظمیہ وہاں سے اخذ ہو سکتا ہے۔

1۔ بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور لیل و نہار کے اختلاف میں وقوف رکھنے والوں کیلئے نشانیاں ہیں۔ وہ جو اللہ کا

ذکر کرتے ہیں، قیام و قعود اور کروٹ پر، اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں نظر کرتے ہیں۔ اے ہمارے رب! تو نے یہ باطل نہیں بنایا۔ تجھے پاکی ہے۔ تو ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔ (القرآن، ۳: 91-90)

2۔ بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور لیل و نہار کے اختلاف، اور کشتی کہ جرمیں لوگوں کے نفع کو چلتی ہے، اور جو اللہ نے آسمان سے پانی باز فرمایا پھر اس سے زمین کو زندہ کر دیا بعد اس کے کہ وہ مرچی تھی، اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلائے، اور ہوا کوں کے بدلتے میں، اور بادل جو آسمان اور زمین کے درمیان مسخر ہیں ان میں یقیناً عقلمند لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں۔ (القرآن، ۲: 164)

3۔ اللہ لیل و نہار کو بدلتا ہے۔ اس میں دیکھنے والوں کیلئے عبرت ہے۔ (القرآن، ۴4: 24)

4۔ وہی ہے جس نے نہش کو ضیاء اور قمر کو نور ٹھہرایا۔ اور ان کیلئے مزید مقرر کیں، کہ تمہیں برسوں کی گنتی اور حساب کا علم ہو سکے۔ اللہ نے یہ سب کچھ یوں ہی نہیں بنایا بلکہ حق سے بنایا ہے۔ علم والے لوگوں کیلئے اپنی نشانیوں کو مغضض بیان فرماتا ہے۔ (القرآن، ۱۰: ۵) لیل و نہار کے اختلاف میں، اور جو اللہ نے آسمانوں اور زمین میں خلق فرمایا ہے اس میں، اللہ سے ڈرنے والوں کیلئے نشانیاں ہیں۔ (القرآن، ۶: 10)

5۔ اور وہی ہے جس نے لیل و نہار کو یکے بعد دیگرے آنے والا خبرایا، اس کے لئے جو ارادہ کر لے کہ اسے نصیحت لینی ہے یا ارادہ کرے کہ اسے نظر کرنا ہے۔ (القرآن، ۲5: 62)

6۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے، اور دن کورات میں داخل کرتا ہے، اور اسی نے نہش و قمر کو مسخر فرمایا ہے، ہر ایک اجل مسکی تک جاری ہے، اور یہ کہ اللہ کو خیر ہے جو عمل تم کرتے ہو۔ (القرآن، ۳۱: 29)

7۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ خلق فرمایا۔ وہ رات کو دن پر لپیٹتا ہے اور دن کورات پر لپیٹتا ہے۔ اور اس نے نہش و قمر کو مسخر فرمایا کہ ہر ایک اجل مسکی تک جاری ہے۔ سن لو! وہی عزت والا، مغفرت فرمانے والا ہے۔ (القرآن، ۳۹: 5)

8۔ اور وہی حیات دیتا ہے، وہی موت دیتا ہے، اور اسی کا کام ہے لیل و نہار کا اختلاف۔ تو کیا تم عقل نہیں کرتے۔ (القرآن، ۲۳: 80)

## حاصل بحث

کسی بھی معقول تفسیر یا تاویل کے ذریعے کسی بھی طرح ان آیات سے ”زمانہ ہی خدا ہے۔“ کے مفہوم کو اخذ نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ اخذ ہوتا ہے کہ زمانے کا اتار چڑھاؤ اللہ کے کنٹرول میں ہے۔ سورہ الجاثیہ

اور سورہ الانسان / الدّھر کی متعلقہ آیات کا جائزہ ہم پہلے لے چکے ہیں۔ اس سے ثابت یہ ہوتا ہے کہ ’زمان اور اللہ کی عینیت کا نظریہ‘، قطعاً خلاف حق ہے۔ جہاں تک تعلق ہے اس بات کا کہ حضرت علامہ صاحب نے جو حدیث بیان کی ہے وہ صحابہؓ میں بیان ہوئی ہے، اس سے صرف یہی تیجہ اخذ ہوتا ہے کہ سند (authority) کا درجہ صرف اور صرف قرآنِ پاک کو حاصل ہے۔ (القرآن، 6:73، 2:42) کسی بھی نظریہ، اصول، عقیدہ، روایت، ارشاد، قول، گمان، خیال، احساس، وہم، قیاس، تصور، تخيیل، تاثیر، وجود ان، واردات، حال، کشف، شہود، تشریح، تعبیر کی صداقت کا حصہ معيار قرآنِ پاک ہی ہے۔ قرآنِ پاک جس کی تصدیق کرتا ہے وہ حق ہے، جس کو رد کرتا ہے وہ خلاف حق (بغیر الحق) ہے۔ (القرآن، 3:21، 2:61) قرآنِ پاک کے حوالے کے بغیر کی گئی باتِ محض رائے، قیاس، گمان یا ظن کا درجہ رکھتی ہے، اور ظن کسی کو حق سے مستغنى نہیں کر سکتا۔ (ماخوذ، القرآن، 28:53، 10:36) بات یہ نہیں کہ حضرت علامہ محمد اقبال صاحب کی توجہ اس طرف جانپیش کی کہ اس آیت کی تاویل اس طرح کی جائے کہ یہ مکملات کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے اور اس روایت کے دیگر درشن (version) کے ساتھ بھی تضاد باقی نہ رہے۔ وہ ایسا کر ہی کیسے سکتے تھے۔ خدا اور زمان میں عینیت کے بغیر ان کا فلسفہ پروان ہی کیسے چڑھ سکتا تھا۔ اس حدیث کی تعبیر کو مکملات کی بنیاد پر استوار کرنے کی صورت میں خدا اور زمان میں عینیت پیدا کرنا ممکن نہ ہوتا۔ علمی کاموں میں تمام تر خلوص نیت اور قابلیت کے باوجود سہو کا امکان تو موجود رہتا ہے۔ خود حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خطبات میں حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر علمائے عظام سے اختلاف کا اظہار کیا ہے۔ فرمانِ الٰہی سے انحرافِ الضلال (گمراہی) ہے۔ فرمایا گیا ہے: الحق کے بعد ہے ہی کیا مگر گمراہی۔ (القرآن، 10:32) قرآنِ پاک کے مقابل نظریات باطل ہیں۔ (القرآن، 18:21، 17:81) اللہ کے بارے میں بے سند بات کرنا اللہ پر افتراء باندھنا (concoction) ہے، اور اس سے منع فرمایا گیا ہے۔

جو روایات قرآنِ پاک کے معيار پر پوری اترتی ہیں وہ یقیناً حدیث ہیں اور جو اسکے بر عکس ہیں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائی ہوئی بات تبھی قرار دی جاسکتی ہیں کہ ان کی مکملات سے ہم آہنگ تاویل کی جائے۔ ’الدّھر‘، اللہ نہیں ہے اور نہ ہی ’الدّھر‘ یا ’الدّھر‘، اسماء الحسنی ہیں (Iqbal n.d., 58-59)۔<sup>20</sup> صاحبِ علم کا کام سند کے ساتھ حق کو روشن کرنا ہونا چاہئے نہ کہ بے سند باقتوں کو جواز مہیا کرنا۔ قرآنِ پاک

کی سند کے ساتھ بات کرنے والے ہر زمانے میں رہے ہیں اور رہیں گے۔ انہوں نے کبھی ”زمانے کو اللہ“ یا ”اللہ کو زمانہ“ نہیں کہا۔ امام غزالی صاحب زمانے کو اللہ کی تخلیق قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں زمانہ اور کائنات ایک ساتھ تخلیق ہوئے (Hourani 1958, 183)۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ زمانہ ’خلق‘ ہے یا ’امر‘، لیکن خدا نہیں ہو سکتا۔<sup>21</sup> انسانی زمان سے مختلف کوئی زمان اللہ سے منسوب کرنا بھی درست نہیں۔ حیات انسانی اللہ کی تخلیق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو الجھ فرمایا ہے۔ ’حیات‘ کو اس سے منسوب کیا جا سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی حیات ہر انسانی حوالے اور تصور سے پاک ہے۔ اسے انسانی خودی کی ممائش پر قیاس کرنا اور ’الدّھر‘ کو اس کے ساتھ منسوب کرنا یا ان میں عینیت قائم کرنا قطعاً غیر درست ہے۔ ذات باری کے بارے میں وہی تصور، خیال، احساس، تشییہ، تعبیر، روحانی تجویہ، روایت، ظن، قیاس، نظریہ، فلسفہ درست ہو گا جو قرآن پاک کی سند کے ساتھ بیان کیا جاسکے۔ بندے کی نیت کا علم اللہ سے بڑھ کر کسی اور کو نہیں ہو سکتا۔ کس سے درگزر کرنا ہے یہ بھی اللہ ہی جانتا ہے، اور اللہ بہت درگزر فرمانے والا ہم بیان ہے۔ علم کی حد تک کسی بھی نظریے یا اسکی تشریح کے درست ہونے کیلئے اسکا قرآن پاک کی محکمات سے مطابقت رکھنا ضروری ہے۔

---



## تخلیق، صدور اور ہم از لیت

اسلام کا بنیادی عقیدہ ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ اللہ نے کائنات کو اپنے ارادے سے تخلیق کیا۔ تخلیق کے جانے سے پہلے کائنات نہیں تھی، اللہ نے اسے عدم سے تخلیق کیا۔ اس نظریہ میں دو باتیں بنیادی اہمیت کی حاصل ہیں: یہ کہ اللہ تعالیٰ صاحب ارادہ ہستی ہے، اور یہ کہ وہ عدم سے (ex-nihilo) تخلیق کرنے پر قادر ہے۔ بعد کے ادوار میں اگرچہ بعض مسلم متكلمین نے یہ نقطہ نظر اختیار کیا کہ زمین و آسمان کی تخلیق سے پہلے ایک ماہہ موجود تھا جس سے کائنات کی تخلیق کی گئی، لیکن اس ماڈے کے بارے میں انہوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ اسے خدا نے اپنے ارادے ہی سے تخلیق کیا تھا۔ قرآن پاک کی ان آیات کو انہوں نے ثبوت کے طور پر پیش کیا جن میں کہا گیا ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق سے پہلے اللہ کا عرش پانی پر تھا۔ چنانچہ اللہ کی ذات ہی ازلی ہے، کوئی اور شے ہم ازلی (co-eternal) نہیں۔ اس کے بر عکس مسلم فلسفیوں الفارابی اور ابن سینا نے موقف اختیار کیا کہ اللہ تعالیٰ صاحب ارادہ ہستی نہیں۔ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی بنیادی صفت 'فکر' ہے۔ انہوں نے اس بات سے انکار کیا کہ کائنات کی تخلیق اللہ کے ارادے سے ہوئی ہے۔ انہوں نے اس بات سے بھی انکار کیا کہ یہ تخلیق عدم سے تھی۔ ان کا نظریہ تھا کہ کائنات کا ذات باری سے صدور (emanation) ہوا ہے جس طرح سورج سے روشنی صادر ہوتی ہے۔ ان کا موقف تھا کہ اللہ کی ذات کمال مطلق کی حاصل ہے، اور صاحب ارادہ ہونا اس کی شان کے منافی ہے۔ انہوں نے دلیل دی کہ ارادے کے اظہار کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ (1) ارادہ کرنے والی ذات کے پاس کسی چیز کی کمی ہو اور اسے حاصل کرنے کا ارادہ کرے۔ (2) صاحب ارادہ ذات اپنی کسی ناقص صفت کو اپنے سے الگ کرنے کا ارادہ کرے۔ چنانچہ صاحب ارادہ ہونا عدم کمال یا نقص (imperfection) پر دلالت کرتا ہے۔ ذات باری کے بارے میں کسی عدم کمال کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، اس لئے وہ صاحب ارادہ ہستی نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے 'فکر' کو خدا کی بنیادی صفت قرار دیا اور کہا کہ اس کا فکر ہی دراصل اس کا ارادہ ہے۔ اگر ذات باری کی بنیادی صفت فکر ہے تو اس فکر کا معروض کیا ہے؟ مسلم فلسفیوں نے جواب دیا کہ ذات باری اپنے فکر کا خود ہی معروض ہے۔ خدا کی ذات ہمیشہ سے ہے، اس کی صفت فکر بھی ہمیشہ سے ہے، لہذا وہ ہمیشہ سے ہی اپنے فکر کا معروض ہے۔ انہوں نے کہا کہ خدا کا اپنے بارے میں فکر اپنے آپ کو جانا ہے۔ خدا اپنے آپ کو جانا دراصل یہ جانا ہے کہ وہ واجب الوجود ہستی (necessary being) اور تمام ممکنات کی علت اولیٰ

ہے۔ اس طرح خدا کا علم ذات تمام ممکنہ موجودات کے علم پر محیط ٹھہرتا ہے۔ چونکہ ذات باری میں کسی چیز کی کی نہ تھی کہ موجودات کے صدور میں کچھ باعث تاثیر ہوتا، لہذا خدا کے اپنے آپ کو جانے کے ساتھ ہی اس کی ذات سے صدور شروع ہو گیا۔ کائنات ازلی (eternal) ہے، اور ذات باری سے صادر ہوئی ہے۔ اسے خدا نے ارادے سے تخلیق نہیں کیا۔ یہ 'نہ ہونے' سے 'ہونا، نہیں ہونی، یہ ہمیشہ سے ہے۔ ذات باری کائنات سے زمانی اعتبار سے متقدم (prior) ہے اور نہ کائنات ذات باری سے زمانی اعتبار سے متاخر (posterior) ہے۔ ذات باری کائنات کی علت ہے اور کائنات اس کا معلول۔ ذات باری کائنات سے محض منطقی اعتبار سے متقدم ہے۔ زمانی اعتبار سے یہ دونوں ہم وقت (simultaneous) ہیں۔ اگر ہم اس بات کا جائزہ لینے کی کوشش کریں کہ مسلم فلاسفہ فارابی اور ابن سینا نے مسلمانوں کے مسلمہ عقیدہ تخلیق کو چھوڑ کر نظر یہ صدور کو اختیار کرنا کیوں ناگزیر خیال کیا، انہوں نے خدا کی صفت 'ارادہ' سے انکار کر کے 'فکر'، کو خدا کی بنیادی صفت کیوں قرار دیا، اور قرآن پاک میں سات آسمانوں کے تصور پر مشتمل نظر یہ کائنات (cosmology) کو نظر انداز کر کے نو افلاک (nine heavens) پر مشتمل کوئیات کو کیوں اختیار کیا تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ افلاطون اور ارسطو کے فلسفیانہ نظریات اور بطیموس (Ptolemy) کی فلکیات (cosmology) جو کہ اس دور کی سائنس کا درجہ رکھتی تھی، سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ ارسطو نے کائنات میں دو بنیادی اصولوں کا بعدالطبعی نظریہ پیش کیا تھا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ تمام ہستی صورت اور مادہ پر مشتمل ہے۔ وہ مطلق صورت (absolute form) کو خدا کا نام دیتا ہے۔ اس نے یہ بھی نظریہ دیا کہ مطلق صورت اور مطلق مادہ حقیقت (real) ہیں لیکن وجود (existence) نہیں رکھتے۔ اپنے تصور خدا کی صفات اخذ کرتے ہوئے ارسطو نے اتدال کیا کہ خدا صاحب ارادہ نہیں ہو سکتا اس لئے کہ صاحب ارادہ ہونا اسکے کمال مطلق (perfection) کے منافی ہے، لہذا خدا کی بنیادی صفت فکر ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ خدا کے فکر کا معروض اس کی ذات سے باہر نہیں ہو سکتا، یہ بھی اس کے کمال کے منافی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ الفارابی اور ابن سینا نے ارسطو کا یہ نظریہ بعینہ قبول کیا اور اسلام کے تصور خدا کو اس کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کی کوشش کی۔ ارسطو کی ما بعدالطبعیات کے مطابق جس طرح خدا ازلی ہے اسی طرح مطلق مادہ بھی ازلی ہے۔ ارسطو کے تصور کے مطابق خدا مادے کا خالق نہیں، بلکہ مادہ ازلی طور پر خدا کے متوالی حقیقت ہے۔ چونکہ کائنات کی تمام اشیاء مادے اور صورت کے ملنے سے وجود میں آتی ہیں، اور

مطلق مادہ اور مطلق صورت ازل سے ہیں، اس لئے کائنات بھی ازل سے ہے۔ الفارابی اور ابن سینا بھی اس بات کے قائل ہیں کہ کائنات ازلی ہے۔ اگرچہ وہ اس طبقے کے بر عکس اس بات کے قائل ہیں کہ مادہ ازل سے ہی خدا سے وجود میں آیا (Hourani, Part-II 1958, 308)۔ اس طرح وہ مسلمانوں کے اس عقیدے کا انکار کرتے ہیں جس کے مطابق صرف خدا کی ذات ہی آغاز سے ماوراء ہے، اور کائنات کی تخلیق اللہ کے ارادے سے ہوئی۔ جب ہم ابن سینا اور فارابی کے نظریہ صدور کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس نظریے پر فلاطینوس (Plotinus) کے بھی اثرات ہیں۔ فلاطینوس کا نظریہ تھا کہ کائنات خدا سے اس طرح صادر ہوئی ہے جس طرح سورج سے شعاعیں۔ سینا اور فارابی نے اس نظریے کو قبول کیا تاہم بعض ممکنہ اعتراضات کے پیش نظر مرحلہ وار صدور (graded emanation) کا نظریہ پیش کیا جس کے مطابق کائنات خدا سے دسویں مرحلے پر وجود میں آتی ہے۔ ایک ممکنہ اعتراض جس سے بچنے کی کوشش میں انہوں نے یہ نظریہ وضع کیا یہ تھا کہ اگر خدا کی ذات واحد مطلق ہے تو پھر کائنات میں پائی جانے والی کثرت (multiplicity) خدا سے کیسے صادر ہو سکتی ہے! دوسرا ممکنہ اعتراض یہ تھا کہ ایک غیر مادی خدا سے مادی کائنات کیسے صادر ہو گئی۔ انہوں نے کائنات کے خدا سے صدور کا جو ماذل پیش کیا اس کے مطابق پہلے مرحلے پر تو صرف ایک ہی چیز یعنی عقل اول صادر ہوتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور بالآخر دسویں مرحلے پر مادہ اور یہ مادی کائنات وجود میں آتی ہے۔ اگرچہ نظریہ صدور کی یہ قدم (version) فلاطینوس کے نظریہ صدور سے فلسفیانہ اعتبار سے بہت بہتر معلوم ہوتی ہے لیکن کیا اسلامی عقائد کے قریب ہونے کے اعتبار سے بھی یہ بہتر ہے! یہ نظریہ تکوین بھی قرآن کے نظریہ تخلیق سے اتنا ہی دور ہے جتنا کہ دیگر غیر اسلامی نظریات۔ یونانی فلسفیوں کے زیر اثر، تخلیق کائنات کے عقیدے کو چھوڑ کر نظریہ صدور کو اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارابی اور سینا نئے نئے فکری مسائل میں الجھتے چلے گئے۔ نظریہ صدور کی رو سے خدا کا تصور یہ بتتا ہے کہ وہ واجب الوجود ہستی (necessary being) ہے جبکہ دیگر تمام اشیاء ممکن الوجود (possible being) ہیں۔ خدا نوں غیر معلول (uncaused) ہے لیکن ہر شے کی پہلی علت وہی ہے۔ خدا کی بنیادی صفت ان کے نزدیک چونکہ فکر ہے اور فکر، منطق کے اصولوں کے مطابق اپنا اظہار کرتا ہے، جس میں لزوم پایا جاتا ہے، اس لئے خدا سے عقل اول کا صدور منطقی لزوم کے تحت ہوا۔ خدا کی وحدانیت (Oneness) کا تصور مسلم فلسفیوں نے خدا کی، مطلق سادہ اور غیر مرکب

فطرت کے اصول (doctrine of the absolute simplicity of God) کی شکل میں دیا۔ یعنی یہ کہ وہ مطلق سادہ فطرت کا مالک ہے اور اسکی ذات کسی بھی قسم کے اجزاء میں تقسیم پذیر نہیں (Wolfson 1956, 545-46)۔ انہوں نے کہا کہ خدا کی مطلق سادہ فطرت کا تقاضا ہے کہ اس کا علم بھی شاید کثرت سے پاک اور واحد ہو۔ چونکہ خدا کے واحد علم سے واحد کا ہی صدور ممکن ہے، اس لئے خدا سے براہ راست صرف ایک ہی شے صادر ہو سکتی ہے۔ اس طرح انہوں نے علت (cause) کے وحدانی (unitary) event ہونے کا نظریہ پیش کیا۔ یعنی علت ایک واحد غیر مرکب حقیقت ہوتی ہے اور اس سے صرف ایک ہی معلول صادر ہو سکتا ہے۔ اس سے پہلے وہ علت اور معلول کے درمیان منطقی لزوم (logical necessity) کے تعلق کا نظریہ پیش کرچکے تھے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کے محض اپنے آپ کو جانے سے اشیائے کائنات وجود میں کیسے آنے لگیں! مسلم فلسفیوں نے کہا کہ خدا چونکہ کمال مطلق کا حامل ہے، اس لئے اس کی ذات میں علم، تخلیق کے مترادف ہے، اور ان میں کوئی زمانی فاصلہ نہیں ہوتا۔ اس سے ان کے نظریہ علت کا ایک اور اہم اصول کہ علت اور معلول زمانی اعتبار سے ہم وقت (simultaneous) ہوتے ہیں، سامنے آتا ہے۔ علت اپنے معلول سے صرف منطقی اعتبار سے متقدم (prior) ہوتی ہے اور معلول بھی علت سے صرف منطقی اعتبار سے (posterior) متاخر ہوتا ہے۔ اگر علت اور معلول میں منطقی لزوم کا تعلق تسلیم کیا جائے تو پھر ماہیت کے اعتبار سے علت اور معلول کو ایک ہی قسم کا ہونا چاہیے۔ چونکہ مسلم فلسفیوں کے نزدیک خدا کی ماہیت عقل یا فکر (pure thought) ہے، انہوں نے استدلال کیا کہ خدا سے جو چیز براہ راست صادر ہوتی ہے، وہ اپنی ماہیت کے اعتبار سے عقل (intellect) ہی ہو سکتی ہے۔ ایک وحدانی یا غیر مرکب علت سے لازماً ایک ہی غیر مرکب معلول صادر ہو گا، اور یہ معلول ہمیشہ اسی علت سے صادر ہو گا۔ اس طرح ان کے نظریہ تغییل کا ایک اور اصول یہ بھی سامنے آتا ہے جسے ”ایک سے ایک کے صادر ہونے کا اصول کہتے ہیں۔“ چنانچہ خدا سے براہ راست صرف عقل اول ہی صادر ہوتی ہے۔ عقل اول کا اپنے بارے میں علم دو قسم کا ہو گا: اپنے وجود کے لئے خدا پر مخصوص ہونے کی بنا پر وہ ممکن الوجود ہے، اور منطقی لزوم کے تحت صادر ہونے کے اعتبار سے واجب الوجود۔ خدا کا علم واحد تھا، اس لئے اس سے ایک ہی شے صادر ہوئی، عقل اول کا علم دو قسم کا ہے اس لئے اس سے دو چیزیں عقل دوم اور فلک اول صادر ہوئیں (Michael E 1962, 304)۔ عقل دوم کا علم اپنے بارے میں دو سے زیادہ قسم کا ہو گا اس لئے اس سے عقل

سوئم اور فلک دوئم اور کچھ دیگر فلکی اجسام وجود میں آتے ہیں۔ ہر نئے درجے پر صادر ہونے والی اشیاء کی تعداد بڑھتی چلی جاتی ہے۔ بالآخر عقل و ہم سے زمان و مکان پر مشتمل دنیا (terrestrial world)، دنیا میں پائے جانے والے تمام جنس (genera) انواع (species) روابط (relations) اور انکے افراد وجود میں آتے ہیں۔ خدا سے کائنات کا صدور، تعلیل اور منطقی لزوم کے جن اصولوں کے تحت و قوع پذیر ہونا شروع ہوا تھا وہ پوری کائنات کے ہر ہر مرحلے پر جاری و ساری رہتے ہیں۔ اس طرح جو تصور کائنات (world view) ابھرتا ہے وہ بلاشبہ ایک کائناتی جبریت (universal determinism) کا تصور ہے۔ اگر کائنات میں جبریت ہے اور ہر واقعہ منطقی لزوم کے تحت رونما ہو رہا ہے تو پھر ہم انسان اور اس کے اعمال کو اس سے مستثنی نہیں ٹھہر سکتے۔ مسلم فلسفیوں کے نزدیک انسانی ارادہ اور نفسیاتی کیفیات بھی نظریہ تعلیل کے اطلاق سے مستثنی نہیں۔ اس طرح انسان کی اخلاقی آزادی کی نفی ہو جاتی ہے، جبکہ اسلام انسان کو آزاد اور اپنے اعمال کے لئے جوابدہ ٹھہر اتا ہے۔ اگر ہر واقعہ منطقی لزوم کے تحت پہلے سے طے شدہ ہے، اور خدا کی ذات صاحب ارادہ ہستی نہیں کہ وہ کائنات میں اپنے ارادے سے مداخلت کر سکے تو پھر انسانی دعاؤں کے اور رجاؤں کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے؟ فارابی اور سینا کے تصور خدا کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خدا اور انسان کے درمیان ناقابل عبور خلیج حائل ہو جاتی ہے۔ انسان آزاد رہتا ہے اور نہ خدا۔ مجراۃ کے مافوق النظرت ہونے سے انکار کرنا پڑتا ہے، اور قیامت کے دن حشر اجساد (bodily resurrection) کو بھی مانا ممکن نہیں رہتا۔ اسی طرح خدا کے علم جزئیات (God's Knowledge of particulars) کا بھی انکار لازم آتا ہے۔

## امام غزالی کا فلسفہ مذہب

امام غزالی نے مسلم فلسفیوں کے نظریات پر شدید تنقید کی۔ وہ فلسفیوں کے نظریات کو غیر درست سمجھتے تھے۔ امام غزالی نے بجا طور پر محسوس کیا کہ فلسفیوں کے نظریات کو روایتی کلامی طریقوں (traditional theological methods) سے مسترد کرنا نتیجہ خیز نہ ہو گا، ضرورت اس امر کی ہے کہ جن فلسفیہ نظریات سے متاثر ہو کر انہوں نے یہ نظریات وضع کئے ہیں ان کا استرداد کیا جائے اور جس منطق پر انہوں نے اپنے دلائل کو استوار کیا ہے، اسی سے ان کے استدلال کا ابطال کیا جائے۔ امام غزالی صاحب نے اپنی کتابوں میں اسلام کا جو فلسفہ مذہب پیش کیا ہے اس کے مطابق:

”کسی مذہبی صداقت سے اس وقت تک انکار نہیں کرنا چاہیے جب تک اسے ماننا منطقی طور پر  
ناممکن (logically impossible) نہ ہو، اور کسی فلسفیانہ صداقت کو اس وقت تک  
صداقت نہیں سمجھنا چاہیے جب تک اسے مسترد کرنا منطقی تضاد (logical  
contradiction) کو جنم نہ دیتا ہو (Sheikh 1974, 154)۔“

امام غزالی، مسلم فلسفیوں کے بر عکس، اسلام اور فلسفے دونوں کو یکساں طور پر حق (truth) نہیں سمجھتے  
تھے بلکہ صرف اسلام کو ہی صداقت مانتے تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ جب بھی اسلام کو فلسفہ سے مطابقت دینے  
کی کوشش کی جائے گی تو نتیجہ میں پیدا ہونے والے نظریات تضاد سے خالی نہیں ہوں گے۔ انہوں نے تہافتہ  
الفلاسفہ کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں مسلم فلسفیوں کی کتابوں سے بیس (20) مسائل پر ان کے  
نظریات اخذ کر کے ان کا تجربیہ کیا اور یہ ثابت کیا کہ (1) یا تو وہ فلسفیانہ اصول ہی غلط ہے جس کی بنیاد پر  
انہوں نے کسی مسئلہ کے بارے میں نتیجہ اخذ کیا یا (2) اگر ان کے مقدمات درست ہیں تو انہوں نے نتیجہ  
اخذ کرنے میں منطقی اصولوں کی خلاف ورزی کی ہے۔ یا (3) اگر کہیں ان کے نتائج درست ہیں تو یہ نتائج  
ان مقدمات سے اخذ ہی نہیں ہوتے جن سے انہوں نے یہ اخذ کئے ہیں۔ امام غزالی صاحب نے بیس میں سے  
سولہ مسائل پر یہ نقطہ نظر اختیار کیا کہ ان پر معروف مذہبی عقیدہ سے فلسفیوں کے اخراج کو نظر انداز کیا جا  
سکتا ہے، لیکن چار مسائل پر ان کے اخراج سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا یونکہ انہوں نے اسلام کے  
بنیادی عقائد کے صریح ابر عکس نظریہ اختیار کیا ہے۔ یہ چار مسائل درج ذیل ہیں۔

(1) ازلیت کائنات کا مسئلہ

(2) خدا کے علم جزئیات سے انکار کا مسئلہ

(3) مجرا ت سے انکار

(4) حشر اجسام سے انکار

## تہافتہ الفلاسفہ — مسلم فلسفیوں کا ابطال

### 1۔ از لیت کائنات کا مسئلہ

امام غزالی نے ٹھیک طور پر یہ محسوس کیا کہ ارادی تخلیق کائنات کے قرآنی نظریے کو چھوڑ کر کائنات کی از لیت کے اس طبقے کے نظریے کو اختیار کرنے کی وجہ یہ تھی کہ مسلم فلسفی ارادے (volition) کی اس تعریف کو مسترد نہ کر سکے جو اس طبقے پیش کی تھی۔ چنانچہ غزالی نے اس تعریف کو غلط ثابت کیا اور ثابت کیا کہ خدا کے لئے صاحب ارادہ ہونا نہ صرف کمال کے منافی نہیں، بلکہ عین کمال کا تقاضا ہے کہ خدا صاحب ارادہ ہستی ہو۔ غزالی اس بات کے قائل ہیں کہ ’کائنات‘ اور ’وقت‘ دونوں ماضی کے ایک ایسے لمحے میں جو موجود لمحے سے ایک محدود زمانی فاصلے پر موجود ہے، عدم محض سے تخلیق کئے گئے ہیں (Hourani 1958, 183)۔ غزالی اپنے نظریے کو ثابت کرنے کے لیے دلائل نہیں دیتے بلکہ فلاسفہ کے از لیت کائنات کے حق میں دیئے گئے دلائل کے ابطال کو کافی سمجھتے ہیں۔ مسلم فلسفیوں نے از لیت کائنات کے حق میں چار دلائل پیش کئے ہیں۔ ان کی پہلی دلیل اس طبقے ’علت‘ اور ’ارادہ‘ کے تصورات پر مبنی ہے۔ اس طبقاً نظریہ علت یہ کہ ہر تبدیلی کی کوئی نہ کوئی علت ہوتی ہے۔ یہ علت تبدیل ہونے والی شے سے الگ ہوتی ہے۔ علت اور معلوم ہم وقت ہوتے ہیں۔ اس طبقے فلسفہ میں یہ تصور علت نہ صرف طبعی تبدیلیوں پر عائد ہوتا ہے بلکہ ارادی افعال اور نفسیاتی تبدیلیوں پر بھی یکساں عائد ہوتا ہے۔ صرف افراد اور اشیاء ہی نہیں، خدا بھی اس کے دائِرہ عمل سے مادراء نہیں ہے۔ ابن سینا استدلال کرتا ہے کہ فرض سمجھنے کائنات بحیثیت مجموعی از لی نہیں بلکہ حادث ہے اور کسی خاص لمحے میں وجود میں آئی ہے۔ کائنات کے وجود میں آنے کی کوئی نہ کوئی علت ضرور ہو گی۔ یہ علت، طبعی نہیں ہو سکتی کیونکہ ہمارے مفروضے کی رو سے مادہ تو ابھی وجود ہی نہیں رکھتا۔ ارادہ الہی کائنات کے وجود میں آنے کی علت ہو سکتا ہے جیسا کہ مذہبی لوگ سمجھتے ہیں لیکن ارادہ الہی کے متحرک ہونے کی بھی کوئی علت ہو گی۔ اس طرح خدا کا ایک فعل اپنی تشریح کے لئے خدا کے کسی دوسرے فعل کا محتاج ٹھہرے گا، یہ سلسلہ لا محدود طور پر چلتا جائے گا اور کائنات کا وجود میں آنانا قابل فہم ہو جائے گا۔ اگر مادہ از لی نہیں ہے جسے حدوث کائنات کی علت قرار دیا جاسکے اور ارادہ الہی بھی اس کی علت نہیں ہو سکتا اور خدا کے علاوہ کوئی اور شے نہیں جسے کائنات کی علت قرار دیا جاسکے تو پھر دو ہی تبادل باقی رہ جاتے ہیں:

کائنات وجود ہی نہیں رکھتی یا کائنات ہمیشہ ہمیشہ سے موجود ہے۔ پہلی بات خلاف واقعہ ہے۔ چنانچہ فلسفی استدلال کرتے ہیں کہ کائنات قدیم (eternal) ہے۔ خدا نے اسے عدم سے تخلیق نہیں کیا بلکہ یہ خدا کے ساتھ ہمیشہ سے اس طرح موجود ہے جیسے سورج کے ساتھ شعاعیں۔ انہوں نے مزید استدلال کیا کہ خدا غیر مادی ہے اور اشیائے کائنات مادی، اس لئے خدا کائنات کی علت نہیں ہو سکتا۔ لہذا خدا کے ساتھ مادہ بھی ازل سے موجود ہے۔ اگرچہ خدا اور مادہ دونوں قدیم ہیں لیکن خدا مادے یا کائنات سے منطقی طور پر متقدم ہے جس طرح علت اپنے معلوم سے منطقی طور پر متقدم ہوتی ہے۔

## ارادے کی تعریف — کھجور کے انتخاب کی مثال

گذشتہ صفحات میں کی گئی بحث کے مطابق کائنات کے حادث ہونے کی ممکنہ وجہ صرف ارادہ الہی ہو سکتی ہے۔ فلسفی ارادہ الہی کے متحرک ہونے کو ناقابل فہم قرار دیکر اس تشریح کو مسترد کر دیتے ہیں لیکن غزالی اسی پہلو سے انہیں تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ غزالی کہتے ہیں کہ عین ممکن ہے کہ خدا نے تخلیق کائنات کا ارادہ تو اzel ہی سے کیا ہو لیکن یہ ارادہ اس طرح سے ہو کہ وہ کائنات کو کسی خاص لمحے وجود میں لائے گا۔ غزالی کے خیال میں اس بات کے ماننے میں کوئی منطقی تضاد واقع نہیں ہوتا۔ غزالی کہتے ہیں کہ فلسفی یہ کہہ سکتے ہیں کہ ’ارادہ، کسی واقعہ کی مکمل علت ہوتا ہے۔ اگر کسی کام کا ارادہ کر لیا جائے تو اسے فوراً وجود میں آجائا چاہیے بشرطیکہ اس میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور ارادہ الہی کے سامنے کسی رکاوٹ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ غزالی جو اباً اشاعرہ کے ایک استدلال کی تائید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ممکن ہے خدا نے اzel ہی سے کائنات کی تخلیق کو کسی وقت یا شرط پر موقوف کر دیا ہو۔ فلاسفہ اس کے جواب میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ارادہ الہی تو اzel ہے اور ہمارے مفروضے کے مطابق تخلیق کائنات ایک حادث واقعہ، ارادہ اzel کو حادث واقعہ کی علت کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟ غزالی اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ کیا علت اور اس کے موقوفی اثر (delayed effect) کو تسلیم کرنے میں کوئی منطقی تضاد و نہما ہوتا ہے؟ غزالی کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے، اور اگر فلسفی سمجھتے ہیں کہ ایسا ہے تو ان کے اس دعویٰ کی بنیاد کس بات پر ہے؟ اگر اس کی بنیاد ان کے وجود ان پر ہے تو پھر ان کے مخالفین ان کے اس وجود ان میں شریک کیوں نہیں (Hourani 1958, 184-91)۔ اشاعرہ کے موقوفی اثر کے نظریہ کے خلاف فلسفیوں کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اس صورت میں یہ ماننا پڑتا ہے کہ ارادہ الہی نے تخلیق کائنات کے لئے لمحے کا انتخاب کیا۔ انتخاب کی بنیاد ہمیشہ کسی اصول تخصیص

(principle of particularisation) پر ہوتی ہے۔ بغیر کسی اختصاص کے دو انتہائی یکساں لمحوں کے درمیان انتخاب ممکن نہیں۔ اور اگر ذات باری ہی از لی ہے تو تحقیق کائنات سے پہلے کسی اصول تخصیص کا ہونا ممکن نہیں۔ لہذا یہ بات درست نہیں کہ خدا نے تحقیق کائنات کا ارادہ تو ازل ہی سے کیا لیکن تحقیق کائنات کے وقوع کو بعد کے کسی لمحے تک مؤخر کر دیا۔ غزالی کہتے ہیں کہ ارادہ اپنی فعلیت میں آزاد ہوتا ہے۔ یہ اپنے انتخاب کا اصول تخصیص خود ہے۔ اس کے بارے میں وجہ کا سوال اٹھانا غیر ضروری ہے۔ غزالی ارادے کی آزاد نوعیت کو واضح کرنے کے لئے کھجور کے انتخاب کی ایک مثال دیتے ہوئے اس استدلال کو آگے بڑھاتے ہیں۔ غزالی کہتے ہیں کہ دو انتہائی یکساں (logically identical) کھجور یں ایک سخت بھوکے شخص کے سامنے رکھی گئی ہیں اور شرط یہ ہے کہ وہ دونوں میں سے صرف ایک کھجور لے سکتا ہے۔ اس مثال کے مطابق سخت بھوک کے احساس کے علاوہ کوئی اور اصول اختصاص نہیں ہے۔ اب دو میں سے ایک بات ممکن ہے۔ وہ شخص کوئی ایک کھجور اٹھا کر کھالے یا کوئی بھی کھجور نہ اٹھا سکے اور بھوکا رہے۔ ابن رشد اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہاں مسئلہ یہ نہیں کہ وہ شخص کو نی کھجور لے، اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ کوئی ایک کھجور اٹھا لے یادوں سے محروم رہتے ہوئے بھوکا رہے۔ اور کوئی سی ایک کھجور لے لینے کے لئے واضح وجہ اور عقلی جواز موجود ہے۔ وین ڈین برگ اس بحث پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس شخص کا ارادہ لازماً ایک کھجور کا انتخاب کر لے گا لیکن اب رشد نے اس بات کا جواب نہیں دیا کہ دونوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا اصول تخصیص کیا ہوگا۔ غزالی کہتے ہیں کہ ارادہ الہی کے لئے کسی تخصیص کا ہونا قطعاً ضروری نہیں۔ اس کے لئے سب لمحے یکساں ہیں۔ ارادہ الہی تحقیق کائنات کے لئے کسی بھی لمحے کا انتخاب کر سکتا تھا۔ غزالی ارادہ الہی کی نوعیت پر مزید گفتگو کرتے ہوئے کائنات کی کچھ خصوصیات کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ خصوصیات، اپنی موجودہ صورت کے بالکل بر عکس بھی ہو سکتی تھیں۔ مثلاً جو اجرام فلکی مشرق سے مغرب کی طرف گردش کرتے ہیں، یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کائنات کو اس طرح تحقیق کرتا کہ یہ بر عکس سمت میں گردش کرتے۔ خدا نے اپنے آزاد ارادے سے ان دو میں سے ایک کو منتخب کیا اور خدا کے اس انتخاب کے لئے اصول تخصیص کا سوال نہیں اٹھایا جا سکتا۔ ابن رشد جواب دیتا ہے کہ اگر ہم گہری نظر سے سائنس کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات کی موجودہ حالت اپنے تمام دیگر امکانات سے بہتر ہے۔ لہذا خدا نے کائنات کو موجودہ صورت میں تحقیق کر کے عقلی لحاظ سے بہترین انتخاب کیا۔ حورانی کہتا ہے کہ ابن

رشد لپنی بات کو ٹھیک طرح ثابت نہیں کر سکا اور اس کا استدلال کمزور ہے۔ این رشد مزید کہتا ہے کہ خدا کے سامنے سوال یہ تھا کہ وہ کائنات کو تخلیق کرے یا نہ کرے۔ خدا کے سامنے دو یکساں لیکن گردش کی سمتیوں کے اعتبار سے مختلف کائناتوں میں سے ایک کے انتخاب کا منسلک نہیں تھا۔ حواری اس کے جواب میں یہ کہتا ہے کہ اگر ارادہ الہی انسانی ارادہ کی طرح سے ہے تو این رشد کو استدلال میں تھوڑی سی برتری ضرور مل جاتی ہے یعنی خدا نے ہمیشہ ہی سے دیکھ لیا تھا کہ کائنات کی تخلیق اس کے عدم تخلیق سے بہتر ہے، لہذا خدا نے کائنات کو ازالہ ہی سے تخلیق کیا ہے اور کائنات قدیم ہے۔ لیکن اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ ارادہ الہی انسانی ارادہ کے مثال نہیں تو پھر این رشد کا استدلال دھڑام سے گرجاتا ہے۔ خدا کسی بھی دلیل کے بغیر کائنات کو، کسی بھی شکل میں، کسی بھی وقت تخلیق کرنے کا ارادہ کر سکتا ہے۔ وہ کسی بھی دلیل یا وجہ کے بغیر کسی امکان کا انتخاب کر سکتا ہے۔ لہذا ارادہ الہی اور ارادہ انسانی کے اس مقابل سے کائنات کے قدیم ہونے کے منسلک کو طے نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ارادہ الہی کی نوعیت کے بارے میں ہماری تمام باتیں اندازے قیاس سے زیادہ کچھ نہیں (Hourani, 186)۔

## نظریہ صدور کا ابطال

کائنات کی ازلیت کو ثابت کرنے کے لئے مسلم فلسفیوں کے دیگر دلائل کا تعلق ارسطو کے اتباع میں ایک ازلی مادے (pimordial matter) کے وجود کو ثابت کرنے سے تھا، اور مادے کی ازلیت سے وہ کائنات کی ازلیت پر استدلال کرتے تھے۔ غزالی نے ان دلائل کا بھی ابطال کیا۔ غزالی نے مسلم فلسفیوں کے نظریہ صدور پر بھی شدید تنقید کی۔ اس نے یہ ثابت کیا کہ فلسفیوں کا نظریہ صدور محض ایک کہانی (myth) ہے۔ غزالی نے استدلال کیا کہ فلسفیوں نے خدا سے کائنات کے صدور کو جن اصولوں کے تحت قرار دیا تھا وہ ہر مقام پر ان اصولوں کی خلاف ورزی کے مرکتب ہوتے ہیں۔ مثلاً امام غزالی صاحب نے کہا کہ فلسفی ایک سے ایک کے صادر ہونے، کے اصول کو بیان کرتے ہیں لیکن جب وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عقل اول کے ایک قسم کے علم سے فلک اول کا صدور ہوتا ہے تو ان کا اپنا پیش کیا ہوا صول یہاں فیل ہو جاتا ہے، کیونکہ فلسفی اس بات کو مانتے ہیں کہ ہر شے مادے اور صورت کے ملنے سے وجود میں آتی ہے۔ فلک اول ایک سماوی شے (celestial body) ہے جو یقیناً مادے اور صورت پر مشتمل ہے۔ غزالی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر ایک سے صرف ایک صادر ہوتا ہے تو عقل اول کے ایک قسم کے علم سے دو چیزیں کیسے

وجود میں آگئیں۔ غزالی نظریہ صدور کے دیگر اصولوں کو بھی غلط ثابت کرتے ہیں۔ مسلم فلسفیوں نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ علت اور معلول میں منطقی لزوم کا تعلق ہوتا ہے۔ امام غزالی نے استدلال کیا کہ یہ بات درست نہیں اور علت و معلول میں نفیتی لزوم (psychological necessity) کا رشتہ پایا جاتا ہے (Hourani, Part-II, 312-13)۔ اسی طرح امام غزالی استدلال کرتے ہیں کہ علت نہ تو ایک وحدانی /غیر مرکب واقعہ ہوتی ہے اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ ایک معلول ہمیشہ ایک ہی علت سے وجود میں آئے۔ غزالی نے علت کے معلول سے محض منطقی تقدم کے نظریہ کو غلط قرار دیتے ہوئے دعویٰ کیا کہ علت اور معلول دو جدا گانہ واقعات ہوتے ہیں، علت و معلول کے درمیان زمانی فاصلہ ہوتا ہے، اور موقوفی اثر ممکن ہے۔ اس طرح غزالی نے نہ صرف فلسفیوں کے از لیت کائنات کے نظریہ اور نظریہ صدور کا ابطال کیا بلکہ فلسفیوں کے نظریہ تعلیل کی تردید کرتے ہوئے ان دلائل کا بھی ابطال کیا جس کی بنیاد پر مسلم فلسفی حشر اجساد اور مجہزات کے وجود کا انکار کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔ فلسفیوں کے نظریہ صدور کے مضرات میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ ان کے لئے یہ ثابت کرنا ممکن نہیں رہا تھا کہ خدا کو حال پر کائنات میں ہونے والے ہر واقعہ کا بر اہ راست علم ہوتا ہے۔ فلسفیوں کے نظریہ علم کے مطابق علم، عالم اور معلوم کے درمیان ایک اضافت کا نام ہے۔ لہذا ہر علم اپنے عالم میں تغیر پیدا کرتا ہے اور تغیر، عدم کمال (imperfection) کے مترادف ہے۔ لہذا خدا کو جزئیات کا بر اہ راست علم ہونا شان کمال کے منافی ہے۔ خدا کے لئے علم جزئیات یعنی حال پر حاضر کے علم سے انکار غزالی کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ انہوں نے اس مسئلہ پر بھی فلسفیوں پر شدید تنقید کی۔ نظریہ تحقیق کو چھوڑ کر نظریہ صدور کو اپنانے کی وجہ یہ تھی کہ مسلم فلاسفہ، فلسفہ یونان بالخصوص افلاطون اور ارسطو کے فلسفوں سے بہت متاثر ہوئے۔ خدا سے کائنات کے صدور کے ضمن میں الفارابی اور ابن سینا نے جو تکوینی ماذل (cosmological model) پیش کیا اگرچہ ظاہر اس قسم کا ماذل یونانی فلسفیوں نے پیش نہیں کیا تھا تاہم اس کا مأخذ بھی اسلامی تعلیمات کے بجائے بطیموس (Ptolemy) کا فلکیاتی نظریہ تھا۔ الفارابی اور سینا کے دور میں بطیموسی نظریات کو اپنے وقت کی سائنسی فلکیات (scientific cosmology) ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ اس فلکیات کے مطابق کائنات تو (9) آسمانی کروں، اور چاند، سورج، مریخ، زہرہ، عطارد اور دیگر سیاروں اور ستاروں پر مشتمل تھی۔ بطیموس نے آسمانوں پر سیاروں کے مقامات کی کامیابی کے ساتھ نشاندہی کی (ہانگ 1992, 14)۔ اس کے کوئی تائی ماذل کی

بنیاد پر چاند اور سورج گر ہن کے مظاہر کی تشریف اور صحیح پیش گوئی کرنا ممکن تھا۔ بطیموس کا کونیاتی ماڈل علمی سطح پر راجح تھا۔ مسلم فلسفیوں نے نظریہ صدور کی جو سکیم بیان کی ہے وہ بطیموس کی فلکیات پر منی ہے۔ قرآن پاک میں سات افلاک کی تخلیق کا ذکر ہے لیکن فارابی اور سینا کا فلکیاتی ماڈل تو (9) سماوی کروں پر مشتمل ہے۔ انہوں نے اپنے نظریہ صدور کی سکیم کو قرآن کی فلکیات سے ہم آہنگ کرنے کی بجائے بطیموس کی سائنسی فلکیات سے ہم آہنگ کرنے کو ترجیح دی۔ سولھویں صدی کی ابتداء میں پولینڈ کے ایک پادری کو پرنیکس نے کائنات کا ایک نسبتاً سادہ ترمادل پیش کیا جس میں بطیموس کے سماوی کروں کے تصور سے نجات حاصل کر لی گئی۔ ستر ہویں صدی کے آغاز پر کیپلر اور گیلیلیو کی تحقیقات نے ارض مرکزی نظریہ مسترد کر کے ار سطھ اور بطیموس کی فلکیات کو اور ضرب لگائی۔ ستر ہویں صدی کے آخری ربع میں نیوٹن نے کائنات کے بارے میں ایک جامع نظریہ پیش کیا جس کے لئے پیچیدہ ریاضیات بھی تشكیل دی۔ نیوٹن کے نظریات سائنسی فلکیات کی حیثیت سے کم و بیش دو صدیوں تک راجح رہے۔ انسیوں صدی کے اختتام پر آئن شائائز نے نظریہ اضافت (theory of relativity) کی صورت میں ایک نظریہ پیش کیا جو جدید کاسمو لو جی کی صورت میں اب تک راجح ہے (1992, 23)۔ اس اعتبار سے سینا اور فارابی کے نظریہ صدور کی بنیاد جن سائنسی نظریات پر تھی وہ بھی مسترد ہو چکے ہیں۔ چنانچہ نظریہ صدور، اور خدا کے علم جزئیات، مجرزات اور حشر اجساد سے انکار کے بارے میں فارابی اور ابن سینا کے نظریات جس بنیاد پر استوار تھے وہ بنیاد ہی ختم ہو چکی ہے۔ مذہب کی تشكیل جدید کے کسی نظریہ کی بنیاد اگر سائنسی اور فلسفیانہ بنیاد پر استوار کی جائے گی تو وہ صرف اس وقت تک ہی قائم رہ سکے گی جب تک یہ سائنسی اور فلسفیانہ نظریات قصہ ماضی نہیں بن جاتے۔

## 2- خدا کے علم جزئیات سے انکار کا مسئلہ

الفارابی اور ابن سینا نے اس بات سے انکار کیا کہ خدا کو حال پر ہونے والے زمانی واقعات کا براہ راست علم ہوتا ہے۔ اس نے یہ نقطہ نظر اختیار کیا کہ خدا کا علم ازلی ہے اور واحد ہے۔ خدا اپنے آپ کو ہمیشہ سے جانتا ہے اور اپنے آپ کو جاننے سے ہی تمام ممکنات کا علم رکھتا ہے۔ تمام جزوئی واقعات کے بارے میں اسے ازل سے ہی علم ہے۔ اس طرح الفارابی نے جزوئی واقعات کے براہ راست علم کا ہونا خدا کے لئے ناممکن قرار دیا (شیدائی 189, 188)۔ اگرچہ ابن سینا کا نظریہ الفارابی سے مختلف نہیں ہے تاہم وہ اسے مختلف انداز میں اس

طرح بیان کرتا ہے کہ اس بات کا شک پیدا نہیں ہوتا کہ وہ خدا کے علم جزئیات سے انکار کر رہا ہے۔ لیکن وہ اس کو فلسفیہ طور پر ثابت کرنے کے لیے جو دلائل دیتا ہے، وہ بالآخر خدا کے علم جزئیات سے انکار پر ہی منجھ ہوتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ ابن سینا نے حقیقت یا ہستی کو دو حصوں، عالم افلک (celestial world) اور عالم کون و مکان (terrestrial world) میں تقسیم کر دیا تھا۔ ابن سینا کے نظریہ تنوین کے مطابق عالم سماوی میں پائی جانے والی ہر ہستی (entity) یا واقعہ (event) اپنی نوع کی واحد ہستی یا واقعہ ہوتے ہیں۔ مثلاً عقل اول اپنی نوع کی واحد ہستی ہے۔ اسی طرح سے فلک اول بھی اپنی نوع کا واحد ممبر ہے۔ ابن سینا نے بطیموس کے اتباع میں اپنی تکوینیات میں یہ بھی بتایا تھا کہ چاند، سورج، مرخ اور دوسرے معلوم ستارے کسی نہ کسی فلک سے تعلق رکھتے ہیں، چنانچہ یہ بھی آسمانی اجسام ہیں، اور جب چاند یا سورج گر ہن گلتا ہے تو یہ بھی ایک سماوی واقعہ ہوتا ہے۔ ابن سینا نے استدلال کیا کہ آسمانی ہستیوں اور اجسام کی طرح سماوی واقعات بھی اپنی نوع کے واحد اور یکتا افراد ہوتے ہیں۔ ابن سینا نے خدا کے علم کے بارے میں فقط نظر اختیار کیا کہ خدا کا علم نہ تو حسی نوعیت کا ہو سکتا ہے، اور نہ ہی عقلی نوعیت کا جس میں مقدمات کے ذریعے نتائج کو اخذ کیا جاتا ہے، بلکہ خدا تمام جزئیات کو ایک کلی علم کے ذریعے جان لیتا ہے۔ (God knows particulars but in a universal way.) افراد کی ماہیت (essences) کا علم ہوتا ہے۔ اشیاء کی ماہیت، اشیاء کی نوع اور جنس کے علم پر مشتمل ہوتی ہے اور یہ علم تمام اشیاء کی فطرت کا ایک کلی (universal and general) علم ہوتا ہے۔ اب اگر کسی جنس کی ایک سے زیادہ انواع یا کسی نوع کے ایک سے زیادہ افراد ہوں تو اس جنس یا نوع کے کلی علم کو اس جنس کی تمام انواع یا اس نوع کے تمام افراد کے انفرادی، جزوی علم کے متراff قرار نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن اگر کسی جنس کی ایک ہی نوع اور اس نوع کا ایک ہی ممبر ہو تو اس جنس کا کلی علم اس فرد کے کمل علم کے متراff قرار دیا جاسکتا ہے۔ ابن سینا یہی فقط نظر اختیار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دائرہ ہائے افلک یعنی عقل اول سے عقل دہم تک پائے جانے والے تمام افراد چونکہ اپنی جنس اور نوع کے واحد ممبر ہیں۔ اس لئے خدا کلی علم کے ذریعے ان تمام اشیاء، افراد، اور واقعات کا برادر است، انفرادی اور کمل علم رکھتا ہے۔ زمان و مکان کی دنیا میں پائے جانے والے تمام افراد اور اشیاء اور واقعات کی انواع اور اجناس کا منجھ چونکہ عقل دہم ہوتی ہے اور

عقل دہم بھی اپنی نوع اور جنس کے اعتبار سے ایسا فرد (entity) ہے جس کا کلی علم این سینا خدا کے لیے ثابت کرچکا ہے چنانچہ خدا کا عقل دہم کے بارے میں براہ راست کلی علم ان تمام اشیاء، افراد، واقعات اور ان کی انواع و اجناس کے براہ راست علم پر بھی محیط ہو گا جن پر یہ مشتمل ہے۔ لہذا این سینا استدلال کرتا ہے کہ خدا تمام جزئیات کا علم رکھتا ہے۔ ایک ذرہ بھی اس کے علم سے باہر نہیں۔ لیکن وہ کلی طریقے سے تمام جزئیات کو جانتا ہے (Michael E, 302, 305)۔

اہن سینا کے نظریہ تکوین کے مطابق عالم سماوی میں دس عقول، نو افلاک اور ان افلاک کے ساتھ چند سیارے ہیں جنہیں اپنی نوع کے واحد افراد قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس طرح اہن سینا کے نظریہ کے مطابق خدا تعالیٰ کو جن ہستیوں کا براہ راست علم ہو سکتا ہے ان کی تعداد تیس کے قریب ہی ٹھہرتی ہے۔ اگرچہ اہن سینا یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ عقل دہم کے براہ راست علم سے خدا عقل دہم سے وجود میں آنے والی تمام کائنات اور اس کی کثرت کو بھی جان لیتا ہے لیکن وہ اسے ثابت کرنے میں کامیاب ہو نہیں پاتا۔ عقل دہم سے وجود میں آنے والی کائنات میں کوئی شےی ایسی نہیں جو اپنی نوع کا واحد فرد ہو۔ ہر جنس بہت سی انواع اور ہر نوع بے شمار افراد پر مشتمل ہے۔ اس طرح خدا کا براہ راست عقل دہم کو جان لینا، ہر فرد، شے یا انفرادی واقعے کے براہ راست علم کے مترادف نہیں ہو سکتا۔ غزال بالکل درست کہتا ہے کہ یہ فلسفی خدا کے علم جزئیات کے منکر ہیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ وہ 'عَالِيَّ الْقَيْبُ وَالشَّهادَةُ' ہے۔ (القرآن، 39:46) صرف 'غیب' ہی کا نہیں، 'حاضر' کا بھی علم رکھتا ہے۔ حال پر موجود اشیاء و افراد کے 'حاضر' ہی کے علم کو فلسفیہ اصطلاح میں 'علم جزئیات' کہتے ہیں۔ ارسطو کے نظریہ تعلیل کو قبول کرنے اور نظریہ تخلیق کے بجائے نظریہ صدور کو اختیار کرنے کے نتیجے میں مسلم فلسفیوں کو مجذرات اور حشر اجساد کے امکان سے بھی انکار کرنا پڑتا۔ علت اور معلوم میں منطقی لزوم کا تعلق تسلیم کیا جائے تو کائنات میں ہونے والا ہر واقعہ محض فطری واقعہ (natural event) قرار پائے گا اور اگر مجرے سے مراد مافوق الغطرت واقعہ (supernatural event) ہے تو اس کا ہونانا ممکن ٹھہرے گا۔ خدا کے صاحب ارادہ ہستی ہونے سے انکار کا نتیجہ بھی یہ نکلتا ہے کہ خدا کائنات میں اپنے آزاد ارادے سے کسی مداخلت پر قادر نہیں۔ خدا کا تصور علت العلل کی حیثیت سے کیا جائے، علت اور معلوم میں منطقی لزوم ہو، تو کائنات میں منطقی جبریت چھا جاتی ہے۔ نہ خدا آزار رہتا ہے نہ انسان۔ دعاوں اور انجوؤں کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ خدا اور بندے کا تعلق

جو مذہب کی روح ہے، اس کا انکار کرنا پڑتا ہے۔ ارسٹو کے نظریہ علت کو قبول کرنے کا ایک نتیجہ یہ بھی برآمد ہوا کہ فلسفیوں کو حشر اجساد کا بھی انکار کرنا پڑا۔ اگر علت اور معلوم میں منطقی لزوم کا تعلق ہوتا ہے تو ایک خاص معلوم ایک ہی خاص علت سے وجود پذیر ہو گا۔ انسان کا ظہور اور پیدائش جن خاص علتوں کے سبب اس دنیا میں ہوا ہے، حشر کے روز بھی اگر انہیں سلسلہ ہائے علت کے تحت ہونا ہے تو حشر اجساد (bodily resurrection) کے لئے اتنا ہی وقت درکار ہو گا جتنا کہ اس دنیا میں انسان کے ظہور اور اس کی نسلوں کی پیدائش میں صرف ہوا۔ لہذا حشر اجساد ممکن نہیں۔ حشر محض روحانی (spiritual) نوعیت کا ہو گا۔

## نظریہ علت کا استرداد

غزالی نے بالکل درست طور پر سمجھا کہ مسلم فلسفیوں کے ان نظریات کا سبب ارسٹو کے نظریہ علت کو قبول کرنا ہے، چنانچہ غزالی نے اسے مسترد کرنا ضروری سمجھا۔ غزالی نے دعویٰ کیا کہ علت اور معلوم کے درمیان منطقی لزوم کے تعلق کا نظریہ غلط ہے۔ ان کے درمیان محض نفسیاتی لزوم کا تعلق ہوتا ہے۔ ہم واقعات کو ایک ساتھ ہوتا دیکھتے ہیں اور ان کے درمیان لزوم کا تعلق قائم کر لیتے ہیں (شیدائی 1988، 195)۔ مثلاً یہ بالکل ممکن ہے کہ پانی پیا جائے اور پیاس نہ بچے، آگ میں ہاتھ ڈالا جائے اور ہاتھ نہ جلے۔ جدید دور میں مشہور فلسفی ہیوم نے بھی غزالی ہی کے اس نظریہ کی تصدیق کی۔ ہیوم نے علت اور معلوم میں منطقی لزوم کے تعلق کا انکار کیا اور اسے نفسیاتی لزوم پر محمول کیا۔ غزالی نے فلسفیوں کے واحد علت کے نظریہ کا بھی ابطال کیا۔ غزالی نے کہا کہ ایک معلوم کا ایک سے زیادہ علتوں سے وجود پذیر ہو سکنا بالکل متصور ہے۔ موت ایک معلوم ہے، ایک سے زیادہ علتوں سے پیدا ہو سکتا ہے۔ جدید دور میں (Mill) نے اپنے کثرت الحعل کے نظریہ (doctrine of the plurality of causes) کی صورت میں غزالی کے نظریہ کی تصدیق کی۔ غزالی نے مسلم فلسفیوں کے اس تصور کی بھی تردید کی کہ علت ایک وحدانی واقعہ (unitary event) ہوتی ہے۔ جدید دور میں غزالی کے اس نظریہ کا اثبات برٹنیڈر سل نے کیا۔ غزالی نے استدلال کیا کہ خدا صاحب ارادہ ہستی ہے اور صاحب ارادہ ہونا اس کی شان کمال کے عین مطابق ہے۔ کائنات کو اس نے اپنے آزاد ارادے سے تخلیق کیا ہے۔ علت اور معلوم میں کوئی منطقی لزوم نہیں پایا جاتا۔ قانون علیت قدرتِ الہی کے تابع ہے، قدرت

اہلی قانون علیت کے تابع نہیں۔ لہذا معجزات کا صدور بالکل ممکن ہے۔ حشر اجساد کے بارے میں غزالی نے استدلال کیا کہ ضروری نہیں قیامت کے دن انسانوں کا دوبارہ زندہ کیا جانا علتوں کے اسی سلسلے کے تحت ہو جس کے تحت اب انسانوں کی پیدائش ہوتی ہے۔ ممکن ہے علتوں کا کوئی نیا نظام موجود ہو جو فی الوقت ہمارے علم میں نہ ہو اور قیامت کے روز رو بے عمل آئے یا خدا قیامت کے دن کوئی نیا نظام وجود میں لے آئے۔ امام غزالی صاحب نے استدلال کیا کہ حشر اجساد قطعاً محال (logically impossible) نہیں۔

## امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ — نظریہ تسلسل بالآثار

خدا اور کائنات کے تعلق کے حوالے سے ہم ازیلت (co-eternity) کا جو نظریہ پیش کیا جاتا ہے، جس کے مطابق کائنات یاما دہ، ہمیشہ سے ایک مطلق اصول کی حیثیت سے، یا ازل ہی سے ذات باری سے صادر ہونے یا حادث ہونے کے اعتبار سے، خدا کے متوازی موجود ہے، اس کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے جو امام ابن تیمیہ نے اپنے نظریہ 'تسلسل بالآثار' (doctrine of the continuity of effects) میں پیش کی۔ این تیمیہ کا نظریہ تھا کہ خدا نے کائنات کو یقیناً اپنے ارادے سے تخلیق کیا ہے، اور اس کی صفت خالقیت اور تمام دیگر صفات حقیقی اور ازلي ہیں۔ لہذا اگر یہ نظریہ اختیار کیا جائے کہ ذات باری اور صفات باری تو ازل سے موجود ہیں لیکن کائنات یا وہ ما دہ جس سے یہ تخلیق ہوئی، ازل سے موجود نہیں اور اپنے ہونے سے پہلے کائنات کسی بھی شکل میں موجود نہ تھی، یعنی وجود میں آنے سے پہلے یہ عدم مطلق کی حالت میں تھی، تو یہ ماننا پڑے گا کہ خدا کی صفت خالقیت اور دیگر صفات، تخلیق کائنات کا عمل شروع ہونے سے پیشتر تعطل کی حالت میں تھیں۔ این تیمیہ کے خیال میں صفات باری کے لئے رکود و تعطل محال ہے۔ این تیمیہ کا نظریہ ہے کہ صفات باری نے، جن میں صفت خالقیت بھی شامل ہے، ازل ہی سے کسی نہ کسی صورت میں اپنا اظہار ضرور کیا ہے۔ لہذا اظہار صفات کی بناء پر وجود میں آنے والے آثار (effects) کسی نہ کسی صورت ازل سے موجود ضرور ہے ہیں۔ مادہ اگرچہ فی نفسه حادث ہے اور یہ عالم بھی بہ حیثیت مجموعی قدیم نہیں، تاہم اللہ تعالیٰ کی صفت تخلیق نے ہر لمحے کچھ نہ کچھ پیدا ضرور کیا ہے، اور ازل سے تا ابد ان کا یہ عمل بغیر کسی خلل اور انقطع کے جاری رہے گا (ندوی، 45-46)۔ این تیمیہ کا نظریہ ہے کہ اگرچہ ہر حادث شے یا واقعہ مسبوق بالعدم ہے، مگر یہ عدم ایسا ہے کہ اس کے ساتھ ایک وجود اس طرح پیوستہ ہے کہ ان کے مابین وقت اور زمان کا کوئی خلاء باقی نہیں رہتا جس پر واضح اور سمجھ آنے والے عدم کا اطلاق کیا جاسکے (ندوی، 48)۔

چنانچہ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ مستقل بالذات اور متعین عدم کا کوئی وجود نہیں۔ عدم، محض اضافی ہے۔ عدم کے معنی محض کسی شے کے نہ ہونے کے ہیں۔ صفات باری کے اظہار میں کوئی قتل قبل تسلیم نہیں اور اللہ تعالیٰ کی قدرت خلق ازل سے جاری ہے۔ اگرچہ ہر حادثہ مسبوق بالعدم ہے لیکن کوئی بھی انفرادی واقعہ خدا کی ذات کے ساتھ ہم از لی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ جوبات ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ خدا کی صفت خالقیت کے دوام کی وجہ سے اس کے آثار و نتائج بھی بحیثیت مجموعی دائی ہو گئے ہیں اور ابن تیمیہ کے خیال میں اس بات کو ماننے میں کوئی حرج نہیں (ندوی، 20)۔ ارسطو نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ خالص صورت اور خالص مادہ کائنات کے دو مطلق اصول ہیں جو ازل سے ایک دوسرے کے متوالی موجود ہیں۔ خالص صورت کو وہ خدا کا نام دیتا ہے۔ خالص مادہ اس کے نظریے کے مطابق اشیاء کی صورت میں ڈھل جانے کی ایک استعداد کا نام ہے، تاہم یہ ہمیشہ سے موجود ہے اور خدا نے اسے تحقیق نہیں کیا۔ مطلق صورت کمال مطلق کی حامل ہونے کی بناء پر خود غیر متحرک (unmoved & immutable) ہے لیکن اس کے کمال مطلق کی کشش سے مادے میں صورت کی طرف حرکت پیدا ہوتی ہے اور اشیاء وجود میں آتی ہیں۔ اگرچہ کوئی شے عبدۃ ازل نہیں لیکن مادے اور صورت کے امترانج سے اشیاء کے وجود میں آنے کا سلسلہ ازل سے جاری ہے۔ اسلئے کائنات بحیثیت مجموعی از لی ہے۔ ہم از لیت کے نظریے کی ایک صورت وہ ہے جو ارسطو سے پہلے افلاطون نے پیش کی۔ افلاطون عالم امثال میں پائے جانے والے تصورات میں اگرچہ صرف واحد مطلق کے تصور کو خدا کا نام دیتا ہے تاہم دیگر تمام تصورات کو بھی از لی جواہر کی حیثیت دے کر خدا کے ساتھ ہم از لی (۵۰-۲۰) خدا کا نام دیتا ہے۔ ان تصورات میں مادے کا مجرد تصور بھی شامل ہے۔ اگرچہ افلاطون کی ما بعد الطیعت کے مطابق یہ کائنات عالم امثال کی ایک ناقص نقل ہے لیکن یہ نقل بھی ازل ہی سے موجود ہے۔ اس طرح افلاطون کی ما بعد الطیعت بھی کائنات کو خدا کے ساتھ ہم از لی بنا دیتی ہے۔

## نظریات کا تقابلی جائزہ

- تحقیق کائنات کا نظریہ واضح طور پر ایک مستقل بالذات عدم کو تسلیم کرتا ہے۔ اس نظریے پر بنیادی اعتراض جو پیش کیا گیا وہ یہ تھا کہ صفت ارادہ خدا کے کمال مطلق کے منافی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ غزالی نے اس اعتراض کو مضبوط دلائل کے ساتھ مسترد کیا۔ افلاطون اور ارسطو کے نظریات کے مطابق کسی مستقل بالذات عدم کا کوئی وجود نہیں۔ خدا کے ساتھ ساتھ مادہ ازل سے موجود ہے اور

ازل سے ہی اشیاء وجود میں آ رہی ہیں۔ ارسٹو کا نظریہ خدا اور کائنات کو متوالی طور پر موجود ثابت کرتا ہے۔ جو متوالی طور پر موجود ہواں پر قدرت ہونا ممکن نہیں۔ اس طرح کائنات خدا کے ساتھ ہم ازلي قرار پاتی ہے۔ ابن سینا اور فارابی کے نظریہ صدور کے مطابق خدا کائنات کی علت اولیٰ ہے۔ چونکہ ابن سینا کے نظریہ علت کے مطابق، علت و معلوم میں کوئی زمانی و قفقہ نہیں ہوتا، اس لئے خدا سے عقل و ہم تک کا صدور ازلي ہے۔ عقل و ہم میں وہ مادہ (primordial matter) اور صورتیں جاتے ہیں، جن سے کائنات کی تمام اشیاء وجود میں آتی ہیں، اس اعتبار سے یہ بھی ازلي قرار پائیں گے۔ جزوی اشیاء، افراد اور کیفیات چونکہ زمانی و مکانی ہیں اس لئے یقیناً مسبوق بالعدم ہیں، لیکن کائنات بحیثیت مجموعی مسبوق بالعدم نہیں اور خدا کے ساتھ ازلي ہے۔ اس طرح یہ نظریہ بھی ارسٹو اور افلاطون کے نظریے کے مماثل ہے۔ ظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ابن تیمیہ اور ابن سینا کے نظریے ایک دوسرے سے بنیادی طور پر مختلف ہیں کہ ابن سینا کے فلسفے میں افلاطون اور ارسٹو کی طرح ایک ازلي مادے کے وجود کو تسلیم کیا جاتا ہے جبکہ ابن تیمیہ کے ہاں ایسا کوئی ازلي مادہ نہیں پایا جاتا جو تمام اشیاء کی ساخت کا مشترک جزو ہو۔ اس اعتبار سے ابن تیمیہ کے ہاں بیشک تخلیق کا سلسلہ ازل سے جاری ہے تا ہم ہر شے کی تخلیق ایک بے مش (unique) تخلیق قرار پاتی ہے اور کائنات بحیثیت مجموعی کو خدا کے ساتھ مقتلن (co-eternal) قرار نہیں دیا جاسکتا۔ جیسے کہ ہم دیکھیں گے، یہ تاثر درست نہیں۔

- تخلیق کا سلسلہ ازل سے جاری ہو تو خالق اور عمل تخلیق یکساں قدیم قرار پائیں گے۔ جو یکساں تدبیم ہوں وہ متوالی طور پر موجود ہوتے ہیں۔ انھیں ایک دوسرے پر کوئی قدرت نہیں ہوتی۔ ارادہ، آزاد انتخاب کی الیت کا نام ہے۔ کسی شے کے 'کرنے'، 'یانا کرنے' دونوں کا اختیار اس میں شامل ہیں۔ صاحب ارادہ ہستی کو اپنی صفات کے اظہار پر اختیار ہوتا ہے۔ نظریہ تسلسل بالآخر، نظریہ صدور کی مانند ذات باری کے اس اختیار کی نفی کر کے تخلیق کو اللہ تعالیٰ کیلئے غیر اختیاری بنادیتا ہے۔
- صاحب ارادہ ہستی ہونے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ارادہ کرنے کے بعد اس کے 'امر' سے شے وجود میں آئے۔ صفت خالقیت اور دیگر صفات کیلئے رکود و تعطل کا محل ہونا، اس بات کی بھی نفی کرتا

ہے۔ اس مفروضے کو اگر قدرت، کلام، رحم و کرم، سمع، بصر، انتقام، جر، قہر اور دیگر صفات باری کے حوالے سے بھی دیکھا جائے تو اسکی بے معنویت واضح ہو جاتی ہے۔

• درج بالا تمام نظریات ذات باری، صفات باری، اور اسکی تخلیق پر زمان کا یکساں تصور عائد کرتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ یکتا اور بے مثل ہے۔

## از لیت کا مفہوم اور نظریہ تسلسل بالآثار

مغربی فلسفہ میں از لیت کا مفہوم دو طرح سے سمجھا گیا ہے: ۱) سرمدیت (everlastingness) اور ب) ماوراءیت زمان (timelessness)۔ سرمدیت اپنی ماہیت میں زمان طبیعی (serial time) ہے جسے ہم ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم کر کے متصور کرتے ہیں۔ اسے اگر آغاز کی سمت لا محدود (without beginning) دیکھا جائے تو یہ از لیت ہے اور انعام کے اعتبار سے غیر مختتم (unending) دیکھا جائے تو یہ ابدیت ہے۔ نظریہ تسلسل بالآثار بھی، نظریہ صدور کی طرح، اپنے مباحثت میں اسی تصور زمان کو صفات باری، آثار صفات، اور عمل تخلیق پر یکساں عائد اور متصور کرتا ہے۔ کائنات کو حادث مانا، حدوث سے پہلے زمان طبیعی کو مستقل بالذات اور متعین عدم کہنا، اسے ناممکن سمجھنا، ہر ہر شے کو مسبوق بالعدم قرار دینا اور عمل تخلیق کو از لی اور متعین تصور کرنا اسی تصور زمان کو متصور کرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ آثار تخلیق کی از لیت اپنے لئے زمان کے ساتھ مکان کو بھی مستلزم ہے۔ اس طرح زمان کی از لیت مکان کی از لیت کو مستلزم ہے۔ اگر جدید تخلیقی فلسفہ کی روشنی میں دیکھا جائے تو ”مستقل بالذات اور متعین عدم“ ایک بے معنی تصور ہے اور اس سے وابستہ تمام مباحثت بھی بے معنی ہیں۔ ذات باری بے مثل اور یکتا ہے۔ اسے اشیاء کی ممائٹ پر دیکھنا اس کی شان کے منافی ہے۔ اشیاء کی حقیقت تعین ہے۔ تعینات کا خالق تعینات سے ماوراء ہی ہو سکتا ہے۔ (لیس کَمِثْلِهِ شَيْءٌۚ ۱۱: ۴۲) زمان و مکان قطعاً حقیقی ہیں۔ اسی حال کا مستقبل بننے جا رہا ہے۔<sup>22</sup> قیامت کو اگرچہ زینت زمین کو ختم کر دیا جائے گا لیکن زمان و مکان پھر بھی قائم رہیں گے۔ (۱۸:۴۷) قرآن پاک میں ’از لیت‘ کیلئے کوئی لفظ نہیں آیا۔ ابدیت کا لفظ بھی انسانوں کے حوالے سے ہے، ذات باری پر اسکا اطلاق نہیں۔ (۹۸:۰۸، ۷۲:۲۳، ۶۵:۱۱، ۶۴:۰۹)

ذات باری کیلئے نہیں آیا۔ اس لفظ کا اطلاق ذات باری کیلئے کرنا قرآن پاک کے خلاف ہے Iqbal's view

<sup>23</sup> - of Omniscience and human freedom, 136)

## ’مقام وحدت‘ اور ’مقام احادیث‘

قرآن پاک ذات باری کیلئے ’واحد‘ اور ’احد‘ کے الفاظ استعمال کرتا ہے (القرآن، 13:16; 16:163; 37:4; 112:1-4) تخلیق کائنات سے پہلے مقام احادیت ہے۔ احادیت میں تعینات کا کوئی مقام نہیں۔ ذات باری مقام صمدیت میں ہے۔ خواہش، اختیار، آزو، تمباکے پاک۔ پہچانے جانے کی آزو ہے نہ آئندہ غیر میں اپنا حسن و جمال دیکھنے کی تمنا، کائنات کو تخلیق کرنے کا کوئی ارادہ موجود ہے ناکائنات کو تخلیق نہ کرنے کا۔ مقام احادیت میں، اس شان صمدیت کے ساتھ، ذات باری نے چاہا کہ وہ اپنا اظہار فرمائے۔ علم الہی میں تعینات وجود میں آتے ہیں اور امر الہی سے مقام وحدت پر تعینات کا ظہور ہوتا ہے۔ خلوت کا مقام پہلے ہے اور جلوت کا بعد میں۔ مقام احادیت پر ذات باری اپنی ذات سے بھی باطن ہے اور صفات سے بھی باطن ہے، مقام وحدت پر وہ اپنی ذات سے باطن اور صفات سے ظاہر ہے۔ ’احدیت‘ اور ’وحدت‘ کے مقابلات اور صفات باری کے حوالے سے ارادہ، امر، تخلیق میں ترجیحی ترتیب قائم کرنا درست ہے، اسلئے کہ قرآن پاک میں اس کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ (إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَهَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿القرآن، 36:82﴾) اسے انسانی تجربے پر قیاس کرنا درست نہیں اسلئے کہ ذات باری بے مثل ہے۔ موجودہ تمام گفتگو اسلام کے تناظر میں ہو رہی ہے۔ قرآن پاک میں موجودہ زمین اور سات آسمانوں پر مشتمل کائنات ہی کی تخلیق کا ذکر ہے جس سے پہلے عرش اور پانی موجود تھے۔ اللہ تعالیٰ عرش کا بھی رب ہے اور پانی کا بھی خالق۔ عرش الہی خلق کی کینیگری سے تعلق رکھتا ہے یا امر کی کینیگری سے۔ پانی سے اس نے تمام ذی حیات اشیاء تخلیق کیں۔ اگر کوئی قیاس آرائی کرتا ہے کہ موجودہ کائنات ہی پہلی اور واحد کائنات کیوں ہے! اس سے پیشتر اور کائناتیں کیوں نہیں ہو سکتیں! تو بے بنیاد بات کا باری ثبوت سوال لئنده کے ذمے ہی ہو گا۔ ”صفات باری کے لئے روود و قطل محال ہے۔“ کامفروضہ شان صمدیت کے منافی ہے، مقام احادیت پر تو اس اصول کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ صفات کا اظہار اسماء الہی کی صورت ہوتا ہے۔ ارشاد باری ہے: ”اللہ تعالیٰ کو اسکے اسماء الحسنی سے پکارو۔“ کائنات حادث ہے۔ آثار اسماء تعینات ہیں۔ لیکن یہ ذات و صفات باری کے اختیار کردہ عارضی تعینات نہیں۔ تعینات حقیقی ہیں۔ ہر تعین ‘خلق‘ ہے یا ’امر‘۔ (إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَهَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿القرآن، 36:82﴾) ہر تعین کی ایک ابتداء ہوتی ہے، ذات واحد ہر ابتداء سے پہلے ہے۔ ہر تعین کی ایک انتہا ہوتی ہے، ہر انتہا کے بعد وہ ہے۔ (هُوَ الْأَوَّلُ وَالآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿القرآن،

(57:3) ذات باری اور صفات باری تین سے ماوراء ہیں۔ اس میں کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں۔ قُلْ هُوَ

اللَّهُ أَحَدٌ ﴿اللَّهُ الصَّمَدُ﴾ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوَلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُواً أَحَدٌ ﴿112:1-4﴾



## وحدث الْجُود، وحدث الشَّهُودُ اور وحدت شاہدین

خلاصہ مضمون: مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد ابتدائی صدیوں سے ہی روحانیت (Islamic Spirituality) کو اسلام کی روح کے عین مطابق سمجھتی چلی آرہی ہے؛ اسی طرح ہر زمانے میں ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں جنہوں نے اسے اسلامی تعلیمات کے خلاف سمجھا ہے۔ اسلام میں روحانیت سے انکار کیا جائے یا اسے عین اسلام قرار دیا جائے، بات سن کے ساتھ ہو تو اسے نور پھیلے گا، اگر اس کے بغیر ہو تو کنفیوژن پیدا ہو گا۔ قرآن پاک کے حوالے سے بات کرنا سد کے ساتھ بات کرنا ہے کہ اللہ نے اپنے نازل کردہ کلام کو 'لحظ' فرمایا ہے اور حال پر یہ درجہ صرف اور صرف قرآن پاک کو حاصل ہے۔ قرآن پاک اس بات کی تقدیم کرتا ہے کہ مااضی میں اللہ کے نازل کردہ کلام میں تحریف ہو چکی ہے، لہذا سد کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام میں روحانیت کی مختلف شکلوں کیلئے تصوف کا لفظ راجح ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ 'تصوف' یا 'صوفی' کا لفظ قرآن پاک میں کہیں آیا ہے اور نہ ہی کسی آیت سے اخذ ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے 'احسان'، کو ایمان کا عالی ترین درجہ قرار دیکھا اسلام میں روحانیت کا مانع تلاش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ہمارے علم کے مطابق یہ لفظ قرآن پاک میں کہیں بھی ماننے کے کسی درجے (level of believing) کیلئے نہیں آیا۔ اسی طرح اگر 'احسان'، کو 'حسن عمل' کے مترادف قرار دے کر تصوف کو حسن عمل سکھانے کی طریقہ کے معنوں میں 'احسان اسلام'، قرار دیا جائے تو بھی تصوف میں تزکیہ و تقدیم کی تشریح نہیں ہوپاتی۔ حضرت فضل شاہ اپنے وقت کے بہت بڑے روحانی بزرگ تھے۔ تفسیر فاضلی حضرت فضل شاہ کے بیان اور محمد اشرف فاضلی کی تحریر پر مشتمل ہے۔ تفسیر فاضلی قرآن پاک کے حوالے سے بجا طور پر طریقہ شاہدین کے نام سے موسوم کیا جانا چاہئے۔ طریقہ شاہدین، عطا نے تزکیہ اور تقدیم کی طریقہ کا نام ہے۔ اہل روحانیت پر بدعت کا الزام بھی عائد کیا جاتا ہے۔ 'بدعت'، (principle of innovation) قرآنی اصول ہے جو اجتہاد کو الہامی بنیاد فراہم کرتا ہے اور قرآن پاک کی مقرر کردہ حدود کے اندر انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کے چلا، انسانی فکر و تجربہ کے حاصلات کو اللہ کے نازل کردہ علم کے ساتھ مریوط کرنے، اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق اسلامی اصولوں کی نئی تعبیر اور نئے ادراوں کو وجود میں لانے کیلئے اسی لازم ہے۔ مروجہ تصوف صدیوں سے 'وحدث الْجُودی' اور 'وحدث الشَّهُودُ' مکاتب فکر میں تقسیم ہے۔ دونوں مکاتب فکر اپنا نظریہ قرآن پاک کی سند کے بجائے اپنے کشف و مشاہدہ کی بنیاد پر پیش کرتے ہیں۔ کسی بھی نظریہ کے درست ہونے کیلئے اسکی قرآن پاک سے مطابقت لازم ہے۔ تفسیر فاضلی، وحدث الْجُود کو قرآن پاک کے حوالے سے درست نظریہ نہیں مانتی۔ تاہم اس مکتب فکر میں بھی بزرگ عشق رسول کے حوالے سے بہت عالی مقامات پر پائے گئے ہیں اس لئے یہی کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے عشق رسول کو قبول فرماتے ہوئے ان سے درگز فرمائے تو اسے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ تفسیر فاضلی دین میں کسی نئے مکتب فکر کی بنیاد نہیں رکھنا چاہتی، تاہم لفظ 'شاہد' کو اسلام میں روحانیت کا مانع قرار دینے اور اپنے کشف و شہود کے بجائے قرآن پاک کی سند سے بات کرنے کو پیش نظر رکھتے ہوئے تفسیر فاضلی کے نقطہ نظر کو 'وحدث شاہدین'، کہنا موزوں معلوم ہوتا ہے۔ درج

ذیل مضمون میں اسلام میں روحانیت کے مأخذ اور روحانیت کی حقیقت پر تفسیر فاضلی کا نقطہ نظر قرآن پاک کی سند کے ساتھ تشکیل دیا گیا ہے۔

## طریقتِ شاہدین

‘تصوف’ یا ‘صوفی’ کا لفظ نہ قرآن پاک میں کہیں آیا ہے اور نہ ہی کسی آیت سے اخذ کیا جاسکتا ہے۔ یہ لفظ، ہماری تاریخ میں کیسے داخل ہوا، اس کے بارے میں صرف قیاس آرائی ہی کی جاسکتی ہے۔ جن لوگوں نے اسے ‘صف’، ‘صفہ’، ‘صوف’، یا ‘صفا’ سے مشتق قرار دینے کی کوشش کی، اسے قیاس آرائی ہی کہا جائے گا۔ بعض لوگ اللہ تعالیٰ کیلئے لفظ ‘وجود’، یا ’وجود و مطلق‘ استعمال کر کے بھی اسلام میں روحانیت کا اثبات کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن بے سند بات کبھی علم کا درجہ نہیں رکھ سکتی۔ اگر ’احسان‘، کو ایمان کا سب سے اعلیٰ مرتبہ قرار دیکر تصوف کو ’احسان اسلام‘، قرار دیا جائے تو یہ بھی درست زاویہ نہ گا نہیں۔ یہ لفظ قرآن پاک میں کہیں بھی مانے کے کسی درجے (Level of Believing) کیلئے استعمال نہیں ہوا۔ اگر ’احسان‘، کو ’حسن عمل‘ کے مترادف قرار دے کر تصوف کو حسن عمل سکھانے کی طریقت کا نام دیا جائے تو بھی تصوف میں عطاۓ تزکیہ اور اسکی تقدیق کے پہلو کی وضاحت نہیں ہو پاتی۔ فرمان الٰہی ہے: ”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور قولِ سدید میں بات کرو۔ اللہ تمہارے اعمال کی اصلاح فرمادے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔“ (القرآن، 71:70-73) حسن عمل کیلئے اعمال کا صالح ہونا ضروری ہے، اعمال کے صالح ہونے کیلئے ضروری ہے کہ قولِ سدید ہو۔ قولِ سدید نہ ہو تو اعمال کی اصلاح کا مقام ہی نہیں آسکتا، حسن عمل تو بعد کی بات ہے۔ حسن عمل کی طریقت سکھانے والے کے اپنے قول کے سدید ہونے کی سند کہاں سے آئے گی؟ کیا ’احسان‘، کی مذکورہ تعبیر سے ان باتوں کا جواب دیا جاسکتا ہے؟ ’حب‘، اور ’تذکیہ‘ کے الفاظ قرآن پاک میں آئے ہیں۔ تصوف کو مانے اور نہ ماننے والے دونوں اپنے موقف کی تائید ان الفاظ سے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن دونوں ہی سند کے ساتھ بات نہیں کرتے۔ تفسیر فاضلی ’تصوف‘ یا ’صوفی‘ کے غیر قرآنی الفاظ استعمال کرنے سے اجتناب کرتی ہے۔ تفسیر فاضلی قرآن پاک کے لفظ ’شاہد‘، کو روحانیت کا مأخذ قرار دیتی ہے۔ جسے عرفِ عام میں تصوف کہا جاتا ہے اسے تفسیر فاضلی کے نقطہ نظر سے بجا طور پر ’طریقتِ شاہدین‘ کے نام سے موسوم کیا جانا چاہئے۔

سلسلہ قادریہ کا آغاز حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی المعروف حضرت غوث اعظم رحمت اللہ علیہ سے ہوتا ہے۔ حضرت غوث پاک سے سلسلہ قادریہ کی جس شاہ نما آغاز ہوا وہ زاہدی قادری کہلاتی ہے۔ اسی سلسلہ عالیہ میں حضرت سلطان باھوٰ سے سروری قادری شاہ نما آغاز ہوا۔ حضرت فضل شاہ رحمت اللہ علیہ المعروف بابا جی نور والے خود سلسلہ قادریہ سے تعلق رکھتے تھے لیکن قادری فاضلی / فاضلی قادری شاہ کے بانی تھے۔ آپ انڈیا کے صوبہ مشرقی پنجاب کے ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ 1947ء میں تقسیم بر صغیر پر انڈیا سے ہجرت کر کے پاکستان تشریف لائے۔ ابتداءً فیصل آباد کی تحصیل ماموں کا نجمن میں آباد ہوئے اور پھر مستقل طور پر لاہور تشریف لے آئے۔ آپ کاظمیہ پاک انٹرنیشنل روڈ ہری پورہ پر آستانا قادریہ نور والوں کاظمیہ کے نام سے واقع ہے۔ 23 ربیع الاول 1398ھ جمیری بہ طابق ۳۰ جولائی ۱۹۷۸ء میں آپ نے وصال فرمایا۔ آپ کامزار شریف تھیں پر واقع ہے۔ حضرت فضل شاہ رحمت اللہ علیہ کے ایک خلیفہ ابو الحسن سید محمد یوسف شاہ امجد نوری قادری فاضلی سجادہ نشین نور والوں کاظمیہ پاک صادق آباد شریف، ضلع رحیم یار خان (وصال 2014ء) ہیں۔ آپ کامزار شریف صادق آباد شریف میں واقع ہے۔ آپ کو حضرت فضل شاہ کے سب سے پہلے خلیفہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ حضرت غلام رحمان سیکریٹری صاحب (وصال 2001ء) کو بھی خلافت حضرت فضل شاہ رحمت اللہ علیہ سے عطا ہوئی۔ حضور سیکریٹری صاحب کامزار شریف فیصل آباد کے مضائقات میں ساہیانوالہ روڈ پر واقع موضع رسول پور، چک بانوے (ر-ب) میں ہے۔ حضرت فضل شاہ صاحب کے اپنے صاحبزادے پیر مقبول الہی بھی صاحب اجازت بزرگ ہیں جنہیں حضرت فضل شاہ صاحب نے ماموں کا نجمن ضلع فیصل آباد میں مقرر فرمایا۔ محمد اشرف فاضلی رحمت اللہ علیہ (1940-2016ء) کو بھی اسی سلسلہ کے بزرگ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہ فاضلی قادری کہلانا پسند کرتے ہیں۔ محمد اشرف فاضلی صاحب کاظمیہ پاک 'فاضلی فاؤنڈیشن' کے نام سے پیکر روڈ کوٹ لکھپت لاہور پر واقع ہے۔ آپ کا مزار شریف بھی فاضلی فاؤنڈیشن کے احاطے میں ہے۔ آپ کے وصال کے بعد جناب طاہر فاضلی صاحب آپ کے خلیفہ ہیں۔ حضرت ملک نمس الدین قادری فاضلی (جنہیں خلافت کا شرف حضرت السید ابو الحسن سید محمد یوسف امجد نوری قادری فاضلی صاحب سے عطا ہوا) کے مطابق پیر صاحب کے صاحبزادے حضرت صاحبزادہ رضا حسین صاحب بھی حضرت فضل شاہ کے خلفاء میں شامل ہیں۔ ان کی مرقد شریف حضرت فضل شاہ کے مزار شریف سے متعلق ہے۔ عمر شریف کے آخری حصہ میں حضرت فضل شاہ صاحب کا

معمول تھا کہ تجدید کے وقت قرآن پاک کے ایک رکوع پر بیان، فرماتے تھے۔ جناب محمد اشرف فاضلی، پیر و مرشد کے امر کے مطابق ان بیانات کے نوٹس لیتے اور حضرت صاحب کے عطا کردہ علم کے مطابق انہیں تحریر کر کے دن میں کسی وقت حضرت صاحب کی خدمت میں تصدیق یا تصحیح کیلئے پیش فرماتے۔ محمد اشرف فاضلی صاحب سے پہلے حضرت فضل شاہ کے بیانات جناب غلام رحمان سیکریٹری صاحب تحریر فرماتے تھے۔ پھر یہ شرف جناب محمد اشرف فاضلی صاحب کو بھی عطا ہو گیا۔ قرآن پاک پر بیان کا یہ کام حضرت صاحب کے وصال شریف سے پہلے کامل ہو گیا۔ وصال سے بارہ روز قبل 18 جولائی 1978 کو حضرت فضل شاہ صاحب نے وصیت لکھوائی جس پر محمد اشرف فاضلی صاحب سمیت پانچ افراد کے دستخط ہیں جن میں حضرت فضل شاہ حضور کے بڑے صاحبزادے جناب رضا حسین (مرحوم)، جناب غلام رحمن صاحب، حاجی سلطان احمد اور محمد اعظم صاحب شامل ہیں۔ یہ وصیت مشہور دانشور جناب محمد حنفی رامے کی قلمی ہے۔ اس وصیت میں محمد اشرف فاضلی صاحب کو تفسیر پاک کی اشاعت کا حق اور مالی کفالت کی نوید عطا کی گئی ہے۔ تفسیر فاضلی منزل اول بار اول مطبوعہ 1982 میں 'متاثرات' کے عنوان سے جناب رشید احمد چودھری مالک لکتبہ جدید پر یہیں کا ایک بیان شامل ہے جو بعد کے ایڈیشنوں میں شامل نہیں رکھا گیا۔ رشید احمد چودھری صاحب نے اس بیان میں فرمایا ہے کہ حضرت فضل شاہ صاحب، جناب محمد اشرف فاضلی صاحب کو امام العارفین کہہ کر خطاب کی دعوت دیا کرتے تھے۔ (تفسیر فاضلی منزل اول 1982) حضرت فضل شاہ کے نزدیک قرآن پاک قول ہے۔ اپنی وصیت میں حضرت صاحب نے جناب محمد اشرف فاضلی صاحب کو 'قول کا بادشاہ' کہہ کر آپ کے فہم قرآن کے درجے کی تصدیق فرمائی۔ یہ تفسیر پاک، تفسیر فاضلی کے نام سے سات منازل پر مشتمل ہے اور مکمل چھپ چکی ہے۔ پہلی منزل 1982ء اور ساتویں منزل 1998ء میں طبع ہوئی۔ اشفاق احمد خان اور انگلی الہیہ محترمہ بانو قدسیہ نے اپنے اکثر ڈراموں اور ناولوں میں باباجی، انگلی بابا جی، باباجی نور والے کہہ کر آپ ہی کاذ کر کیا ہے۔ اشفاق احمد خان کی وفات کے بعد چھپنے والی کتاب 'بابا صاحبا' کا انتساب 'نوروالوں کے ڈیرے' کے نام ہے۔ تفسیر فاضلی تو حضرت فضل شاہ رحمت اللہ علیہ کے وصال کے بعد چھپی، تاہم علمی ادبی حلقوں میں حضرت صاحب کا تعارف مشہور صحافی اکمل علیی، اور مشہور ادیب اشفاق احمد خان اور محترمہ بانو قدسیہ کے ذریعے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ تفسیر فاضلی کی انگلش ٹرنسلیشن کا کام جاری ہے۔ اس وقت تک پانچ منازل چھپ چکی ہیں۔ چھٹی زیر طبع ہے۔ ساتویں منزل پر کام ہو رہا ہے۔

متن قرآن کی تفہیم حضور نبی کریم ﷺ نے سات منزل میں فرمائی تھی۔ تفسیر فاضلی کی جملوں کے تعین میں اسی علم الہی کا اتباع کیا گیا ہے۔ ایک سنبھالہ طالبعلم کی حیثیت سے ہم نے فلسفہ پڑھا تھا اور لاہور کے ایک سرکاری کالج میں فلسفہ کے مضمون میں لیکچر رتھے جب 1985ء کے آخر میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے جناب محمد اشرف فاضلی صاحب کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ فلسفہ کے مضمون میں مسلم فلسفہ بھی پڑھایا جاتا ہے۔ کیفیت یہ تھی کہ سالہ سال سے ذہن میں بہت سے سوالات تھے جن کا کوئی قابلِ اطمینان جواب نہیں مل سکتا تھا۔ حضرت صاحب سے پہلی ہی ملاقات میں ایسا علم عطا ہوا جو دماغ کے اندر اترتا چلا گیا۔ اس ملاقات میں جو سوالات پوچھے گئے ان میں سے ایک تصوف کے بارے میں تھا۔ اس موضوع پر جو علم عطا ہوا، جسے بعد میں مزید جلا ملتی چلی گئی، اسے ہم نے اپنے 2012ء میں شائع ہونے والے مضمون 'The Way of Shahideen: The Construction of a Qur'anic Theology of Sufism in Tafseer-e-Fâzli' میں پیش کیا ہے۔ درج ذیل مضمون مذکورہ موضوع پر ایک جدید تو سیعی تحریر ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے مقابل وحدت شاہدین، کاظمیہ پیش کیا گیا ہے۔ 1986 سے 1998 تک تفسیر فاضلی کے مسودات کی پروف ریڈنگ کی سعادت حاصل رہی، جس کی تصدیق جناب محمد اشرف فاضلی صاحب کی طرف سے جلد چہارم مطبوعہ 1995 اور جلد ہفتم مطبوعہ 1998 میں فرمائی گئی ہے۔ اسکے بعد تفسیر فاضلی کی انگلش ٹرانسلیشن کے کام کے ساتھ بحیثیت مدیر وابستہ ہونے کا شرف حاصل رہا۔ حضرت صاحب کے وصال تک (قریباً 28 سال) جزل سیکریٹری فاضلی فاؤنڈیشن کی حیثیت سے خدمات سرانجام دینے کا شرف حاصل رہا۔ زیر نظر تحریر میں تصوف کی حقیقت، قرآن میں اسکے مانع، اور وحدت الوجود اور وحدت الشہود پر تفسیر فاضلی کا نقطۂ نظر تنکیل دینے کی کوشش کی گئی ہے جسے وحدت شاہدین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ کاوش جناب محمد اشرف فاضلی صاحب کے حکم پر کی گئی اور آپ ہی کی تصدیق سے شائع ہوئی۔ موجودہ تحریر حضور حضرت ملک شمس الدین قادری فاضلی صاحب کی بارگاہ سے تصدیق کے بعد شائع کی جا رہی ہے۔ اس تصدیق اور نظر ثانی سے پہلے یہ مضمون، احکامت 2012-2014 میں تین اقساط میں شائع ہو چکا ہے۔ صاحبانِ علم کی طرف سے جو سوال اٹھائے گئے ان کا جواب دیا گیا ہے، جن نکات کی وضاحت کیلئے کہا گیا تھا، ان کی وضاحت کی گئی ہے۔

## معاملات دین میں سند سے بات کرنے کا طریقہ

تفسیر فاضلی کے مطابق قرآن پاک قول ہے اور 'الحق' ہے۔ قرآن پاک کے حوالے سے بات کرنا سند (authority) کے ساتھ بات کرنا ہے۔ مصنف کو یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں بالعموم اور تصور میں بالخصوص سند کے ساتھ بات کرنے کی روایت کبھی پروانہ چڑھ سکی۔ سند کے بغیر بات کرنا دراصل قیاس آرائی ہے، تجھیں و ظن ہے۔ تجھیں و ظن (conjecture) سے علم میں کچھ اضافہ نہیں ہوتا۔ ایک کے تجھیں و ظن کو دوسرا کے تجھیں و ظن سے بہتر یا کمتر قرار دینا بھی تجھیں و ظن ہے۔ اس سے اپنا بھلا ہو سکتا ہے نہ کسی کا۔ اللہ کا فرمان ہے: ظن کسی کو حق سے مستغنی نہیں کر سکتا۔ (القرآن، 10:36) 'الحق' ہونے کی حیثیت سے صرف قرآن پاک ہی کو سند کا درجہ حاصل ہے۔ کوئی قول، ارشاد، اصول، فہم، دعویٰ، نظریہ، تعلیمات، ہدایت، رہنمائی، روایت، یا کشف و شہود کی کوئی تعبیر اگر 'الحق' کے مطابق ہے تو حق ہے، اگر اس سے مقصاد ہے تو ناحق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو زوج ہج پیدا کیا ہے۔ 'قول'، کا جوڑا (complement)، 'عمل' ہے۔ (ماخوذ، القرآن، 71-70:33) تفسیر فاضلی کے محترم مصنفوں کا ارشاد ہے: جس قول کا عمل شاہد نہ ہو وہ سچا ثابت نہیں ہوتا۔ قرآن پاک نے مسلمانوں کو بولنے کا جو علم عطا فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ: "اے ایمان والو! وہ بات کیوں کہتے ہو جس پر تم خود عمل نہیں کرتے۔ اللہ کے نزدیک یہ نہایت قابل نفرت بات ہے کہ تم وہ کہو جس پر تم خود عمل نہیں کرتے۔" (القرآن، 3-2:61) تفسیر فاضلی اس اصول کا اطلاق زندگی کے تمام پہلوؤں پر کرتی ہے۔ فاضل مصنفوں کے مطابق اللہ کے نزدیک ایسی تبلیغ بھی ناپسندیدہ ہے جس پر ہادی کے اتباع میں مبلغ کا اپنا عمل نہ ہو۔ اللہ کی طرف رجوع لانے والے کا اتباع کیا جائے، اپنی برتنی ہوئی بات کی جائے، کسی بات پر عمل کرنے سے جو فائدہ پہنچا ہے اس میں دوسروں کو شریک کیا جائے، تو یہ تبلیغ اللہ کے فرمان کے مطابق ہوگی۔ حق اور ناحق کے درمیان فرق کرنے کی اہلیت علم ہے۔ قرآن پاک کو 'الحق'، مانا جائے مگر بات سند کے بغیر کی جائے تو اختلافات ہی پیدا ہوں گے۔ علم والوں کے نزدیک تحریر یا تقریر کا منشاء، قرآن پاک کی سند کے ساتھ حق کو روشن کرنا ہی ہوتا ہے۔ (ماخوذ، القرآن، 5:15) مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد ابتدائی صدیوں سے ہی روحانیت (Islamic Spirituality) کو اسلام کی روح کے عین مطابق سمجھتی چلی آ رہی ہے؛ اسی طرح ہر زمانے میں ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں جنہوں نے اسے اسلامی تعلیمات کے خلاف سمجھا ہے۔ اسلام میں روحانیت سے انکار کیا جائے یا اسے عین اسلام قرار دیا

جائے، بات سند کے ساتھ ہو تو اس سے نور پھیلے گا، اگر اس کے بغیر ہو تو کنفیوژن پیدا ہو گا۔ آئیے دیکھتے ہیں کہ تفسیر فاضلی کے فاضل مصنفوں اس موضوع پر سند کے ساتھ کیا علم عطا فرماتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضور نبی پاک ﷺ کو شاہد بن کے بھیجا ہے۔ آپ ماننے والوں کو بشارت دیتے ہیں، نا ماننے والوں کو انذار کرتے ہیں۔ تمام انبیاء کرام شاہد بن کر بھیج گئے۔ جو شاہد کی بشارت یا انذار کو مان لیتا ہے وہ ماننے والوں (believer) ہو جاتا ہے۔ شاہد ماننے والوں پر آیات تلاوت فرماتا ہے، انھیں تزکیہ عطا کرتا ہے، اور کتاب اور حکمت کا علم عطا فرماتا ہے۔ (القرآن، 16:4، 3:164) شاہد، کلام الہی تلاوت فرماتا ہے اور اسکی اپنی ذاتِ اقدس اس پر عمل کا نمونہ ہوتی ہے۔ اللہ نے اپنے رسول کو معلم کتاب و حکمت ہونے کا شرف عطا فرمایا ہے۔ تفسیر فاضلی کے مطابق رسول پاک ﷺ نے اپنے تبعین کو تلاوتِ آیات کے بعد تزکیہ عطا کیا اور کتاب و حکمت کا علم عطا فرمایا، اور ان میں سے چنے ہوئے لوگوں کی تقدیق فرمائی اور یہ سلسلہ تاقیامت جاری رہے گا۔ فرمایا گیا ہے: اللہ نے حضرت طالوت کو چن لیا اور انہیں علم اور جسم کے اعتبار سے زیادہ عطا فرمایا؛ (القرآن، 2:247) اللہ نے حضرت بی بی مریم علیہ السلام کو چن لیا اور طاهر کیا، اور جہان کی دیگر عورتوں پر چن لیا۔ (القرآن، 3:42) اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم، حضرت نوح، اور آل ابراہیم اور آل عمران کو عالمیں سے چن لیا، جو ایک دوسرے کی ذریت تھے۔ (القرآن، 3:33) ہر زمانے میں اللہ چن لیتا ہے بعض مرد اور خواتین کو، تاکہ لوگ ان کے ذریعے اللہ کی رضا کو پاسکیں۔ اللہ کے چنے ہوئے کو مان لینا باعثِ راحت ہوتا ہے۔ چنے ہوئے کے ذریعے اللہ کو مانا جائے توحید ایت عطا ہوتی ہے۔ قرآن پاک مسلمانوں کو تین گروہوں میں تقسیم کرتا ہے: اصحابِ ائمین (جنہیں اعمالنامے دائیں ہاتھ میں دئے جائیں گے)، اصحابِ الشہاد (جنہیں اعمالنامے بائیں ہاتھ میں دئے جائیں گے)، اور السالقون الاؤلوں (سبقت کرنے والے اول حضرات)۔ قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے ”اور تم تین گروہوں میں بٹ جاؤ گے۔“ (القرآن، 7:56-10:56) تفسیر فاضلی اس آیت کریمہ کی تفسیر اس طرح کرتی ہے: حال پر بھی لوگوں کی تینوں قسمیں موجود ہیں۔ لیکن توفیق کی موجودگی اور اصلاح کیلئے مہلت موجود ہونے کی وجہ سے انہیں الگ الگ نہیں کیا جاتا۔ قیامت کے دن جزا کیلئے تینوں قسموں کا الگ الگ ہو جانا ضروری ہے۔<sup>24</sup> مہاجرین و انصار سے سبقت کرنے والے اول حضرات اور جنہوں نے احسان کے ساتھ اگلی چیزوں کی، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے... یہ عظیم کامیابی ہے۔ (القرآن، 100:9) السالقون الاؤلوں میں سے ہر صاحب لوگوں کو ظلمات سے

نور کی طرف آنے میں سہارا دیکھ اپنا حق ادا کر تا رہا ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے الساقون الاؤلوں کا اتباع کیا اور قدرو منزلت کے ساتھ انکی خدمت کی، یہ بھی انکے نور سے منور ہوئے۔ الساقون الاؤلوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ”سبقت کرنے والے تو ہیں ہی سبقت کرنے والے۔ وہی مقرب ہیں۔“ (القرآن، 56:10) یہ بھی فرمایا گیا: ایک گروہ اولین میں سے: اور قلیل آخرین سے ہونگے۔ (القرآن، 56:13-14) اصحاب ایمین کے بارے میں فرمایا گیا کہ ایک گروہ اولین سے ہو گا اور ایک گروہ آخرین سے ہو گا۔ (القرآن، 56:39-40) العشرۃ المبشرۃ، الساقون الاؤلوں میں سے وہ دس لوگ تھے جن میں سے ہر ایک کا نام لیکر حضورؐ نے فرمایا کہ وہ جنتی ہے۔ یہ پچھے ہوئے دس انعامیافتہ لوگ تھے۔ انہیں تصدیقیافتہ ہونے کا شرف ہوا۔ تفسیر فاضلی کا موقف ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی عنایت یہ ہے کہ اس نے اپنے پچھے ہوئے بندوں کو لوگوں کیلئے نمونہ بنانے کے بھیجا، تاکہ لوگ پچھے ہوئے بندوں کے ذریعے اللہ کو مانیں اور انکا اتباع کریں تاکہ خوف و حزن سے نجات نصیب ہو۔ (تفسیر آیت 3:33) (تفسیر فاضلی منزل اول) سلسلہ شاہدین، عطاۓ تزکیہ اور اسکی تصدیق کا ادارہ ہے۔ لیکن تزکیہ کی اہمیت کیا ہے؟ تفسیر فاضلی کا نقطہ نظر ہے کہ تزکیہ اور فلاح لازم و ملزم ہیں۔ اس نے فلاح پائی جس نے اپنے نفس کو پاک رکھا۔ (القرآن، 87:14) شاہد کی تصدیق کے بغیر تزکیہ یافتہ ہونا محض دعویٰ ہے۔ ’اللہ نے مومنین سے فلاح کا وعدہ کر رکھا ہے۔‘ (القرآن، 1:23) مومن کے نو مقامات ہیں: توبہ، عبادت، حمد، روزہ، رکوع، سجدہ، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اور حدود اللہ کی حفاظت۔ (القرآن، 9:112) شاہد میں یہ صفات اعلیٰ ترین درجے میں پائی جاتی ہیں۔ شاہد کے نقش قدم پر رہنے سے ان مقامات پر پورا رہنے کا شرف ہوتا ہے، تزکیہ اور فلاح عطا ہوتی ہے۔ (القرآن، 87:14) اگر حضور ﷺ کے زمانہ نبوت میں یہ ضروری تھا کہ آپ تزکیہ عطا فرمائیں تو کسی اور زمانے میں یہ کیسے ممکن ہے کہ شاہد کے بغیر تزکیہ عطا ہو جائے۔ اللہ کریم نے اپنے محبوب کو سراجِ میرابنا کے بھیجا ہے۔ چراغ سے چراغ جلتے ہیں اور جلتے رہیں گے۔ شاہد کے دعویٰ کی تصدیق دوستاد سے ہوتی ہے: اسکا قول سدید ہو یعنی قرآن پاک اسکے قول کی تصدیق کرے۔ (القرآن، 70:33) اسکا عمل ہر مقام پر اپنے صاحب کے اتباع میں ہو۔ (القرآن، 15:31) اور وہ تصدیق یافتہ ہو۔ اللہ ایمان والوں کا دوست ہے۔ شاہدین، اللہ کے دوست ہوتے ہیں۔ اللہ اپنے دوستوں کو کلمات سے نور کی طرف نکالتا ہے۔ (القرآن، 2:257) اللہ کے دوستوں کی شان یہ ہے کہ وہ خوف و حزن سے پاک ہوتے ہیں۔ (القرآن، 62:10) جو اللہ کے دوستوں میں سے کسی کا

دوست ہو جاتا ہے، اللہ کا دوست ہو جاتا ہے۔ اسے ظلمات سے نور کی طرف آنے کا شرف ہو جاتا ہے۔ وہ خوف و حزن سے پاک ہو جاتا ہے۔ تفسیر فاضلی کے مطابق شاہدین اللہ کے محبوب بندے ہوتے ہیں۔ فرمانِ الہی ہے: اللہ تعالیٰ محسینین کی حب رکھتا ہے۔ (2:195) اللہ تعالیٰ تو این کی حب رکھتا ہے۔ (القرآن، 2:222) اللہ تعالیٰ مظہرین کی حب رکھتا ہے۔ (القرآن، 2:222) اللہ تعالیٰ صابرین کی حب رکھتا ہے۔ (القرآن، 3:146) اللہ تعالیٰ متولیین کی حب رکھتا ہے۔ (القرآن، 3:76) اللہ تعالیٰ مظہرین سے محبت رکھتا ہے۔ (القرآن، 9:108) اللہ تعالیٰ مسٹریں سے محبت رکھتا ہے۔ (القرآن، 15:9) اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے محبت رکھتا ہے، جو اسکی راہ میں صفتی ہو کر اڑتے ہیں جیسے سیسہ پلانی ہوئی دیوار ہوں۔ (القرآن، 4:61) جو حضور ﷺ کا اتباع کرتے ہیں، اللہ ان سے محبت کرتا ہے۔ (القرآن، 3:31) یہ لوگ اللہ کے محبوب بندے ہیں اور محبوب کو راضی کرنا محب کو راضی کرنے کی احسن صورت ہے۔

جو لوگ برائیوں کو اختیار کر لیتے ہیں، قرآن پاک میں ان کا بھی ذکر ہے۔ فرمایا گیا ہے: اللہ ظالمین کی حب نہیں رکھتا۔ (القرآن، 3:140) اللہ مفسدین کی حب نہیں رکھتا۔ (القرآن، 5:64) اللہ مسرفین کو پسند نہیں کرتا۔ (القرآن، 6:141) اللہ حد سے بڑھنے والوں (معتدين) کو پسند نہیں کرتا۔ (القرآن، 7:55) اللہ خائنین کو پسند نہیں کرتا۔ (القرآن، 8:58) اللہ مستکبرین کو پسند نہیں کرتا۔ (القرآن، 23:16) اللہ کسی ناشکرے گناہگار کو پسند نہیں کرتا۔ (القرآن، 2:276) اللہ کافرین کو پسند نہیں کرتا۔ (القرآن، 3:32، 30:45) اللہ اترانے والے خر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ (القرآن، 4:76، 31:18، 57:23) اللہ دغabaز گناہگار کو پسند نہیں کرتا۔ (القرآن، 4:107) اللہ دغabaز، ناشکرے کو پسند نہیں کرتا۔ (القرآن، 22:38) اللہ فارحین کو پسند نہیں کرتا۔ (القرآن، 28:76)

جو اللہ کے محبوب بندوں میں سے کسی کی صفت اپنالیتا ہے، اسکے قریب ہو جاتا ہے، وہ اللہ کو محبوب ہو جاتا ہے۔ اللہ کے محبوب کی صفات، محبت کے ساتھ اتباع کرنے سے ہی آتی ہیں۔ تصدیق کرنے کا شرف بھی تو اللہ کے محبوب ہی کو حاصل ہے۔ تمام شاہدین وجود واحد ہیں، صورتیں جدا جدیں۔ مانا صرف ایک ہی کو جاتا ہے، لیکن ادب سب کا کیا جاتا ہے۔ ارشاد باری ہے: اتباع اس کا کرجو میری طرف رجوع لارہا ہے۔ (القرآن، 31:15) جو اللہ کے محبوب کے قرب کا دعویٰ کرتے ہیں بغیر ان میں سے کسی کا اتباع کئے، ان کا

دعوئی بثوت سے خالی ہوتا ہے۔ ہر نبی اور رسول اپنی قوم کیلئے اللہ کی عبدیت کا معیار مطلق تھا۔ ہر نبی اور رسول نے قوم سے اپنی اطاعت اور اتباع کا مطالبہ کیا۔ نبی کریم ﷺ تمام بنی آدم کیلئے اللہ کی عبدیت کا معیار مطلق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ”عبدہ“ اور ”عبدہ“ کہہ کر اپنے محبوب کے عبدیت کا معیار مطلق ہونے کی تصدیق فرمائی ہے۔ (القرآن، 17:1، 25:1) اللہ کے محبوب بندوں کی صفات جس اکمل درجے میں حضور نبی کریم ﷺ میں پائی جاتی ہیں، وہ کسی اور میں نہیں پائی جاسکتیں۔ اپنے محبوب پاک کو یہ صفات خود اللہ تعالیٰ نے عنایت فرمائی ہیں۔ محبین کو یہ صفات حال پر اللہ کے محبوب سے عطا ہوتی ہیں۔ حضور نبی پاک ﷺ، اللہ کے محبوب ترین بندے اور روشن چراغ ہیں۔ اس چراغ سے جو روشن ہوئے وہ بھی اللہ کے محبوب ہیں اور روشن چراغ ہیں۔ مصنفین تفسیر فاضلی نے یہ بات کتنے خوبصورت انداز میں بیان فرمائی ہے: مخلصین کا وجود واحد ہے، چونکہ انکا مقصود واحد ہے، اور انکا مقصود ہے لوگوں کو ظلمات سے نور کی طرف لانا۔ مخلص وہ ہوتا ہے جسے شیطان بہکا نہیں سکتا، کہ وہ مدح سے بے ربط نہیں ہوتا اور مذمت سے پریشان نہیں ہوتا۔ (تفسیر فاضلی منزل اول 1982ء، ج)

## کشف و شہود اور کرامات

بعض لوگ کشف و شہود اور کرامات (unveiling, direct witnessing, and making miracles) کو ہی روحانیت (تصوف) سمجھتے ہیں۔ تفسیر فاضلی اس سے اتفاق نہیں کرتی۔ طریقت شاہدین، کشف و شہود اور کرامات کا نام نہیں۔ کشف و شہود یا کرامات، یا علم کی جو شکل بھی اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو خود عطا فرمانا پسند فرمائے، وہ یقیناً قابل قدر ہے، لیکن ان میں سے کچھ بھی اللہ کے محبوب کے محبین کا کبھی مقصود نہیں ہوتا۔ کسی صاحب کا کشف و شہود اس کے ماننے والوں کیلئے جتنا بھی اہم ہو، دین کے معاملات میں سند (authority) کا درجہ نہیں رکھتا اور نہ ہی اس حیثیت سے جست (quote-worthy) ہوتا ہے۔ کرامت بھی کسی کے ترکیب یافتہ ہونے کی سند نہیں ہوتی۔ حضرت فضل شاہ رحمۃ اللہ علیہ کافرمان ہے: ”کرامت کسی لفظ کی کثرت تکرار کا حاصل ہوتی ہے، چاہے وہ لفظ مہمل ہی کیوں نہ ہو۔“ (تفسیر فاضلی منزل اول) اللہ سے بہتر کون جانتا ہے کہ کسی حال پر اس کے کسی دوست کو لوگوں کو ظلمات سے نور کی طرف آنے میں مدد دینے کیلئے کوئی علم درکار ہے! اللہ اپنے محبوب کو اپنی پسند سے جو علم عطا فرمائے، وہ اسے پورا جانتا ہے اور راضی رہتا ہے۔ مقامات کی طلب کا طریقت شاہدین سے کوئی تعلق نہیں۔ مقامات کی خواہش

بندے کو مشقت میں ڈالتی ہے۔ (ماخذ 61:2) ایک بزرگ ریاضت اور مجہدے میں مشہور تھے۔ ایک دن رات میں صرف سات کھجوریں کھاتے۔ بس یہی ان کی کل غذا تھی۔ وجود ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا۔ وہ صاحب ان کی مجلس میں حاضر ہوئے۔ ایک نے عرض کیا: جناب آپ کے بارے میں سناء ہے کہ آپ ایک دن رات میں صرف سات کھجوریں کھاتے ہیں۔ بس یہی آپ کی کل غذا ہے۔ آپ کے وجود سے بھی لگتا ہے کہ بات درست ہے۔ تصدیق کے لئے عرض کیا ہے۔ بزرگ نے فرمایا آپ کی اطلاع درست ہے۔ تصدیق چاہئے والے نے عرض کیا: اگر اجازت ہو تو ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ بزرگ نے فرمایا: پوچھئے۔ اس نے عرض کیا: جناب میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ نے اپنے آپ کو اس دکھ میں کیوں ڈالا ہوا ہے۔ بزرگ کو سوال اور پوچھنے کا انداز برالگا، اس نے دانت کچکا کر کہا: تم داڑھی منڈھے ہو کر یہ سوال پوچھتے ہو۔ سوال پوچھنے والے کے دوسرا ساتھی نے جو باریش تھا، عرض کیا: جناب کا اعتراض سوال پوچھنے والے کی موزوںیت سے تعلق رکھتا ہے، سوال کی موزوںیت پر آپ نے اعتراض نہیں کیا۔ اگر اجازت ہو تو یہی سوال میں جناب کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ لب ولجہ بھی موڈ بانہ تھا۔ بزرگ کے پاس اب اعتراض کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ انہوں نے کہا: میں یہ ریاضت اس لئے کر رہا ہوں کہ مجھے یہ مقام حاصل ہو جائے کہ جس پر نظر کروں اسے حضور نبی پاک ﷺ کی بارگاہ میں حضوری حاصل ہو جائے۔ سائل نے عرض کیا: جناب کیا یہ لازم ہے کہ اس ریاضت کے نتیجے میں یہ مقام حاصل ہو جائے گا۔ بزرگ نے جواب دیا: قطعاً لازم نہیں۔ اللہ چاہے گا تو ایسا ہو گا۔ سائل نے عرض کیا: کیا یہ لازم ہے اس ریاضت کے بغیر یہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔ بزرگ نے فرمایا: اللہ چاہے تو بغیر کسی ریاضت کے بھی اس شرف سے نواز دے۔ سائل نے عرض کیا: کیا قیامت کے روز آپ سے پوچھا جائے گا کہ آپ نے اس مقام کے حصول کیلئے کوشش کیوں نہیں کی۔ بزرگ کے پاس جواب نہیں تھا۔ وہ اٹھ کر اندر چلے گئے۔

## شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کیلئے قدم کی تمثیل

شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت مانے کے درجے ہیں۔ شریعت، اللہ کا امر ہے جس کا اتباع ضروری ہے۔ شریعت کی حقیقت شاہراہ ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے: ہم نے تم میں سے ہر ایک کو ایک دستور (شریعت) اور راستہ (منہاج) دیا۔ اور اللہ چاہتا تو تم کو ایک امت ٹھہرایا۔ (القرآن، 5:48) مزید فرمایا: پھر ہم نے تحسین (اپنے) امر سے شریعت پر ٹھہرایا، تو اسی کا اتباع کرو اور بے علم لوگوں کی خواہشات

کے پیچھے نہ لگو۔ (القرآن، 45:18) بے علم لوگ اپنی خواہشات کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں۔ بے علم لوگوں کی بات ہمیشہ بے سند ہوتی ہے۔ جو شریعت پر عمل پیرا ہوتا ہے جیسے وہ پسند کرتا ہے، وہ صرف اپنی ہی پسند ناپسند کا اتباع کرتا ہے، وہ بے علم لوگوں کی خواہشات کے پیچھے لگتا ہے۔ وہ اللہ کے امر کو نہیں مانتا۔ ایسا شخص رسموم دین میں بڑی مہارت بھی حاصل کر لے، کبھی دین کی روح کو نہیں پاسکتا۔ تفسیر فاضلی کے مطابق شاہد کے نقش قدم کے اتباع میں شریعت پر عمل کرنا، طریقت ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:- ﴿وَاتْتَّیعُ سَبِیْلَ مَنْ أَنَّابَ إِلَيْهِ﴾۔ ”... اور اتباع اس کا کرجو میری طرف رجوع لا رہا ہے۔“ (القرآن، 31:15) طریقت وہ معیار ہے جو حق کے حوالے سے قائم ہے۔ ارشاد ہے: ﴿وَأَلَّا يَسْتَقِمُوا عَلَى الطَّرِيقَةِ لَا شَقِيقَاتُهُمْ مَا ظَنَّا فَإِنَّا هُنَّا أُولَئِكَ﴾ اور یہ طریقت پر استقامت سے رہتے تو ہم انہیں خوب سیراب کرتے۔“ (القرآن، 16:72) کسی تصدیقیافتہ کو اللہ کی طرف رجوع لانے والے کی حیثیت سے مان کر اس کا اتباع کرنا طریقت ہے۔ اتباع کبھی ایک سے زیادہ کا نہیں کیا جاسکتا۔ جو ایک سے زیادہ کا اتباع کرتا ہے، صرف اپنے آپ کو مانتا ہے۔ جس نے اپنی زندگی میں خود کسی کا اتباع نہیں کیا، اس نے اللہ کے فرمان کو نہیں مانا، وہ قابل اتباع نہیں ہو سکتا۔ جو حق کے حوالے سے اصلاح قبول کرتے ہیں، وہ صالح ہیں۔ جو من مانی کرتے ہیں، وہ غیر صالح ہیں۔ صالح اور غیر صالح کی طریقت الگ الگ ہے۔ جنون کی ایک جماعت نے قرآن پاک سناؤ وہ ایمان لے آئے۔ انہوں نے اعتراض کیا کہ انکا بیو قوف سردار اللہ کے بارے میں بے سند باتیں کرتا رہا ہے۔ انہوں نے یہ بھی اعتراف کیا: ”هم میں سے کچھ صالح ہیں اور کچھ ان کے مقابل (یعنی غیر صالح)۔ ہمارے راستے (طرائق) الگ الگ ہیں۔“ (القرآن، 11:72) اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت میں، شاہد کو اللہ کی طرف رجوع لانے والا مان کر اسکے نقش قدم پر چلنا صالحین کی طریقت ہے۔ (مانو، القرآن، 15:31) اپنی پسند اور ناپسند کا اتباع ان کے مقابل والوں کا طریقہ ہے۔ جس کا قلب اللہ کے ذکر سے غافل ہو، جو اپنی خواہشات کی پیروی میں لگا ہوا ہو، اور جس کا کام حد سے گزر جائے، اسکی اطاعت سے منع فرمایا گیا ہے۔ اطاعت اسی کی حق ہے جس کا قلب اللہ کے ذکر سے غافل نہ ہو، جو اپنی خواہشات کی پیروی نہ کرتا ہو، اور حدود اللہ کا احترام کرتا ہو۔ (مانو، القرآن، 18:28) حقیقت کے درجے کا تعلق علم سے ہے۔ تفسیر فاضلی بیان کرتی ہے کہ ”علم ہمیشہ عمل کے بعد عطا ہوتا ہے۔“ شاہد کی صداقت اور امانت کے اعتراف کے بعد اسکی بات کو بلا دلیل مانا ایمان بالغیب ہے۔ شاہد کے نقش قدم کا اتباع کرنے سے ایمان بالغیب، ایمان بالشهادت میں بدل جاتا ہے۔ شاہد کے اتباع میں

شریعت پر عمل کرنے کے بعد جو مقام آتا ہے وہ 'حقیقت' ہے۔ جو قول، عمل، اور علم تینوں مقامات پر اپنے شاہد کے اتباع میں پورا رہتا ہے، اسے معرفت بطور انعام عطا فرمادی جاتی ہے۔ معرفت وہ درجہ ہے جسے قرآن عرفانِ حق کا نام دیتا ہے۔ (اقرآن، 5:83) وہ مخلصین میں شمار ہو جاتا ہے اور مخلصین کو شیطان بہ کا نہیں سکتا۔ (اقرآن، 15:40، 38:83) قرآن پاک میں ارشاد ہے: صاحب لوگ دعا کرتے رہتے ہیں "یا اللہ ہم اس پر ایمان لائے جو تو نے نازل فرمایا، اور رسول کے تابع ہوئے، تو ہمیں شاہدین کی معیت میں لکھ لے۔" (اقرآن، 3:53) جسے معرفت عطا ہوئی اسے شاہدین کی معیت عطا ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو سمجھانے کیلئے قرآن پاک میں مثالیں بھی بیان فرمائی ہیں۔ شاہدین بھی فرمانِ الہی کے اتباع میں بات سمجھانے کیلئے مثالیں بیان فرماتے ہیں۔ لیکن ضروری ہے کہ مثال فرمانِ الہی سے مطابقت رکھتی ہو۔ اگر کوئی مثال یا تمثیل فرمانِ الہی سے متناقض ہے تو وہ خلاف حق ہے اور لوگوں کو ظلمات سے نور کی طرف آنے میں کوئی مدد نہیں دیتی۔ فاضل مصنفین تفسیرِ فاضلی نے شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کے تعلق کو واضح کرنے کیلئے اس طرح تمثیل بیان کی ہے: شریعت بمنزلہ دودھ، طریقت بمنزلہ دہی، حقیقت بمنزلہ مکھن اور معرفت بمنزلہ گھٹی ہے۔ اگر دودھ ہی نہ ہو تو نہ کچھ بن سکتا ہے، نہ کوئی بنا سکتا ہے۔ (تفسیرِ فاضلی منزل اول 1992، تعارف) تفسیرِ فاضلی اسے ایک اور طرح بھی بیان کرتی ہے: "شاہد کا قدم علوم کا معدن ہوتا ہے۔ علم، قدم کی صفت ہے۔ شریعت، قدم ہے۔ طریقت، نقش قدم ہے۔ حقیقت قدیم ہے۔ شریعت قدم کی ابتداء ہے اور معرفت قدم کی انتہا ہے۔" (تفسیرِ فاضلی منزل، ہفتہ، 228) انہوں نے یہ بھی فرمایا ہے: "شریعت کا مزاج دودھ کی مانند ہے۔ اگر پیپٹ ٹھیک ہو تو دودھ فائدہ دیتا ہے، اگر ٹھیک نہ ہو تو مرض کو بڑھاتا ہے۔ اگر قلب ٹھیک ہو تو شریعت سے فائدہ پہنچتا ہے، اگر قلب میں مرض ہو تو شریعت پر عمل کرنے سے مرض میں اضافہ ہوتا ہے۔" ایسا شخص شعائرِ دین پر عمل کرنے کو ہی پورا دین سمجھتا ہے اور یعنی بگھارتا ہے، اور جو شعائرِ دین پر عمل کرنے کے اعتبار سے اسے کمزور نظر آتے ہیں ان کی تحریر کرتا ہے۔ (شریعت، طریقت، اور حقیقت کے تعلق کو واضح کرنے کیلئے ایک مختلف تمثیل کا جائزہ ہم آئندہ صفحات میں لیں گے۔)

## انعام یافتہ بندوں کی کینٹیگریز — نبیین، صدیقین، شہداء اور صالحین

قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے: "جو اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کی اطاعت کرے، تو اسے ان لوگوں کی معیت حاصل ہوگی۔ جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا، کہ وہ نبیین اور صدیقین اور شہداء اور صالحین

ہیں۔ یہ کیسے اچھے رفتیں ہیں۔“ (اقرآن، 4:69) اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے انعام یافتہ حضرات کی چار انتہائی کینٹیگریز کا ذکر کیا ہے: نبین، صد لقین، شہداء، صالحین۔ دیگر تمام ٹانکل جو انعام یافتہ حضرات کو بیان کرنے کیلئے استعمال ہوئے ہیں مثلاً رسول، اولو العزم، شاہدین، مخلصین، ابرار، متقین، حسین وغیرہ انہیں چار کینٹیگریز میں سے کسی کے تحت آئیں گے۔ (اقرآن، 4:69) سید حسین نصر، علامہ جاوید احمد غامدی ، ڈاکٹر اسرار احمد اور کئی دیگر سکالر رسالت کو نبوت سے برتر مقام سمجھتے ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ رسول ہونا نبی ہونے کو مستلزم ہے جبکہ اس کے بر عکس درست نہیں۔ رسالت کو نبوت سے بالا، یا اولو العزم کو رسالت سے الگ کوئی کینٹیگری سمجھنا، اس آیت کریمہ کی روشنی میں درست نہیں۔ تفسیر فاضلی کے مطابق رسالت کا مقام نبوت کے تحت ہے اس سے بالا نہیں۔ نبی ہونا رسول ہونے کو مستلزم ہے نہ کہ اس کے بر عکس۔ قرآن پاک میں رسول کا لفظ فرشتے کیلئے بھی استعمال ہوا ہے اور انسان کیلئے بھی۔ (اقرآن، 11:77، 11:69، 22:75، 43:80، 20:96-97، 22:75، 43:96)

نبی کا لفظ صرف بنی آدم کے افراد کیلئے ہی مخصوص ہے۔ فرشتہ رسول تو ہو سکتا ہے مثلاً فرمایا گیا ہے: ”رسول چن لیتا ہے اللہ ملائکہ اور آدمیوں میں سے جسے چاہے۔“ (اقرآن، 22:75) لیکن کوئی فرشتہ نبی بنانا کرنے نہیں بھیجا گیا۔ اگر رسول ہونا نبی ہونے کو مستلزم ہو تو پھر جن فرشتوں کو رسول چنا گیا انکا نبی ہونا لازم قرار پائے گا۔ ”نبی، صاحب شریعت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے نئی شریعت سمجھتے ہیں۔ حضور ﷺ کو اللہ نے خاتم النبیین ہونے کے مرتبہ پر سرفراز فرمایا ہے۔ (اقرآن، 33:40) مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے کہ اب قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا۔ قیامت تک حضور کی لائی ہوئی شریعت ہی تمام بنی نويع انسان کے لئے ہو گی۔ قرآن پاک نے حضور کو ”ختم الرسل“، نہیں کہا۔

چونکہ ”نبوت جنس“ (genus) اور رسالت اسکے تحت (sub-class) ہے اسلئے حضور ﷺ کی ختم نبوت آپ کے ”ختم الرسل“ ہونے کو بھی مستلزم ہے۔ لیکن اگر اس کے بر عکس تسلیم کیا جائے تو پھر آپ کا ”ختم الرسل“ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ تفسیر فاضلی میں مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں فرمایا گیا ہے: اللہ تعالیٰ علیم مطلق ہے، اسکا ہر کام علم مطلق سے ہوتا ہے۔ اسکا چناوہ بھی اسکے اپنے علم سے ہوتا ہے، اسلئے اس سے بہتر چناوہ ممکن نہیں۔ اسے ملائکہ سے جن کو چناوہ بھی بڑی شان رکھتے ہیں، انسانوں میں سے جنہیں چناوہ بھی بڑی شان رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ انتخاب، بندوں کو بڑی آسانیاں عطا کرتا ہے، کہ وہ اللہ کے چنے ہوئے کو مان لیں اور فلاح کی راہ پر چل پڑیں (تفسیر فاضلی چہارم، 2012، 261)۔

## شاہد کا مرتبہ

فرمایا گیا ہے: "... اس نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے، اس سے قبل اور اس میں بھی، تاکہ رسول تم پر شاہد ہو اور تم اور لوگوں پر شاہد رہو...“ (القرآن، 78:22) شاہد ہونا رسول کا منصب ہے۔ اللہ کا ہر رسول شاہد تھا۔ حضور ﷺ آپ کے تصدیق یافتہ شاہدین پر شاہد ہیں۔ شاہدین لوگوں پر شہادت دیتے رہیں گے۔ فرمانِ الٰہی ہے: ”بے شک ہم نے آپ کو شاہد اور مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ تاکہ اے لوگوں تم اللہ اور اسکے رسول پر ایمان لاو، اور آپؐ کی تنظیم کرو اور آپؐ کی توقیر کرو...“ (القرآن، 48:9-8) فرمانِ الٰہی ہے: ”اور تمھیں معلوم رہے کہ اللہ کے رسول تم میں ہیں...“ (القرآن، 49:7) شاہد ماننے والوں پر آیات تلاوت فرماتا ہے، ان کا تذکیرہ کرتا ہے، انھیں کتاب اور حکمت کا علم عطا فرماتا ہے، اور حضور ﷺ کے تصدیق یافتہ شاہدین اس منصب کے وارث ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ، شاہدین کی صورت، حال پر ہمارے درمیان موجود ہیں اور تلقیامت رہیں گے اور ان کی معیت سے بہتر کوئی ساتھ نہیں۔ جو یہاں ان کے ساتھ ہو گا، وہی آخرت میں ان کے ساتھ ہو گا کہ اسی حال کا مستقبل بننے والا ہے۔ (القرآن، 76:5; 130، 110؛ 2:25، 82)

## سید حسین نصر

نظریہ وحدت شاہدین کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کرنے کیلئے آئیے ایک ہم عصر مسلم سکالر سید حسین نصر (1933-) کے نظریات کا جائزہ لیتے ہیں جو ایک صوفیانہ سلسلے کے اہم نمائندہ ہیں۔ سید حسین نصر نے، جو واشنگٹن یونیورسٹی امریکہ میں اسلام سٹڈیز کے پروفیسر ہیں، دنیا کو اسلامی تعلیمات سے متعارف کرانے کیلئے 1966 میں ”Ideals and Realities of Islam“ کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔ اس کتاب میں انھوں نے تصوف کے بارے میں بھی اپنے نظریات پیش کئے ہیں۔ اس کتاب سے دو مثالیں پیش کر رہا ہوں۔

## شریعت، طریقت، حقیقت کیلئے دائے کی تمثیل

یہ کتاب شریعت، طریقت، اور حقیقت کے تعلق کو واضح کرنے کیلئے دائے کی تمثیل بیان کرتی ہے۔ اس تمثیل میں دائے کا محیط شریعت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق شریعت تمام ماننے والوں کیلئے

ہے اور ماننے والے دائرے کے محیط پر ہوتے ہیں۔ اس دائیرے کے مکملہ رداں، طرائق (طریقت کی جمع) کی علامت ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق طریقت وہ رداں (radius) ہے جو محیط کے ہر ہر نقطے کو مرکز سے ملاتا ہے۔ دائیرے کا مرکز ”حقیقت“ ہے۔ لوگوں کے شفاقت اور نفسیاتی اختلاف کی وجہ سے طریقت کے مظاہر میں فرق پایا جاتا ہے، لیکن ان کی ماہیت میں کوئی فرق نہیں۔ سید حسین نصر کے مطابق طریقت کے اتنے ہی مظاہر ممکن ہیں جتنے کہ بنی آدم ہیں۔ ایمان لانے والا فرد، محیط پر آ جاتا ہے جو کہ شریعت ہے۔ شریعت سے حقیقت یعنی دائیرے کے مرکز کی طرف سفر طریقت ہے۔ حقیقت خدا ہے اور یہی تمام روحانی سفر کی مزول ہے۔ حقیقت (خدا)، شریعت اور طریقت کا منبع ہے۔ خدا نے شریعت اور طریقت کو الگ الگ پیدا کیا ہے۔ ان دونوں کا حقیقت (یعنی خدا) سے الگ الگ نوعیت کا تعلق ہے۔ مخفی شریعت پر عمل پیرا ہونا، نجات کیلئے کافی ہے لیکن بعض افراد کا مزاج ایسا ہوتا ہے کہ وہ حقیقت تک پہنچنے سے رک نہیں سکتے۔ (S. H. Nasr)

(128) 1966ء سید حسین نصر حقیقت، صداقت، خدا اور مرکز کو ایک قرار دیتے ہیں اور یہ الفاظ مترا دف طور پر استعمال کرتے ہیں (S. H. Nasr, 15, 16, 17, 19, 137 etc.)۔ اس تمثیل کا جائزہ لیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا ہر ہر جزو قرآنِ پاک کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اس تمثیل کے مطابق دائیرے کا مرکز حقیقت، صداقت، یا خدا ہے۔ لیکن قرآنِ پاک، اللہ کیلئے ”حقیقت“، ”اللفظ“ کہیں استعمال کرنا پسند نہیں کرتا۔ ”حقیقت“، ”عربی کا لفظ ہے جس کا مادہ ’ح-ق-ق‘ ہے۔ اس مادے کے درج ذیل مشتقات قرآنِ پاک میں آئے ہیں:

حق: بارہ مرتبہ۔ بمعنی جائز، درست، منصفانہ، اللہ کے وعدہ یا وعید کا پورا ہونا وغیرہ۔ (القرآن، 7:3)

17:6

حقت: پانچ مرتبہ۔ بمعنی منصفانہ۔ (القرآن، 10:33, 96)

حقٌ: ایک مرتبہ۔ بمعنی وعدہ پورا کرنا، یا پورا کر کھانا۔ (القرآن، 36:70)

حقت: دو مرتبہ۔ بمعنی پورا ہونا، پورا لٹرنا (القرآن، 2: 84-85)

حقٌ: چار مرتبہ۔ بمعنی حق کو حق کر دینا۔ (القرآن، 8:7-8)

استحقاق: ایک مرتبہ۔ بمعنی واقعی ثابت ہونا۔ (القرآن، 5:107)

حقّة: سترہ مرتبہ۔ بمعنی برحق ہونا۔ (القرآن، 2:180, 236)

حَقٌّ؛ تِينَ مَرْتَبَةٍ۔ بِمَعْنَى اَسْ كَاحِقٌ، اَنْ كَاحِقٌ۔ (الْقُرْآن، 14:6)

أَحَدٌ؛ دَسْ مَرْتَبَةٍ۔ بِمَعْنَى بِرَاحِقٌ هُونَا، زِيَادَه حَقٌّ هُونَا۔ (الْقُرْآن، 26:17؛ 5:107)

حَقِيقَتٌ؛ اِيكَ مَرْتَبَةٍ۔ بِمَعْنَى لَازِمٌ هُوَ كَه۔ (الْقُرْآن، 103:7)

الْحَاقَةُ؛ تِينَ مَرْتَبَةٍ۔ بِمَعْنَى وَهُ حَقٌّ هُونَهُ وَالِي۔ (الْقُرْآن، 1-3:69)

الْحَقُّ؛ دُو سُوتَانِيَسْ (227) مَرْتَبَةٍ۔ بِمَعْنَى اللَّهُ كَانَ اَذْلَلَ كَرَدَه فَرْمَانَ الْهَيِّ، (الْقُرْآن، 26:2)؛ حَقٌّ  
بِمَقَابِلَه بَاطِلٌ (الْقُرْآن، 42:2)؛ حَقٌّ بِمَقَابِلَه اَضْلَالٌ (الْقُرْآن، 10:32)؛ حَقٌّ بِمَقَابِلَه ظُلُّنٌ  
(الْقُرْآن، 154:3)

(The Concordance of the Quran 1992)

## خدا بطور 'حقيقیت' یا 'حقيقیتِ اولیٰ'

قرآن پاک کی روشنی میں بات کرتے ہوئے خدا کو 'حقيقیت' یا 'حقيقیتِ اولیٰ' (The Reality, The Ultimate Reality) کہنا ممکن نہیں۔ اسے 'الْحَاقَةُ' سے بھی اخذ کرنا ممکن نہیں جو کہ سورہ الحاقۃ کی پہلی تین متصل آیات میں آیا ہے۔ مارماڈیوک پکتحال اس کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں:

The Reality! What is the Reality? Ah, what will convey thee what the reality is! (al-Qur'an, 69:1-3)

عبداللہ یوسف علی انجیں آیات کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں:

The Sure Reality! What is the Sure Reality? And what will make thee realize what the Sure Reality is? (69:1-3)

لیکن اسی سورہ کی آیات نمبر 13 تا 17 کے مارماڈیوک پکتحال اور عبداللہ یوسف علی کے ترجمے کے بعد اس بات میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ پہلی تین آیات میں ان کے نزدیک reality, the sure event, the undeniable truth گئے اعمال کی جزاًی جائے گی (Yousaf Ali 1934)۔

ذات باری کیلئے دائرے کی تمثیل بیان کرنے کا قرآنی حوالے سے کوئی جواز نہیں۔ ذات باری کیلئے قرآن پاک یہ تمثیل قطعاً بیان نہیں کرتا ہے، یہ اللہ کی شان کیلئے موزوں ہے۔ قرآن پاک میں اللہ کیلئے

نقطے (point) کی تینیل بھی بیان نہیں کی گئی۔ اپر بیان کیا گیا ہے کہ شریعت سے مراد قول، تعلیمات، بدایت ہے؛ طریقت سے مراد شاہد کے اتباع میں شریعت پر عمل ہے اور حقیقت، علم کا درجہ ہے۔ جسے ان تینیوں مقامات پر اپنے صاحب کے اتباع میں پورا رہنے کا شرف ہوتا ہے اسے معرفت سے بطور انعام نواز دیا جاتا ہے۔ ”Ideals and Realities of Islam“ معرفت کا کوئی ذکر ہی نہیں کرتی، سوائے سرسری حوالے کے اور وہ بھی بغیر سند کے۔ اور کیا بھی کیسے جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ’حقیقت‘، قرار دے دینے کے بعد مزید درجہ کون سارہ جاتا ہے۔! اگر خدا ’حقیقت‘ ہے تو پھر زمین و آسمان، اور جو کچھ ان کے مابین ہے یا تو بے حقیقت (appearance) ہے، یا خدا (یعنی حقیقت) کے اختیار کئے ہوئے عارضی تعینات ہیں! کائنات اگر بے حقیقت ہے تو پھر یہ دنیا دار العمل نہیں ہو سکتی، اس میں کئے گئے اعمال بھی بے حقیقت ہونگے۔ آخرت کو دارالجہرا ممکن نہیں رہے گا۔ کائنات اگر ’حقیقت‘، یعنی خدا کے اختیار کئے ہوئے عارضی تعینات کی کلیت ہے، تو بجیشیت کلیت اور بحیثیت جوهر یہ ازلی اور ابدی (eternal and everlasting) ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن قرآن پاک تو فرمرا ہے کہ زمین و آسمان، اور جو کچھ ان کے مابین ہے اسے اللہ نے چھ دنوں میں تخلیق فرمایا اور ساتویں دن آسمان پر استوار فرمایا۔ اور یہ بھی کہ ہم نے اسے حق کے ساتھ تخلیق فرمایا۔ (مانعوذ، القرآن، ۱۰:۵، ۴۵:۲۲، ۶:۷۳) یہ سند درج بالا دونوں امکانات کی نفی کرتی ہے۔

اللہ کا فرمان ہے کہ شریعت اسکا امر ہے۔ (القرآن، ۱۸:۴۵) اور اللہ کی طرف رجوع لانے والے کے اتباع میں شریعت پر عمل کرنا طریقت ہے۔ حسین نصر صاحب فرماتے ہیں کہ اللہ نے شریعت اور طریقت کو الگ الگ پیدا فرمایا ہے۔ ان کی یہ بات قرآن پاک سے ثابت نہیں ہوتی۔ شریعت قول یعنی انفار میشن کا درجہ ہے۔ قول کے بعد عمل کا مقام ہے، یہ طریقت کا درجہ ہے۔ عمل کے بعد حاصل ہونے والی کیفیت علم کہلاتی ہے۔ یہ حقیقت کا مقام ہے۔ ان مقامات پر پورا رہنے والے کو معرفت عطا ہوتی ہے۔ لیکن سید حسین نصر کے ہاں تو ’علم‘ کا کوئی مقام ہی نہیں، وہاں تو خدا ہی حقیقت ہے۔

## وحدت الوجود کے بنیادی مفروضے

مسلمانوں میں یہ عقیدہ صدیوں پیشتر رائج ہو چکا ہے کہ ’الحق‘، اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنی میں سے ایک ہے۔ ’الحق‘، کو ’الله‘ کے خصوصی نام کی حیثیت سے لفظ ’الله‘ کے متراوف استعمال کرنا، اور اس کی بنیاد پر اللہ کو ’الله‘ کو مطلق، ’The Ultimate Reality‘، ’The Reality‘، ’The Truth‘ کا کائنات

کو relative reality یا اضافی حقیقت قرار دینا و حدت الوجودی مکتب فلکر کے دو بنیادی مفروضات میں سے ایک ہے۔ حدت الوجودی مابعد الطبیعت (الحق، کو 'اللہ' کے مترادف قرار دے کر اسکے مضمرات اخذ کرنے سے تشكیل پاتی ہے۔ دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ خدا کائنات سے تنزیہ (transcendence) اور تشیبیہ (immanence) دونوں نو عیت کا تعلق رکھتا ہے۔ مشہور صوفی حضرت محبی الدین ابن العربی (وفات 638/1240) اس مکتب فلکر کے بانی قرار دیئے جاتے ہیں۔ موجودہ دور میں سید حسین نصر اس مکتب فلکر کے اہم نمائندوں میں سے ہیں۔ یہ نظریہ حدت الوجود کیلئے Doctrine of the Unity of all existence کا نمائش استعمال کرنا پسند کرتے ہیں being کا نمائش استعمال کرنا پسند کرتے ہیں

(S. H. Nasr 1996, 29) (Chittick, 8) -<sup>26</sup> تفسیر فاضلی 'الحق' کا الاسماء الحسنی میں سے ہونا تسلیم نہیں کرتی۔ اسلئے وہ حدت الوجودی مابعد الطبیعت کو قرآنِ پاک کے مطابق نہیں صحیح۔ تفصیل کیلئے مصنف کے درج ذیل تحقیقی مضمایں سے استفادہ کیا جاسکتا ہے Is al-haqq One of Al-Asma' al-Husna! اور مجلہ بازیافت، اشاعت دسمبر 2009 میں شائع ہوئے۔ یہ مضمایں ہماری کتاب "The Qur'anic Theology, Philosophy and Spirituality" جو بالترتیب تحقیقی مجلہ بازیافت، جلد 9 (2006) اور مجلہ بازیافت، اشاعت دسمبر 2009 میں شائع ہوئے۔ یہ مضمایں ہماری کتاب "The Qur'anic Ontology and Status of al-haqq" میں بھی موجود ہیں۔ تفسیر فاضلی کا موقف بالاختصار اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔

”... اور جو کچھ آپ کی طرف آپ کے رب سے نازل ہوا وہ الحق ہے، مگر اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔“ (القرآن، 1:13)

”اور فرمائیے الحق تمہارے رب کی طرف سے ہے۔ تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرئے۔...“ (القرآن، 29:18)

”قول اسی کا الحق ہے۔“ (القرآن، 74:6)

”الحق تمہارے رب ہی کی طرف سے ہے، تو ٹوٹو شک لانے والوں میں سے نہ ہو۔“ (القرآن، 147:2)

”... حکم اللہ ہی کا ہے۔ حق بیان فرماتا ہے۔...“ (القرآن، 57:6)

”جب ان کے پاس الحق آیا، کہنے لگے یہ تو سحر ہے اور ہم اسکا انکار کرتے ہیں۔“ (القرآن، 30:43)

”اور جب ان سے فرمایا جائے ایمان لاو جو اللہ نے نازل فرمایا، کہتے ہیں: ہم تو اس پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر نازل ہوا، اور باقی سے انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ الحق ہے۔ اس کا مصدق ہے جو ان کے پاس ہے۔۔۔“ (القرآن، 91:29)

”اور وزن اس دن الحق سے ہو گا۔ پھر جن کے وزن بھاری ہوئے، وہی فلاح پانے والے ہیں، اور جن کے تول ہلکے ہوئے تو وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جانوں کو خسارے میں ڈالا۔“ (القرآن، 9:7-8)

”اس میں کچھ شک نہیں کہ اس کتاب کی تنزیل رب العالمین کی طرف سے ہے۔ کیا یہ کہتے ہیں کہ آپ کا افتراء ہے! بلکہ وہ آپ کے رب کی طرف سے الحق ہے۔۔۔“ (القرآن، 33:32-32)

”اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور صالح عمل کئے اور اس پر ایمان لائے جو محمد ﷺ پر نازل ہوا، اور وہی ان کے رب کی طرف سے الحق ہے۔۔۔“ (القرآن، 2:47)

”اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ تم انہیں دوستی کے پیغام بھیجتے ہو، اور وہ اس حق کے منکر ہیں جو تمہارے پاس آیا۔۔۔“ (القرآن، 1:60)

”الحق، جو ماضی میں نازل ہوا مصدق ہے اس الحق کا جو حال پر نازل ہوا، اور الحق، جو حال پر نازل ہوا مصدق ہے اس الحق کا جو ماضی میں نازل ہوا۔“ (2:91, 3:31; 6:5; 35:31; 3:03; 2:41, 89, 91)

37:37)

”۔۔۔ (بنی اسرائیل) کلام کے مواضع میں تحریف کرتے ہیں...“ (القرآن، 5:13)

”اور وہ جو یہودی ہیں... اللہ کی باتوں میں ان کے مواضع کے بعد تحریف کرتے ہیں۔۔۔“ (القرآن، 5:41)

”اے اہل کتاب بے شک ہمارے رسول تمہارے پاس تشریف لائے، کہ تم پر روشن فرماتے ہیں سب کچھ جو تم نے کتاب میں سے چھپا لیا تھا اور، بہت کچھ سے عفو فرماتے ہیں۔۔۔“ (القرآن، 5:15)

”... اور ان کی خواہشات کی بیرونی نہ کرو جبکہ الحق تمہارے پاس آچکا...“ (القرآن، 5:48)

”... اور جو اللہ کے نازل فرمائے ہوئے کے مطابق حکمنہ کرے، تو وہی کافر ہیں۔“ (القرآن، 44:5)

”... اور جو اللہ کے نازل فرمائے ہوئے کے مطابق حکمنہ کرے، تو وہی ظالم ہیں۔“ (القرآن، 45:5)

”... اور جو اللہ کے نازل فرمائے ہوئے کے مطابق حکم نہ کرے، تو وہی فاسق ہیں۔“ (القرآن،

(5:47)

”... اور بے شک لوگوں میں سے کثیر فاسق ہیں۔“ (القرآن، 5:49)

”اور ہمیں کیا ہوا کہ ہم اللہ پر ایمان نہ لائیں اور اس الحج پر جو ہمارے پاس آیا...“ (القرآن، 5:84) (چند آیات ہیں جن کی نامناسب تعبیر کر کے، ان تمام آیات کے باوصاف جن کے معنی یہ ہیں کہ ’الحق‘ وہ ہے جو اللہ نے نازل فرمایا ہے اور اللہ، ’الحق‘ کا نازل فرمانے والا ہے، یہ اخذ کیا جاتا ہے کہ ’الحق‘، اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔ ہم نے اپنے بعض مضامین میں ان آیات کے تراجم کا جائزہ لے کر دکھایا ہے کہ یہ تراجم صحیح نہیں ہیں۔<sup>27</sup>)

## قرآن پاک ہی ’الحق‘ ہے۔

قرآن پاک میں ’الحق‘، اپنے مختلف مشتقات کی صورت میں 227 مرتبہ آیا ہے۔ مصنف نے اپنے محوالہ بالا مضامین میں ان تمام مقالات کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ’الحق‘، ہونے کا درجہ اللہ کے نازل کردہ فرمان کا ہے۔ اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ ’الحق‘ کا نازل فرمانے والا ہے۔ نازل کیا گیا کلام اور اس کا نازل فرمانے والا، ایک نہیں ہو سکتے، کلام اور متکلم ایک نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ’الحق‘، اللہ کا نام نہیں۔ ’الحق‘ کے معنی ہیں ’معیارِ حق‘۔ ’الحق‘ ہونا قرآن پاک کی شان ہے۔ ’الحق‘ ہونا فرمانِ الہی کا درجہ ہے۔ ماضی میں اللہ کا نازل کردہ کلام بھی ’الحق‘ کا درجہ رکھتا تھا لیکن قرآن پاک شہادت دیتا ہے کہ ان صحائف میں تحریف کی گئی ہے، اس لئے اب وہ سند کا درجہ نہیں رکھتے۔ (القرآن، 41، 15، 13:5) اس لئے تفسیرِ فاضل کا نقطہ نظر ہے کہ اہل کتاب کے کسی نظریے کی تردید یا تصدیق نہیں کرنی چاہئے، صرف یہ کہنا چاہئے کہ جو اللہ نے نازل فرمایا ہے وہ حق ہے۔ (تفسیر آیت 29:46) حال پر صرف قرآن پاک ہی سند کا درجہ رکھتا ہے۔ کسی بھی نظریہ، اصول، عقیدہ، روایت، ارشاد، قول، گمان، خیال، احساس، وہم، قیاس، تصور، تخيیل، تاثر، وجہ ان، واردات، حال، کشف، شہود، تشریح، تعبیر کی صداقت کا حقیقی معیار قرآن پاک ہی ہے۔ قرآن پاک جس کی تصدیق کرتا ہے وہ حق ہے، جس کو رد کرتا ہے وہ بغیر الحق ہے۔ (القرآن، 3:21؛ 2:61) قرآن پاک کے حوالے کے بغیر کی گئی بات محسوس رائے، قیاس، گمان یا ظن کا درجہ رکھتی ہے، اور ظن کسی کو حق سے مستغنى نہیں کر سکتا۔ (ماخوذ، القرآن، 53:28، 10:36) فرمانِ الہی سے انحراف، الضلال (گمراہی) ہے۔

فرمایا گیا ہے: الحجت کے بعد ہے ہی کیا مگر مگرا ہی۔ (القرآن، 10:32) قرآن پاک کے مقابل نظریات باطل ہیں۔ (القرآن، 18:81، 21:18) اللہ کے بارے میں بے سند بات کرنا اللہ پر افترزی باندھنا (concoction) ہے، اور اس سے منع فرمایا گیا ہے۔ (القرآن، 4:171) فرمانِ الٰہی ہے: اور اس سے بڑھ کر ظالم کوں جو اللہ پر جھوٹ باندھے۔ وہ لوگ اپنے رب کے حضور پیش ہونگے، اور گواہی دینے والے کہیں گے، یہی ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ باندھا تھا۔ سن لو! ظالمین پر اللہ کی لعنت ہے۔ (القرآن، 11:18) حکمِ الٰہی ہے: ”— اور اللہ پر نہ کہو مگر حق۔—۔ (القرآن، 4:71) فرمانِ الٰہی کو اپنی خواہش کے مطابق بنانا فتنہ ہے، اور اللہ فاسق ہی کو گمراہ کرتا ہے۔“ (القرآن، 2:26) مومنین کی شان یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ وہ لغو سے اعراض کرتے ہیں۔ حضرت فضل شاہ کا ارشاد ہے کہ جس بات کا کوئی حاصل نہ ہو وہ لا حاصل ہوتی ہے، اور لا حاصل بات ہی لغو ہوتی ہے۔ لا حاصل سے اعراض کتنا ہم ہے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ تفسیر فاضلی میں ہر آیت شریفہ کی تفسیر کے بعد اس کا حاصل بھی بیان کیا گیا ہے۔ تفسیر فاضلی اپنے نظریات قرآنِ پاک کی سند سے بیان کرتی ہے۔ تفسیر فاضلی کے فاضل مصنف اس بات کو درست نہیں سمجھتے کہ شریعت، اور طریقت کو الگ الگ لوگوں کیلئے تخلیق کیا گیا ہے، یعنی شریعت عام لوگوں کیلئے اور طریقت پنچے ہوئے لوگوں کیلئے۔ حضرت فضل شاہ کا ارشاد گرامی ہے: ”عام سے خاص بنتا ہے، اور خاص سے خاص الخاص۔“ ان کا نظریہ ہے کہ شریعت کو جاننے کا منع الحجت یعنی قرآنِ پاک ہے (تفسیر فاضلی منزل ششم، 314)۔ (القرآن، 18:45) اس کی تعلیمات پر عمل کرنے کا طریقہ طریقہ مستقیم یعنی طریقت بھی قرآنِ پاک میں بتایا گیا ہے۔ (46:30) ’طریقہ مستقیم یا طریقت‘ کا اتنی تعداد میں ہونا جتنے بھی آدم ہیں، بے سند بات ہے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ جس طرح کسی کے جی میں آئے شریعت پر عمل کرے، یہی طریقہ مستقیم ہے، کسی اللہ کی طرف رجوع لانے والے تصدیقیافتہ کا اتباع کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ بات قرآنِ پاک سے صریحاً مقصود ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:—۔ اور اتباع اسکے راہ کا کرنا جو میری طرف رجوع لائے۔—۔ (القرآن، 15:31) اسلام ہمیشہ سے اللہ کا اپنے بندوں کیلئے پسند کیا ہوادیں رہا ہے۔ (القرآن، 5:3) تمام شاہدین اپنی اپنی قوم کے سامنے یہی دین پیش کرتے رہے ہیں۔ ہر زمانے میں تمام لوگوں کیلئے یہ مکمل دین رہا ہے۔ حضور نبی ﷺ پر اسے اکمل کر دیا گیا۔ شریعت اب اس دین کی تعلیمات پر مشتمل ہے۔ شریعت اپنی ماہیت کے اعتبار سے شاہراہ ہے (تفسیر فاضلی منزل ششم 1997، ص 314)۔ قرآنِ پاک

اس کیلئے صراطِ مستقیم کی تمثیل استعمال کرتا ہے۔ سورہ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے دعا سکھائی گئی ہے: ”ہمیں صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا فرماء۔ راہ اُنکی جن پر تو نے انعام کیا۔“ ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ: انعام یافتہ کے نقش قدم کا نام صراطِ مستقیم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کے مرسلین میں سے ہونے اور صراطِ مستقیم پر ہونے کی شہادت دی ہے۔ (القرآن، 4-36:3) جس کی آپ نے اپنے نقش قدم پر ہونے کی شہادت دی، وہ بھی صراطِ مستقیم پر ہے۔ اس تقدیق یافتہ شاہد سے جسے تقدیق عطا ہوئی اس کے صراطِ مستقیم پر ہونے میں بھی کوئی شبہ نہ رہا۔ یہ سب انعام یافتہ ہیں۔ صورتیں جدا جد ایں، راستہ سب کا ایک ہے۔ تفسیر فاضلی کے مصنف ارشاد فرماتے ہیں: ”اللہ کے محبوب کے نقش قدم کو صراطِ مستقیم کہتے ہیں کہ اللہ کی رضا اسی سے روشن ہوتی ہے۔“ وہ مزید فرماتے ہیں کہ: ”صراطِ مستقیم کی ہدایت طلب کرنے سے یہ حق عائد ہوتا ہے کہ اللہ کے محبوب سے کسی مقام پر اپنی کوئی صورت نہ رکھی جائے اور رب العالمین کو اسی کے حوالے سے اور اسی کی شہادت سے یاد کیا جائے۔“ اللہ کے محبوب کے نقش قدم کا اتباع ہی طریقت ہے۔ سورہ نساء میں فرمایا گیا ہے: اور جو اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی اطاعت کرے تو اسے اُنکی معیت حاصل ہو گی جن پر اللہ نے انعام کیا۔ ”... النبیین، صدیقین، شہداء اور صالحین۔ اور وہ کیا ہی اچھے رفقیں ہیں۔“ (القرآن، 4:69) ان انعام یافتہ حضرات کی معیت رضائے الہی کی سند ہے۔ اس معیت کا طریق حصول یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہو۔ اللہ کی اطاعت اللہ کے رسول کی اطاعت ہی سے ثابت ہوتی ہے، اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت تابعین، ناصحین، شاہدین کی اطاعت سے ثابت ہوتی ہے۔ دعویٰ بھی حال پر ہوتا ہے، شاہد بھی حال پر ہوتا ہے اور بغیر شہادت دعویٰ قبل سماحت ہی نہیں ہوتا۔ انعام یافتہ کا اتباع خوف و حزن سے یقینی نجات کا باعث ہوتا ہے۔ اس سے بڑی رفاقت کوئی نہیں ہو سکتی (تفسیر فاضلی منزل اول 1992، ص 1:5-6، ص 2:3) خطِ مستقیم دون نقاط کے درمیان مختصر ترین فاصلہ ہوتا ہے۔ تقدیق یافتہ شاہد کا اتباع منزل کے حصول کا لیقین، مختصر ترین اور محفوظ ترین راستہ ہے۔ دائرے کے محیط کا نہ آغاز ہوتا ہے نہ انجام۔ محیط پر سفر کرنے والا کبھی منزل آٹھا نہیں ہوتا۔ قرآن پاک میں دائرے کی تمثیل 'مصارف' میں گھر جانے، یا بُری گردش، کے معنی میں آئی ہے۔ کہیں پر یہ تمثیل شریعت یا اس کے طریق اور حقیقت سے تعلق کو بیان کرنے کیلئے نہیں آئی۔ (القرآن، 6:48)

## سیدنا حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں ایک تمثیل

سید حسین نصر بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”بسم اللہ سے سورہ الفاتحہ کا آغاز ہوتا ہے، چنانچہ یہ سارے قرآن سے پہلے ہے۔ قرآن کی روح الفاتحہ ہے۔ اور ’بسم اللہ‘ کی روح حرفاً ب، ہے جس سے ’بِسْمِ اللَّهِ كَأَعْزَزْتُكُمْ‘ کا آغاز ہوتا ہے۔ اور ب، کی روح وہ نقطہ ہے جو حرفاً ب، کے نیچے ہوتا ہے۔ اور میں [حضرت علی علیہ السلام] وہ نقطہ ہوں۔“ سید حسین نصر کے الفاظ یہ ہیں :

”The basmallah [بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ] begins the Surah al-Fatiyah and therefore the whole of the Quran. It thus comes at the beginning of the prophetic message which is itself revealed because of God's mercy towards men. It is in reference to the inner meaning of the formula that 'Ali, the representative par excellence of the esotericism in Islam, said that 'all the Quran is contained in the Surat al-Fatiyah, all of this Surat is contained in the Surat al-Kauthar [الْكَوْثَرُ]، all of the Surat al-Kauthar [الْكَوْثَرُ]، in the letter 'ba' (ب) with which it begins, all of the letter 'ba' in the diacritical point under it and I am that diacritical point'. The beautiful symbolism indicated in this saying refers to Ali's 'supreme identity' as the perfect saint who is inwardly in union with God. The point with which the Quran begins is according to another Hadith the first drop from the Divine Pen. It thus marks the beginning of things as it is also the beginning of the Quran. Like the point which generates all geometric space, the point is the symbol of the Origin of all creation, as the Surat al-Kauthar [الْكَوْثَرُ] itself marks the beginning of things (S. H. Nasr 1966, 63).“

حضرت علیؑ، شاہدین میں بہت ہی بلند مرتبہ رکھتے ہیں اور شاہدین انکی عظمت کو ہمیشہ سلام کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ لیکن جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے، کیا اسے اللہ کے نازل کردہ الحق کے ساتھ کوئی نسبت ہے! ہر گز نہیں۔ یہ حضرت علیؑ کرم اللہ وجہ، کی شان کے منافی ہے کہ وہ کوئی ایسا دعویٰ کریں جسے قرآنِ پاک کی سند حاصل نہ ہو۔ حرفاً ب، کا diacritical point ایک نقطہ ہے اور نقطہ ہمیشہ بلا جہت اور بے رخ (dimensionless, directionless) ہوتا ہے۔ حضرت علیؑ نے ہمیشہ حضور ﷺ کے

نقش قدم کا اتباع کیا۔ آپ نے ہمیشہ حضور کی اطاعت کی۔ آپ کا رخ ہمیشہ ظلمات سے نور کی طرف رہا۔ آپ رضی اللہ عنہ، بے جہت اور بے رخ کیسے ہو سکتے ہیں! تفسیر فاضلی باطنیت (esotericism) کے نام پر اللہ کے کسی محبوب بندے کی ذاتِ اقدس کو پر اسرار بنانے پر یقین نہیں رکھتی۔ حضرت علیؓ کپن ہی میں ایمان لے آئے اور تمام عمر مبارک حضور نبی پاک ﷺ کے اسوہ حسنی کا اتباع کرتے ہوئے فرمانِ الہی کے مطابق بُر کی۔ زندگی کے کسی بھی مقام پر آپ نے خواہش کا اتباع نہیں کیا۔<sup>28</sup> تفسیر فاضلی قربِ الہی کے لحاظ سے اللہ کے کسی بندے کی شان بیان کرنے کیلئے اتحاد (union with God) حلول یا سریان (immanance) جیسے الفاظ استعمال کرنا خلاف حق صحیح ہے۔ تفسیر فاضلی کے مطابق قرآن پاک اس مقصد کیلئے 'معیتِ الہی' (togetherness) کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ مثلاً فرمایا گیا ہے: صابرین اللہ کی معیت میں ہیں، متقین اللہ کی معیت میں ہیں، محسینین اللہ کی معیت میں ہیں۔ (القرآن، ۲:194, 2:153, 29:69) مکہ شریف سے مدینہ پاک بھارت کے دوران جب آپ ﷺ غارِ ثور میں تھے اور دشمن تعاقب کرتے ہوئے غار کے دہانے تک پہنچ گیا تھا، آپ کے یارِ غار حضرت ابو بکر صدیقؓ اس اندر یہ سے محروم ہوئے کہ کہیں حضور پاک کو کوئی گزندہ پہنچ جائے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: لا تحزن ان الله معنا۔ حُزْنَ نَهْ كَرُوهُمُ اللَّهُ كَمَعِيَتْ مِنْ هِيَ۔ (القرآن، 9:40) حضرت علیؓ کی کامل معیت میں تھے لیکن "in union with God" قطعاً نہیں تھے اور نہ ہی کوئی ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں میں پانچ نہایت مقرب ہستیوں کا تصور ہے جنہیں پنجتن پاک کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کچھ حضرات حضور نبی ؓ کریم ﷺ، حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ، حضرت بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہم، حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ، اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو پنجتن پاک مانتے ہیں، جبکہ کچھ حضرات ان پاک ہستیوں کا بھی ادب کرتے ہیں اور حضور نبی ؓ کریم ﷺ، حضرت ابو بکر صدیقؓ رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، اور حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ کو پنجتن پاک قرار دیتے ہیں۔ حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ کی شان بیان ان کرتے ہوئے حضرت فضل شاہ کا ارشاد ہے: ”ہر خلوت کی ایک جلوٹ ہوتی ہے اور ہر جلوٹ کی ایک خلوت ہوتی ہے۔ مقدم الذکر خلوت کے پنجتن پاک ہیں، مؤخر الذکر جلوٹ کے پنجتن پاک ہیں۔ حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ کا شمار خلوت کے پنجتن پاک میں بھی ہے اور جلوٹ کے پنجتن پاک میں بھی ہے۔“ یہ سب اللہ کی

کامل معیت میں ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی in union with God نہیں۔ بسم اللہ شریف کی تفسیر میں تفسیر فاضلی میں ارشاد ہے:

”صاحبِ اللہ تعالیٰ پاک ہے۔ جو پاک ہو وہ اسے پاسکتا ہے۔ یہ پاکی اللہ کے محبوب سے عطا ہوتی ہے اور اسکی بدولت مخلوق کے ساتھ پورا رہنے کا ذائقی اور صفائی علم عطا ہوتا ہے۔ الرحمن کی شان یہ ہے کہ وہ رحم کرتا ہے اور جب کوئی مقصود سے دور ہو رہا تو اسے قریب کرنے کیلئے سختی بھی کرتا ہے۔ مگر یہ وقت ہوتی ہے۔ پھر اس کا رحم ہی رحم ہوتا ہے۔ یہ اللہ کا کرم ہے کہ جس پر اللہ کا کرم ہوا اس کے قریب ہونے کا شرف ہو جائے۔ اس طرح بسم اللہ عمل سے ہو جاتی ہے، ورنہ قول کی تکرار سچا ثابت ہونے کیلئے کافی نہیں ہے۔ جس قول کا عمل شاہد نہ ہو وہ قول سچا ثابت نہیں ہوتا۔ حاصل ہے کہ کام میں بسم اللہ قول سے ادا کرنا حق ہے۔ عملاً یہ دیکھنا لازم ہے کہ ہم عباد مخلصین کے اتباع میں تجویز سے پاک رہیں۔“

بہت کچھ جو تصوف کے نام پر پیش کیا جا رہا ہے دراصل سریت یا باطنتیت سے سوا پکھ اور نہیں۔ طریقت شاہدین سے اسے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ باطنتیت کو فروع دینے والوں نے ایک روایت گھٹلی ہے کہ قرآن پاک کی تلاوت سات طرح سے کی جاسکتی ہے۔ اس طرح قرآن پاک میں اپنی مرضی کے معنی داخل کرنے کی انہیں وسیع گنجائش مل جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”اس کا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمے ہے۔ تو جب ہم اسکو سنائیں تو اس کا اتباع کیجئے۔“ (القرآن، 18:17-18) اللہ کے رسول ﷺ نے جیسے پڑھ کر سنایا ہے، ویسے ہی آپ گوپڑھایا گیا ہے۔ قرات میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔

## اپنا تزکیہ آپ کیوں نہیں کیا جاسکتا!

پوچھا جا سکتا ہے کہ شاہد کے بغیر اپنا تزکیہ آپ کیوں نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ اس نے اپنا تزکیہ آپ کر لیا ہے تو یہ محض دعویٰ ہو گا جس کا کوئی شاہد نہیں ہو گا۔ اس بیان کی تصدیق کون کرے گا۔ جو اپنا تزکیہ آپ کرنے کی بات کرتا ہے، جو کسی کو اپنے سے بڑے علم والا منے کیلئے تیار نہیں، وہ اللہ کے اس امر کہ: ”... اتباع اس کا کرو جو میری طرف رجوع لائے۔...“ (القرآن، 15:31) پر عمل پیرا کس طرح ہو سکتا ہے! اسی طرح فرمانِ الہی ہے: ”... اللہ درجات بلند فرماتا ہے جس کے چاہتا ہے۔ اور ہر علم والے سے اوپر ایک علم والا ہے۔...“ (القرآن، 76:12) اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اشیاء کے ناموں کا علم عطا فرمائے

فرشتوں پر آدم کے علم کی فضیلت واضح فرمادی۔ ابلیس فرشتوں کی اس جماعت کے ساتھ تھا۔ تکریم آدم سب سے پہلا حکم تھا جو کائنات میں دیا گیا۔ فرشتوں نے فرمانِ الٰہی کے مطابق سجدہ کر کے آدمؑ کی فضیلت کو ماننے کا ثبوت دے دیا۔ ابلیس کا کیامسلہ تھا! ابلیس نے فرمانِ الٰہی پر عمل کیوں نہ کیا! آدمؑ علیہ السلام کو اپنے سے بہتر نہ مانتا ہی ابلیس کا مسلہ تھا! اپنا ترکیہ آپ کرنے کا دعویٰ کر نیوں والوں کیلئے کسی کو اپنے سے بہتر مانتا ہی مشکل ہوتا ہے۔ ابلیس اگر آدمؑ کو اپنے سے بہتر مان لیتا تو وہ اپنی پسند اور ناپسند کے دائرے سے نکل آتا۔ سورہلقمان میں فرمایا گیا ہے: ”--- میرا اور اپنے والدین کا شکر کرو۔ میری ہی طرف آنا ہے۔ اور اگر وہ دونوں تم پر زور دیں کہ تم میرا شریک ٹھہراؤ، جو تمھیں معلوم نہیں، تو ان کی اطاعت نہ کرنا، اور دنیا میں معروف طریق پر ان سے مصاجبت کرنا، اور اتباع اس کا کرنا جو میری طرف رجوع لائے۔---“ (القرآن، 15:14-15) اللہ کی طرف رجوع لانے والے کا اتباع کرنا رخ کے درست ہونے کی سند ہوتا ہے۔ حال پر اللہ کے محبوب کو شناخت کر کے اسکا اتباع کرنا ہی طریقت ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ اس کے بغیر شریعت پر عمل کرنے والا اپنی پسند اور ناپسند کے دائرے سے باہر نکل سکے۔ اللہ کے محبوب کے قدم کو بوسدے بغیر قول سے عمل کے درجے میں داخل ہونے کا شرف ہوتا ہی نہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ فرمانِ الٰہی ”--- اللہ پاک کرتا ہے جسے چاہتا ہے۔---“ (ماخوذ، القرآن، 21:49، 4:49) کے بعد شاہد کو تلاش کرنے اور پانے کی ضرورت رہتی ہی کہاں ہے! تفسیر فاضلی کے مطابق اللہ نے اپنے محبوب ﷺ کو تو کیہ عطا فرمانے کا شرف عطا کیا ہے۔ جسے پاک کرنا حضور پسند فرماتے ہیں، اللہ اسے پاک کر دیتا ہے۔ قرآنِ پاک میں ارشاد ہے: اے محبوب! آپ فرمادیجئے، اگر تم اللہ کی حبّ چاہتے ہو تو میرا اتباع کرو، اللہ تمھیں ان لوگوں میں شامل فرما لے گا جن سے وہ محبت کرتا ہے۔ (القرآن، 3:31) اللہ کا درجہ محب کا ہے۔ محسین، توابین، مطہرین، متظہرین، صابرین، متولکین، مقسطین، متقيین، اللہ کی راہ میں صفتستہ ہو کر لڑنے والے، اور اللہ کے محبوب ﷺ کا اتباع کرنے والے اللہ کے محبوب ہیں۔ حضور ﷺ اللہ کے محبوب ترین بندے ہیں۔ شاہدین میں یہ صفات بد رجہ کمال ہوتی ہیں۔ یہ اللہ کو بہت محبوب ہوتے ہیں۔ اللہ اپنے محبوب پاک کا محبت ہے، ماننے والے بھی اللہ کے محبوب کے محب ہیں۔ بعض لوگ اس آیت کریمہ سے کہ ”--- ایمان والے اللہ سے محبت کرتے ہیں اشد۔---“ (القرآن، 2:65) یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اللہ ایمان والوں کا محبوب ہے۔ تفسیر فاضلی کا موقف ہے کہ ”جس کی صداقت اور امانت کی شہادت دی جائے، اس کی بات کو بلا دلیل ماننا ایمان بالغیب

ہے۔ ”(تفیر آیت، 3:2) ایمان والے شاہد کی صداقت اور امانت کی شہادت دے کر آپ کی اتحاری پر اللہ کو مانتے ہیں اور اپنے شاہد کے اللہ کی حیثیت سے اس سے اشہد محبت کرتے ہیں۔ اللہ سے انکی محبت، شاہد کی محبت ہی کا تقاضا ہوتی ہے۔ جب تک شاہد کی کامل معیت نہ ہو، اللہ کی حب کے اشہد ہونے کی کوئی سند نہیں ہوتی۔ جو اللہ کے محبوب کو مانے بغیر اللہ کو مانتا ہے، اللہ اس کو نہیں مانتا۔ فرمانِ الٰہی ہے: ”--- اور معلوم رہے کہ اللہ کے رسول تمہارے درمیان موجود ہیں۔---“ (القرآن، 7:49) تفسیر فاضلی کے مطابق اللہ کے رسول ﷺ شاہدین اور مخلصین کی صورت ایمان والوں کے اندر موجود ہیں۔ (القرآن، 3:53، 15:40، 5:83) تفسیر فاضلی کے مطابق جو حال پر اللہ کے محبوب کا اتباع کرتا ہے، اللہ اسے چاہتا ہے، اور اللہ جسے چاہتا ہے اسے اللہ کے محبوب سے تزکیہ عطا ہوتا ہے اور تصدیق عطا ہوتی ہے (تفسیر فاضلی منزل اول 1992، تفسیر آیت 4:49)۔ جو اپنی خواہش کا اتباع کرے وہ مشقت میں پڑ جاتا ہے۔ پھر بھی اللہ کو منظور ہو تو خیر کی طرف آنے کا شرف ہو جاتا ہے، لیکن اگر تعلق ہی منقطع ہو گیا ہو تو پھر خیر کی طرف آنے کا راستہ ہی بند ہو جاتا ہے۔ شان یہ ہے کہ جو شاہد کی نہ مانے شاہد اسے مان لیتے ہیں تاکہ تعلق برقرار رہے اور خیر کی طرف آنے کا راستہ کھلا رہے۔

## ذاتِ اقدس ﷺ کی حیثیتوں کا نظریہ — ڈاکٹر اسرار احمد

قرآنِ پاک اتباع اور اطاعتِ رسول کو مطلق قرار دیتا ہے۔ اسکی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ رسول ﷺ کا اتباع کرنے والے کو اللہ اپنا محبوب بنایتا ہے اور آپ کی اطاعت کرنے والے کو انعام یافتہ بندوں کی صفت میں شمار ہونے کا شرف ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی حضور پاک کی ذاتِ اقدس کو مختلف حیثیات میں تقسیم کرے اور آپ ﷺ کے رسول ہونے کو آپ کی ذاتِ اقدس کی محض ایک حیثیت قرار دے اور یہ کہے کہ آپ صرف اسی حیثیت میں واجب الاتبع اور واجب الاطاعت ہیں۔ اور پھر یہ کہے کہ اس حیثیت میں بھی آپ کا اتباع اور اطاعت محض امورِ دین کے ساتھ مشروط ہے، امورِ دنیا اس میں شامل نہیں ہیں، تو وہ حضور ﷺ کا کیا اتباع اور اطاعت کر لیتا اگر حضور کے زمانہء بعثت میں بھی ہوتا۔ ڈاکٹر اسرار احمد اپنے مضمون ”خلافت کے اقتصادی نظام کی اصولی اساس“ (خلافت کے اقتصادی نظام کی اصولی اساس 1992، 10) میں لکھتے ہیں کہ اللہ کا رسول ہونا آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس کی مختلف حیثیات میں سے ایک ہے۔ بعض افراد کو آپ نے مختلف اوقات میں جو احکام دیئے، ضروری نہیں کہ وہ رسول اللہ کی حیثیت ہی میں دے

ہوں۔ مثلاً بعض مانے والوں کے آپ رشتہ دار تھے، بعض محترم خواتین کے آپ خاوند تھے، عرب کے ایک قبیلہ کے ممبر تھے، کمیونٹی کے ایک دانا شخص تھے۔ ان حیثیات میں آپ ﷺ کے کسی امر کی اطاعت یا اتباع لازم نہیں ہو سکتا۔ ہاں امورِ دین میں آپ کی اطاعت اور اتباع لازم ہے، اور اللہ کے مذکورہ بالا حکم کا یہی محل ہے۔ تفسیر فاضلی ذاتِ اقدس ﷺ کی حیثیتوں کے نظریہ کو خلافِ قرآن صحیح ہے۔ تفسیر فاضلی کے محترم مصنفوں شاہد کی ذاتِ اقدس کی وحدت پر یقین رکھتے ہیں۔ شاہد صرف اور صرف شاہد ہوتا ہے۔ باپ، بیٹا، بیوی، رشتہ دار یا غیر رشتہ دار جو شاہد پر ایمان لاتا ہے، اسکا ہے، اور جو نہیں مانتا اسکا کچھ نہیں لگتا۔ یہ بات تمام شاہدین کے بارے میں درست ہے۔ شاہد کا مقام اس کی حیاتِ طیبہ کے تمام پہلوؤں پر محیط ہوتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا آپ کا ماننے والا نہیں تھا۔ قرآن شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وہ آپ کے اہل میں سے نہیں۔ (القرآن، 11:45) حضرت نوح اور حضرت لوط علیہم السلام کی ازوں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ ان کے ماننے والے نہیں تھے، وہ آپ کے کچھ نہیں لگتے تھے۔ (القرآن، 66:10)

حضور ﷺ حکم کے لمحے میں بہت ہی کم بات کرتے تھے۔ اگر کبھی آپ نے حکم دیا تو اس پر عمل نہیں کیا گیا۔ مثلاً حضور ﷺ نے جنگِ احمد کے موقع پر دڑے کے اوپر مقرر کئے جانے والوں کو کسی صورت وہاں سے نہ ہٹنے کا حکم دیا، اس پر عمل نہ کیا گیا۔ آپ ﷺ مشورے یا تجویز کے طور پر بات فرماتے تھے، تحریک یا ترغیب سے کام لیتے تھے تاکہ اطاعت نہ کر سکنے والا ناہگار نہ ہو۔ شاہدین کا بھی یہی طریقہ ہوتا ہے۔

## تابیرِ خل کے بارے میں روایت

ذاتِ اقدس کی حیثیتوں میں تقسیم سے یہ لوگ کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں! یہ اپنی پسند اور ناپسند سے شدید طور پر جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ زندگی کے تمام پہلوؤں میں حضور ﷺ کی اطاعت اور اتباع کیلئے تیار نہیں ہوتے۔ کسی کو بڑے علم والا مانے، افتداء کے مقام پر فائز ہونے سے پہلے کسی رجوع لانے والے کا اتباع کر کے اس سے تصدیق پانے کا شرف حاصل کرنے کے لئے یہ تیار نہیں ہوتے، کیونکہ اس میں اپنی پسند اور ناپسند کے اتباع اور قیاس آرائیوں کیلئے گنجائش نہیں ہوتی۔ دنیا اور دین کو دو الگ دائرے متصور کرنے، اور رسالت کو صرف امورِ دین تک محدود کرنے میں، اپنی پسند اور ناپسند کا اتباع کرنے اور اپنی قیاس آرائیوں کو علم کا نام دینے کی انہیں وسیع گنجائش نظر آتی ہے۔ حضورؐ کے اتباع اور اطاعت کے صریح امرِ الہی کو اپنی خواہشات کے مطابق بنانے کیلئے یہ ایک حدیث بیان کرتے ہیں۔ اس حدیث کے مطابق کھجور کی کاشت کرنے والے چند

لوگ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضور کی مدینہ پاک تشریف آوری سے پہلے ہم زر کھجور کے زرداں (پنتر) سے زرداں نہیں (پولن گرین) اتار کر مادہ درختوں کے زرداں پر کل دیا کرتے تھے اور اسے کھجوروں کی شادی کا نام دیتے تھے۔ لیکن جب یہ بات حضور کے سامنے رکھی گئی تو ہم نے سمجھا کہ حضور ﷺ نے اسے ناپسند فرمایا ہے۔ ہم نے اس طریق کار کو ترک کر دیا۔ لیکن حضورؐ کھجور کی فعل تو بہت ناقص ہوئی ہے۔ حدیث مزید بیان کرتی ہے کہ اس پر حضورؐ نے فرمایا: أَتَهُمُ الْأَعْلَمُ بِأُمُورِ دُنْيَاٰكُمْ (تم امور دنیا میں اعلم ہو سکتے ہو) (احمد 1992, 10)

## سیکولر علم اور مذہبی علم میں تقسیم

تفسیر فاضلی کے مطابق یہ بات قرآن پاک کی تعلیمات کے قطعاً منافی ہے کہ کوئی شخص کسی قسم کے امور میں حضور ﷺ سے بڑے علم والا بھی ہو سکتا ہے۔ آئیے اس روایت کی صحت کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں۔ یہ روایت کچھ امور (affairs/ matters) کو امور دنیا (mundane affairs, worldly matters) (معاذ اللہ) حضور ﷺ سے بڑے علم والے ہو سکتے ہیں۔ امور دنیا کے بعد جو امور بچھتے ہیں انھیں امور دین (religious matters) ہی کہا جائے گا۔ چنانچہ اس روایت کو درست مانے والے امور کو امور دنیا اور امور دین میں تقسیم کرتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ حضور ﷺ کی اطاعت اور اتباع محض امور دین کے ساتھ مشروط ہے۔ بعض لوگ اس روایت کو بنیاد بنا کر علم کو سیکولر علم اور مذہبی علم میں تقسیم کر کے حضور ﷺ کے علم کو صرف مذہب سے متعلق امور کے علم تک محدود کرتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ حضور ﷺ کا اتباع صرف مذہبی امور میں لازم ہے، سیکولر علم سے متعلق معاملات پر اس حکم کا اطلاق نہیں ہوتا (Islam on Secular Science) (n.d.)۔ تفسیر فاضلی اس تقسیم کو درست نہیں سمجھتی۔ تفسیر فاضلی کے مطابق سے اخذ ہوتا ہے کہ قرآن پاک میں اس تقسیم کی بنیاد موجود نہیں۔ اس بات کے ثبوت کیلئے قرآن پاک سے ان آیات کے چند حوالے پیش کرتے ہیں جہاں 'امر' یا 'امور' کا الفاظ آیا ہے۔ فرمایا گیا ہے:

”اگر مومنین کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں، تو ان کے مابین صلح کراؤ۔ پھر اگر ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو، حتیٰ کہ وہ اللہ کے امر کی طرف لوٹ آئے۔“ (اقرآن، 49:9)

”... اور امور کا رجوع اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہے۔“ (اقرآن، 2:110، 3:109)

”...اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کرو، تو یہڑے عزم کے امور ہیں۔“ (القرآن، 186:3)

”...اور امور کی عاقبت اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔“ (القرآن، 14:22)

”...اور اللہ کا امر ہوتا ہی تھا۔“ (القرآن، 37:33)

”...کسی مومن یا مونمنہ کا یہ کام نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی امر کا فیصلہ فرمادیں تو ان کے لئے ان کے کام کا کوئی اختیار ان کے پاس رہ جائے۔“ (القرآن، 36:33)

”اور وہ جنہوں نے اپنے رب کا حکم مانا اور نماز قائم کی، اور جن کے کام (امر) باہم مشورے سے ہوتے ہیں اور وہ ہمارے دے ہوئے رزق سے خرچ کرتے ہیں۔“ (القرآن، 38:42)

’امر‘ یا ’امور‘ کے لفظ کی یہ چند مثالیں ہم نے پیش کی ہیں۔ کیا انھیں امورِ دنیا اور امورِ دین میں تقسیم کیا جا سکتا ہے؟ ’امور‘، لفظ ’امر‘ کا واحد ہے۔ قرآنِ پاک کے مطابق ’امور‘ معروف ہوتے ہیں یا ممکن۔ حضور ﷺ نے ماننے والوں کو ہمیشہ معروف کا امر دیا اور منکر سے منع کیا۔ (القرآن، 7:157) منافق مرد اور منافق عورتیں برائی کا امر کرتے ہیں اور بھلائی سے روکتے ہیں۔ (القرآن، 9:67) قرآنِ پاک میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا پیدا فرمایا، مثلًا دن اور رات، موت اور حیات، ظلمات اور نور، مسلم اور مجرم، عالم اور جاہل، اندھا اور دیکھنے والا، نر اور مادہ وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں ’دنیا‘ کا ’دین‘ کے ساتھ جوڑا نہیں بنایا۔ قرآنِ پاک ہر مقام پر ’دنیا اور آخرت‘، ’جوڑے کے طور پر بیان کرتا ہے۔ مثلًا ”... اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھلائی دے، اور آگ کے عذاب سے بچا۔“

(القرآن، 2:201) ’دین‘ کا لفظ قرآنِ پاک میں دینِ اسلام کیلئے آیا ہے یادِ دین کفر کیلئے، اور اسلام اور کفر ایک دوسرے کے مقابل آئے ہیں۔ (القرآن، 6:109) یہ ممکن ہی نہیں کہ حضور نبی ﷺ کریم اپنے فرمان میں قرآنِ پاک کے ڈکشن سے متناقض الفاظ استعمال فرمائیں۔ حضور کی اطاعت مطلق ہے۔ شاہد کی شان یہی ہے کہ ماننے والا خلوت اور جلوت کے ہر مقام پر آپ کا اتباع کرے اور اطاعت کرے۔ حضور ﷺ کی ذات اقدس کو حیثیات میں بانٹنے، معاملاتِ حیات کو امورِ دنیا اور امورِ دین میں تقسیم کرنے والے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مسلمان سائنسی علوم کی ترقی میں اس لئے پیچھے ہیں کہ وہ کھل کر تحقیق کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں حضور ﷺ کے اتباع اور اطاعت کے حکم کی خلاف ورزی نہ ہو جائے، جبکہ غیر مسلم بلا خوف، تحقیق کرتے ہیں۔ چنانچہ اس قبل کے لوگ رسالت کو ذاتِ اقدس کی صرف ایک جہت قرار دیتے ہیں، اور اس جہت میں بھی حضور کے اتباع کو صرف امورِ دین تک

محدود کر کے دعویٰ کرتے ہیں کہ سائنسی مطالعہ و تحقیق کوئی امر دین نہیں اور حضور ﷺ کے اتباع و اطاعت کے حکم الہی کا اطلاق ان امور پر نہیں ہوتا۔ بلکہ اس طرح کی قابل نفرت بات بھی کرتے ہیں کہ امور دنیا میں کوئی شخص اپنے دائرہ علم میں (معاذ اللہ) حضور ﷺ سے بڑے علم والا ہو سکتا ہے۔

دائرہ عبدیت میں ہر اعتبار سے جو شان حضور نبی پاک ﷺ کو حاصل ہے، وہ ماضی میں کسی کو حاصل تھی، نہ حال پر ہے اور نہ مستقبل میں کبھی ہوگی۔ حضور ﷺ کے ادنیٰ پیر و کاروں کی شان، علم کے اعتبار سے اتنی بڑی ہے کہ اس کی مثال نہیں پیش کی جاسکتی۔ چونکہ ’تاپیر غل‘ سے متعلق روایت کا تعلق ایک سائنسی حقیقت سے ہے اس لئے سائنس سے متعلق مثالیں زیادہ فائدہ مند ہوں گی۔ جب حضرت فضل شاہ قطب عالمؒ کے علم میں یہ بات آئی کہ ڈاکٹردواں نجیکشنا کی صورت میں بر اور استخون کی نسou میں داخل کر دیتے ہیں اور جدید سائنسی طریق علاج میں اس طریقے (intravenous) کو بہت فروغ حاصل ہو رہا ہے تو آپ بہت دیر تک افسوس کا انہصار کرتے رہے۔ فرمایا: ’بیٹا! اللہ نے تو کسی چیز کے بر اور استخون میں شامل ہونے کا راستہ ہی نہیں رکھا۔ اس طریقے کو تو صرف اسی صورت میں استعمال کیا جانا چاہئے جب مریض کی جان بچانے کیلئے اس کے علاوہ کوئی اور چارہ کا رہنا ہو‘،

## سنت کی پیروی — چند پہلو

مذہبی لوگ حضور ﷺ کی سنت کی پیروی پر بہت زور دیتے ہیں، تزکیہ نفس اور تہذیب نفس کی بہت بات کرتے ہیں، اور سنت کی پیروی اనیں نسبتاً ایسے غیر اہم معاملات میں ضروری دھکائی دیتی ہے جن سے بظاہر نہ فرد کو خود کوئی معتقد فائدہ پہنچتا ہے نہ جماعت کو۔ مثلاً اڑھی کا سائز کیا ہو ناجائز، مساوک کتنی لمبی ہو تو سنت کے مطابق ہوگی۔ حضور ﷺ نے اپنی پوری حیات طیبہ میں ایک بار بھی میدے / باریک آٹے کی روٹی نہیں کھائی، میدے سے بنی ہوئی کوئی چیز نہیں کھائی۔ ہم نے آج تک کسی عالم دین کو، سنت کو مأخذ شریعت قرار دینے والے کو، اس سنت پاک کی پیروی کرتے ہوئے، اپنے پیروؤں کو اس سنت پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کرتے ہوئے نہیں سنا اور نہ پڑھا۔ سب سے زیادہ خلاف ورزی اس سنت پاک کی مکہ شریف اور مدینہ شریف میں ہوتی ہے۔ بے شمار بیماریاں محض اس ایک سنت پاک پر عمل نہ ہونے سے پیدا ہوتی ہیں۔ جدید سائنسی طریق علاج کے ماہرین میں سے شائد ہی کوئی مریض کو میدے سے بنی ہوئی اشیاء کے استعمال سے منع کرتا ہو۔ جدید سائنسی طریق علاج کے ماہرین میں سے شائد ہی کوئی اپنے مریضوں کی غذا کا

شیدول بنوا کر مرض کے سبب کو معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہو۔ اب آئیے دیکھتے ہیں کہ حضرت فضل شاہ<sup>ؒ</sup> (وصال 1978ء) اس سلسلہ میں کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ فرمایا: ”تشخیص درست ہو، غذا اور دوادرست ہو، پرہیز ہو رہا ہو، تو مریض کو افاقہ ہونا چاہئے۔ مریض کے ذمے ایک ہی کام ہوتا ہے اور وہ ہوتا ہے ان حدود کا احترام جو طبیب نے اس کیلئے مقرر کی ہیں، اور مریض کوتا ہی بھی اسی میں کر سکتا ہے۔ ہمیں اپنی تشخیص پر یا غذا اور دوائے کے اعتبار سے اپنی تجویز پر کبھی شک نہیں ہوا۔“ مزید فرمایا: ”دواشدت مرض کو کم کرنے کیلئے درکار ہوتی ہے۔ غذا درست ہو تو طبیعت کو تقویت ملتی ہے، طبیعت کو تقویت ملے تو مرض مغلوب ہوتا ہے۔ جسے غذا کا علم نہ ہوا سے علاج کرنا کبھی خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ اس کی تجویز کر دو اگر مفید بھی ہو تو بھی زندگی کے لوازمات میں داخل ہو جاتی ہے (تغیری فاضلی منزل اول، تعارف)۔“ حدیث اور سیرت پاک کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ حضور نبی، کریم ﷺ کو بکری کے شوربے کا ثرید بہت پسند تھا۔ کروڑوں مسلمانوں میں سے گنتی کے چند لوگ ہی جانتے ہوئے کہ ثرید ہوتا کیا ہے۔ امورِ دنیا میں بزرگ خود اعلم، ہونے کے دعوے داروں کی اکثریت یہی سمجھتی ہے کہ جس طرح لوگوں کو کھانے پینے میں کچھ چیزیں مرغوب ہوتی ہیں، حضور ﷺ کو بھی ثرید مرغوب تھا۔ جو رسانی کو ذاتِ اقدس کی صرف ایک جہت قرار دیتا ہو، اور صرف امورِ دین میں آپ کی اطاعت اور اتباع کو ضروری سمجھتا ہو، اور یہ کہتا ہو کہ امورِ دنیا سے متعلق امور میں لوگ (معاذ اللہ) حضور ﷺ سے بڑے علم والے ہو سکتے ہیں اس کے ذمہ میں یہ سوچ آہی کیسے سکتی ہے کہ ثرید کی طرف حضور ﷺ کی رغبت غذا کے حوالے سے آپ کے بہت بڑے علم پر مبنی ہی۔ لئے ماہرین علاج بالغذہ (nutritionist and dietitian) ہوں گے جو علاج بالغذہ میں حضور کے اس علم سے استفادہ کرتے ہوں۔ ہر مقام پر حضور ﷺ کے نقش قدم کو بوسہ دینے والے ہی پر آپ ﷺ کے علم کی شان روشن ہو سکتی ہے۔ حضور ﷺ کو پتلے شوربے والا سالن پسند تھا، آپ بھنا ہوا گوشت پسند نہیں کرتے تھے۔ تابیرِ خل والی روایت کو مانے والوں پر، علم کو سیکولر علم اور مذہبی علم میں تقسیم کر کے حضور کے علم کو صرف مذہبی امور کے علم تک محدود کرنے والوں پر، پتلے شوربے والا سالن پسند کرنے میں، بھجور، جو، ستو، شہد، ثرید کے استعمال میں حضور کے علم کی شان کیسے روشن ہو سکتی ہے۔ حضور ﷺ کے علم کو امورِ دنیا اور امورِ دین میں تقسیم کرنے والوں کو اس کے طبی فوائد اور روحانی فوائد کا علم ہو ہی کیا سکتا ہے۔ حضرت فضل شاہ کی قبلی کے لوگ ہی یہ فرماسکتے ہیں کہ ”جس کی پسند کو پسند کر لیا

جائے اس کے قریب ہونے کا شرف ہو جاتا ہے۔ ”حضور حضرت فضل شاہ قطب عالم ظاہری اعتبار سے تعلیمیافت نہیں تھے، لیکن مختلف علوم کے ماہرین میں سے جس کو حضرت فضل شاہ قطب عالم رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا، تمام عمر آپ کے علم کی عظمت کو سلام کرتا رہا۔

### مواخات، میثاق مدینہ، اور صلح حدیبیہ

حضور پاک ﷺ جب بھارت کر کے مدینہ پاک تشریف لائے تو مہاجرین مکہ اور انصارِ مدینہ کے درمیان آپ نے مواخات کا رشتہ قائم کر دیا۔ اس سے نہ صرف مہاجرین و انصار کے درمیان گھری یگانگت پیدا ہو گئی بلکہ مہاجرین کیلئے بعد میں میثاقِ مدینہ کی بنیاد پر وجود میں آنے والے غیر امنی نظام میں ختم ہونا ممکن ہو گیا۔ عرب کے قبائلی نظام میں مختلف معاهدے کرنا کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہ پہلے بھی ایک دوسرے کے ساتھ معاهدے کرتے رہتے تھے، ”تاہم مواخات اپنی نوعیت اور اثر آفرینی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ تھی۔ مواخات کی بدولت مدینہ میں ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا جس کی اساس اسلام تھا، نہ کہ قبائلی تخصص و امتیاز!“ پوچھا جا سکتا ہے کہ حضور پاک ﷺ کی طرف سے مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات کا رشتہ طے کرنا اور پھر انصار و مہاجرین کا حضورؐ کے اس حکم پر عمل پیرا ہونا امورِ دین میں سے تھا ایامِ دنیا میں سے! مواخات کی بنیاد پر وجود میں آنے والی اس اسلامی کیوٹی کے علاوہ مدینہ پاک میں یہود اور مشرک بھی موجود تھے۔ ایک پر امن معاشرے کے قیام کیلئے ضروری تھا کہ ان غیر مسلم قبائل کے ساتھ بھی تعلقات کی نوعیت متعین کر لی جائے۔ حضور پاک ﷺ نے یہود اور دیگر اہلِ مدینہ کے ساتھ ایک معاهدہ کیا جو میثاقِ مدینہ کے نام سے مشہور ہے۔ ”اس معاهدے کی کل 47 دفعات ہیں۔۔۔ پہلی تین (23) دفعات مسلمانوں کے بارے میں ہیں اور باقی یہود اور دیگر اہلِ مدینہ کے بارے میں۔“ اس معاهدے سے مدینہ پاک میں مدتیں سے قیام پذیر گرو ہوں اور متفرق قبیلوں کے درمیان امتِ مسلمہ ایک منفرد سماجی اکائی کی حیثیت سے ابھری۔ امتِ مسلمہ کے دیگر غیر مسلم قبائل کے ساتھ ربط و ضبط کی شرائط بھی متعین کر دی جائیں، اس طرح ان بکھرے ہوئے قبائل کے درمیان ریاستی تنظیم کی صورت وجود میں آئی اور مدینے کی سماجی، سیاسی اور معاشری زندگی میں ایک ربط و آہنگ پیدا ہو گیا۔<sup>29</sup> (ایام جیب ﷺ، 17-24، 416)

بتایا جا سکتا ہے کہ اس معاهدے کا تعلق سیکولرنیج سے ہے یا ریلیجنس نالج سے! حضرت نوح علیہ السلام نے جو کشتنی تیار کی، اس کا علم کس سے سیکھا تھا! حضرت یوسف علیہ السلام خوابوں کی تعبیر کس علم سے بتاتے تھے؛ مصر

میں خوشحالی کے سات سالوں میں فلے کو سنبھالنے اور پھر قحط کے سات سالوں میں حکمت و دانائی کے ساتھ تقسیم کرنے کا علم سیکولر ناج تھا یا ریلیجیس ناج! یہ امورِ دنیا سے تعلق رکھتا تھا یا امورِ دین سے! حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کی تربیت کہاں سے حاصل کی تھی؟ کہا جاتا ہے کہ جنگِ بدر کے موقع پر ابتدأ حضور نے پڑاؤ بدر کے چشمے کے قریب ڈال دیا۔ حباب بن منذر نے آگے بڑھ کر عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا یہ مقام ایسا ہے جہاں آپ ﷺ کو اللہ نے اتارا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: نہیں یہ ہماری ذاتی رائے ہے۔ حباب نے گزارش کی: یہ مقام اچھا نہیں۔ آگے تشریف لے چلے۔ ہم اس چشمے پر اتریں گے جو قریش کے قریب تر ہے۔ اس کے پیچھے جتنے چشمے ہیں ان کو ہم ناکارہ بنا دیں گے اور اپنے چشمے کے پاس حوض بن کر اس میں پانی ذخیرہ کر لیں گے۔ حباب بن منذر کی رائے کو رسول اللہ ﷺ نے پسند فرمایا۔ پھر آپ ﷺ آگے بڑھے اور قریش کے قریب تر چشمے پر پڑاؤ ڈال دیا (ایام حبیب ﷺ، 490)۔

## علم کسب اور علم الہی

علوم دو قسم کے ہوتے ہیں: علم کسب (man-made knowledge, acquired knowledge) اور علم الہی (God-given knowledge)۔ انسیا اور رسول کا علم، علم الہی ہوتا ہے، اور یہ علم تمام امور پر محیط ہوتا ہے۔ یہ حضراتِ گرامی معلم ہوتے ہیں۔ یہ اگر مشورہ کرتے ہیں تو مشورہ کرنے اور مشورہ دینے کا علم سکھانے کیلئے۔ بہتر جاننے والے کی خدمت میں مشورہ پیش کرنے کا منشاء اس کے علم میں اضافہ کرنا نہیں ہوتا، اپنے علم کی تصدیق یا تصحیح ہوتا ہے۔ حضور ﷺ نے اگر بدر کے چشمہ پر پڑاؤ ڈال دیا تھا تو یقیناً یہ علم الہی کی بنیاد پر تھا۔ مبتدی یہ سمجھ لیتا ہے کہ بعض امور میں اسے جو علم ہے وہ منتبی کو نہیں۔ منتبی وہ بھی جانتا ہوتا ہے جو مبتدی جانتا ہے، اور وہ بھی جانتا ہے جو مبتدی نہیں جانتا۔ لیکن اپنے ساتھیوں کو ساتھ رکھنے کیلئے، قریب ہونے میں مدد دینے کیلئے، جس حد تک ممکن ہو ان کی بات مان بھی لیتا ہے تاکہ ان میں اعتناد پیدا ہو۔ اگر حباب بن منذر نے کوئی رائے نہ دی ہوتی یا حضور نے قریش کے قریب تر چشمے پر پڑاؤ ڈالنا پسند نہ کیا ہوتا، تو یہی جگہ مسلمانوں کیلئے ہر اعتبار سے موزوں ہو جاتی اور اس جگہ کے انتخاب میں جو حکمت تھی وہ لوگوں کو نظر آ جاتی۔ اللہ کا وعدہ ہے: ”اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ بے شک میں غالب آؤں گا اور میرے رسول غالب آئیں گے۔ بے شک اللہ قوت والا، عزّت والا ہے۔“ (القرآن، 58:21)

اللہ کے رسول کی فتح جنگِ بدر میں حباب بن منذر اور جنگِ خندق میں حضرت سلمان فارسی کے مشورہ کی

وجہ سے نہیں تھی۔ حضور جہاں بھی پڑا وڈا لئے یا جنگ کا جو طریقہ بھی اختیار کرتے، علم الٰہی سے ہوتا اور آپ یقیناً غالب رہتے۔ کیا جنگ بدر کے موقع پر ایسا ہوا نہیں تھا کہ مسلمان جس زمین پر تھے وہ رتیل تھی اور کفار جس زمین پر تھے، پختہ تھی اور جتنی نقطہ نظر سے بہتر تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے باش بر سادی۔ رتیل زمین پر پاؤ جنے لگا اور پختہ زمین پھسلن ہو گئی۔ مشورہ دینے والے اپنے ماضی کا علم حضور کی خدمت میں اس احساس کے ساتھ پیش کرتے تھے کہ اللہ اور اس کار سول بہتر جانتے ہیں۔ اگر حضور اس علم کی تصدیق فرمادیں گے یا صحیح فرمادیں گے تو یہ علم سن بھال رکھنے کے لائق ہو جائے گا، ورنہ اس علم کو چھوڑ دیا جائیگا۔ پاک لوگ ہر آواز کو آوازہ حق سمجھتے ہیں اور علم الٰہی کی بنیاد پر اپنا حق ادا کرتے ہیں۔ جنگِ احمد کے حوالے سے ایک واقعہ سے اس بات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضور ﷺ شہر کے اندر رہ کر جنگ کرنا پسند فرماتے تھے، اور یہ کہا جاتا ہے کہ حضور کو اس سلسلے میں خواب بھی آپ کا تھا کہ شہر میں رہ کر جنگ لڑنا مناسب ہے، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نبی علیہ السلام کا خواب بھی وحی کے مت ادف ہوتا ہے، لیکن نوجوان صحابہ کرام کی کثرت تھی، جنہیں جنگ بدر میں جنگ لڑنے کا موقعہ نہیں ملا تھا، اب وہ چاہتے تھے کہ انھیں کھلے میدان میں بہادری کے جوهر دکھانے کا موقع مل سکے، چنانچہ حضور ﷺ نے نوجوان صحابہ کرام کی اکثریت کے اصرار پر شہر سے باہر جا کر جنگ لڑنے کا فیصلہ فرمایا۔ اس سے نتیجہ یہ نکالا جاتا ہے کہ حضور ﷺ اکثریت کی رائے کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ جو نتیجہ اس روایت سے نکالا جا رہا ہے وہ درست نہیں۔ نبی کی شان یہ ہے کہ وہ مطاع مطلق ہوتا ہے۔ اس کے اتباع سے اللہ کے محبوب بندوں اور اس کی اطاعت سے انعام یافتہ بندوں کی صفائح میں شمار ہونے کا شرف ہوتا ہے۔ ماننے والے قائل ہوں یا کثیر، وہ اپنا حق ادا کرتا ہے۔ اس کا فیصلہ ہمیشہ علم الٰہی کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ آپ یہ سمجھتے کہ جنگ شہر کے اندر ہی رہ کر لڑنے کا حکم ہے تو آپ یقیناً یہ فرمادیتے، کہ جڑ جائے جس نے جڑنا ہے اور ٹوٹ جائے جس نے ٹوٹنا ہے، ہم وہی کریں گے جس کا ہمیں حکم ہے۔ کیا صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ نے کسی اکثریت کی رائے کو اہمیت دی؟ حضرت فضل شاہ صاحب کا ارشاد ہے کہ بہتر جانے والے کی مان لی جائے تو بھلا ہو جاتا ہے، منوائی جائے تو مشقت لگے پڑ جاتی ہے۔

## سورہ عبس کی چند آیات

امورِ دنیا اور امورِ دین میں تفریق کرنے والوں نے کئی ایسی روایات ڈھونڈ نکالی ہیں جن کی بنیاد پر وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ حضور ﷺ کا مقام عام لوگوں سے بس اتنا ہی بڑا تھا کہ نبی اور رسول ہونے کی حیثیت سے امورِ دین آپ ہی سے سیکھ جاسکتے تھے ورنہ جہاں تک امورِ دنیا کا تعلق ہے کئی مقامات پر عام صحابی کی بات (معاذ اللہ) کہیں بہتر تھی، یا بعض موقع پر حضور کے کسی فیصلہ پر (معاذ اللہ) آیاتِ عتاب نازل ہوئیں۔ شاہدین، حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس کو مقصودِ کائنات مانتے ہیں، عبدیت کا اکمل نمونہ مانتے ہیں۔ امورِ دنیا اور امورِ دین کی تفریق کو خلاف حق سمجھتے ہیں۔ کسی کا علم حضور ﷺ سے بڑا بھی ہو سکتا ہے، ناقابلِ تصور اور سخت بے ادبی کی بات سمجھتے ہیں۔ ان روایات کو قرآنِ پاک میں بیان کی گئی حضور کی شان کے مطابق نہ ہونے کی بناء پر خلافِ واقعہ سمجھتے ہیں یا اس کی تعبیر کو غلط سمجھتے ہیں۔ ایسی بہت سی روایات ہیں، فی الحال ایک روایت مزید بیان کرنے پر اتفاقاً کرتے ہیں۔ سورہ عبس قرآنِ پاک کی اسی (80) نمبر کی سورت ہے اور تیوسیں پارے میں واقع ہے۔ اس کی ابتدائی چند آیات کا ترجمہ اس طرح ہے:

”اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا! اس پر کہ وہ ناپینا اس کے پاس آیا۔ اور تھیں کیا معلوم کہ وہ ترکیہ پانے والا ہوتا، یا نصیحت نے تو نصیحت اسے نفع دے۔ وہ جو بے پرواہ بنتا ہے، تم اس کی طرف رخ کرتے ہو۔ حالانکہ وہ اگر پاک نہ ہو، تو تم پر کوئی ذمہ داری نہیں۔ اور جو تمہارے پاس ذوق سے آتا ہے؛ اور وہ اللہ سے ڈرتا بھی ہے؛ تم اس سے بے رخی برستے ہو۔“ (القرآن، 10:1-80)

حضرت عبداللہ ابن مکتوم جو ناپینا صحابی بیان کئے جاتے ہیں، کے حوالے سے حضور اکرم ﷺ سے متعلق ایک روایت گھٹلی گئی ہے اور ان آیات میں موجود سرزنش کا انتساب (معاذ اللہ) حضور نبی اکرم ﷺ سے کر دیا گیا ہے۔ تفسیر فاضلی میں ان آیات کی وضاحت اس طرح فرمائی گئی ہے:

”تلخیق حق کرنے والے ایک صاحب کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا۔ یہ صاحب تلبیق کر رہے تھے۔ سامعین کو خیر کی طرف لانے کا کام بڑا نازک ہوتا ہے۔ اگر ان میں طلبِ بدایت کی کی ہو تو یہ کام بہت ہی نازک ہوتا ہے۔ ان صاحب کو بھی ایسی ہی صورت حال سے واسطہ پڑے۔ اسی اثنائیں ایک ناپینا صاحب اس مجلس میں حاضر ہوئے اور حاضرین مجلس کی کیفیت کی پروانہ نہ کرتے ہوئے اپنی بات شروع کر دی۔ اس پر تلبیق کرنے والے صاحب کو ناپینا صاحب کی مداخلت ناگوار ہوئی، تو اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا۔ یہ

بات قطعاً اللہ کے رسول ﷺ سے تعلق نہیں رکھتی کہ اللہ نے اپنے رسول کے بارے میں جو کچھ بھی ارشاد فرمایا ہے، یہ بات اس سے میل نہیں کھاتی۔ ”تمہرے فرمائیے اللہ تعالیٰ نے نبی پاک کے بارے میں کیا فرمایا ہے: آپ کا خلق عظیم ہے۔“ (القرآن، 68:04)

”ہم نے تم میں، تمسیح میں سے رسول بھیجا، جو تم پر ہماری آیات تلاوت فرماتا ہے، تمسیح پاک کرتا ہے، تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور تمسیح وہ علم دیتا ہے جو علم تمسیح نہیں تھا۔“ (القرآن، 151:2) اب اگر خلق عظیم کے حوالے سے اللہ کا رسول بھی معیارِ مطلق نہ ہو، تو تنزکیہ عطا ہونے کے باوجودہ، کتاب و حکمت کا علم عطا ہونے کے باوجودہ، اور وہ علم عطا ہونے کے باوجودہ جو بڑی شان رکھتا ہے، بندے کی تکمیل تو نہیں ہوگی۔ ”اللہ کے رسول کی اطاعت ہو تو اللہ کی اطاعت ہوتی ہے۔ رسول کی اطاعت نہ کرنے والے اللہ کو پسند نہیں ہوتے۔“ (القرآن، 32:3) اب اگر اللہ کے رسول کے، اللہ کی اطاعت کا معیارِ مطلق ہونے میں ہی شک ہو جائے تو ایمان کا مقام ہی کہاں رہے گا۔

ارشاد ہے: ”اگر تم میں تنازع ہو جائے، تو اللہ اور اسکے رسول کی طرف رجوع کرو۔“ (القرآن، 4:59) اللہ کے رسول کے ارشاد کو سند مانا جائے گا تو تنازعہ ختم ہو گا۔ پھر ارشاد ہے: ”اگر تم رسول کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے، اور رسول کے ذمے تو پہنچا دینا ہی ہے۔“ (القرآن، 24:54)

فرمایا گیا ہے: ”بے شک اللہ کے رسول کی حیاتِ طیبہ تمہارے لئے اسوہ حسنہ ہے۔“ (القرآن، 33:21) اللہ کے رسول ﷺ کا اسوہ حسنہ ہمارے لئے سند کا درجہ رکھتا ہے۔ پس تیوری چڑھانا اور منہ پھیرنا، آپ کی شان کے لاائق ہی نہیں۔

## صیغہ واحد حاضر میں خطاب

حب الناصحین شرعاً ایمان ہے۔ حضور سے محبت ہو گی تو ایمان کی حب نصیب ہو گی۔ کسی منفی صفت کو آپ سے منسوب کرنا محبت کی نفی اور قطعاً بے ادبی ہے۔ اندازہ تکھے ان لوگوں کی بے بھجی کا جو قرآن پاک میں جہاں بھی صیغہ واحد حاضر میں یعنی تُو، کہہ کر خطاب کیا گیا ہے، یہ دیکھے بغیر کہ کیا یہ بات حضور ﷺ کی شان سے تعلق رکھ بھی سکتی ہے کہ نہیں، اسے حضور پاک سے منسوب کر دیتے ہیں جیسے سورہ البقرہ میں فرمایا گیا ہے: ”حق تمہارے رب کی طرف سے ہے، تو شک لانے والوں میں سے نہ ہو۔“ (القرآن،

(2:147) یا سورہ الحجی میں فرمایا گیا ہے: ”اور تجھے گراہ پیا تو ہدایت نہ دی۔ (القرآن، 7:93) اب قرآن پاک کی درج ذیل آیات ملاحظہ فرمائیے:

ارشاد باری ہے: ”وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا کہ اسے سب دینوں پر غالب کرے۔ اور اللہ کی گواہی کافی ہے۔“ (القرآن، 9:61، 9:33) اسی طرح فرمایا گیا: ”ہم نے آپ کو شاہد بنائے کے بھیجا، بشارت دینے والے اور انذار کرنے والے۔“ (القرآن، 48:8؛ 33:45) حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ”اے ہنسی اسرائیل میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہوں۔۔۔ اور اپنے بعد آنے والے رسول کی بشارت دیتا ہوں جس کا اسم شریف ‘احمد’ ہے۔“ (القرآن، 6:61) فرمایا گیا: ”محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو لوگ آپ کی معیت میں ہیں کافروں پر شدید اور آپس میں رحم کرنے والے ہیں۔ تم ان کو دیکھو گے، رکوع کرتے ہوئے، سجدہ کرتے ہوئے۔ اللہ کا فضل اور اسکی رضا چاہتے ہیں۔ انکی نشانی ان کے چہروں پر سبود کے اثر سے ہے۔ یہ توصیف ان کی تورات میں ہے۔ اور انھیل میں ان کی مثل یوں ہے۔۔۔“ (القرآن، 48:29) فرمانِ الہی ہے: ”اور ہم نے آپ کو رحمت الملائیں بنائے کر بھیجا ہے۔“ ”اللہ نے نبیوں سے بیان لیا کہ جو کتاب و حکمت تمھیں عطا ہوا سکی تقسیم کرو، پھر رسول تمھارے پاس تشریف لائے کہ جو تمھارے پاس ہے اس کی تصدیق فرمائے، تو تم ضرور آپ پر ایمان لانا اور آپ کی نصرت کرنا۔۔۔“ جس کی یہ شان بیان کی گئی ہے، کیا صیغہ واحد حاضر میں بیان کی بنا پر آیت نمبر 7:93 اور 147:2 اور 19:30 میں خطاب کو اس ذات اقدس سے منسوب کیا جاسکتا ہے! حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابھی نوزاںیدہ تھے کہ آپ نے کلام کیا اور فرمایا: ”بے شک میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب عطا فرمائی ہے۔ اور مجھے نبی ٹھہرایا ہے۔ اور اس نے مجھے برکت والا کیا ہے، جہاں بھی ہوں، اور صلوٰۃ و زکوٰۃ کی وصیت فرمائی ہے جب تک حیات ہوں۔ اور اپنی والدہ سے حسن سلوک کرنے والا۔ اور اس نے مجھے جبار اور شقی نہیں ٹھہرایا۔“ (القرآن، 19:30-32) حضرت زکریا علیہ السلام نے پاک اولاد کیلئے دعا کی۔ فرمایا گیا: ”اللہ تعالیٰ آپ کو بھی علیہ السلام کی بشارت دیتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کے ایک کلمہ کے مصدق ہونگے، سردار، عورتوں سے بچنے والے، اور نبی ہونگے صالحین سے۔“ (القرآن، 3:39) ابھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا نہیں ہوئے، انکی شان اور مقام پہلے ہی بتا دیا گیا۔ اسی طرح فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹھے حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش کی بشارت دی اور ساتھ ہی پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام کی پیدائش کی بشارت دی اور اللہ نے دونوں کو صاحب ٹھہرایا۔ (القرآن، 11:71)

(21:72) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: ”میں نے آپ کو اپنے لئے بنایا۔“ (القرآن، 41:20)

جسے رحمت اللہ علیہ بنی اسرائیل کا نبی بننا کر بھیجا گیا ہے، جسے پدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا گیا، جس کے بارے میں تمام انبیاء سے میثاق لیا گیا، جس کے شرف و کرم کا تمام انبیاء و رسول اعلان کرتے چلے آئے، جس کا اسم گرامی آپ کی تشریف آوری سے صدیوں پہلے انجلی میں، اور آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کی توصیف توریت اور انجلی میں بیان کر دی گئی، جس کے ہاتھ کو اللہ نے اپنا ہاتھ قرار دیا، جس کے قدم مبارک سے قدم آگے بڑھانے کو اللہ نے اپنے سے تقدم فرمایا، جس کے قلب مبارک پر قرآن پاک کا نزول فرمایا گیا، جس کی زبانِ اقدس کے بارے میں فرمایا گیا کہ ”آپ تو نوہش نفس سے بات ہی نہیں کرتے، وہی کہتے ہیں جو آپ پر وحی کی جاتی ہے۔“ جس کی تعظیم اور توقیر کا اور جس کے سامنے اپنی آوازوں کو پست رکھنے کا حکم دیا گیا، لتنی بے سمجھی کی بات ہے کہ ”حق تمہارے رب کی طرف سے ہے، ٹوٹک لانے والوں میں سے نہ ہو۔“ (القرآن، 2:147) یا ”اور تجھے گرہا پیا تو بد ایت نہ دی۔“ (القرآن، 7:93) یا ”اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیر اجب نایباً اس کے پاس آیا۔“ (القرآن، 1:80) اور ایسی دیگر آیات میں خطاب کا انتساب حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس سے کیا جائے۔

## قرآن کا اسلوب تقریری ہے۔

قرآن پاک کا اسلوب تقریری ہے، تحریری نہیں۔ ایک آیت میں خطابِ مومنین سے ہو تو دوسری آیت میں خطابِ کافرین سے ہو سکتا ہے، اہل کتاب سے ہو سکتا ہے۔ کبھی خطاب کرنے والا صیغہ واحد حاضر کے ذریعے ایک ایک فرد سے برادرست مخاطب ہوتا ہے۔ قرآن پاک کے مفہوم کو صحیح طور پر سمجھنے کیلئے اور بھی کئی باقاعدہ کا دھیان رکھنا ضروری ہے۔ ایک ہی مضمون میں تمام پہلوؤں کا زیر بحث لا یاجانا ممکن نہیں۔ اہم ترین بات یہ ہے کوئی بھی مقام ایسا نہیں جہاں اللہ تعالیٰ نے حق تک پہنچنے میں رہنمائی نہ کی ہو۔ فرمانِ الہی ہے: - - - نَرْفَعُ دَرْجَاتٍ مَّنْ يَشَاءُ وَنَفْوَقُ الْمُّغْلِيْذِي عَلِيِّعَلِيِّمُ ﴿٧٦﴾ (القرآن، 12:76) ”ہم درجات بلند کرتے ہیں جس کے چاہیں۔ اور ہر علم والے سے اوپر ایک علم والا ہے۔“ بہتر جانے والے ہر حال پر ہوتے ہیں۔ جسے اطمینان کی طلب ہو وہ کسی بہتر جانے والے کو تلاش کر لے۔ بد نسبتی یہ ہے کہ جو حضور ﷺ کے علم ہی کو معیار نہیں مانتا وہ کسی دوسرے کو بڑے علم والا کیسے مان لے گا۔

## ذاتِ اقدس ﷺ سے تقدیم

حکم ہے: ”اللہ کے رسول ﷺ جو عطا فرمائیں، وہ لے لو، جس سے منع کر دیں اس سے منع ہو جائے، اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ کا عقاب شدید ہے۔“ (القرآن، 59:7) اللہ کے رسول کے فرمان کو فرمان الہی مانا جائے گا تھی ماننے کا حق ادا ہو سکتا ہے۔ اللہ کے نبی کا قوم سے منه پھیرنا بہت بڑی بات ہوتی ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام کی مثال دیکھئے۔ اللہ کے نبی منه پھیر لیں تو عذاب الہی سے بچ جانا ممکن نہیں رہتا کہ نبی، اللہ کے امر کے مطابق ہی کرتے رہے ہیں (تفسیر فاطمی منزل ہفتہم، 368-69)۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے تقدیم سے منع فرمایا گیا ہے۔ (القرآن، 1:49) اللہ کا قدم تعین سے پاک ہے۔ اللہ کے رسول سے تقدیم ہی دراصل اللہ سے تقدیم ہے اور اس سے منع فرمایا گیا ہے۔ حضور پاک کی ذات اقدس کی شان میں قرآن پاک کی مذکورہ اسناد کے ہوتے ہوئے جو لوگ نبی پاک کی حیثیتوں کا تعین کرتے ہیں اور رسول ہونے کو حضور کی ذات اقدس کی محض ایک حیثیت قرار دیتے ہیں، اور اس حیثیت میں بھی آپ ﷺ کے علم کو امورِ دنیا اور امورِ دین میں تقسیم کر کے حضور کے ساتھ یہ بات منسوب کرتے ہیں کہ آپ نے خود فرمایا ہے کہ ’تم اپنے امورِ دنیا میں مجھ سے بڑے علم والے ہو سکتے ہو‘ (انتہم الاعلم بامورِ دنیا کہ) کیا وہ ایک بے سند روایت کو اسناد قرآن پر ترجیح دے کر اللہ اور اس کے رسول سے تقدیم کا ارتکاب نہیں کر رہے۔ تفسیر میں نادانستہ طور پر تقدیم ہو جانے کی ایک مثال پیش کرتا ہو۔

زبان و ادب اور گریب سے متعلق علوم اور بیان کی گئی تعریف کے مطابق ”امورِ دنیا“ کے ذیل میں آسمیں گے۔ ایک صاحب جنہیں عربی زبان، صرف و نحو، اور دورِ جاہلیت کے عربی ادب میں بہت ماہر قرار دیا جاتا ہے، کی تفسیر قرآن سے سورہ البقرہ کی پہلی آیت ”آل-لام-میم“ کی تفسیر کا خلاصہ پیش کرتے ہیں: ”جو لوگ عربی رسم الخط کی تاریخ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ عربی زبان کے حروف عبرانی سے لیے گئے ہیں اور عبرانی زبان کے حروف ان حروف سے مانوذ ہیں جو عرب قدیم میں رائج تھے۔ عرب قدیم کے یہ حروف محض آواز ہی نہیں بتاتے تھے بلکہ معانی اور اشیاء پر بھی دلیل ہوتے تھے اور عموماً انہی اشیاء کی صورت اور بیان پر لکھی جاتے تھے۔ ان حروف کے معنی کا علم اب مٹ پکا ہے تاہم بعض حروف کے معنی اب بھی معلوم ہیں اور ان کے لکھنے کے ڈھنگ میں ان کی قدیم شکل کی جگہ پائی جاتی ہے۔ مثلاً ”الف“ گائے کے معنی بتاتا تھا اور گائے کے سر کی صورت ہی پر لکھا جاتا تھا۔ ”الف“ کے ایک معنی اللہ واحد کے بھی ہوتے تھے۔ ”ب“ کو بیت یعنی بد و وہ کے نئیے، ”جیم“ کو جمل یعنی اونٹ، اور ”نوں“ کو مچھلی، ”نم“ کو پانی کی لہر اور ”ط“ کو سانپ کی شکلوں سے ظاہر

کیا جاتا تھا اور ان کے معنی بھی بھی ہوتے تھے۔ عربی زبان کے حروفِ تجھی میں اس کا تصویری عنصر بہت کم ہو گیا۔ عربی زبان کے حروفِ تجھی جب عربانی سے لئے گئے تو تجویدی عنصر اور بڑھ گیا۔ اب ’الف‘ بالکل سیدھا ہو گیا۔ ’بیت‘ کا اپر والا حصہ غائب ہو گیا اور کھونے کا نشان ’ب‘ کے نقطے کی صورت اختیار کر گیا۔ باقی الفاظ کے انہدراں میں بھی اسی طرح تبدیلیاں آگئیں۔ اس سورہ میں بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم دئے جانے کا ایک مشہور واقعہ ہے جس کی مناسبت سے اس سورہ کا نام بھی البقہ ہے۔ حروفِ مقطعات ’لَمْ‘ میں پہلا حرف ’الف‘ گائے کے اس واقعہ کی طرف علمتی اشارہ ہے۔ حروف ’لَام‘ اور ’مِيم‘ کے بارے میں بھی اسی طرح تحقیق کی جا سکتی ہے!

”اللَّهُ“ کی تقریبیًّا سو اتنی صفحات پر مشتمل مذکورہ بالا تحقیق پیش کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔ ”میرے نزدیک اس کی حیثیت ابھی تک ایک نظریہ سے زیادہ نہیں ہے۔ جب تک تمام حروف کے معنی کی تحقیق ہو کر ہر پہلو سے ان ناموں اور ان سے موسم سورتوں کی مناسبت واضح نہ ہو جائے اس وقت تک اس پر ایک نظریہ سے زیادہ اعتقاد کر لینا صحیح نہیں ہو گا۔“

سوال یہ ہے کہ اس پر جتنی بھی تحقیق کر لی جائے کیا یہ تحقیق کبھی بھی پایہ یقین کو پہنچ سکے گی، کیا اس قیاس آرائی کے نتیجے میں کسی کو قرآن پاک سے ہدایت نصیب ہو سکتی ہے، کیا قیامت کے دن ان الفاظ کے معنی کے بارے میں کسی کو مسئول ٹھہرایا جائے گا!

عربی رسم الخط کی تاریخ کے بارے میں اپنے استاد مختارم کی تحقیق پیش کرنے سے پہلے مذکورہ مفسر قرآن حروفِ مقطعات پر سورتوں کے نام ہونے کے حوالے سے نظر ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

”یہ جس سورت میں بھی آئے ہیں بالکل شروع میں اس طرح آئے ہیں جس طرح کتابوں، فصلوں اور ابواب کے شروع میں ان کے نام آیا کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کیا یہ ان کے نام ہیں۔“ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ”جو سورتیں ان ناموں سے موسم ہیں اگرچہ ان میں سے سب اپنے انہی ناموں سے مشہور نہیں ہوئیں، بلکہ بعض دوسرے ناموں سے مشہور ہوئیں۔“

اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ حروفِ مقطعات کو سورتوں کے محض نام قرار دینا، قیاس آرائی ہے۔ فاضل مفسر قرآن خود بھی اس کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”کم از کم فہم قرآن کے نقطۂ نظر سے ان ناموں کے معنی کی تحقیق کی تو کوئی غاصہ اہمیت ہے نہیں۔“

اگر فہم قرآن کے حوالے سے اس تحقیق کی کوئی اہمیت نہیں، اور قیاس آرائی سے زیادہ اس کی حیثیت نہیں، ہدایت اور نجات کا اس پر انحصار نہیں، عملی زندگی میں اس سے کوئی فائدہ نہیں تو امور دنیا کے اس علم

میں اعلم، ہونا کس کام کا ہے۔ حضور پاک سے زیادہ کوئی ان الفاظ کی تفسیر بیان کرنے کا حقدار نہیں ہو سکتا تھا۔ جس مقام پر حضور پاک نے خاموش رہنا پسند فرمایا، اس مقام پر کلام کرنا کیا اللہ اور اس کے رسول سے تقدم نہیں! کیا یہ اللہ اور اسکے رسول سے تقدم نہ کرنے کے صریح حکم کی خلاف ورزی نہیں! حقیقت یہ ہے کہ حروفِ مقطعات کسی سورت میں ایک پوری آیت کے طور پر آئے ہیں جیسے سورہ البقرہ میں، اور کسی سورت میں آیت کے حصے کے طور پر آئے ہیں۔ اس طرح یہ متن قرآن پاک میں تباہات کی حیثیت سے شامل ہیں، اور اسی حیثیت میں ان پر تدبیر کیا جانا چاہئے اور حکمات کو نظر انداز کر کے ان پر بات کرنا خلاف حق سمجھا جانا چاہئے۔

آئیے دیکھتے ہیں تفسیر فاضلی اس آیت کی تفسیر کس طرح بیان کرتی ہے۔ ارشاد ہے:

”صاحبواں لفظوں کے معنوں کا تعین کرنا اللہ کے رسول ﷺ سے تقدم ہے، اور خلاف حق ہے۔ حاصل ہونے کے مقام پر بولنا، اور خاموش رہنا ضروری ہے۔“ (تفسیر فاضلی منزل اول 1992)

ارشاد ہے: اے ایمان والو! تم اپنی آوازوں کو نبی ﷺ کی آواز سے بلند نہ کیا کرو، اور نہ آپ کو اس طرح بلند آواز سے پکار کرو جیسے ایک دوسرے کو پکارتے ہو، ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمھیں شعور بھی نہ ہو۔ (القرآن، 49:2) آوازِ حق کے مقابل اپنی آواز کو پست رکھنا ادب ہے، اور آوازِ حق کے مقابل اپنی آواز کو بلند کرنا تقدم ہے۔ جو لوگ سائنسی اور فلسفیانہ علوم کو سیکولر نالج قرار دیکریا یہ کہتے ہیں کہ ان علوم میں تحقیق کرنے میں حضور ﷺ کے اتباع کے ہم مکلف نہیں، کیا وہ آوازِ حق کے مقابل اپنی آوازوں کو بلند نہیں کر رہے!

ارشادِ ربانی ہے: ”اور تمھیں معلوم رہے کہ اللہ کے رسول تم میں ہیں۔ اگر یہ کثیر امور میں تمہاری مان لیا کریں، تو تم مشقت میں پڑ جاؤ گے۔“ (القرآن، 49:7) اللہ کے رسول ﷺ کو اللہ نے جس علم سے نوازا ہے، وہ علم سب سے بڑی شان رکھتا ہے۔ اس علم کی قدر کرنی چاہئے اور اس سے استفادہ کرنا چاہئے اور کبھی اپنے گمان کو یہ درجہ نہیں دینا چاہیے کہ حق کے مقابل اسے قابل ذکر سمجھا جائے۔ حضور اکرم اگر اکثر امور میں لوگوں کی مان لیا کرتے تو لوگ یقیناً مشقت میں پڑتے۔“ (تفسیر فاضلی منزل ششم، 393-94) اللہ کے حکم کے مقابل حضور کسی کی بات مان لیں، یہ ممکن ہی نہیں۔ جہاں اللہ کا حکم نہ بھی ہو، حضور کا فیصلہ علم الہی سے ہوتا ہے۔ جو لوگ حضور کی مان لیتے ہیں، حضور کے علم کو سلام کرتے ہیں، ان کا بھلا ہو جاتا ہے، جو لوگ

حضور کی نہیں مانتے حضور انکی مان لیتے ہیں تاکہ ساتھ قائم رہے، لیکن مشقت ان کے لگے پڑ جاتی ہے۔ جنگِ احمد کے موقع پر جب لوگوں نے حضور کی بات نہیں مانی، تو کیا مشقت ان کے لگے نہیں پڑ گئی۔

بیعتِ رضوان کے موقع پر اگرچہ یہ نوید سنائی جا چکی تھی کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو گیا ان سب سے جنہوں نے درخت کے نیچے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ اقدس پر بیعت کی، (القرآن، 18:48) لیکن جب صلح حدیبیہ کی شرائط کی جا رہی تھیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر سے نہ دیکھنے کی وجہ سے صحابہ کرامؐ انہیں تو ہیں آمیز سمجھ رہے تھے اور سختِ رنجیدہ تھے۔ یہاں تک کہ سورہ الفتحؐ آیات نازل ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے اسے ”فتح میں“ قرار دیا۔ صلح کے نتائج نے جلد ہی یہ ثابت کر دیا کہ یہ واقعی فتح میں تھی۔ جو لوگ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ فلاں موقع پر فلاں صحابی نے حضور کی خدمت میں عرض کیا کہ حضور! یہ فیصلہ آپ نے اپنے علم سے کیا ہے یاد گی کی بنیاد پر، اگر آپ نے اپنے علم سے ایسا کیا ہے تو اسے یوں کر لیجئے، اور اس صحابی کے مشورہ کو قبول کر لینے کی وجہ سے مسلمان فلاں نقصان سے نجگے یا انہیں فلاں فائدہ پہنچا، یا کہتے ہیں کہ فلاں موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فلاں فیصلے یا عمل پر آیتِ عتاب نازل ہوئی، انہیں سوچنا چاہئے کہ صحابہ کرامؐ میں سے کون تھا جس کے مشورہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے الانصار و مہاجرین کے درمیان مواثیق جیسا معاهدہ کرایا جس کی کوئی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی، ان میں سے کس کے مشورہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میثاقِ مدینہ کے بارے میں سوچا۔ بیعتِ رضوان اور صلح حدیبیہ کا فیصلہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس کی تجویز پر کیا! اسیروں جنگِ بدر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا تھا کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے انھیں فدیہ لیکر چھوڑنے، ان کی مالی استطاعت کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھیں رعایت دینے، تھی دامن قیدی جو پڑھنا لکھنا جانتے تھے، انھیں دس، دس مسلمان بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھانے کی شرط پر رہا کرنے کا جو فیصلہ کیا گیا، اس کے بارے میں کہا جاتا ہے اللہ نے اسے سخت ناپسند فرمایا اور اس پر آیتِ عتاب نازل ہوئی۔ (ایام حبیب صلی اللہ علیہ وسلم، 504)

آئیے دیکھتے ہیں کہ اس آیت پاک میں کیا فرمایا گیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

”کسی نبی کی شان کے لا اق نہیں کہ قیدیوں کو اپنے ہاں رکھیں حتیٰ کہ زمین میں انکا خون نہ بہائیں۔ تم لوگ اساب اُ دنیا چاہتے ہو اور اللہ آخرت چاہتے ہو اور اللہ عزت والا حکمت والا ہے۔ اگر اللہ پہلے سے ایک بات کو لکھنا نہ پکا ہو تو تم جو لینا چاہتے تھے، کے بد لے تھیں بڑا عذاب پہنچتا۔“ (القرآن، 68:67-8)

کیا اس کا یہ مطلب لایا جانا ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ جنگی قیدیوں کے بارے میں قیامت تک یہ قاعدہ مقرر فرمانا چاہتا تھا کہ انہیں قتل کر دیا جایا کرے! نبی پاک ﷺ کی رضا کا جو علم تھا کیا وہ کسی دوسرے کو ہو سکتا تھا! قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہئے تھا، انھیں قید کرنے سے پہلے ان کا خون بہانے کے لئے کیا کرنا چاہئے تھا، حضور اکرم ﷺ سے بہتر جانے والا کون ہو سکتا تھا! (کوئی نہیں ہو سکتا تھا) حضور اکرم ﷺ نے ساتھیوں کو علم الہی سے نواز نے کیلئے ان کا ارادہ پوچھا، لوگوں نے اپنی سمجھ کے مطابق جو مشورے دیئے ان کا مجموعی تاثر یہی تھا کہ لوگ اساب دنیا کے طالب ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بات سخت ناپسند ہوئی۔ قرآن پاک میں یہ شہادت موجود ہے کہ اللہ نے یہ لکھ دیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی موجودگی میں عذاب نہیں کیا جائے گا۔ (القرآن، 8:33) اور استغفار کرنے والوں پر عذاب نہیں کیا جائے گا۔ (القرآن، 8:33) چنانچہ حضور نبی پاک ﷺ کی موجودگی کی بدولت اساب دنیا چاہئے والوں کو یقیناً بڑے عذاب سے بچالیا گیا (تفسیر فاضل منزل دوم، 365-66)۔ معلم کتاب و حکمت ہونا حضور ﷺ کی شان ہے۔ جنگی قیدیوں سے حسن سلوک کے حوالے سے حضور ﷺ نے انسانیت کو وہ علم عطا فرمایا جس سے قیامت تک استفادہ فرمایا جاتا رہے گا۔

## گُن، او گُن کو گُن کر مانو

شاہد کی بات ہمیشہ غرض و غایت سے پاک ہوتی ہے اور بڑے علم سے ہوتی ہے۔ اسے وہ بھی علم ہوتا ہے جو مقتدی کو ہوتا ہے، اور وہ ہوتا ہے جو اسے نہیں ہوتا۔ اسلئے بعض اوقات شاہد کی بات کی حکمت ماننے والوں کو سمجھ نہیں آتی، انھیں شاہد کی بات بالکل 'او گُن' (unjustified) لگتی ہے حالانکہ وہ عین 'گُن' (virtue) ہوتی ہے۔ (جیسے صلح حدیبیہ کے موقعہ پر ہوا) مقتدی جب شاہد کی بات کو اپنے علم کے پیمانے سے ناپتا ہے تو اسے حکم بجالانا مشکل ہو جاتا ہے۔ شاہدین کو ماننے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہوتی ہے کہ ان کی بات سمجھ آئے تو بھی ماننا ہوتا ہے اور نہ سمجھ آئے تو بھی ماننا ہوتا ہے۔ شاہد کے 'او گُن'، 'کو گُن'، مانے بغیر شاہد کو مانا جاسکتا ہی نہیں۔ شاہد کامانے والا، شاہد کی صداقت اور امانت کی شہادت دیکر ہی اس کے مانے والوں میں داخل ہوتا ہے۔ اسکی اگلی بات کو بلاد لیل مان کر ماننے کا ثبوت دینا ہوتا ہے۔ ماننے کے بعد ہی جانے کا مقام آتا ہے۔ بلاشبہ یہ بہت بھاری مقام ہے، لیکن اس کے بغیر شاہد کی اطاعت اور اتباع کے مقام پر پورا رہنا ممکن نہیں۔ حضرت میر اس سید بھکھ ایک بزرگ گزرے ہیں۔ پوربی زبان میں آپ کا صوفیانہ کلام چپا

ہوا ہے۔ مالی، صاحب ان کے شاہد تھے۔ انہوں نے اسی بات کو بہت خوبصورتی سے اس طرح بیان فرمایا ہے:

بھیک، مالی کو اپنا جانو  
گلن، او گلن کو گلن کرمانو  
تب ہو نیا پار پر بجی،  
تب ہو نیا پار

### علمِ لدنی

آئیے دیکھتے ہیں قرآن پاک میں اسکا ذکر کہاں ہے۔ سورہ الکھف میں ایک صاحب کا ذکر ہے جن سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملنے کا اشتیاق ہوا۔ مسلم روایت میں یہ حضرت خضر علیہ السلام کے نام سے مشہور ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”وہ ہمارے عباد میں سے ایک عبد ہیں جنہیں ہم نے اپنی رحمت اور علمِ لدنی (اپنے پاس سے ایک خصوصی علم) سے نوازے ہے۔“ (القرآن، 22:65) ”حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آپ سے کہا کہ میں آپ کا اتباع کروں، اس پر کہ آپ مجھے تعلیم فرمادیں گے جو علمِ رشد آپ کو عطا ہوا ہے۔“ جواب دیا، آپ کیلئے میری معیت میں صبر کے ساتھ رہنا مشکل ہو گا۔۔۔ کہا غفرنیب آپ مجھے صابر پائیں گے۔۔۔ کہا، اگر آپ میر اتباع کرتے ہیں تو کسی شے کے بارے میں مجھ سے سوال نہ کیجئے حتیٰ کہ میں خود آپ سے اس کا ذکر کروں۔“ (القرآن، 66:70)

اب دونوں چلتے ہیں۔ اس سفر میں تین واقعات پیش آتے ہیں۔ تینوں مقامات پر حضرت خضر علیہ السلام کا عمل انہیں خلاف حق نظر آیا۔ بالخصوص جب آپ ایک لڑکے سے ملے اور حضرت خضر علیہ السلام نے اسے قتل کر دیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بول اٹھے ”بے شک آپ نے ممنوعہ کام کیا ہے۔“ اس بات کو جانتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے عباد میں سے ایک عبد فرمایا ہے جسے اس نے اپنی رحمت اور علمِ لدنی سے نوازے ہے، ان کے ظاہر خلاف حق عمل (اوگن) کو گلن، مانتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس یقین کے ساتھ خاموش رہنا چاہئے تھا کہ یہ مقام میرے احاطہ علم سے باہر ہے (تفیر فاضل چارم، 82-85) مگر وہ صبر نہ کر سکے۔ شاہدین کی بات بھی بڑے علم سے ہوتی ہے اور شاہد کو مان لینے کے بعد اس کے ظاہر ”اوگن، کو گن،“ مان کر ہی پورا رہنا ممکن ہوتا ہے ورنہ معیت ممکن نہیں رہتی۔ یہی بات ہے جسے حضرت میر اس سید بھیکھ نے اپنے خوبصورت اشعار میں بیان کیا ہے۔ شاہد کے ہر عمل کا حوالہ قول کی صورت میں اللہ کا فرمان ہوتا ہے، اس فرمان پر عمل کی طریقت کا حوالہ اسکا اپنا شاہد ہوتا ہے۔ اسکی اپنی کوئی بات نہیں ہوتی۔

## حدیث جبرائیل اور تصوف بطور احسانِ اسلام

صوفیاء اور مقاصدِ تصوف کو دین کے عین مطابق سمجھنے والے علماء کرام کے لئے یہ مسئلہ ہمیشہ رہا ہے کہ اسلامی تعلیمات میں اس کا مأخذ کہاں تلاش کریں جبکہ قرآن کریم میں کہیں سے بھی 'تصوف' یا 'صوفی' کا لفظ اخذ کرنا ممکن نہیں۔ معاصر صوفیاء اور علماء کرام کی اکثریت جنہیں پڑھنے کا ہمیں اتفاق ہوا ہے، تصوف کی بنیاد حدیثِ جبرائیل میں تلاش کرتی نظر آئی ہے۔ اس حدیث کی بنیاد پر وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام، ایمان، اور احسان ماننے کے تین درجے (three levels of believing) ہیں۔ زبان سے اقرار کرنا اسلام ہے، دل سے تصدیق کرنا ایمان ہے، اور اس یقین سے عمل کرنا کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں اور اگر یہ درجہ میسر نہ ہو تو یقین رکھنا کہ اللہ مجھے ضرور دیکھ رہا ہے، احسان ہے۔ اس نظریہ کے حامی دعویٰ کرتے ہیں کہ احسان کا مقام ماننے کے درجے، کے اعتبار سے سب سے بڑا ہے، اور عرفِ عام میں جسے صوفی کہا جاتا ہے، ماننے کے اعتبار سے احسان کے مقام پر ہوتا ہے (Rendezvous in Orlando, 7). شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاهر القادری اپنی کتاب سلوک و تصوف کا عملی دستور میں تصوف کو تزکیہ و احسان کے نظام سے موسم کرتے ہیں (سلوک و تصوف کا عملی دستور, 11-14)۔ سید حسین نصر اور آپ کے مکتبہ، فکر سے تعلق رکھنے والے تمام لوگ تصوف کا جواز اسی حدیث میں تلاش کرتے ہیں۔ ولیم سی چنک اور مریتا چنک کی کتاب "کا بہت بڑا حصہ تو مشتمل ہی اسی حدیث کے مضمرات اخذ کرنے پر ہے۔ The Vision of Islam"

اس حدیث کا متن اس طرح ہے:

"حضرت عمر بن الخطابؓ سے روایت ہے کہ ایک دن ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے کہ ایک شخص ہمارے سامنے سے نمودار ہو۔ اس کا باراں انتہائی سفید تھا اور بال انتہائی سیاہ۔ اس پر سفر کا کوئی اثر دھائی نہیں دیتا تھا، اور ہم میں سے کوئی اسے پہنچاتا بھی نہیں تھا۔ (وہ چلتا ہوا آیا) یہاں تک کہ حضور ﷺ کے گھنون سے گھٹنے نے ملا کر بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھ آپ ﷺ کے زان پر رکھ دئے اور کہا: 'آپے محمد ﷺ مجھے اسلام کے بارے میں بتائیں'۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: 'اسلام یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ اللہ کے سو اکوئی اللہ نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اور یہ کہ نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکو اور اگر وہاں جانے کی استطاعت ہو تو حج بیت اللہ کرو، وہ بولا: 'آپ نے سچ کہا'۔ ہمیں یہ بات عجیب لگی کہ یہ شخص آپ ﷺ سے سوال کرتا ہے اور پھر تصدیق بھی کرتا ہے کہ آپ نے سچ کہا! (اس کے بعد) اس نے کہا: 'آپ مجھے بتائیے ایمان کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: 'ایمان یہ ہے کہ تم ایمان لاو اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اسکی کتابوں پر، اس کے

رسولوں پر اور یوم آخر پر، اور یہ کہ تم یقین رکھو تقدیر پر اور اس کے خیر و شر پر۔ ”جَعْلَهُ آپَ نَے“، اس نے کہا اور پھر استفسار کیا: اب مجھے بتائیے کہ احسان کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگرچہ تم اسے نہیں دیکھ رہے لیکن وہ تحسیں دیکھ رہا ہے، پھر اس شخص نے پوچھا: مجھے قیامت کے بارے میں بتائیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جس سے پوچھا جا رہا ہے، وہ خود پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔ اس نے کہا: مجھے اس کی تثنیاں بتاؤ مجھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: گئیز لپنی مالکہ کو جنم دے گی اور تم دیکھو گے کہ جن کے پاؤں میں جوتا ہے نہ تن پر کپڑا، بھوکے ننگے اور بھیڑ کبڑیاں چڑھنے والے عمارتیں کھڑی کرنے کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کریں گے۔ ”حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد وہ شخص رخصت ہو گیا۔ میں خاصی دیر تک منتظر رہا، آخر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے عمر! تحسین معلوم ہے کہ وہ سوال کرنے والا کون تھا؟ میں نے عرض کیا: اللہ اور اسکے رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ جبریل تھے تحسین تمہارا دین سکھانے آئے تھے (چک 2009, 26-27)۔

“

پورے یقین سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ’احسان‘ کا لفظ اسلام اور ایمان کی طرح، قرآنِ پاک میں کسی بھی مقام پر ماننے کے اگلے درجے (higher level of believing) کے طور پر نہیں آیا۔ اس حدیث کی یہ تعبیر کہ ’احسان‘، اسلام اور ایمان کے بعد ماننے کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے درست نہیں۔ اس حدیث پاک میں دئے گئے ’احسان‘ کے تصور سے اسلام میں روحاںیت کے ادارے کے سڑک پر کی تشریح نہیں کی جاسکتی جو مرشد (تزکیہ اور تصدیق عطا کرنے والے) اور مریدین (تزکیہ اور تصدیق پانے والے) کے تعلق پر قائم ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے مقاصد کی تشریح کی جاسکتی جو تزکیہ عطا کئے جانے پر مشتمل ہے۔ اللہ اور اسکے رسول ﷺ نے معروف کا حکم دیا ہے اور مکر سے منع کیا ہے۔ معروف کے تین ہی درجے ہو سکتے ہیں: عبادت، سخاوت، اور خدمت۔ عبادت، عبیدت، محض ایک رکن ہے۔ احسان کا تعلق عمل کے ساتھ ہے۔ اللہ کی رضا کو مقصود رکھتے ہوئے، کسی کو اس کے حق کی ادائیگی میں آسانی مہیا کرنا احسان ہے۔ قرآنِ پاک میں والدین پر بھی احسان کا حکم ہے۔ جسے احسان کرنے کا شرف ہوا سے استفادہ کرنے والے کا شکر یہ بھی ادا کرنا چاہئے کہ مستفید ہونے والے کی بدولت ہی محسن کو فانی شی کے بد لے دائی انعام ملتا ہے۔ سخاوت عمل ہے۔ خدمت عمل ہے۔ خدمت کا درجہ سب سے بڑا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد، جنہوں نے اپنی کتاب ’تصوف یعنی احسان اسلام‘ میں کہا ہے کہ صوفی درجہ اعتقاد کے اعتبار سے احسان کے مقام پر ہوتا ہے، ہم دیکھ پکے ہیں کہ اس بات کو قرآنِ پاک کی سند سے ثابت نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی انہوں نے اس کیلئے

قرآن پاک سے کوئی سند نقل کی ہے۔ کیا ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے اپنے عمل سے اس کی کوئی تصدیق ملتی ہے! ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ایک بہت قریبی ساتھی سے ہم نے استفسار کیا کہ کیا ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے کسی صوفی کو 'احسان' کے مقام پر پایا اور اسکی اطاعت، اتباع اور تصدیق سے مانے کا یہ اعلیٰ ترین درجہ پایا! ان کا جواب تھا: "ڈاکٹر اسرار احمد کہتے ہیں کہ میں نے دنیا کے بہت سے ممالک کا سفر کیا ہے، لیکن مجھے کوئی ایسا شخص ملا نہیں جس کی میں بیعت کر لیتا۔ اب میں نے قرآن پاک پر ہی بیعت کر لی ہے۔" مطلب یہ کہ میں نے اپنے ہی فہم قرآن کو سندeman لیا ہے، اور اپنے سے بڑھ کر اللہ کی طرف رجوع لانے والا مجھے کوئی ملا نہیں جس کا میں اتباع کر لیتا۔ ڈاکٹر اسرار احمد اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایمان کے درجے ہیں: "ایک قانونی ایمان اور دوسرا حقیقی ایمان۔ قانونی ایمان کے درجے میں عمل علیحدہ ہے ایمان سے جبکہ حقیقی ایمان کے درجے میں عمل جزو لاینک بن جاتا ہے ایمان کا۔ اور پھر اس سے اوپر تیسرا درجہ احسان کا ہے (مروجہ تصوف یا سلوکِ محمری؟ یعنی احسان اسلام! جون 1997، 12-13)۔" ڈاکٹر اسرار احمد اہل تصوف کے مقاصد کو صدقہ دین سمجھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ تصوف کا اصل تانا بانا قرآن مجید کے مکملات پر قائم ہے۔ اس میں وہ تصوف کے فلسفیانہ حصہ کو بھی شامل سمجھتے ہیں۔ یہ صوفیاء کو اسلام کے اصل فلسفی قرار دیتے ہیں (جون 1997، 43)۔ حضرت فضل شاہ صاحب کا فرمان ہے کہ مسلمان کی دونشنازیاں ہیں: اسکی زبان پاک اور ہاتھ امین ہوتا ہے۔ دعویٰ تسلیم کی بنیاد ایمان بالغیب ہے۔ جس کی صداقت کی شہادت دی جائے، جس کی امانت کی شہادت دی جائے، اسکی بات کو بلا دلیل ماننا ایمان بالغیب ہے۔ ان حضرات کا یہ بھی فرمان ہے کہ جس قول کا عمل شاہد نہ ہو وہ سچا ثابت نہیں ہوتا۔ یہ بھی فرمایا کہ دعویٰ بلا شہادت قابل سماحت ہی نہیں ہوتا۔ ایمان بالغیب کے بعد ایمان بالشہادت کا مقام ہے۔ مثلاً حضور ﷺ کا فرمان ہے: "بے شک اللہ کے ذکر میں ہی اطمینان قلب ہے۔" (القرآن، 28:13) شاہد سے ذکر کا طریقہ سمجھنے کے بعد جب مانے والے پر اطمینان قلب کا مقام آتا ہے تو ایمان بالغیب، ایمان بالشہادت کے درجے میں آ جاتا ہے۔ یہ علم کا مقام ہے۔ اللہ کے فضل سے اگر مشاہدے کا شرف نصیب ہو تو اس سے ایمان میں رفت آتی ہے۔ مانے والے کے ذمے میں ہے کہ وہ قول، عمل، اور علم تینوں مقالات پر مشاہدے کے اتباع میں پورا رہے۔

## ”تحریر الروح“—ایک بے معنی تصور

ڈاکٹر اسرار احمد لکھتے ہیں کہ انسانی شخصیت کے اندر دو مخابر اور باہم خالف اور متفاہ عناصر اس کا نفس حیوانی اور اس کی روح ملکوتی ہیں، اور کرنے کا اصل کام یہ ہے اور ہر انسان پر لازم ہے کہ روحانی عنصر کی تقویت و تغذیہ کا سامان کیا جائے اور دوسری طرف حیوانی عنصر کی تہذیب و تزکیہ کا بندوبست کیا جائے۔ روح کی تقویت و تغذیہ کیلئے وہ ذکرِ الٰہی تجویز کرتے ہیں۔ ”سب سے بڑا ذکر خود قرآن ہے، پھر نماز اور پھر ادعیہ و اذکارِ مسنونہ۔ اس سے تجلیٰ روح کا مقصد حاصل ہو گا اور ایمان کی شدت اور گہرائی میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا، یہاں تک کہ انسان منزلِ احسان، کو پالے گا (جون 1997ء، ایضاً)۔“ تہذیب و تزکیہ نفس کیلئے مخالفتِ نفس کی کیا ریاضتیں اختیار کی جائیں، اس کیلئے سب سے پہلی چیز اقامتِ صلوٰۃ یعنی نماز کو اس طرح قائم کرنا کہ کوئی مصروفیت، کوئی دوستی، کوئی کار و بار دنیوی، طبیعت کی غیر آمادگی، موسم کی شدت، غرض کوئی چیز آڑے نہ آنے پائے، اور نماز تہجد کیلئے تو نیند کو بھی قربان کرنا پڑتا ہے۔ پھر روزہ ہے۔ پھر انفاق مال ہے۔ ان سے مخالفتِ نفس کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد مزید لکھتے ہیں کہ یہی مقصد دو اور فرائض یعنی حج، اور دعوتِ دین اور اقامتِ دین کی جدوجہد کے ذریعے بھی پورا ہوتا ہے، یہ دو فرائض دراصل ان تینوں کے جامع ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد کہتے ہیں کہ مخالفتِ نفس کی ان ریاضتوں میں سے ترجیح کا اصول یہ ہے کہ ”اگر اللہ کادین غالب ہے اور اسلامی ریاست موجود ہے تو مخالفتِ نفس کیلئے اقامتِ الصلوٰۃ، صوم، انفاق، اور حج کے ذرائع اختیار تکھیے، اور اگر اللہ کادین پاماں ہو رہا ہے تو۔۔۔ اقامتِ دین کی جدوجہد کو تمام فنی عبادات پر فوقيت حاصل ہو جائے گی۔“ اس کے بعد مزید کہتے ہیں: ”کہ خدمتِ خلق کی تین منزلیں ہیں۔ پہلی منزل ہے بھوکوں کو کھانا کھلانا، ضرورت مندوں کی امداد کرنا۔ اور ایک دائیٰ حق کیلئے یہ چیز نہایت ضروری ہے ورنہ اسکی دعوت دوسروں تک نہیں پہنچ پائے گی۔ دوسری منزل ہے خدمتِ خلق کے حوالے سے لوگوں کی عاقبت سنوارنے کی کوشش کرنا، اللہ کی طرف دعوت دینا۔ اس سے بڑی کوئی خدمتِ خلق نہیں ہو سکتی کہ انسان دوسروں کی ابدی زندگی کی فلاح کے لئے کوشش کرے۔ خدمتِ خلق کی تیسرا منزل یہ ہے کہ خلقِ خدا کو ظالمانہ نظام کے جبرا و استھصال سے نجات دلانے کی کوشش کی جائے۔ صرف پہلی قسم کی خدمتِ خلق کو کل سمجھ لینا دراصل دین کے محدود تصور کا شاخانہ ہے (جون 1997ء، 26-29)۔

روح کے بارے میں قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے کہ یہ اللہ کے امر کی چیزوں سے ہے۔ اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ تمحیص اس کا علم قلیل ہی دیا گیا ہے۔ (القرآن، 17:85) قرآنی وجودیات (Quranic Ontology) کے مطابق جس کو بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ہستی سے نوازا گیا ہے، وہ خلق کی کیمیگری سے تعلق رکھتا ہے یا امر کی کیمیگری سے۔ (القرآن، 7:54) درج بالا آئیہ کریمہ میں روح کے بارے میں ارشاد ہو رہا ہے کہ یہ 'امر' کی کیمیگری سے تعلق رکھتی ہے۔ انسان روح کے بارے میں جتنی بھی تحقیق کر لی جائے، قرآن پاک شاہد ہے کہ اس کے بارے میں انسان کا علم ہمیشہ قلیل ہی رہے گا۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ نہ تو خلق کسی بھی درجے میں اللہ کی الوہیت میں شریک ہے اور نہ ہی امر۔ ڈاکٹر اسرار احمد بھی اس کو مانتے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ "صادر توہین سے ہوتی ہے۔" اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں "بعض عارفین نے جو مثال دی ہے وہ یہ ہے کہ ہماری روح کا ذاتِ باری کے ساتھ وہی تعلق ہے جو سورج کی کرن کا سورج کے ساتھ ہوتا ہے (جون 1997, 20)۔" سورج اور کرن کا رشتہ علت اور معلول کا رشتہ ہے۔ معلول کے علت سے صادر ہونے میں کہیں علت کے ارادہ کو دخل نہیں ہوتا۔ معلول اپنی نیچر کے اعتبار سے علت سے مختلف نہیں ہو سکتا۔ کیا روح اپنی نوعیت کے اعتبار سے الوہیت کی حامل ہے؟ اگر عارف سے مراد وہ ہے جسے معرفتِ ربی سے نوازا گیا، تو کیا وہ خدا اور روح کے تعلق کے حوالے سے بے سند بات کرے گا! ڈاکٹر اسرار ایہ بھی کہتے ہیں کہ امر رب، ہونے کے اعتبار سے روح اندھی اور بہری تو نہیں ہو سکتی لیکن سوئی ہوتی ہوتی ہے، اللہ کا ذکر اسے بیدار کرتا ہے (جون 1997, 20)۔ جو لوگ قرآن کے عالم ہونے کے دعویدار ہوتے ہیں ان سے بجا طور پر توقع کی جاتی ہے کہ وہ سند کے ساتھ بات کریں گے۔ کیا روح کے خفته ہونے (dormant) اور پھر 'ذکر' کے ذریعے بیدار ہونے کا کوئی بیان قرآن پاک میں ہے؟ ہرگز نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک اصطلاح 'تحریر الرّوح' وضع کی ہے جس کے معنی انہوں نے خود حریتِ روح شدید ہو گا اسی تدریج ہماری روح ان بیڑیوں میں مقید رہے گی اور نفسِ حیوانی کا غلبہ جتنا کمزور پڑے گا اسی تناسب سے روح کو آزادی ملے گی۔ تہذیب و تزکیہ نفس کا نتیجہ تحریر الرّوح کی شکل میں نکلتا ہے یعنی روح در حقیقت نفسِ امارہ کے تسلط سے آزاد ہوتی ہے (ایضاً، 19)۔ "روح کے قید ہونے کا یا بیڑیوں سے آزاد ہونے کا کوئی تصور قرآن پاک میں نہیں ملتا۔ یہ خالصتاً افلاطونی تصور ہے جسے ہمارے علماء اور صوفیاء استعمال کرتے

ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ’تحیر الرؤح‘ ایک بے سند اصطلاح ہے اور ہماری تحقیق کے مطابق مسلم فلسفہ و کلام اور تصوف کے مسائل کی بہت بڑی وجہ غیر قرآنی اصطلاحات کا وضع و قول ہے۔

### ذکر اور شکر

قرآنِ پاک میں اولی الالباب (عقلمند لوگوں) کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ چلتے پھرتے، اٹھتے ہوئے بیٹھتے ہوئے، اور پہلوؤں پر لیٹتے ہوئے اللہ کاذک کرتے رہتے ہیں۔ ذاکر کو اولی الbab کی معیت حاصل ہو جاتی ہے، وہ اولی الالbab میں شمار ہو جاتا ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ بے شک اللہ کے ذکر ہی میں اطمینانِ قلب ہے۔ (القرآن، 28:28) ذاکر کو اطمینانِ قلب عطا ہو جاتا ہے۔ اور اطمینانِ قلب کیلئے تو انبیاء کرام نے بھی دعا کی ہے۔ (القرآن، 2:260) قرآنِ پاک میں منصبِ شاہدین میں تزکیہ عطا فرمانے (purification) کا تو ذکر ہے، لیکن تہذیبِ نفس کی اصطلاح ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی اپنی بنائی ہوئی ہے۔ کیا تزکیہ نفس عطا ہونے کے باوجود تہذیبِ نفس ہونا باقی رہ جاتا ہے! اس کی سند کیا ہے؟ ’ذکر‘ کے ضمن میں یہ واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ ہر ایک کیلئے ہر ذکر مفید نہیں ہوتا۔ حضرت فضل شاہ رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے: ذکر ایک دعویٰ ہے۔ جس دعوے کے ساتھ شہادت موجود نہ ہو وہ سچا ثابت نہیں ہوتا۔ ایک صاحب حضرت فضل شاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عرض کیا: بزرگوں کا ماننے والا ہوں۔ ’اداریہ قادر یہ نور والوں کا ذیرہ‘ کا بورڈ کیکھ کر سلام کے لئے حاضر ہو گیا ہوں۔ حضرت صاحب نے اس کی عزت افزائی کیلئے اہتمام فرمایا، اپنے ارشادات کے ذریعے روحانی خوارک بھی مہیا کی، جب وہ رخصت ہونے لگا تو آپ نے فرمایا: ذکر کیا کرو یا وہود، یا وہود پڑھا کرو۔ اس نے بر امنیا اور کہا میں جو ذکر پہلے کرتا ہوں وہی ٹھیک ہے۔ حضرت صاحب نے فرمایا: جو بتایا ہے اس پر عمل کرو، کہیں مشقت میں نہ پڑ جانا۔ کچھ عرصے کے بعد اس کا خط آیا۔ جیل میں تھا۔ عرض کیا: آپ صاحب نظر ہیں۔ مجھے احساس ہو رہا ہے کہ آپ نے تو میرا ہی بھلا چاہا تھا۔ میں نے آپ کی بات نہیں بانی۔ میرے لئے دعا فرمائیں، اور مجھے بتائیں میں کیا کروں تاکہ مشقت سے نجات ہو۔ حضور پیر صاحب نے جواب لکھا یا: چلتے پھرتے، اٹھتے ہوئے بیٹھتے ہوئے، اور پہلوؤں پر لیٹتے ہوئے یا وہود، یا وہود پڑھتے رہو۔ تمھیں اٹھا کر جیل سے باہر پچینک دیں گے۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد وہ ذیرہ پاک پر سلام کیلئے حاضر ہوا۔ عرض کیا: دل و جان سے حضور کے ارشاد پر عمل شروع کر دیا۔ کچھ ہی دنوں بعد جیل حکام کو احساس ہوا کہ قانونی تقاضے پورے نہیں ہیں اور مجھے انہوں نے جیل میں رکھا ہوا ہے، اگر یہ بات عدالت کے علم میں آگئی تو خود ان کیلئے

مشکل پیدا ہو جائے گا۔ انھیں عافیت اسی میں نظر آئی کہ مجھے فوراً جیل سے فارغ کر دیا جائے۔ اس کے رخصت ہونے کے بعد محین میں سے ایک صاحب نے عرض کیا: حضور! ذکر تو یہ پہلے بھی کر رہا تھا اور اللہ ہی کے پاک ناموں کا کر رہا تھا، آپ نے بھی اللہ ہی کے ایک پاک نام کا ذکر تلقین کیا، تو پھر حضور نے یہ کیوں فرمایا کہ یاً وَذُو ذِيْهِ، یاً وَذُو ذِيْهِ پڑھا کرو، کہیں مشقّت میں نہ پڑ جانا۔ پیر صاحب نے فرمایا: یہ سرکاری ملازم ہے۔ معاملے میں دیانت دار نہیں تھا۔ یاَلَطِيفُ يَا حَبِيبُ، کاذکر ہر وقت کرتا تھا۔ دعویٰ یہ تھا: یاَللّٰهُ تَوَهْرَ بَاتَ تَوْ خَرْ رَكْنَهُ وَالا، نَهَايَتُ بَارِيكَ بَيْنَهُنَّ۔ عمل اس کے بالکل بر عکس تھا، ہر وقت جھوٹا ثابت ہو رہا تھا، مشقّت تو آئی ہی تھی۔ عرض کیا: حضور! اگر وہ یاً وَذُو ذِيْهِ، یاً وَذُو ذِيْهِ کاذکر کرتا لیکن عمل اسکا وہی رہتا تو پھر اس پر مشقّت نہ آتی! فرمایا: الْوَذُوْهُ، کام طلب ہے 'محبت کرنے والا دوست'۔ جو اللہ کو اس نام سے پکارتا ہے وہ اس سے محبت اور دوستی ہی کا سوال کرتا ہے۔ اگر اس کا عمل ابھی ٹھیک نہیں تو بھی اللہ اسے مشقّت سے بچایتا ہے۔ اگر یہ ذکر کسی پاک بندے نے بتایا ہے اور کرنے والا یکوئی سے کرتا ہے تو دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے اسے برائی کے دائرے سے باہر نکل جانے کا شرف ہو جاتا ہے۔ ایک خاتون نے عرض کیا: "لو میرج کی ہے۔ والدین کی اجازت سے کی ہے۔ میاں بہت اچھا ہے۔ آمدنی بھی مناسب ہے۔ چند سرالی رشتہ دار میرے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کا رہنا مجھے اچھا نہیں لگتا حالانکہ میری خدمت بھی کرتے ہیں۔ طبیعت میں بے چینی اتنی زیادہ ہے کہ دل چاہتا ہے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں چلی جاؤں۔ ایک دن ایسا ہوا بھی۔ میں نے بیگ تیار کیا، پکا ارادہ کر لیا آج میں نے چلے ہی جانا ہے۔ گھر سے باہر نکلی۔ خیال آیا جانے سے پہلے اپنے میاں سے مل لوں۔ اس کے دفتر چلی گئی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے مجھے سنھالا دیا اور گھر واپس لے آیا۔ میں سوچتی ہیں اگر میں ایک رات بھی گھر سے باہر رہ جاتی تو میر اکیا بنتا۔ لیکن حضور طبیعت میں اضطراب بہت ہے، پیر صاحب نے فرمایا: "تم اللہ کے فلاں فلاں ناموں کا ذکر کرتی ہو! وہ چونک سی گئی۔" حضور! وہ تو میں کرتی ہوں۔ فرمایا: اللہ کے جن ناموں کا تم ذکر کرتی ہو ان کا ذکر کرنے والا سیماں صفت ہو جاتا ہے۔ اس ذکر سے راحت بھی ہوتی ہے، لیکن طبیعت میں اضطراب بہت بڑھ جاتا ہے۔ مراج میں ٹھہراؤ نہیں رہتا۔ زندگی پر اسکے اثرات مرتب ہو نالازم ہیں۔ فرمایا: فوراً یہ ذکر بند کر دو اور جو ہم بتاتے ہیں وہ کیا کرو، طبیعت میں اعتدال آجائے گا۔ فرمایا: کچھ اور بھی ذکر کرتی ہو۔ عرض کیا: "ربِّ آنِ مَغْلُوبٍ فَإِنْصِرْ" پڑھتی ہوں۔" فرمایا: یہ کس لئے پڑھتی ہو۔ عرض کیا: اس لئے پڑھتی ہوں کہ سرالی رشتہ داروں پر میر اربع رہے۔

فرمایا: تمھیں پتہ ہے جب سائز ہے نوسال تک نہایت صبر سے تبلیغ حق کرنے کے باوجود قوم نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کو مانے سے یکسر انکار کر دیا اور آپ کو دھمکی دی اور جھٹر کا تو آپ نے ان الفاظ میں اپنے رب کو مدد کیلئے پکارا تھا، اور تم کیا کر رہی ہو۔ چار قسم کے لوگ والدین کے درجے میں ہوتے ہیں: جن کے ہاں پیدائش ہوتی ہے، جو رزق کمانے کا علم سکھاتا ہے، میاں / بیوی کے والدین، شاہد اور اسکے اہل خانہ۔ اللہ کا حکم یہ ہے کہ والدین سے حسن سلوک سے پیش آؤ، ان کے آگے رحمت کے بازو بچاؤ، انھیں جھٹر کو مت، ان کی خدمت کرو معروف طریقے سے۔ اور تم ان کے حوالے سے وہ دعا کر رہی ہو جو حضرت نوح علیہ السلام نے قوم کافرین کیلئے کی تھی۔ یہ بہت بڑے گناہ کی بات ہے۔ ” فرمایا: ذکر کرنے کا علم شاہدین سے سیکھنا چاہئے۔ ذکر کامنشاخواہشات کی پیروی نہیں بلکہ اولی الباب کی معیت ہونا چاہئے۔ ہر ذکر ایک دعویٰ ہے۔ اس بات کا دھیان رکھنا چاہئے کہ دعویٰ بلا شہادت قابل سماعت ہی نہیں ہوتا۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: بے شک اللہ اور اسکے ملائکہ نبی پاک ﷺ پر صلاۃ بھیجنے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی حضور پر صلاۃ بھیجا کرو اور سلام بھیجا کرو۔ عام طور پر کتابوں میں لکھا ہوتا ہے کہ درود پاک سے بڑا وظیفہ ہی کوئی نہیں۔ ایک روایت سے یہ بھی اخذ کیا جاتا ہے کہ درود پاک ایسا ذکر ہے جو ہر وقت کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ بات درست نہیں۔ درود پاک ہر وقت پڑھا جاسکنے والا وظیفہ نہیں۔ مصنف کا اپنا تجھ بیان کرنے سے لوگوں کو فائدہ پہنچ گا۔ بی اے کی تعلیم کے دوران ہم بیمار ہو گئے۔ چند سال تک باقاعدہ تعلیم کا سلسہ بھی منقطع رہا۔ اسی دوران تصوف ہماری توجہ کا مرکز بنا۔ تصوف کے بارے میں ہم سوچتے پہلے بھی رہتے تھے، لیکن عملاً اسے جانے کو شش نہیں کی تھی۔ بیماری کے ان سالوں میں چند مشہور صوفیاء کے تذکرے پڑھنے کا موقع بھی ملا۔ کشف و کرامات کے واقعات سے زیادہ کچھ سمجھنہ آئی۔ لیکن اندر ایک لگن لگنگی کہ اس کی حقیقت کا پتہ چلے۔ اگر یہ کوئی بہت اعلیٰ درجے کا علم ہے تو پھر اس کے حصول میں لگ جایا جائے، اور اگر یہ کوئی بہت اعلیٰ درجے کا علم نہیں ہے تو بھی پتہ چلے۔ طبیعت میں سنجیدگی پہلے ہی تھی، بی اے کی تعلیم کے دوران ایک استادِ محترم نے ہمارے مزاج کو دیکھتے ہوئے ہمارے مضامین تبدیل کروائے کے سامنے سے ہمیں فلسفہ کا طالب علم بنوادیا۔ بیماری سے سنجیدگی میں اور اضافہ ہوا۔ ہر وقت ایک ہی لگن تھی، زندگی کا مقصد کیا ہے۔ اس کو پانے کا لیکن راستہ کیا ہے۔ تصوف کی حقیقت کیا ہے۔ جس علم کا یہ دعویٰ کرتے ہیں اس کی قدر و قیمت کیا ہے۔ آسانی اور عزّت کے ساتھ یہ علم حاصل کیے ہو۔ انھوں نے اپنے لئے اتنے امتیازات اختیار کئے ہوئے

ہیں، اتنے اوچے پیدا مل پر بیٹھ کربات کرتے ہیں کہ طالب علم اپنے آپ کو بے و قت محسوس کرتا ہے۔ کوئی سوال پوچھنا عموماً بے ادبی سمجھا جاتا ہے، اگر جواب ملتا ہے تو عقلى کو اپیل نہیں کرتا، کشف و کرامات، بے سند روایات، حقیقی یا فرضی بزرگوں کے حقیقی یا فرضی خواب یا مشاهدات سے استدلال کیا جاتا ہے۔ قرآن پاک کی سند سے بات کرنے کا یہاں رواج ہی نہیں۔ اختلافِ رائے کے اظہار کی اجازت نہیں۔ بیعت سے پہلے کچھ بتانے کیلئے تیار نہیں ہوتے۔ ان حالات میں ایک بزرگ نے جن کی خدمت میں ہمیں کثرت سے حاضری کا شرف تھا اور جن کی بے غرضی بہت قابلِ قدر تھی، ہم سے حضرت فضل شاہ صاحب کا ذکر کیا اور فرمایا کہ وہ بڑے صاحبِ علم بزرگ ہیں۔ جسمانی علاج کا بھی بہت بڑا علم رکھتے ہیں۔ آپ ان سے ملیں۔ 1977ء یا 1978ء کی بات ہے حضرت فضل شاہ صاحب سے ملنے کا شرف ہوا۔ ڈیرہ پاک کے اندر داخل ہوا اور پیر صاحب سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ڈیرہ پاک کے ایک خادم حاجی سلطان احمد صاحب نے ہمیں ایک جگہ بٹھا دیا جہاں بہت سادہ انداز میں بیٹھنے کا اہتمام تھا۔ ایک عمر سیدہ بزرگ کسی دوسرے بزرگ سے گفتگو فرما رہے تھے۔ ہمیں بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ یہ پیر صاحب ہیں۔ ہم نے لپنی روحانی اور جسمانی کیفیت آنے کا مقصد پوچھا تو پتا چلا کہ یہی حضرت فضل شاہ رحمت اللہ علیہ ہیں۔ ہم نے لپنی روحانی اور جسمانی کیفیت بیان کی۔ فرمایا: ذکر کیا کرو یا وہود، یا وہود پڑھا کرو۔ غذا کے بارے میں رہنمائی دی اور فرمایا کہ اس پر عمل کرو، فائدہ ہو گا۔ ہم نے یہ عرض کرنا بہت ضروری سمجھا کہ ”جناب میں تو پچھلے چھ ماہ سے ہر وقت باوضورہ کر درود پاک پڑھتا رہتا ہوں۔“ حضرت صاحب نے بہت ہی دوڑوک انداز میں فرمایا: ”جب تک ذکر نہیں کرو گے، کچھ نہیں بنے گا۔“ ہمارے پاس اب مزید کہنے سننے کیلئے کچھ نہیں تھا۔ اجازت لی، کچھ فاصلے پر ایک چار پائی پڑی نظر آئی وہاں جا بیٹھے اور سوچنے لگے: ”کتابوں میں تو لکھا ہوا ہے درود پاک سے بڑا وظیفہ ہی کوئی نہیں، یہ بزرگ کہتے ہیں جب تک ذکر نہیں کرو گے، کچھ نہیں بنے گا۔“ حاجی سلطان احمد صاحب نے ہمیں اس کیفیت میں دیکھا تو کہا کہ یہاں اس مجرہ پاک میں ایک ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں، پیر صاحب کے خاص عقید تمند ہیں، اگر آپ چاہیں تو ان سے مل لیں۔ لیکن ہم ڈاکٹر صاحب سے نہیں ملے اور کچھ دیر کے بعد ڈیرہ پاک سے چلے آئے اور شاہید دوبارہ نہیں گئے۔ کتابیں لکھنے والوں کے علم کو بڑا سمجھا، پیر صاحب کی بات پر عمل نہیں کیا۔ اس دوران ہم نے شعبہ فلسفہ پنجاب یونیورسٹی سے ماسٹر زکی ڈگری حاصل کی۔ ایک سنجدہ

میں اپنے سوالوں کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن احساس بھی تھا کہ اصطلاحات سمجھی ہیں، نظریات پڑھے ہیں، بحث و تجھیس کے فن کا پتہ چلا ہے؛ لیکن سوالوں کا ایسا جواب نہیں ملا جو دل و دماغ کو اطمینان عطا کر سکے۔ چند سال شکر گڑھ کے سرکاری ڈگری کالج میں فلسفہ کا پیغمبر رہنے کے بعد 1984 میں گورنمنٹ سائنس کالج وحدت روڈ میں تبدلہ ہو گیا۔ 1985 میں شادی کے بعد ذمہ داریاں مزید بڑھ گئیں۔ شکر گڑھ کے قیام کے دوران بھی تلاش کا عمل جاری رہا، کچھ بزرگوں کی خدمت میں حاضری بھی رہی، اندر جو ترپ تھی وہ مزید بڑھ چکی تھی، طبیعت میں چین نہیں تھا۔ سوالوں کے ایسے جواب جو ہمارے دل اور دماغ میں اتر جائیں کہیں سے ملتے نہیں تھے۔ کسی سے ملاقات میں ایک ہی موضوع ہوتا تھا: حق کیا ہے۔ حق کا علم کیسے ہو۔ ایمان کیا ہے۔ خدا کو ماننے کا دعویٰ کرنے والے خدا کے نام پر ایک دوسرے کا گلا کیوں کاٹتے پھرتے ہیں۔ فرقہ بندی کی حقیقت کیا ہے۔ ایک قرآن اور ایک رسول کو ماننے والے فرقوں میں کیوں بٹ گئے ہیں۔ تصوف کی حقیقت کیا ہے۔ کتابوں میں تو بہت سے واقعات ہیں کہ کوئی بندہ پیر صاحب کی خدمت میں گیا، پیر صاحب نے نظر کی اور بندہ بدل گیا لیکن حقیقت میں تو کوئی ملتا نہیں۔ داتا صاحب ہیں یا دوسرے بزرگ جن کے مزارات پر تانتابند حارہ تھا، کیا یہ صرف ماضی ہی میں تھے، حال پر نہیں ہوتے! اگر حال پر اس درجے کے لوگ نہیں ہوتے تو ماضی میں ان کے ہونے کا کیا ثبوت ہے۔ ان کے تصدیق یا نتہاً اگر حال پر موجود ہیں تو ان تک رسائی کیسے ہو۔ وحدت الوجود کیا ہے، وحدت الشہود کیا ہے۔ صحیح کیا ہے، غلط کیا ہے، حق کا معیار کیا ہے۔ اللہ کے ساتھ واصل ہونا کیا ہوتا ہے۔ فنا فی اللہ، بقا بـاللـہ کا کیا مطلب ہے وغیرہ۔

## فلسفہ اور وجودیات

فلسفی اپنے تصور کائنات کے مطابق اصطلاحات (terms) وضع کرتا ہے، ان اصطلاحات میں سوال تنقیل کرتا ہے۔ یہ سوال کچھ ایسے پیش فرضیوں (presuppositions) پر مبنی ہوتے ہیں جنہیں وہ بدیہی صداقت (self-evident truth) سمجھتا ہے اور انھیں ثابت کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ ان کے جواب میں قیاسی نظریات (theories) پیش کرتا ہے، حق اور مخالف میں آنے والے حقیقی یا متوقع اعتراضات کا جائزہ لیتا ہے۔ دعویٰ کرتا ہے کہ جس طرح اس نے حقیقت کو دریافت کیا ہے، حقیقت ویسی ہی ہے۔ اگلا فلسفی اس کے پیش فرضیوں ہی کو رد کر دیتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ اس کا سوال ہی بے معنی یا غلط ہے۔ اگر مقدمات کو مان لیتا ہے تو اس بات کا جائزہ لیتا ہے کہ کیا اس کا نظریہ خود اپنی تنقیص تو نہیں کرتا۔ کیا

نتیجہ قوانین منطق کے مطابق درست اخذ کیا گیا ہے۔ اور پھر اس بات کا بھی جائزہ لیتا ہے کہ جس منطق کو معیار مانا گیا ہے کیا وہ خود بھی درست ہے۔ فلسفیانہ مسائل ہوتے ہی ایسے ہیں کہ ان کا جواب نہ تو کسی سائنسی لیبارٹری میں تلاش کیا جاسکتا ہے، اور نہ ہی ریاضیاتی طریقے یا شماریات کی بنیاد پر۔ فلسفہ صرف عقل ہی کو حتیٰ ذریعہ علم مانتا ہے، اور اس کے نزدیک عقل سے مراد وہ صلاحیت ہے جس کی بنیاد پر استدلال کیا جاتا ہے۔ صحتِ استدلال کیلئے فلسفی ان اصولوں کو معیار بناتے ہیں جو منطق کے نام سے معروف ہیں۔ جنہیں سب سے پہلے ارسطو نے منطقِ استخراجیہ اور منطقِ استقرائیہ کی صورت میں منضبط کیا۔ منطق کی روایتی تعریف صحتِ استدلال کے اصولوں کی حیثیت سے کی جاتی ہے۔ منطقِ استقرائیہ کا استعمال زیادہ تر سائنسی علوم میں ہوتا ہے۔ فلسفے میں استدلالِ منطقِ استخراجیہ کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ منطقِ استخراجیہ بھی کوئی حقیقی معیار نہیں صحتِ استدلال کا۔ منظقوین نے ارسطو کے منضبط کئے ہوئے اصولوں پر بھی شدید تقيید کی ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ منطق اپنی ما بعد الطبیعت کے تابع ہوتی ہے۔ ارسطو کی وجودیات (ontology) دو انتہائی اصولوں یعنی خالص صورت اور خالص مادہ کو مطلق حقیقت قرار دیتی ہے، اور یہ ثابت کرتی ہے کہ کائنات کی ہر شے ان دو اصولوں پر مشتمل ہے۔ اس وجودیات کی بنیاد پر جو منطق تشكیل پذیر ہوتی ہے وہ شتوی (dualistic) ہے۔ شے کو موضوع اور محمول میں تحویل کر کے اپنے فکری مقدمات تشكیل دیتی ہے۔ مادی اشیاء کی حد تک تو یہ منطق قابلِ استعمال ہے، لیکن جب شتوی ما بعد الطبیعت (dualistic metaphysics) پر مشتمل یہی منطق ذاتِ باری کیلئے بھی استعمال کی جاتی ہے تو یہ خدا تعالیٰ کو (ارسطو کی ما بعد الطبیعت کی اصطلاحات) 'ذات' (essence) اور 'صفات' (attributes) میں تحویل کر کے متصور کرتی ہے۔ مسلم الہیات اور فلسفہ کے اکثر مسائل ہماری تحقیق کے مطابق ارسطو کی منطق، وجودیات، اور ما بعد الطبیعت کے قرآنِ پاک کے نظامِ عقائد سے بکسر تناقض اصولوں کو، قبول کرنے سے پیدا ہوئے اور صدیوں سے ہم اس میں الجھے ہوئے ہیں۔ (ملاحظہ کیجئے مصنف کے مضامین بالخصوص "قرآن: خلق یا امر"، اور "مسئلہ ذات و صفات باری"؛ "علم مطلق اور انسانی آزادی"، اور دیگر مضامین۔) اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ فلسفے میں کوئی چیز حقیقی نہیں ہوتی۔ پیش فرض یہ حقیقی ہوتے ہیں نہ اصطلاحات اور مقدمات، استدلال حقیقی ہوتا ہے نہ منطق، وجودیات حقیقی ہوتی ہے نہ ما بعد الطبیعت۔ خود عقل کا تصور جس پر فلسفہ استوار ہوتا ہے وہ بھی حقیقی نہیں ہوتا۔ صرف نظریات (theories) ہوتے ہیں جنہیں فلسفی پڑھتے اور پڑھاتے رہتے ہیں۔ حرمت

ہوتی ہے ان مذہبی لوگوں پر جو فلسفے کو آئندہ میں بنایتے ہیں، قیاس آرائیوں کو علم صحیح ہے اور مذہب کو فلسفہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

## طریقت شاہدین

فلسفہ کے مطالعہ سے بھی سوالات کے جواب نہیں ملے اور تشکیل بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ 1986ء میں ایک عزیز سے ملاقات ہوئی۔ یہی بات موضوعِ گفتگو تھی۔ اس نے کہا یہاں بھائی گیٹ میں اونچی مسجد کے پاس، حنفی رامے صاحب کے بھائیجے کے مکان میں، ایک بزرگ رہ کر گئے ہیں، انھیں ڈاکٹر صاحب کہا جاتا تھا۔ عمر رسیدہ نہیں تھے۔ انکی بات بہت متاثر کرتی تھی۔ بڑے صاحب علم تھے۔ اشراق احمد، بانو قدسیہ اور حنفی رامے کی طرح کے صاحبان علم ان کے پاس آیا کرتے تھے۔ لٹکر کا بہت اعلیٰ احتمام ہوتا تھا۔ کوئی سوال پوچھا جاتا تو جواب ایسا ہوتا کہ دل کے اندر اترتا چلا جائے۔ کسی معاملے میں مشورہ کیا جاتا تو اس میں حکمت کا احساس ہوتا اور عمل کرنے سے واقعی بہت فائدہ پہنچتا۔ علاج بالغذا کے طریقے سے علاج کرتے تھے۔ ان کی بدایت پر عمل کرنے سے فائدہ پہنچتا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے وہ یہاں سے کوٹ لکھپت تشریف لے گئے ہیں، مجھے ان کے رحمت خانے کا پتہ ہے، اگر آپ ان سے ملنا چاہیں تو میں آپ کو لے جاسکتا ہوں۔ معلوم ہوا یہ وہی ڈاکٹر صاحب ہیں جن کا ذکر حضرت فضل شاہ قطب عالم رحمۃ اللہ علیہ کے ادارہ قادریہ نور والوں کا ڈیرہ، پر حاجی سلطان احمد نے کیا تھا۔ ہم نے کہا چلو ابھی چلتے ہیں۔ پیکو روڈ کوٹ لکھپت پرمائیکرو الکیٹرولکس کے بال مقابل، ایک رہائشگاہ پر پہنچ جو فاضلی فاؤنڈیشن کے نام سے موسوم ہے۔ ایک صاحب سے ملاقات ہوئی، سفید کاٹن کے شلوار قمیں میں مبوس نہایت باوقار شخصیت۔ سٹیل کی چند کرسیاں پڑی تھیں، ساری ایک چیزیں۔ فرمایا: تشریف رکھیں۔ حافظ صاحب (ہمارے عزیز) نے ہمارا تعارف کرایا۔ فرمایا: جی پروفیسر صاحب! کیسے تشریف لائے۔ عرض کیا کچھ سوالات ہیں، جواب نہیں ملتا۔ سخت بے چینی ہے، حق کا پتہ نہیں چلتا۔ اطمینان قلب کی تلاش ہے، راستہ نہیں ملتا۔ فرمایا: سوال بیان کیجئے۔ عرض کیا: ایمان سے کیا مراد ہے۔ ارشاد فرمایا: حب الناصحین شرطِ ایمان ہے۔ ناصحین سے محبت ہو تو ایمان ہو گا، ورنہ دعویٰ جو بھی ہو، ایمان نہیں ہو سکتا۔ فرمایا: جب حضرت صالح علیہ السلام کی قوم پر عذاب نازل ہو گیا، تو آپ نے فرمایا: اے میری قوم! بے شک میں تمھیں ارشاداتِ ربیٰ پہنچاتا رہا، تمھیں نصیحت کرتا رہا۔ لیکن تمھیں حب الناصحین، ہی نہیں تھی۔ (القرآن، 7:79) عرض کیا: ایمان بالغیب سے کیا مراد ہے۔ فرمایا: یہ متقین کی پہلی صفت ہے، جن

کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ 'قرآنِ پاک کتابِ ہدایت ہے متقین کیلئے'، (القرآن، 2:2) عرض کیا: قرآنِ پاک کیوں کتابِ ہدایت ہے صرف متقین کیلئے! قرآنِ پاک کا نزول تو ہوا ہے سب زمانوں اور سب انسانوں کیلئے۔ فرمایا: ہر کام کیلئے کچھ کو لیٹنکیشن درکار ہوتی ہے۔ کتابِ ہدایت سے ہدایت یا ب ہونے کیلئے جن صفات کی ضرورت ہے وہ متقین میں پائی جاتی ہیں۔ اور ان میں سب سے پہلی صفت ہے، ایمان بالغیب۔ (القرآن، 3:2) متقی جس کی صداقت اور امانت کا اعتراف کر لیتے ہیں، اسکی الگی بات کو بلادِ لیل مانتے ہیں۔ یہ ایمان بالغیب ہے۔ ان لوگوں نے حضور ﷺ کو صادق اور امین مان لینے کے بعد آپ کی ہربات کے جواب میں یہی عرض کیا: اَمْتَأْدَ وَصَدَقَنَا۔ (ایمان لائے اور تصدیق کی)۔ مثلاً حضور نے فرمایا: لَا يَذْكُرُ اللَّهُ تَطْمِئْنَ الْقُلُوبُ۔ متقین نے حضور ﷺ سے ذکر کا طریقہ سیکھا اور جب انھیں اطمینان قلب عطا ہو گیا تو ان کا ایمان بالغیب ایمان بالشہادت میں تبدیل ہو گیا۔ حضور نے فرمایا: نماز برائی اور بے حیائی سے روکتی ہے۔ ماننے والوں نے مان لیا اور جب انکی زندگی میں یہ مقام آگیا، ان کا ایمان بالغیب، ایمان بالشہادت میں تبدیل ہو گیا۔ فرمایا: ایمان بالغیب پہلا درجہ ہے۔ یہ قول ہے، یہ ماننے کا مقام ہے۔ علم، عمل کے بعد عطا ہوتا ہے۔ ایمان بالشہادت، علم کا مقام ہے۔ ہم نے عرض کیا: تو پھر مشاہدہ کیا ہوتا ہے؟ فرمایا: صاحب مشاہدہ کیلئے مستقبل کو حال بنادیا جاتا ہے۔ مشاہدہ عطا ہو جائے تو اس سے ایمان میں رفت آتی ہے۔ لیکن مشاہدہ کبھی مقصود نہیں ہونا چاہئے۔ عرض کیا: تصوف کیا ہوتا ہے؟ فرمایا: 'تصوف'، 'غیر قرآنی لفظ' ہے۔ ہم تو یہ لفظ استعمال ہی نہیں کرتے۔ قرآنِ پاک کے کسی بھی مقام سے 'تصوف' یا 'صوفی' کا لفظ اخذ نہیں ہوتا۔ عرض کیا: ہم تو آپ کو صوفی سمجھ کر حاضر ہوئے ہیں۔ کیا مشہور بزرگ حضرت فضل شاہ، جن سے تصدیق عطا ہونے کے آپ دعویدار ہیں، جنکا ذکر اشراق احمد نے اپنی اکثر تحریروں یا ذرا ماموں میں 'نور والے بابا جی'، 'آئی بابا جی' کہہ کر کیا ہے، کبھی 'نور والوں کے ڈیرے' کا ذکر کیا ہے، کیا وہ صوفی بزرگ نہیں تھے؟ فرمایا: بات سند (اتھارٹی) کے ساتھ کی جائے تو اس سے فائدہ پہنچتا ہے۔ سند کا درجہ قرآنِ پاک کو حاصل ہے۔ بات قرآنِ پاک کے حوالے سے کی جائے تو سند ہوتی ہے۔ عرض کیا: سند کے حوالے سے تصوف کو کیا کہا جائے گا؟ فرمایا: قرآنِ پاک میں اللہ کے رسول ﷺ کو شاہد فرمایا گیا ہے۔ حضور ﷺ کو اللہ نے شاہد بننا کر سمجھا ہے۔ 'شاہد' کا مطلب ہے تصدیق کرنے والا، شہادت دینے والا۔ حضور ﷺ نے اپنے محبین میں سے جس جس کو تذکیرہ و تصدیق کے شرف سے نوازا، وہ مشہود سے شاہد کے مرتبے پر سرفراز ہو گئے۔ ان تصدیق یافتہ شاہدین نے

اپنے محین میں سے جس جس کو ترکیہ عطا فرمایا اور اسکی پاکیزگی کی تصدیق کی وہ بھی شاہدین میں شامل ہو گئے۔ یہ سلسلہ شاہدین ہے جسے عرف عام میں سلسلہ صوفیاء کہا جاتا ہے۔ عرض کیا: شاہدین کی خدمت میں حاضری کا مشنا کیا ہونا چاہئے! فرمایا: ایک صاحب کسی بزرگ کی خدمت میں حاضر ہونے کیلئے جارہے تھے، یہی سوال انھوں نے ہم سے پوچھا۔ ہم نے بتایا: عرض کرنا، جناب کیا آپ خواہش سے، خوف و حزن سے پاک ہیں! اگر جواب ہاں میں ہو تو عرض کرنا: جناب! کیا آپ خواہش سے، خوف و حزن سے پاک کرنے کا محکم علم رکھتے ہیں! اگر جواب ہاں میں ہو تو عرض کرنا: جناب مجھے بھی خواہش سے، خوف و حزن سے پاک کر دیجئے۔ عرض کیا: جناب آپ خواہش، اور خوف و حزن سے پاک ہیں۔ فرمایا: ہمارے شاہد نے یہ شرف ہمیں عطا فرمایا ہے۔ عرض کیا: جناب خواہش، اور خوف و حزن سے پاک کرنے کا محکم علم رکھتے ہیں! فرمایا: جسے پاک کیا جاتا ہے اسے پاک کرنے کا علم بھی عطا فرمایا جاتا ہے۔ ہم نے عرض کیا: ہم بھی اسی مقصد کیلئے حاضر ہوئے ہیں، ہمیں بھی خواہش سے، خوف و حزن سے پاک فرمادیجئے۔ فرمایا: ذکر، ہم آپ کو بتاتے ہیں، آپ اس پر عمل کریں، آپ کو پتہ چل جائے گا۔ عرض کیا: کتابوں میں ایسے بہت سے واقعات لکھے ہوئے ہیں کہ فلاں شخص کسی بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا، بزرگ نے ان پر نظر کی، اور وہ بالکل بدل گیا۔ مہربانی فرمائے آپ بھی کوئی ایسی نظر فرمادیجئے۔ فرمایا: کبھی کبھی کوئی شخص کسی بزرگ کی خدمت میں اس حال میں حاضر ہوتا ہے کہ زمین تیار ہو چکی ہوتی ہے، بس خیر کا نقش بونا بیکی ہوتا ہے، وہ بودیا جاتا ہے، کام ہو جاتا ہے۔ اسے ‘نظر کرنا’ کہتے ہیں۔ اگر اس حال میں نظر کر دی جائے کہ زمین ابھی تیار نہ ہو، تو وہ بندہ ابتدا مل ہو جاتا ہے۔ (آپ نے پنجابی میں فرمایا: خصیت نوں چب پے جانے تیں۔) وہ بندہ اپنے حقوق ادا کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ ایسا کرنے میں کوئی عقلمندی نہیں۔ نظر کرنے والے سے پوچھ ہو گی۔ یہ بھی فرمایا: جو علم سینہ بسینہ عطا ہوتا ہے، وہ آگے اسی طرح عطا کیا جاتا ہے۔ آپ استاد ہیں۔ آپ کو علم اس طرح عطا فرمایا جانا چاہئے جسے آگے پھیلایا جانا ممکن ہو، اور آسان ہو۔ فرمایا: آپ کو جو ذکر، بتایا گیا ہے اس پر عمل کریں، مقصد پورانہ ہو تو ہم ذمہ دار۔ ایک مدت سے جن سوالوں کے جواب کی تلاش تھی، احساس ہوا کہ ان میں سے کچھ سوالوں کا جواب آج پہلی بار ملا ہے اور اس طرح ملا ہے کہ کہیں دل اور دماغ کے اندر ارتاتا چلا گیا ہے۔ دل میں یہ عہد کیا کہ ایک سال تک اُنکی پات پر عمل کر کے ضرور دیکھنا ہے، اگر گیارہ ماہ میں بھی کوئی فائدہ نہ ہو تو بھی بارہ ماہ پورے کر کے ہی بات کریں گے۔ اس احساس کے ساتھ اجازت لیکر رخصت ہوئے۔ چند ہی ماہ میں یقین ہو گیا کہ بے چینی رخصت ہو

رہی ہے، سوالوں کے ایسے جواب عنایت فرمائے جا رہے ہیں جو سند کے ساتھ ہوتے ہیں اور پھر شک کا مقام نہیں رہتا۔ ہم نے یہ حال اس لئے بیان کیا ہے کہ پتہ چلے سند کے سات بات کرنے کا کیا طریقہ ہے۔ من مانی اصطلاحات بنالینے اور قیاس آرائی سے کبھی حق کا علم عطا نہیں ہو سکتا۔

بعض لوگ 'احسان' کو ماننے کے درجے سے تعمیر نہیں کرتے بلکہ حسن عمل کے معنی میں لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عرف عام میں جسے صوفی کہا جاتا ہے وہ حسن عمل کے مقام پر ہوتا ہے۔<sup>30</sup> شاہدین یقیناً حسن عمل کا نمونہ ہوتے ہیں اور اپنے پیروؤں کو اس کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ لیکن حسن قول کے بغیر تو حسن عمل کا مقام آہی نہیں سکتا اور بندے کے ذمے تو یہی ہے کہ وہ اپنے قول کو سدید بنائے، اعمال کو صالح بنانے کا وعدہ تو اللہ کا ہے۔ فرمان الہی ہے: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور قول سدید میں بات کرو۔ ہم تمہارے اعمال کی اصلاح کر دیں گے اور تمہارے گناہ معاف کر دیں گے۔... (33:70-71) بات قول کی پاکیزگی سے شروع ہوتی ہے۔ قول (عقیدہ، اصول، نظریہ، تصور، اصطلاح) حق کے مطابق ہو تو سدید ہوتا ہے۔ حضرت فضل شاہ نے اس کی طریقت یوں بیان فرمائی ہے کہ جسے تذکیرہ مطلوب ہوا سے شاہدین میں سے جس کی خدمت میں حاضری کا شرف ہو وہاں میں جوں رکھے۔ محض میں جوں سے اس کا قول پاک ہونا شروع ہو جائے گا۔ جیسے جیسے قول کے پاک ہونے کا احساس برہتتا ہے، شاہد کے ساتھ محبت محسوس ہونے لگتی ہے اور بندہ اپنے اعمال میں اس کا اتباع کرنے لگتا ہے۔ شاہد کے اعمال صالح ہوتے ہیں، وہ حسن عمل کے مقام پر ہوتا ہے، اس لئے پیروی کرنے والے کے اعمال صالح ہوتے جاتے ہیں۔ صالح اعمال ہی احسن ہوتے ہیں۔ عمل کے بعد حاصل ہونے والی کیفیت کا نام علم ہے۔ علم، عمل کے بعد عطا ہوتا ہے۔ (Knowledge is post-experience.) قول، عمل، تینوں مقامات پر اپنے شاہد کے اتباع میں پورا رہتا ہے اسے معرفت سے بطور انعام نواز دیا جاتا ہے۔ تصوف کو محض حسن عمل کا درجہ قرار دینے والے قول کو سدید بنانے کے اپنے حق کو بھول جاتے ہیں۔ قول، عمل، اور علم کے مقامات پر اپنے شاہد کے اتباع میں پورا رہنا انہیں یاد نہیں رہتا۔ معرفت کے مقام کی ان کے نظام فکر میں کہیں جگہ ہی نہیں بنتی۔ جس کا کوئی شاہد ہی نہ ہو وہ حسن عمل اور اسکی تصدیق کے مقام پر فائز ہو ہی کیسے سکتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے: اے ایمان والو! وہ کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں۔ اللہ کے نزدیک بڑی بیزاری کی بات ہے کہ تم وہ کہو جو تم کرتے نہیں۔ (القرآن، 61:2-3) درج بالا نظریہ، ایمان کو 'ماننے' کے درجوں میں دوسرے نمبر پر رکھتا ہے۔ قرآن پاک مومن

کے درج ذیل نو مقامات بیان کرتا ہے: توبہ، عبادت، حمد، صوم، رکوع، سجدہ، امر بالمعروف، نهى عن المنکر، حفاظت لی حدود اللہ۔ (القرآن، ۹: ۱۱۲) اگر احسان، ایمان سے برتر کوئی درجہ ہے تو اس نظر یہ کے ماننے والوں کو قرآن پاک کی سند کے ساتھ بتانا چاہئے کہ وہ کون سے اضافی مقامات ہیں جو مومن کے مقامات میں شامل نہیں مگر محسین کے مقامات میں شامل ہیں۔

سلسلہ شاہدین میں ہر شاہد ایک ادارہ ہوتا ہے۔ ایک صاحب کو مرشد مانا جاتا ہے، دیگر لوگ معتقد ہوتے ہیں۔ مرشد مزکی ہوتا ہے، خوف و حزن سے پاک ہوتا ہے، اور خوف و حزن سے پاک کرنے کا محکم علم رکھتا ہے۔ تزکیہ کے طالب اس سے میل جوں رکھتے ہیں، اسکی اطاعت اور اتباع کو اپنا حال بناتے ہیں۔ جسے کامل تزکیہ عطا ہوتا ہے اور اسکی تصدیق کر دی جاتی ہے، اسے شاہدین میں سے ہونے کا شرف عطا ہو جاتا ہے۔ کسی کو وضو کر ادیا جاتا ہے، دائی پاک دامت اس کا حال ہو جاتی ہے، اور وہ مخلصین کی صف میں شمار ہو جاتا ہے۔ مخلصین وہ لوگ ہوتے ہیں جن پر شیطان کا اغوا ممکن نہیں۔ مرشد کو اللہ کا دوست ہونے کا شرف ہو تا ہے۔ اللہ اپنے دوستوں کو ظلمات سے نور کی طرف کالتا ہے۔ جوان کی خدمت میں ادب اور محبت سے حاضر ہوتا ہے، اسے کچھ بھی نہ آتا ہو، اس کا رخ ظلمات سے نور کی طرف ہو جاتا ہے۔ وہ نور والوں میں سے ہو جاتا ہے۔ ایک آدمی حضرت فضل شاہ قطب عالمؒ کے ذیرہ پاک ادارہ قادر یہ نور والوں کا ذیرہ، پر حاضر ہوا۔ پیر صاحب نے اسے دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: 'اونور والے!'، حضور پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے وہ بیت الخلاء گیا اور بہت جلد باہر آگیا۔ ایک صاحب نے عرض کیا: حضور! لگتا نہیں کہ اسے ٹھیک طہارت کرنا بھی آتا ہو، اور حضور فرمادی ہے ہیں 'اونور والے!'۔ حضرت فضل شاہؒ نے فرمایا: بیٹا! ہم اللہ کے دوست ہیں نا۔ ' عرض کیا: بھی! حضور اللہ کے دوست ہیں۔ ' فرمایا: 'ہم نور والے ہیں نا۔ ' عرض کیا: بھی! حضور نور والے ہیں۔ ' فرمایا: یہ نور والوں کے پاس آیا ہے۔ اس کا رخ نور والوں کی طرف ہے۔ یہ نور والا ہے۔ ' فرمایا: بیٹا! اگر اس کو طہارت کرنا نہیں آتا، تو آجائے گا۔ ' کیا احسان، کو حسن عمل کے متراود قرار دیکر اس ادارے کے مأخذ اور نوعیت کی تشریح کی جاسکتی ہے! ہرگز نہیں۔ شاہدین نور والے، ہوتے ہیں۔ 'نور والا' پہلے بناتے ہیں، حسن عمل سکھانے کی باری بعد میں آتی ہے۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ بندہ اپنا تزکیہ آپ کر سکتا ہے (تزکیہ نفس، ۹۵-۱۱۳)۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک ایسے رسول کے بھیج جانے کیلئے دعا کرنے کی کیا ضرورت تھی جو لوگوں کو تزکیہ

عطائے کرے۔ اسی طرح بعض رسول کا مقدمہ بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی کیا ضرورت تھی کہ آپ لوگوں کو پاک کرتے ہیں (القرآن، 151: 129)۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ رسول ﷺ نے نماز، روزہ، و دیگر فرض اور نوافل عبادات اور ذکر اذکار کا طریقہ سکھا دیا ہے، اور اسی طرح سے آپ ﷺ تزکیہ عطا فرماتے تھے، یہ تمام چیزیں قرآن پاک اور احادیث میں محفوظ ہیں۔ جو بندہ اپنا تزکیہ کرنا چاہے وہ ان تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر ایسا کر سکتا ہے۔ تفسیر فاضلی اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ قرآن پاک میں کہیں بھی مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنا تزکیہ خود کریں، یا وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ اللہ کی طرف رجوع لانے والے کسی شخص کا حال پر اتباع کئے بغیر اگر کوئی شخص بزم خود تزکیہ یافتہ ہونے کا دعویٰ دار بن بیٹھے تو اس کے دعویٰ کی قدریق کون کرے گا۔ اگر ایسا شخص از خود اپنے آپ کو شاہد کے مقام پر فائز کر لے تو اسکی قدریق کی حیثیت کیا ہو گی! کتاب اگر ”معلم“ کا فریضہ سر انجام دے سکتی تو پھر انبیاء کرام کے مبعوث کئے جانے کی ضرورت کیا ہو سکتی تھی۔ جو ”کتاب“ کو ”صاحب کتاب“ کی جگہ دیتا ہے وہ اپنے علاوہ کسی کو نہیں مانتا۔ یہ حضور ﷺ کی شان ہے کہ اللہ نے انہیں معلم کتاب و حکمت بنائے بھیجا ہے (القرآن، 3: 164; 151: 2) ارشادِ ربانی ہے: ”جبیسا کہ ہم نے تم میں، تمھیں میں سے ایک رسول بھیجا، کہ تم پر ہماری آیات تلاوت فرماتا ہے، اور تمھیں پاک کرتا ہے، اور تمھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور تمھیں وہ تعلیم دیتا ہے جس کا تمھیں علم نہ تھا۔“ (القرآن، 151: 2) حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بیت اللہ کی بنیادیں اٹھاتے وقت دعا کی تھی ”اے ہمارے رب! ان میں ایک رسول مبعوث فرماجو ان پر تیری آیات تلاوت فرمائے، اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور انھیں پاک کرے۔ بے شک اللہ عزت والا حکمت والا ہے۔“ (القرآن، 129: 2) دعا کو شرف قبولیت بخشنا گیا، اور حضور اکرم ﷺ ہی آپ کی دعا کا حاصل ہوئے اس طرح کہ تلاوت آیات کے بعد حضور نبی پاک ﷺ کی بارگاہ سے تزکیہ پہلے عطا ہوتا ہے کتاب و حکمت کی تعلیم سے۔ حضرت ملک شمس الدین قادری فاضلی صاحب نے فرمایا کہ پہلی امتوں میں طریقہ یہ تھا کہ تزکیہ بعد میں عطا ہوتا تھا تعلیم کتاب و حکمت کے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اس کے مطابق تھی۔ لیکن امت محمدیہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے معاملہ یہ رکھا ہے کہ یہاں تزکیہ پہلے عطا ہوتا ہے، تعلیم کتاب و حکمت سے۔ اور جسے تزکیہ عطا ہو جاتا ہے، کتاب و حکمت طواف کرتے ہیں اس کے گرد۔ جن کی اصلاح مقصود ہو، معیار ان کے سامنے ہے و قتنی موجود رہنا چاہیے۔ حکم اللہ تعالیٰ کا ہو، نمونہ اسکا محبوب ہو۔

کتاب کی تعلیم یہ ہے کہ احکام خداوندی کی بجا آوری واضح ہو۔ حکمت کی تعلیم یہ ہے کہ اشیاء کو ان کے صحیح مقام پر رکھنے کا علم عطا ہو۔ یہ علم پہلے نہیں تھا کسی کو، کہ خلاف حق کرنے والے کی لاعلمی پر شہادت دینے سے اس کا بچاؤ ہو جاتا ہے۔ اس سے معافی کا دروازہ کھل جاتا ہے، اور دیر چاہے لگ جائے، رحمت کی شاخ اس سے پھوٹتی ضرور ہے۔ جسے اللہ کے محبوب کا عرفان ہو جائے اسکی بسم اللہ عمل سے ہوتی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے: ”بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنین پر احسان فرمایا جب انھیں میں سے رسول مبعوث فرمایا۔ ان پر اسکی آیات تلاوت فرماتا ہے، اور انہیں تزکیہ عطا کرتا ہے، اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور اس سے قبل وہ یقیناً گمراہی میں تھے۔“ (القرآن، 16:3) اس آیت مبارکہ کی تفسیر کے ضمن میں ارشاد ہے: ”مومنین پر اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ وہ ایّی تھے اور ان میں مبعوث ہونے والا رسول بھی ایّی ہے۔ اس میں تمام مشکلات کا حل رکھا گیا ہے، جو بھی مومنین کو پیش آسکتی تھیں یا آسکتی ہیں۔ حضور ﷺ سے فیض جس قدر آسانی کے ساتھ محبین کو حاصل ہوا اس سے بڑا کوئی معیار ہو نہیں سکتا۔ آپ نے لوگوں پر اللہ کی آیات تلاوت فرمائیں۔ انہیں تزکیہ کی نعمت سے نوازا کہ پاک ہو تو فلاح ہوتی ہے۔ انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دی۔ فرمان کا علم اور فرمان سے استفادہ کرنے کی طریقت روشن فرمائی۔ اس سے قبل جو کچھ بھی کیا جاتا تھا، انسانی تجویز سے تعلق رکھتا تھا۔ انسانی تجویز گمراہی ہی پیدا کرتی ہے۔ حضور ﷺ نے جو کچھ کیا علم الہی سے کیا۔ حکم کی تلاوت، تزکیہ اور کتاب و حکمت کی تعلیم شاہدین جاری رکھتے ہیں۔“

## شہید اور شاہد

نبی کی شان علم الہی کی خبر دینا ہے۔ اور خاتم النبیین کے بعد نبی کی بعثت کا محل ہی موجود نہیں۔ صدقین اور شہداء کے بارے میں سورہ الحدید میں ارشاد ہے: ”اور وہ لوگ جو اللہ اور اسکے رسول پر ایمان لائے، وہ اپنے رب کے نزدیک صدقیق اور شہداء ہیں۔ ان کیلئے ان کا اجر اور نور ہے۔ اور وہ جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کی یکنذیب کی وہی دوزخی ہیں۔“ (القرآن، 19:58) شہید کے بارے میں سورہ الحفل میں ارشاد ہے: ”اور جس دن ہم ہرامت میں سے شہید مبعوث فرمائیں گے کہ ان پر گواہی دیں اور آپ کو ان سب پر شہید ٹھہرائیں گے۔ اور ہم نے آپ پر یہ کتاب نازل فرمائی کہ اس میں ہر شے کا بیان ہے، اور مسلمین کیلئے ہدایت و رحمت اور بشارت ہے۔“ (القرآن، 19:16) تفسیر فاضلی کے مطابق صدقیق کی شان یہ ہے کہ وہ شاہد کے ارشاد کو سنے اور مانے، اور اس کا کوئی عمل شاہد کی تصدیق سے خالی نہ ہو۔ صدقیق وہ ہوتا ہے جسے اپنا کوئی

کام نہ رہے۔ وہ خدمتِ خلق کو ہمیشہ سعادت جانتا ہے۔ شہید کی شان یہ ہے کہ وہ باوضحو ہو، اور اموال اور نفس کو رضاۓ الہی کیلئے وقف کر دے۔ شہداء وہ لوگ ہیں جو نورِ معرفت کو پھیلاتے ہیں۔ لوگوں کو ظلمات سے نور کی طرف لاتے ہیں۔ سورہ الحلق 19:16 کے مطابق شہید شاہد ہوتا ہے۔ ہرامت میں سے شہید (گواہی دینے والا) یہ گواہی دے گا کہ اس نے اللہ کے فرمان کو ان لوگوں تک پہنچایا جن کی طرف اسے مبوعث فرمایا گیا تھا۔ اس نے وہ نمونہ عمل اسکے سامنے رکھا جو خوف و حزن سے نجات کی حمانت دینا تھا اور اس نے اتمامِ جھٹ میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ انبیاء سابقین کی شہادت کے بعد خاتم النبیین کی شہادت سے گواہی کا کام پورا ہو جائے گا۔ حضور اکرم ﷺ کے بعد آپ کا اتباع کرنے والے قیامت تک شاہدین کی صورت سے آپ کے اسوہ حسنی کو روشن کرتے رہیں گے تاکہ لوگوں کو نظر آتا رہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور فلاح کے حصول کے لئے انھیں کیا کرنا چاہئے۔ سورہ الحمدید کی محولہ بالا آیت کریمہ کے مطابق، اللہ اور اسکے رسول کے ماننے والوں میں سب سے بہتر ماننے والے صدقیت ہیں اور شہداء ہیں۔ ان لوگوں کیلئے ان کے رب کی بے پایاں عنایات ہیں اور نور ہے۔ صالح کی شان یہ ہے کہ لوگ اس کے قرب کی توری سے اپنی اصلاح کریں اور عافیت حاصل کریں۔ صالحین کے بارے میں ارشاد ہے: مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ اُنْثَى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَئِنْحِيَّتَهُ حَيَاةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَّتْهُمْ أَجْرُهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَلُُوا يَعْمَلُونَ ﴿١﴾ ”جس نے صالح عمل کیا، مرد ہو یا عورت، اور ہو مومن، تو ہم اس کو حیات طیبہ سے زندہ رکھیں گے اور ان کے خوب کاموں کا جو وہ کرتے تھے، اجر دیں گے۔“ (القرآن، 16:97) صالح عمل وہ ہوتا ہے جو شاہدین کی طریقت کے مطابق کیا جائے۔ صالح عمل کرنے والے مومن کو اس کے عمل کی جزا کے طور پر حیات طیبہ سے زندہ رکھا جاتا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ مقامِ موت کے بعد ہی آئے۔ یہ مقام انھیں حیات دنیا میں ہی عطا ہو جاتا ہے لیکن موت کے مقام سے سلامتی کے ساتھ گزار دئے جانے کے بعد پاکیزگی کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے کوئی خطرہ نہیں رہتا۔ اس حیات طیبہ کی کیفیت کو جزا عطا کرنے والا تو جانتا ہی ہے اور جزا اپانے والا بھی جانتا ہے، کسی اور کو اس حیات طیبہ کا شعور تبھی ہو سکتا ہے جب اللہ اسے اس کیفیت کے تجربے سے نوازنا چاہے۔ وہ بھی اس حد تک ہی جان سکتا ہے جس حد تک اللہ چاہے۔ صدقین کا درجہ شہداء اور صالحین دونوں سے بڑا ہوتا ہے۔ حضرت بنی مریم علیہما السلام کے بارے میں ارشاد ہے کہ آپ صدقیقہ تھیں۔ (القرآن، 16:97, 75) حضرت ابو بکرؓ کے صدقیق ہونے کی تصدیق حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمائی۔ حضرت عائشہ صدقیقہ رضی اللہ عنہا بھی شرف

صدقیت سے بہرہ در تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ کیسے ابھرے رفتیں ہیں۔ اچھار فتن وہ ہوتا ہے جس کا قول، عمل، اخلاص رضائے الہی کیلئے ہو۔ (القرآن، 69:4) قرآن پاک میں ارشاد ہے:

”جو اللہ کی راہ میں قربان ہو جائیں انہیں مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں، ولیکن تمھیں شعور نہیں۔“ (القرآن، 154:2)

”جو اللہ کی راہ میں مارے جائیں انہیں مردہ مت جانو، وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس سے رزق پاتے ہیں۔ خوش ہیں اس پر جو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے فضل سے عطا فرمایا ہے۔ اور خوشیاں منا رہے ہیں پچھلوں کی، جو ابھی ان سے نہیں ملے۔ ان پر نہ خوف ہے اور نہ وہ محروم ہو گے۔ اللہ کی نعمت اور فضل کی بشارت دیتے ہیں اور یہ کہ اللہ مومنین کا اجر ضائع نہیں کرتا۔“ (القرآن، 171:3-169:3)

یہ لوگ نبی پاک کے قدموں پر جان ثنا رکر کے مرتبہ شہادت سے سرفراز ہوتے ہیں۔ اللہ کی بارگاہ سے انھیں حیات طیبہ سے اور انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ لیکن یہ شاہد نہیں ہوتے۔ شہید، صدیق اور نبی شاہدین ہوتے ہیں۔ ارشاد ہے: ”ہم نے آپ کو شاہد بن کے بھیجا، بشارت دینے والے اور انذار کرنے والے۔“ (القرآن، 45:33) کیا یہ ممکن ہے کہ نبی پاک کے قدموں پر ثنا رہو جانے والا تابدی زندگی پالے، آپ ﷺ کی اطاعت کرنے والے صالحین کو تو اللہ حیات طیبہ سے زندہ رکھے اور شاہدین اور صدیقین کو حیات طیبہ سے زندہ رکھا جانا عطا نہ ہو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ نبیین علیہم السلام جو مقام اور مرتبے میں اللہ کی راہ میں جان قربان کرنے والوں سے، اور صالحین، شہداء (شاہدین) اور صدیقین سب سے بہت بلند ہوتے ہیں، موت کے مقام سے گزارے جانے کے بعد ابدی حیات طیبہ سے نوازے نہ جائیں! اللہ تعالیٰ شہادت دے رہا ہے کہ تمھیں اللہ کی راہ میں جان ثنا رکرنے والے حیات طیبہ کا شعور نہیں۔ نبی کی شان تو اتنی بلند ہے کہ وہ غیر نبی کے فہم و ادراک میں آہی نہیں سکتی، تو اس حیات طیبہ کا شعور کیسے ممکن ہے جس سے بعد از وصال انبیاء علیہم السلام کو نوازا جاتا ہے۔ انبیاء کرام، صدیقین، شہداء اور صالحین اپنے وصال کے بعد بھی حیات طیبہ سے زندہ ہوتے ہیں۔ ان کے مزارات پر ادب اور محبت کے اظہار کیلئے حاضر ہونا، زائر کو فائدہ دیتا ہے۔ جس طرح شہید موت کے مقام سے گزرنے کے بعد اتنا پاک ہو جاتا ہے کہ اسکی پاکیزگی کو کوئی مخطہ لا جو نہیں رہتا۔ اسی طرح دیگر پاک لوگ بھی وصال کے مقام سے گزرنے کے بعد ابدی حیات طیبہ کو پالیتے ہیں۔ رزق عطا فرمایا جانا اور متحرک ہونا حیات کی صفت ہے۔ یہ علم الہی سے متحرک رہتے ہیں۔ اپنی شان کے مطابق انہیں اختیار سے نواز دیا جاتا ہے۔ وہ طالبین کی رہنمائی کرتے ہیں، انھیں دنیاوی اور اخروی خیر و برکات سے بھی نوازتے ہیں، ان کیلئے دعا کرتے ہیں۔ حضور حضرت علی ہجویری المعروف حضرت داتا نجح

بخش رحمت اللہ علیہ جن کے وصال کو کم و بیش ایک ہزار سال ہو چکے ہیں کے بارے میں حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ کا یہ شعر بالکل حسب حال ہے۔

ناقصاں را پیر کامل، کاملاں را رہنا  
کنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا

## حال اور صاحب حال

اگرچہ صاحب حال کو فیض انہیں حضرات کی منظوری سے جتاب نبی ﷺ کریم ﷺ کی بارگاہ سے عطا ہوتا ہے جیسا کہ حضرت فضل شاہ قطب عالمؒ کو سلسلہ قادریہ میں فاضل قادری فخر کا شرف حضور نبی ﷺ کریم ﷺ کی بارگاہ سے حضور حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے دست مبارک سے عطا ہوا، لیکن تفسیر فاضلی کے مطابق شاہد ہونا صرف صاحب حال کا درجہ ہے۔ صاحب مزار اس مقام سے سلامتی سے گذارا جا چکا ہوتا ہے۔ تصدیق عطا فرمانے کا حق صرف صاحب حال کو ہوتا ہے۔ حضرت فضل شاہؒ نے اس بات کو کیا خوبصورت انداز میں بیان فرمایا ہے: ”حال، حال پر عطا ہوتا ہے اور صاحب حال سے عطا ہوتا ہے (تفسیر فاضلی منزل اول، د)۔“ کیا صاحب حال کی معیت اختیار کئے بغیر یہ ممکن ہے! ہرگز نہیں۔ ایک پنجابی شاعر بابا سترہ نے اس بات کو اپنے ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے:

مویاں دیاں مُنْذُھِریاں تے جو ندیاں نال رکھن ویر اپنہنیں کمیں ستر یا کدی نہیں ہندی خیر  
اگرچہ بابا سترہ امارات کے زائرین پر صاحبانِ حال کا ادب کرنے، ان سے راہنمائی لینے، ان سے رجوع کرنے کی اہمیت واضح کرنا چاہتا ہے، لیکن الفاظ نہایت کھرد رے ہیں۔ شاہدین کے مزارات کو، ابدی حیات طیبہ سے نوازے ہوؤں کے مزارات کو ”مویاں دیاں ڈھیریاں“ کہنا بہت ہی نامناسب ہے۔ آئیے دیکھتے ہیں قرآن پاک میں مزارات پر حاضری کا جواز کہاں ہے۔ قرآن پاک میں حضور ﷺ سے فرمایا گیا ہے کہ ”آئندہ آپ کسی منافق کی قبر پر نہ کھڑے ہوں، اور نہ ہی اس کے لئے دعا کریں۔“ (القرآن، ۹:۷۹)  
۸۰ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قبروں پر کھڑے ہونا اور اہل قبور کی مغفرت اور بلندی اور درجات کے لئے دعا کرنا حضور نبی پاک ﷺ کا طریقہ تھا اور آپ کو صرف منافق کی قبر پر کھڑے ہونے اور دعا کرنے سے منع فرمایا گیا۔ انبیاء کرام، صدیقین، شہداء اور صالحین وہ پاک ہستیاں ہوتی ہیں جن کی قبر پر کھڑے ہونے اور ادب اور محبت کا اظہار کرنے سے زائر کو فائدہ ہوتا ہے۔

## برائی سے کراہت اللہ کو پسند، برے سے کراہت ناپسند

سیدنا حضرت یونس علیہ السلام کے مرسلین سے ہونے کی سند قرآن پاک میں ہے۔ (القرآن، 37:139)

اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق بڑی حکمت کے ساتھ قوم کو تبیغ حق کرتے ہوئے حضرت یونس علیہ السلام پر ایک مقام ایسا آیا جب قوم نے ماننے سے انکار کیا اور انکار کی حد کر دی۔ حضرت یونس علیہ السلام نے قوم کی جہالت دیکھ لی اور حال پر اللہ کے حکم کا انتظار کئے بغیر ان سے دور ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کو آپ کی یہ عجلت ناپسند گذری۔ برائی سے کراہت درست، لیکن برے سے کراہت کرنا اللہ کو قطعاً ناپسند ہے۔ مرسلین سے گناہ کے ارتکاب یا نافرمانی کا تو تصور بھی محال ہے، لیکن بھول ہو جائے تو بھی اللہ کی کپڑا آسکتی ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے: ”اوْرَذُوا النُّونَ جَبْ غَضْبٍ سَبَبَ بَهْرَءَ چَلَّهُ تَوْمَانَ كَيَا كَهْ هَمَ انْ پَرْ كَوَيَّ تَكَنِي نَدَرَ كَهِيْسَ گَهْ۔ پَھَرَ ظَلَمَاتٍ مِّنْ نَدَادِيْ تَيَرَ سَوَا كَوَيَّ مَعْبُودَ نَيَيَنَ۔ تَجْهِيْهَ پَاكِيْ ہَے۔ بَے شَكَ مِنْ قَصْوَرَ وَارَ ہُوَ۔“ (القرآن، 21:88)

پھر ارشاد ہے: ”پَھَرَ مَجْھُلِيْ نَے آپَ كَوَنَگَلَ لِيَا اور آپَ غَمَ زَدَهَ تَھَه۔ توَّاَگَرَ آپَ تَسْتَقِيْحَ كَرْنَے والَّوْنَ سَے نَهَ ہُوتَے، توَّيَمَ بَعْثَتْ كَيِّسَيَ كَهْ بَطَنَ مِنْ رَبَتَتَے۔“ (القرآن، 44:142)

اللہ کا بھیجا ہوا اسکی مخلوق سے کراہت کا اظہار کرے اور انھیں چھوڑنے میں اسقدر عجلت کرے کہ اللہ کے حکم کا انتظار بھی نہ کرے، اللہ کو یہ سخت ناپسند ہوا۔ چنانچہ ارشاد ہوا: ”صَاحِبُ حَوْتٍ كَيِّ طَرَحَ نَهَ هُونَ۔ جَبْ آپَ نَے اپَنَے رَبَتَ كَوَپَكَارَا اور آپَ غَمْگَيِنَ تَھَه۔ اگر تَمَحَّارَے رَبَتَ كَيِّ نَعْمَتَ اسَ کَے تَدارَكَ كَوَنَهَ پَڪْنَچَتِيْ تَوَوَهَ مَيَدَ انَ مِنْ مَذَمَتَ كَتَنَ پَڑَے رَهَ جَاتَے۔ توَّآپَ كَوَآپَ کَے رَبَتَ نَے نَوازَا اور پَھَرَ صَالِحِينَ سَے ٹَھَبَرَ ایَا۔ مرسلین یقیناً شاہدِین ہُوتَے ہیں۔ جو بَاتِ مرسلین کَے بَارَے مِنْ تَحْجِيْهَ ہے وہ غیر نبی شاہدِین کَے بَارَے مِنْ بَھِيْ یقیناً درست ہے۔ حضرت فضل شاہ قطبِ عالم رحمت اللہ علیہ کا ارشاد گرائی ہے: ”مِبْتَدِيَ كَيِّ اپَنِي حَفَاظَتَ كَا تَقَاضَاهَ كَه وَه لوَگُونَ سَے دَورَ رَهَ۔ مُتَهَّيِ اگر لوَگُونَ سَے کراہت کرے تو اس پر اللہ کی عطا کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔“ شاہدِین لوگوں کی بیقداری قطعاً نہیں کرتے۔ برائی سے نفرت درست، برے سے نفرت غیر درست ہے۔ بھول ہو جائے تو اللہ معاف کر دیتا ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام کی بھول ان کی قوم کیلئے بھول بن گئی اور اس سے قیامت تک کلینے معافی کا ایک دروازہ کھل گیا۔

## اللہ کے نور کی تمثیل

اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ کبھی کبھی کوئی شخص کسی بزرگ کی خدمت میں اس حال میں حاضر ہوتا ہے کہ زمین تیار ہو چکی ہوتی ہے، بس خیر کافی بوناباتی ہوتا ہے، وہ بودیا جاتا ہے، کام ہو جاتا ہے۔ اسے نظر کرنا کہتے ہیں۔ قرآن پاک کی ایک تمثیل کی روشنی میں اس بات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

اللہ سے آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس نور کی مثال ایک طاق ہے جس میں چراغ ہو۔ وہ چراغ ایک شیشے میں ہے۔ وہ شیشہ ہے جیسے ایک تارہ چمکتا ہو۔ تیل جلتا ہے اس میں شحر مبارک کا، وہ زیتون ہے۔ نہ شرقی ہے، نہ غربی ہے۔ قریب ہے کہ اسکا تیل روشن ہو جائے اگرچہ اسے آگ نے مس نہ کیا ہو۔ نور علی نور ہے۔ اللہ اپنے نور کی راہ دکھلاتا ہے جس کو چاہے، اور اللہ لوگوں کے واسطے مثالیں بیان فرماتا ہے، اور اللہ ہر شے کا علم رکھتا ہے۔ (سورہ النور، 24:35)

اللَّهُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَ مَثَلُ نُورٍ يَهُ  
كَوْشَكَةٌ فِيهَا مِضَاحٌ الْمِضَاحُ فِي رُجَاجَةٍ  
الرُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُوقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ  
مُبَارِكَةٌ رَبِّيُونَةٌ لَا شَرْقِيَّةٌ وَلَا غَرْبِيَّةٌ لِيَكَادُ زَيْنُهَا  
يُضْيِي مُؤْلِمَتَ مَنْسَسَةً نَازِعًا طُورٌ عَلَى نُورٍ طَيْهَدِي  
اللَّهُ لَوْبِرِكِ مَنْ يَشَاءُ طَ وَيَصْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ  
لِلَّئَامِ طَ وَاللَّهُ يُغْلِلُ شَيْءًا عَلَيْمٌ

”آسمانوں اور زمین میں جو کچھ منور ہے، وہ اللہ کے نور ہے۔ کسی مقام پر اگر نور معرفت کو اللہ کے سوامیں دیکھا جائے گا تو شرک ہو جائے گا اور شرک ظلم عظیم ہے۔“ نور الہی کی مثال اس طرح بیان فرمائی گئی ہے، ”کہ ایک طاق ہے جس میں چراغ ہے۔ طاق وہ محفوظ مقام ہے جس میں چراغ رکھا ہو۔ پھر چراغ ایک شیشے میں ہے جو بالکل صاف ہے۔ اس میں کوئی سیاہی نہیں کہ روشنی کے پھیلنے میں حائل ہو۔ یہ شیشہ روشنی کو پھیلانے کا باعث بتا ہے۔ یہ مومن کا قلب ہے۔ چراغ میں جو تیل جلتا ہے وہ زیتون کا مبارک تیل ہے جو شفاف ہوتا ہے۔ سورج کی شعاعوں میں پہلے پھر اور پچھلے پھر کا جو فرق ہوتا ہے، وہ اس مقام پر نہیں ہوتا جو مقام باغ کے درمیان میں ہو۔ جو تیل ایسے شحر مبارک سے حاصل ہو، وہ انتہائی شفاف ہوتا ہے اور روشنی کو قبول کرنے کی اعلیٰ استعداد رکھتا ہے۔ یہ تیل جب جلتا ہے تو نور علی نور کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اللہ اپنے نور کی راہ دکھاتا ہے تو یہ راہ ملتی ہے اور اسے ہی ملتی ہے جس کو اللہ دکھائے۔ اللہ لوگوں کیلئے مثالیں بیان فرمائے اس نور بہادیت کی طلب کو واضح کرتا ہے، اور اللہ کو ہر شے کا علم ہے۔

حاصل: حصول علم کی طلب رکھنے والے کو آسمانوں اور زمین میں ہر مقام پر نور سے واسطہ پڑتا ہے۔ اللہ کا نور، نور حقیقی ہے باقی سب نور اسکی بدولت ہیں۔ نور بہادیت کو محفوظ مقام پر ہونا چاہیے، شیشے کی طرح صاف اور روشن دل میں ہونا چاہیے۔ حق کو ماننے کی وہ طلب ہونی چاہیے، کہ حق سامنے آتے ہی نور علی نور کی کیفیت حاصل ہو۔ نور کی راہ دکھانا اللہ کی شان ہے اور اللہ کا

کام ہمیشہ پر اہوتا ہے۔ مثالیں بیان فرمائے گوں پر ایک احسان کیا جاتا ہے۔ اللہ کا علم ہی علم مطلق ہے (تفسیر فاضلی چارم، 320)۔

مومن کا قلب وہ شیشہ ہے جس میں چراغ رکھا ہوا ہے۔ یہ شیشہ اتنا صاف ہے کہ یہ ستارے کی مانند چمکتا ہے۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ شیشہ چراغ کی روشنی کو کس قدر، اور کس خوبصورتی سے پھیلانے کا باعث بن سکتا ہے۔ قلب، عقل کا مقام ہے۔ (ارشادِ رباني ہے: ”کیا انہوں نے زمین میں سیر نہیں کی! تو ان کے قلوب ہوں تو عقل کریں، یا کان ہوں تو سینیں۔ تو آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں ولیکن قلب اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔“ (القرآن، 22:46)) عقل کا کام بندے کو تضاد سے پاک ہونے میں مدد دینا ہے۔ عقل کو زیتون کے اس تیل سے تشبیہ دی گئی ہے جو روشنی کو قبول کرنے کی اعلیٰ استعداد رکھتا ہے۔ عقل جب کنفیوزن سے پاک ہو، خالص ہو، تو اس میں اللہ کے نورِ ہدایت سے روشن ہوا ہٹنے کی اعلیٰ استعداد ہوتی ہے۔ آسمان اور زمین اللہ کے نورِ ہدایت سے منور ہیں، اللہ کی نشانیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ لیکن جب انسان خواہشات کی پیروی میں لگ جاتا ہے، عقل خالص نہیں رہتی، قلب کا شیشہ دھنڈلا جاتا ہے، سیاہ پڑ جاتا ہے۔ (جو خواہشات کی پیروی کرتے ہیں، مگر اہ ہو جاتے ہیں۔) (القرآن، 18:28; 25:43; 23:45) جس کی عقل خالص ہو، جس کا شیشہ شفاف ہو، اللہ اس قلب کو اپنے نورِ معرفت کی راہ دکھاتا ہے۔ شاحدوہ منور چراغ ہے جس سے نورِ معرفت عطا ہوتا ہے۔ مومن کا قلب جب منور ہوتا ہے تو نورِ علی نور کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اللہ علیم مطلق ہے۔ وہ جسے اپنے فضل سے نوازا پسند فرماتا ہے، علم مطلق سے فرماتا ہے۔ اللہ بندوں کی رہنمائی کیلئے مثالیں بیان فرماتا ہے۔

## اویسیہ—عطائے علم کی ایک خاص صورت

کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ اویسیہ ایک سلسلہ شاہدین ہے جہاں تزکیہ یا تصدیق کیلئے شاہد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ عطائے تزکیہ کے عمل کو ایک اسرار بنا دیتے ہیں (شہاب 1987، 1114)۔<sup>31</sup> حضرت فضل شاہ کے نزدیک یہ بات درست نہیں۔ سیدنا حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ شاہد نہیں، رئیس العاشقین تھے۔ اویسیہ، سلسلہ شاہدین نہیں، سلسلہ عاشقین ہے اور علم عطا کرنے کا ایک خصوصی طریقہ کار ہے۔ شاہدین کی شان ہے کہ وہ جسمانی طور پر فاصلے پر ہوتے ہوئے بھی اپنے عاشق صادق کو فیضیاب فرمائتے ہیں۔ علم عطا کرنے کے عام طریقہ کار کے علاوہ بھی طریقہ کار ہیں، قرآن پاک میں ان کا ذکر ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ

علیہ السلام کی پیدائش کے موقع پر آپ کی والدہ متزمہ کو علم عطا فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے بچانے کیلئے کیا کرنا چاہئے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں ڈالنے کے بعد جب اس کا دل بے قابو ہونے کے قریب تھا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کے قلب پر ربط رکھا، اسے آسرادیا۔ (القرآن، 10:28) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے حضرت بی بی مریم علیہ السلام کو علم عطا فرمایا کہ اپنا پاؤں زمین پر ماریں وہاں سے چشمہ پھوٹ نکلے گا اور کھجور کے تنے کو ہلانگیں، تازہ کھجوریں گریں گی۔ بچے کے حوالے سے لوگوں کے استفسار کے جواب میں کیا کہنا ہے، اس کے بارے میں بھی علم عطا فرمایا۔ (القرآن، 19:23-29) حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول تھے۔ قرآن پاک میں اللہ کے ایک بندے کا ذکر ہے جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات دو دریاؤں کے سقماں پر ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے انہیں اپنے پاس سے ایک خاص علم (علمِ دُنْدُنی) سے نوازا ہے۔ (القرآن، 18:66) اللہ کے نبی حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں جنات بھی تھے اور پرندے بھی۔ اللہ تعالیٰ نے جنات کو آپ کے تابع کیا ہوا تھا، اور آپ پرندوں کی بولیوں کا علم بھی رکھتے تھے۔ آپ نے چیزوں کے سردار کی بات سن بھی لی اور سمجھ بھی لی۔ جب ملکہ سبا حضرت سلیمان علیہ السلام سے ملاقات کیلئے آرہی تھی، تو آپ نے اپنے دربار خاست ہونے سے پہلے یہ کام کر سکتا ہے کون ملکہ سبا کا تخت یہاں لاسکتا ہے۔ جن نے عرض کیا کہ وہ دربار برخاست ہونے سے پہلے یہ کام کر سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا اس سے پہلے لانا درکار ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایک درباری نے عرض کیا جناب آپ کے پلک جھکنے سے پہلے تخت یہاں موجود ہو گا، اور وہ وہاں موجود تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ”کہ ہم نے اسے کتاب کا ایک علم عطا فرمایا تھا۔“ (القرآن، 40:38) ان خصوصی علوم کے حاملین ہر زمانے میں موجود رہتے ہیں، حال پر بھی ہیں، اور آئندہ بھی ہونگے۔ بابا بھی خان ملامتی، اویسی، سیاہ پوش فقیر ہیں۔ ان خصوصی علوم کے حاملین میں سے ہیں۔ ان کی کتابیں ’بیارنگ کالا‘، ’ما جل کوٹھا‘، ’شب دیدہ‘ اور ’لے بابا بیل‘، ان علوم پر انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہیں۔

## وحدث الوجود اور وحدت الشہود

”وحدث الوجود“ اور ”وحدث الشہود“ کا کچھ تذکرہ بھی ضروری ہے۔ یہ نظریہ کہ اللہ تعالیٰ وجود مطلق ہے اور باقی ہر شے اسکا اظہار، مسلم فکر کی تاریخ میں ”وحدث الوجود“ یا the Doctrine of the unity/oneness of all being or unity/oneness of all existence کہلاتا ہے۔ اس

نظریہ کے دو بنیادی مفروضات میں سے ایک یعنی یہ کہ 'الحق' اللہ تعالیٰ کا نام ہے پہلے زیر بحث آپ کا ہے اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآنِ پاک کے مطابق 'الحق'، قرآنِ پاک کا نام ہے، الحق ہونا فرمانِ الہی کی شان ہے اور اللہ 'الحق'، کا نازل فرمانے والا (Descender of al-haqq) ہے۔ اللہ کو 'الحق' کہنا درست نہیں۔ دوسرے بنیادی مفروضے کہ 'الله تعالیٰ وجودِ مطلق' ہے اور باقی سب کچھ اس کے اختیار کئے ہوئے عارضی تعینات (یعنی وجود اضافی) ہیں، کا ذکر اب کیا جائے گا۔

'وجود' عربی زبان کا لفظ ہے اور 'وجود' مادے سے اسکا تعلق ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں وجود مطلق ہوتا تو عربی زبان میں نازل فرمائے گئے قرآنِ پاک میں اس بات کو بیان کردیتے ہیں میں کیا مشکل تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی ذاتِ اقدس کے بیان میں 'وجودِ مطلق' یا اس مادے کا کوئی دیگر لفظ مثلاً 'موجود' یا 'غیر موجود'، وغیرہ استعمال کرنا پسند نہیں کیا۔ کیا کوئی دوسرا شخص اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس کو اللہ سے زیادہ جان سکتا ہے؟! یہ سی چیز کہتا ہے:

"Ibn Arabi is not a philosopher, but a sage, a visionary and wahdat al-wujud is one of the many dimensions of his overall vision of reality which Ibn Arabi wants to convey to his reader. He further observes: "one of Ibn Arabi's themes is that reason or intellect ('aql) is inadequate as a source of knowledge of God, the self, and the world (The Mujaddid's Concept of Tawhid, 9)." "

ابن عربی کی اپنی تعلیمات بنیادی طور پر 'کشف'، 'شهادہ'، 'ذوق' پر مشتمل ہیں جو عقل کی حدود سے ماوراء ہیں (ibid., 35-36). چیز کے درج بالایاں سے ظاہر ہے کہ ابن عربی کے نزدیک اسکا اپنا وژن ہی معیار حق ہے۔ اسکے مکتب فکر کے بارے میں بھی بھی بات درست ہے۔ قرآنِ پاک شہادت دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بے مثل ہے۔ اللہ کی ذاتِ اقدس کے بارے میں اپنے وژن، مشاہدے یا کشف و شہود کو اتنی اہمیت دے دینا کہ اسے حق کا درجہ دے دیا جائے جبکہ اللہ نے اس کے لئے کوئی سند نازل نہ کی ہو بالکل غلط بات ہے۔ (القرآن، 7:21) شیخ احمد سرہندی نے اس نقطہ نظر پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ 'وحدت الوجود'، منازلِ سلوک پر محض ایک مقام ہے اور مزید کہا کہ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے فضل سے اس مقام سے آگے جانے کا شرف عطا کیا تو تباہ اکٹھاف ہوا کہ یہ آخری منزل نہیں اور یہ کہ وحدت الوجود کی منزل پر خدا کا جو تصور ان کے ذہن میں تھا وہ صحیح نہیں تھا۔ شیخ احمد سرہندی نے اس نظریے کا اظہار کیا کہ اللہ تعالیٰ

خالق ہے اور کائنات اسکی تخلیق۔ اور تخلیق قطعاً پنے خالق کی الوہیت میں کسی بھی طرح شریک نہیں، نہ اسکے اظہار کی صورت میں اور نہ اسکی تجھی کی حیثیت سے۔ 'تخلیق' حقیقت ہے، لیکن 'خالق' اس سے مطلق طور پر مادراہ ہے۔ شیخ احمد سرہندی کے نظریہ کو 'وحدت الشہود' (doctrine of the shahadah) کا نام دیا جاتا ہے۔ بقول جناب محمد اشرف فاضلی، حضرت فضل شاہ نے فرمایا کہ ایک مقام ہے۔ اس مقام پر سالک کو ایسا تجربہ ہوتا ہے جسے وحدت الوجود پر محمول کر لیا جاتا ہے۔ حضرت فضل شاہ کے نزدیک وحدت الوجود بطور تصورِ اللہ خلاف حق نظریہ ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ کئی بزرگ مثلاً امام العارفین حضرت سلطان باہور حمت اللہ علیہ قطعاً وحدت الوجودی نہیں تھے جبکہ ان کے اخلاف میں ایسے لوگ بھی آگئے ہیں جو انھیں وحدت الوجودی ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

وحدت الوجودی عام طور پر سمندر اور لہر، روشنائی اور حروف والفاظ، جیسی تشبیہات استعمال کرتے ہیں جن کا کوئی جواز قرآن پاک سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً لہر اپنی ماہیت میں سمندر سے مختلف نہیں ہوتی۔ سمندر کا باطنی اہتزاز اس کا سبب بنتا ہے۔ لہر جب جنم لے لیتی ہے تو پھر اس کی حقیقت سے انکار کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اپنی اصل میں تو وہ سمندر ہی ہوتی ہے۔ ساحل سے ٹکر ا کر پھر اصل میں لوٹ جاتی ہے۔ تمام حروف، الفاظ، کتابیں، لا بیریاں جو علوم کو منضبط کرتے ہیں، روشنائی ہی کے انفراد سے وجود میں آتے ہیں اور اصلاً روشنائی ہی ہوتے ہیں۔ خدا وجود مطلق ہے۔ اس نظریے کے مطابق کائنات وجود مطلق کے اختیار کئے ہوئے عارضی تعینات پر مشتمل ہے جن کا آغاز بھی ہوتا ہے اور انجام بھی۔ اپنے انجام پر یہ پھر اپنی اصل میں مل جاتے ہیں۔ خدا الحق ہے، اشیائے کائنات اس کا عارضی اظہار ہیں، خدا مطلق حقیقت ہے، کائنات اضافی حقیقت ہے۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ pantheism اور وحدت الوجود، اور panantheism اور وحدت الشہود ایک چیز ہیں۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ وحدت الوجود، اور وحدت الشہود مکاتب فکر ہیں جو مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ جبکہ pantheism اور panantheism فلسفیہ مکاتب فکر ہیں۔ خدا pantheism اور کائنات کو ایک دوسرے کا عین قرار دیتا ہے جیسے سپاً نوزا کا فلسفہ ہے۔ panantheism کے مطابق خدا کی ذات کے دو پہلو ہیں: سریانی (immanent) اور مادری (transcendent)۔ ایک پہلو سے

کائنات وجود مطلق کا اظہار ہے اور وجود مطلق کائنات میں سریانی ہے۔ کائنات خدا کے ساتھ عینیت رکھتی ہے لیکن خدا کائنات کے عین نہیں کیونکہ خدا، کائنات سے ماوراء بھی ہے۔ حضرت ابن عربیؑ کا نظریہ وحدت الوجود مذہبی نظریہ ہونے کے باوجود panatheism کے بہت قریب ہے۔ اگر حضرت ابن عربیؑ نے اپنا نظریہ وحدت الوجود اپنے صوفیانہ وثن اور کشف و شہود کی بنیاد پر پیش کیا تو شیخ احمد سرہندیؑ نے اپنا نظریہ وحدت الشہود کسی سند کی بنیاد پر پیش نہیں کیا۔ انہوں نے بھی اپنے روحانی تجربات ہی کو بنیاد بنایا۔ تفسیر فاضلی کے مطابق سند کے ساتھ بات کی جائے تو ”وحدت شاہدین“ (oneness of shahideen) صحیح نظریہ ہے۔ تمام شاہدین وجود واحد ہیں، کیوں کہ انکا مقصود واحد ہے، اور ان کا مقصد وہ لوگوں کو نظمات سے نور کی طرف نکالنا، ان کو پاک کرنا، انکی تصدیق کرنا، ان کو کتاب و حکمت کا علم عطا فرمانا۔ آیت نمبر 4:26 کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت فضل شاہ کا ارشاد ہے: ماضی، حال کا مصدق ہوتا ہے اور حال، ماضی کا مصدق۔ یہ بھی فرمایا کہ جس حال کا ماضی شاہد نہ ہو وہ حال سچا نہیں ہوتا، اور جس ماضی کا حال شاہد نہ ہو وہ ماضی سچا نہیں ہوتا۔ وحدت الوجودی تصور خدا ”الحق“ کے مطابق نہیں ہے، اپنے کشف و شہود کو معیار ٹھہرانے کی وجہ سے درست نہیں کہا جاسکتا، لیکن ان کے عشق رسول، تقویٰ اور پاکبازی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر اللہ تعالیٰ در گزر فرمادے تو اسے کوئی پوچھنے والا نہیں۔

## بدعت: علم کسب کو علم الہی سے مطابقت دینے کا قرآنی اصول

اہل حق پر عام طور پر بدعت کا الزام عائد کیا جاتا ہے حالانکہ انسانی فکر و تجربہ کے حاصلات کو اللہ کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے قرآنی تعلیمات سے مربوط کرنے کے قرآنی اصول کا نام بدعت ہے۔ اس اصول کی وجہ ہی سے قرآنی تعلیمات تاقیم تاقیم تقابل عمل رہیں گی۔ یہی اصول تاقیم اسلام کے دنیا کا نہایت ترقی یافتہ مذہب ہونے کا ضامن ہے۔ اجتہاد کو قرآنی بنیاد یہی اصول فراہم کرتا ہے۔ شاہدین ہی کی وجہ سے یہ اصول، بڑے محدود دارہ کارہی میں سہی، بچا ہوا ہے۔

اسلام خواہشات کی من مانے طریقے سے پیروی کو گمراہی قرار دیتا ہے اور اللہ کی مقرر کردہ حدود کے اندر تشفی کو فرمان الہی کی پیروی قرار دیتا ہے۔ اللہ کی مقرر کردہ حدود کے دائرے میں خواہشات کی تشفی کیلئے انسانی زندگی میں آسانیاں مہیا کرنا، تقویٰ اور پرہیز گاری کافروغ، افراد معاشرہ کی تخلیقی صلاحیتوں کی جلا کیلئے موزوں ماحول مہیا کرنا اسلامی تعلیمات سے وجود میں آنے والے تمام علوم اور قانون سازی کی بنیاد ہے

اور ہونی چاہیے۔ تبدیلی کو آنے سے روکا نہیں جاسکتا۔ ضروری ہے کہ انسانی فکر و تجربہ سے وجود میں آنے والی ہر تبدیلی کو قرآن پاک کی حدود میں رکھ کر اس سے استفادہ کی صورت واضح کی جائے اس سے پہلے کہ آپکی ہر مزاجمت دم توڑ جائے اور وہ تبدیلی تمام حدود پھلا لگتی ہوئی آپ کے گھروں اور بیڈر و مز کے اندر داخل ہو جائے۔ لیکن اگر ہر تبدیلی کو بدعت کہہ کر اسکی مذمت کی جاتی رہے گی، تو آپ دنیا کے سامنے اسلام کو دنیا کا سب سے ترقی یافتہ دین بنانے کا پیش نہیں کر سکتے۔

حیات اللہ کی بہت بڑی عطا ہے۔ اس کی قدر کرنا اللہ کو بہت پسند ہے۔ ایک بزرگ فریضہ حج کی ادائیگی کیلئے تشریف لے کر گئے۔ اس سال رمی جمار کے موقع پر بہت بڑا حادثہ ہوا جس میں حجاج کرام کی بہت بڑی تعداد اللہ کو پیاری ہوئی۔ رمی جمار فریضہ حج کا ایسا رکن ہے جو کسی دوسرے سے بھی ادا کروایا جاسکتا ہے۔ اس بزرگ کو یہ دکھادیا گیا کہ اگر آپ خود رمی جمار کیلئے جائیں گے تو اپنی نہیں ہوگی۔ انھیں اس بات کا اختیار دیا گیا کہ چاہیں تو یہ رکن خود ادا کریں اور چاہے تو کسی دوسرے سے کروالیں۔ انھوں نے زندگی کی سلامتی کو ترجیح دینا پسند کیا، اور جس کے یہ کام پر درکیا اس کی سلامتی کیلئے بھی دعا کی۔ دونوں سلامتی سے واپس آگئے۔ حضرت فضل شاہ صاحب جب آخری بار بیمار ہوئے تو آپ نے فرمایا: اس سے پہلے تین مرتبہ مہلت زندگی بڑھائی جائی گی ہے۔ اب رخصت ہونے کا وقت آگیا ہے۔

انسانی عقل و فکر نے جن بنیادی انسانی حقوق کی نشاندہی کی ہے، انسانی فکر اور تجربے سے وجود میں آنے والے علوم (philosophy and manmade sciences) اور اداروں کا مطہر نظر ان بنیادی حقوق کے دائے میں افراد معاشرہ کو اپنی خواہشات کی زیادہ سے زیادہ تسلیکیں اور اپنی صلاحیتوں کی تکمیل کے زیادہ سے زیادہ موقع اور آسانیاں مہیا کرنا اور اس مقصد کو یقینی بنانے کیلئے قانون سازی کرنا ہے۔ یہی سیکولرازم ہے۔ سیکولرازم پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ عیسائیت اور یہودیت بھی سیکولرازم کا الباہد اوڑھ کر ہی زندہ ہیں۔ سیکولرازم بڑی تیزی کے ساتھ مسلم معاشروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لیتا چلا جا رہا ہے۔ آپ اپنی زندگی کے کسی بھی پہلو پر نظر ڈال کے دیکھیں، ہر چیز مغربی تہذیب میں رنگی ہوئی اور غنگی ہوئی نظر آئے گی۔ ہماری دانست میں اس دور میں مسلم معاشروں کو اپنی اقدار کے مطابق سلامتی کے ساتھ زندہ رکھنے کیلئے ضروری ہے کہ بدعت کے قرآنی اصول کو، مذہبی فریضہ کی حیثیت سے، وسیع تر تناظر میں نافذ کیا جائے، زندگی کے ہر پہلو میں فروغ دیا جائے، ہر میدان میں انسانی فکر و تجربہ (فلسفیانہ اور سائنسی علوم) کے

حاصلات کو قرآن کے دائمی اصولوں کی روشنی میں رد و بقول کے ذریعے اپنایا جائے، قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ان میں اصلاح کر کے ان سے بہتر نظام تجویز کئے جائیں۔

بدعت کو غیر مشروط طور پر رد کر دینے والے لوگ اپنی کوتاه فہمی سے یہی سمجھتے ہیں کہ انسانی فکر و تجربہ کے حاصلات کو رد کر دینا چاہئے حالانکہ ان کی اپنی زندگیوں کے ہر مقام پر اس کی فہم موجود ہوتی ہے۔ انسانی فکر و تجربہ کے حاصلات کو استعمال میں لانے میں قرآن پاک نے اپنے ماننے والوں کو بے یار و مدد گار نہیں چھوڑ دیا۔ جس طرح بعض علماء کے ایک فیصلے سے (ان کے حسن نیت پر شک کئے بغیر) صدیوں یہ غلط خیال مسلمانوں کے اندر راسخ رہا کہ اب اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا، اسی طرح ماضی کے بعض جیگہ علماء کی کوتاه نظری سے (ان کے حسن نیت پر شک کئے بغیر) لوگوں کی سوچ اس حد تک مسوم ہو چکی ہے کہ بدعت کے ساتھ صرف اور صرف معنی معنی اس طرح وابستہ ہو چکے ہیں کہ اس نے مسلمانوں میں تخلیق کی صلاحیت کو کچل کے رکھ دیا ہے۔ جائز حدود کے اندر رہتے ہوئے کوئی تجربہ کرنے کو بدعت قرار دیکر اسکی مذمت کی جاتی ہے اور پھر معاشیات، خوارک، سیاست، انتظامی معاملات، تعلیمی نظام اور نصاب، سپورٹس، نظام حرب، بینکنگ، میڈیا کل، انجمنگ، انفار میشن یونیورسٹی، سوشن سائنسز، فون ایفی، تعمیرات غرض زندگی کے ہر میدان میں فلسفہ و سائنس سے حاصل والے علوم کی خوشہ چینی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جاتی۔ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ کوئی نئی بات بدعت حسنہ بھی ہو سکتی ہے اور بدعت سیئہ بھی۔ قاعدہ کالیہ یہ ہے کہ ممکرات کے معاملے میں کوئی بدعت جائز نہیں۔ ایسی بدعت، بدعت سیئہ ہے۔ شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاهر القادری ان کے لئے بدعت لغویہ اور بدعت شرعیہ کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ اساسیات دین میں کوئی نئی بات داخل کرنا بدعت شرعیہ ہے۔ یہ متع ہے، اور اس کے بارے میں فرمایا گیا ہے ”کہ ہر بدعت گمراہی ہے۔“ بدعت حسنہ، اللہ کی رضا چاہئے کیلئے ہوتی ہے۔ کسی بدعت حسنہ کی حدود کا تعین کرنا اجتہاد کھلاتا ہے اور یہ راسخون فی العلم کا کام ہے۔ آئیے دیکھتے ہیں قرآن پاک میں یہ اصول کہاں سے اخذ ہوتا ہے۔

## بدعت کے اصول کا مأخذ اور قرآن و حدیث سے اسکی تفہیض کی چند مثالیں

سورہ الحمد میں ارشاد ہے:

— وَرَهْبَانِيَّةَ أَبْغَدُوهَا مَا كَتَبْنَا هَا عَلَيْهِمْ إِلَّا أَبْغَاعَاءِ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِيعَانِيَّهَا فَأَتَيْتَهَا

الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرٌ هُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ

”۔۔۔ رہبانیت کی ابتداء انہوں نے (عیسائیوں نے) خود کی تھی۔ یہ ہم نے ان پر نہیں لکھی تھی، منشا اللہ کی رضا چاہنا تھا۔ پھر اس کی رعایت نہ رکھی، جیسے اس کی رعایت کا حق تھا۔ تو ان میں سے ایمان والوں کو ہم نے ان کا اجر دیا۔۔۔“ (القرآن، 57:27)

تفسیر فاضلی میں اسکی تفسیر اس طرح فرمائی گئی ہے: ”رہبانیت، اپنے نفس کی خواہشات کے خلاف کرتے چلے جانا ہے، اور اس رویے کو اپنی پہچان بنانے کی کوشش ہے۔ یہ ان لوگوں کی اپنی اختراع تھی، فرمان الہی نہیں تھا۔ منشا ضرور اللہ کی رضا چاہنا تھا۔ مگر اس میں نفس کو یہ رعایت دی جانی چاہئے تھی کہ جب وہ سواری کا کام دینے لگے، اور شاہد کے امر کو ادب سے ماننے لگے تو پھر اس کے ساتھ سختی رو انہ رکھی جائے (تفسیر فاضلی منزل ہفتہ 1998)۔“ اہل روحانیت کی بدولت ہی بدعت کا اصول محدود دائرے میں ابھی تک موجود ہے۔ ضرورت ہے کہ علم میں راخ حضرات اس کام کو مدد ہی فریضہ سمجھتے ہوئے ہر میدانِ زندگی میں انسانی فکر و تجربہ کے حوصلات سے اللہ کی مقرر کردہ حدود کے اندر استفادہ کرنے کی صورت اور اسکی حدود کا تعین کریں۔ شدید ضرورت ہے کہ مسلمانوں کی زندگی کے تمام پہلوؤں میں اس اصول کو زندہ اور نافذ کیا جائے۔ سورہ الحدید کی مذکورہ بالا آیت کریمہ کی روشنی میں، جمہ کے خطبات میں اکثر پڑھی جانے والی حدیث ”کہ ہر بدعت گمراہی ہے۔۔۔ ایک بڑی حدیث کا چوتھا سا حصہ ہے، پوری حدیث نہیں ہے، اور اس کا مطلب صرف اتنا ہی ہے کہ فرمانِ الہی کے خلاف جو بدعت ہوگی وہ گمراہی ہوگی۔ آئیے چند مثالیں دیکھتے ہیں: سورہ الحج (22) کی آیت نمبر 27 میں ذکر ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا ”اور لوگوں میں حج کی اذان دیجئے، کہ وہ آپ کے پاس آئیں۔ پیادہ اور دبلے دبلے اوٹو پر دروازوں سے چلے آئیں (تفسیر فاضلی چہارم 2012)۔“

کیا آج لوگ پیدل یا دبلے اوٹو پر حج کرنے جا سکتے ہیں! خود عرب شریف کے رہنے والے بھی ایسا نہیں کر سکتے۔ اب تو بھری جہازوں کے ذریعے حج پر جانا بھی ممکن نہیں رہا۔ کیا یہ بدعت نہیں! کیا یہ گمراہی ہے! ایک وقت تصویر اتارنے کو بدعت سیہ سمجھا جاتا تھا، اب جب تک آپ کی تصویر آپ کے پاس نہ ہو آپ حج نہیں کر سکتے!

چند سال پہلے تک رمی جمار کیلئے، جو حج کا ایک لازمی رکن ہے، بہت محدود وقت مقرر تھا۔ صدیوں سے حجاج کرام 10/دواں الحج کو اشراق سے دوپہر تک، اور 11 اور 12 دواں الحج کو دوپہر سے غروب آفتاب تک یہ رکن ادا کرتے تھے۔ یہی سُتھ چلی آ رہی تھی۔ حجاج کرام کی تعداد میں اضافے کے ساتھ اس رکن کی ادائیگی

اس محدود وقت میں ممکن نہیں رہی تھی۔ چنانچہ چند سال قبل اس وقت کو اشراق سے غروب آفتاب تک بڑھا دیا گیا ہے۔<sup>32</sup> اب تینوں دن چوپیں کھنے رمی جمار کیا جاتا ہے۔ کیا یہ بدعت نہیں! کیا یہ مگر اسی ہے! اگر مسلمانوں میں بدعت کو قابلِ مذمت نہ بنادیا گیا ہوتا، اگر اس بات کا شعور ہوتا کہ بدعت تغیرات زمانہ کے ساتھ بدلتے ہوئے حالات میں اسلامی تعلیمات کو قابل عمل رکھنے کا ایک قرآنی اصول ہے تو ہزاروں جانوں کے ضیاء سے بہت پہلے اس بارے میں اجتہاد کر لیا گیا ہوتا۔ اگر اس بات کا شعور ہوتا کہ قرآن پاک حکم ہے، اور حدیث اس کی تفییز۔ اور تفییز حکم، وقت، مقام اور مقدار کے مطابق ہوتی ہے تو بہت سارے معاملات میں بہت نقصان اٹھائے بغیر ضروری اقدام کرنے لگتے ہوتے۔

حج کے معین ایام میں چوپاپیوں کو ذبح کرنا بھی حج کے ارکان میں شامل ہے۔ ججاج کرام کی تعداد میں اضافہ کے ساتھ انفرادی طور پر اس کا اهتمام کرنا، اس میں سے خود کھانا اور محتاجوں کو کھانا تقریباً ممکن ہو گیا ہے۔ چنانچہ سالہا سال تک حاجج کے مشکلات کا شکار رہنے اور گوشت اور بے شمار کھالوں کے ضیاء کے بعد اب قربانی کو اجتماعی اهتمام کی شکل دی گئی ہے، اور قربانی کا گوشت ضرور تمددوں تک پہنچانے کا بندوبست بھی کیا جاتا ہے۔ کیا یہ بہت بہتر نہ ہوتا! اگر بہت پہلے موزوں منصوبہ بندی کے طور پر یہ بدعت اختیار کر لی گئی ہوتی! اس اهتمام کو مزید بہتر بنانے کی بھی بہت گنجائش موجود ہے۔ اللہ کا حکم اس میں سے خود کھانے کا بھی ہے، جس پر عمل نہیں کیا جا رہا۔ اس کو بھی کوئی اجتماعی شکل دی جانی چاہئے تاکہ فرمان الہی کے اس حصہ پر عمل ہو سکے۔

زکوٰۃ کی ادائیگی فرض ہے صاحبِ نصاب پر۔ حضور ﷺ نے اس حکم الہی کی عملی تشكیل فرمادی اپنی سنت پاک میں۔ احادیث میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ کچھ سال پہلے اسے نظام زکوٰۃ کے ایک ادارے کی شکل دی گئی ہے۔ تمام ترقائق کے باوجود وقت، مقام، مقدار کے اعتبار سے یہ کام بہت پہلے ہو جانا چاہئے تھا۔ اب بھی زکوٰۃ فنڈ سے انڈسٹریل یونٹ قائم کئے جاسکتے ہیں، میں بنائے جاسکتے ہیں جن کی آمدنی کا بڑا حصہ خرچ ہو مستحقین زکوٰۃ پر، جن کی آمدنی کا ایک حصہ انہی جیسے مزید ادارے قائم کرنے کیلئے وقف ہو، جس کی ایڈمنیسٹریشن یا سپرویژن کسی مسلمہ غیر سیاسی فلاحتی ادارے کے سپرد ہو۔ پاکستان میں ایسے کئی غیر سیاسی فلاحتی ادارے قائم ہیں جن کی امانت داری اور قابلیت شک و شبہ سے بالا ہے۔ نظام زکوٰۃ کو غربت کے خاتمے اور اس کے فوائد کو حقیقی مستحقین تک پہنچانے کیلئے بہت بہتر طور پر تشكیل دیا جا سکتا ہے۔

آج پوری دنیا میں مسلمان ایک ہی دن عید کیوں نہیں کر پاتے! ہر علاقے میں چاند خود دیکھ کر عید کرنا سُت، اور مکہ شریف میں چاند دیکھ کر عید کرنا، یا سپس سائنس کے ماہر مسلمانوں کے مرتب کئے گئے کیلئے در کے مطابق تھواڑوں کو طے کر لینا اخیس بدعت دکھائی دیتا ہے اور بدعت کو وہ خلاف سنت سمجھتے ہیں، مگر اسی سمجھتے ہیں۔ اس کوتاه نظری کی بنیاد ان کے قرآن پاک اور حدیث پاک میں تعلق کے غلط تصور پر ہے۔ صرف اس کوتاه نظری کی وجہ سے مسلمان قمری تقویم کے مطابق اپنا کیلئڈر بنانے اور چلانے سے قاصر اور اسکی برکات سے محروم رہتے۔ اس کیلئڈر کو چلانے سے مسلمانوں کو جو فوائد و برکات حاصل ہو سکتی ہیں ان کا کچھ اندازہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی کتاب 'خطبات بہاولپور' سے کیا جاسکتا ہے۔

حضور پاک ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں قطعاً کبھی میدہ استعمال نہیں کیا۔ اس وقت مسلمانوں میں میدے کی بنی ہوئی اشیاء کا استعمال کس قدر ہے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ مکہ شریف اور مدینہ شریف غالباً دنیا کے وہ شہر ہیں جہاں ان اشیاء کا استعمال سب سے زیادہ ہے۔ لیکن کبھی علماء دین کو اسے خلاف سنت یا بدعت قرار دیتے ہوئے نہیں سن۔ قرآن پاک کے نزول کو چودہ صدیاں گزر گئی ہیں لیکن اب تک ہم اس کی تعلیمات کے مطابق سودے پاک نظام میشست، نظام سیاست، نظام حکومت، خون خرابے کے بغیر نئے موزوں حکمران کا انتخاب، صنعت میں آجر اور اجیر کے تعلق کی جزئیات کچھ بھی مرتب نہیں کر سکے کیونکہ ہر نئی بات (بدعت) کو مگر اسی قرار دئے جانے کا یہی نتیجہ ہو سکتا تھا۔ غیر مسلموں نے محض فکر و تجربہ سے ان تمام نظاموں کو نہایت باریک جزئیات کے ساتھ مرتب کر لیا ہے۔ اللہ نے صرف اور صرف قرآن پاک کو الحق، بنانا نازل کیا ہے۔ مقتابات، جو قرآن پاک کی اپنی آیات ہیں، کی تاویل کو بھی محکمات کی اساس پر استوار کرنے کا پابند بنایا ہے۔ عقائد سے متعلق روایات کی تاویل کو بھی محکمات کی اساس پر استوار ہونے کا پابند بنایا جانا ضروری ہے۔ معاملات سے متعلق روایات کو تفہیز حکم کے نظائر (precedents) کی حیثیت سے دیکھا جانا اور محکمات کو ملحوظ رکھتے ہوئے وقت، مقام، اور مقدار کے مطابق بنایا جانا ضروری ہے۔ شاہدین کی یہ شان ہے کہ وہ سُت کی روح پر عمل کرتے ہیں، تغیرات زمانہ کے حوالے سے، قرآن پاک کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے، بدعت کو رضاہ اللہی کا باعث سمجھتے ہیں اور اجتہاد کرتے ہیں (تفہیز فاضلی منزل بہتم، 153) مزید مطالعہ کیلئے دیکھئے ہمارا مضمون: State and

## حال اور صاحبِ حال

ابھی حال ہی میں ایک کتاب 'اقبال: صاحبِ حال' دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، جو پنجاب یونیورسٹی لاہور کے ایک محترم استاد (مرحوم) کی تصنیف ہے (تیمی 2011)۔ انہوں نے اقبال کے اشعار کی تشریح و تعبیر کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال صاحبِ حال بزرگ تھے۔ انتساب کے فوراً بعد سب سے پہلی بات جو انہوں نے درج کی ہے وہ حضرت فضل شاہ رحمت اللہ علیہ کا ایک قول ہے کہ "حال، ہمیشہ حال پر عطا ہوتا ہے اور صاحبِ حال سے عطا ہوتا ہے۔" لیکن پوری کتاب میں کہیں یہ پختہ نہیں چلتا کہ علامہ صاحب کو حال کس صاحبِ حال سے عطا ہوا۔ ان کا شاہد کون تھا۔ کس نے ان کو تزکیہ عطا کیا اور ان کی تصدیق کی۔ اقبال نے تو خود کہا ہے: "یہ نہ سمجھ کہ میں بغیر شراب کے مست ہوں اور شاعروں کی مانند مغض افسانے گوئی کر رہا ہوں۔ میں تو جبریل امین کا ہم دستاں ہوں۔ میر اکوئی رقیب، قاصد یادربان نہیں، بلکہ میں اللہ تعالیٰ سے براہ راست فیض یاب ہوں (زبورِ عجم کے چند اشعار کا ترجمہ (بحوالہ کلیات فارسی، 538)، اقبال میموریل پیپر 2013، 9)۔" اقبال تو خود تسلیم کر رہے ہیں کہ انہیں حال کسی صاحبِ حال سے عطا نہیں ہوا۔ اقبال کو 'صاحبِ حال' ثابت کرنے کیلئے اس کتاب میں واصفِ علی و اصف صاحب کے اقوال کا حوالہ بھی کثرت سے دیا گیا ہے۔ ہم نے پروفیسر صاحبِ محترم سے استفسار کیا کہ واصفِ علی و اصف صاحب کو حال کہاں سے عطا ہوا! فرمایا: حضرت فضل شاہ رحمت اللہ علیہ سے حاصل ہوا۔ عرض کیا: اسکا ثبوت۔ انہوں نے فرمایا: اسی طرح سننے میں آیا ہے۔ عرض کیا: کیا واصفِ علی و اصف صاحب نے اپنے کلام میں کہیں اپنے شاہد کا ذکر کیا۔ فرمایا: نہیں۔ عرض کیا: آپ نے تو خود اپنی کتاب کے شروع میں حضرت فضل شاہ صاحب کا رشاراد نقل فرمایا ہے کہ "حال، حال پر عطا ہوتا ہے اور صاحبِ حال سے عطا ہوتا ہے۔" اس کے علاوہ انہوں نے یہ بھی فرمایا ہے: "حال اپنا ہو، نام اپنے شاہد کا لیا جائے۔" جس نے کہیں اپنے شاہد کا ذکر ہی نہ کیا ہو کیا وہ حضرت فضل شاہ صاحب کا ماننے والا ہو سکتا ہے! مصف کو حضرت علامہ اقبال رحمت اللہ علیہ کے صاحبِ حال مانے جانے پر کوئی اعتراض ہے نہ جناب حضرت واصفِ علی و اصف رحمت اللہ علیہ کے صاحبِ حال مانے جانے پر۔ مطلب صرف یہ ہے کہ کتاب کے آغاز میں صاحبِ حال کی جو تعریف درج کی گئی ہے، اس پر حضرت علامہ اقبال پورا اترتے ہیں اور نہ حضرت واصفِ علی و اصف۔ صاحبِ حال کی کوئی ایسی تعریف تلاش کی جانی ضروری ہے

جسے ان کے بارے میں سند کے ساتھ ثابت بھی کیا جاسکے۔ یا 'صاحب حال' کے بجائے کوئی اور موزوں اصطلاح اُنکی توصیف کیلئے تلاش کی جائے۔ اچھی کتاب کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ تناقض سے پاک ہو۔

## حاصل

تمام گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ جسے عرفِ عام میں تصوف کہا جاتا ہے قرآنِ پاک کے مطابق اسے 'طریقت شاہدین' کے نام سے موسم کیا جانا چاہئے۔ مرشد کا درجہ شاہد کا ہوتا ہے۔ شاہد، مجین کیلئے آیات تلاوت فرماتا ہے، انھیں تزکیہ عطا کرتا ہے، کتاب و حکمت کا علم عطا کرتا ہے، جھیل چاہتا ہے تصدیق سے نوازتا ہے۔ شاہد اپنی پوری حیاتِ طیبہ میں شاہد ہوتا ہے۔ تمام شاہدین وجود واحد ہیں، کیوں کہ ان کا مقصود واحد ہے، اور انکا مقصود ہے لوگوں کو ظلمات سے نور کی طرف لانا۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود مابعد الطبيعیاتی نظریات ہیں۔ قرآنِ پاک کی روشنی میں وحدتِ شاہدین درست نظریہ ہے۔ کشف و کرامات کسی کی بزرگی کا ثبوت نہیں ہوتے۔ لوگوں کو ظلمات سے نور کی طرف لانے میں مدد دینے کیلئے اللہ اپنے پاک بندوں کو اپنے علم مطلق کی روشنی میں جس علم سے نوازناسندر فرماتا ہے، خود اس سے نوازتا ہے۔ شاہدین اللہ کی رضا کے مطابق زندگی گذارتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔ وفات کے بعد ان کے مزارات سے بھی خیر و برکات کی تقسیم ہوتی رہتی ہے۔ لیکن صاحبِ حال کا درجہ صرف شاہد کو حاصل ہوتا ہے۔ حال، حال پر عطا ہوتا ہے اور صاحبِ حال سے عطا ہوتا ہے۔ تفسیر فاضلی ہو، کشف الحجوب ہو، مشنوی، معنوی ہو یا قرآنِ پاک ہو، کتاب، شاہد نہیں ہوتی۔ معلم کتاب و حکمت ہی شاہد ہوتا ہے اور اسکے تصدیق یافتہ شاہدین جو حال پر موجود ہوں۔ یہی علم حدیث اور سُنّت رسولؐ کے وارث ہیں۔ تمام ماننے والے کبھی بھی ایک درجے کے نہیں ہوتے۔ ماننے کے دعویدار ہر زمانے میں تین قسم کے ہوتے ہیں: الساقون الاؤلوں، اصحاب اليمین، اصحاب الشمال۔ سب سے بڑا مرتبہ ان کا ہوتا ہے جو پنے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہی معیار ہوتے ہیں۔ یہ الساقون الاؤلوں میں سے ہی ہو سکتے ہیں۔ شریعت قول ہے، طریقت عمل ہے، حقیقت علم ہے، اور معرفت انعام ہے۔ شاہدین میں سے جس کی خدمت میں حاضری کا شرف ہوا سے میل جوں رکھا جائے تو قول پاک ہو جاتا ہے۔ اس سے محبت ہو جائے تو اعمالِ حسن ہو جاتے ہیں۔ عمل کے بعد علم عطا ہوتا ہے۔ ان تینوں مقامات پر اپنے شاہد کے اتباع میں پورا رہنے والے کو معرفت بطورِ انعام عطا فرمادی جاتی ہے۔ دنیا میں پاک لوگوں کی معیت، اور آخرت میں پاک لوگوں کے ساتھ اٹھایا جانا نصیب ہو جائے، تو اس سے بڑی کوئی

کامیابی نہیں۔ قول کی حفاظت، اعمال کی حفاظت، علم کی حفاظت، اخلاص کی حفاظت اور شیطان اور شر ارت سے بچائے جانے کیلئے دعا کرتے رہنا چاہئے۔

---

## قرآن پاک اور فلسفہ و سائنس میں تعلق

ابن سینا، سر سید احمد خان، ڈاکٹر محمد اقبال اور چند معاصر علماء اور مکاتب فکر کے نظریات کا

### تعمیدی جائزہ

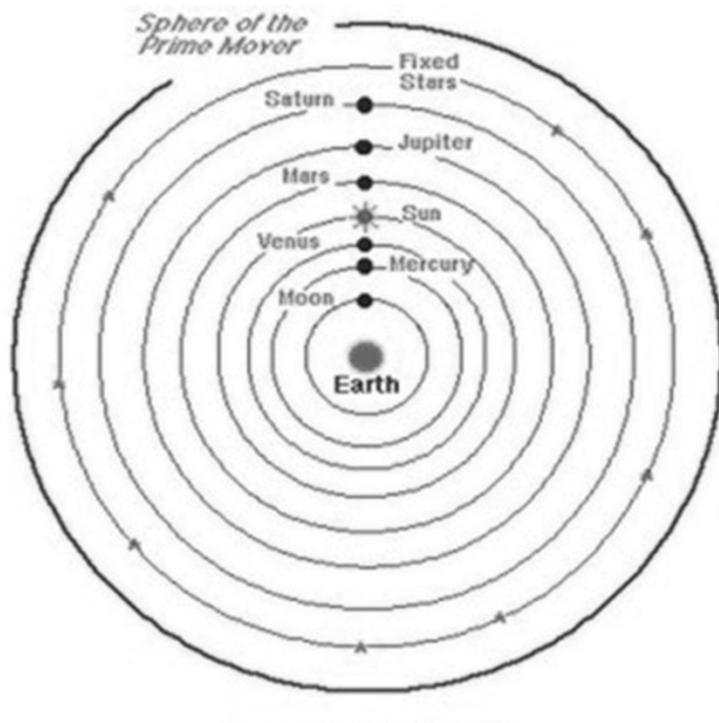
خلاصہ: مذہب زندگی اور کائنات کے آغاز، مقصد اور سڑک پر کے بارے میں اہم نظریات پیش کرتا ہے جن کی بنیاد وحی والہام پر ہوتی ہے، جنہیں نبی یا رسول کی صداقت اور ایمان بالغب کی بنیاد پر مانا جاتا ہے۔ فلسفہ اور سائنس اپنا تصور کائنات منطقی استدلال اور تجربی تصدیقات کی بنیاد پر پیش کرتے ہیں، چنانچہ کسی زمانے کے فلسفہ و سائنس کے اہم نظریات اور تصور کائنات کو اس زمانے کے 'صداقت کے عقلی معیار' (rational version of truth) کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔

مذہب کو مانے والے، اپنے مذہب کی تعلیمات کو 'صداقت کا الہامی معیار' (revealed version of truth) سمجھتے ہیں۔ انکی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے مذہبی عقائد کی عقلی تاویل کر کے انھیں اپنے زمانے کے معیار عقل کے ساتھ ہم آہنگ ثابت کریں تاکہ راست الاعتقادی اور اذعانیت کے اعتراض سے بچ سکیں۔ فلسفہ و سائنس کے نظریات بہر حال حتیٰ نہیں ہوتے اور مزید تحقیق کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ افلاطون اور ارسطو کے فلسفیانہ نظریات اور بطیموس کا نوسادی کروں پر مشتمل تصور کائنات ابن سینا کے زمانے کا معیار عقل تھے۔ سر سید احمد خان کے زمانے میں نیوٹن کا سائنسی نظریہ کائنات اور انکی معیت میں پیدا ہونے والا نچپر ازم معیار عقل کی حیثیت رکھتے تھے۔ حضرت علامہ اقبال کے زمانے میں آئیں شائن کا سائنسی نظریہ کائنات اور برگسال اور جیمز وارڈ نیوٹن کے فلسفیانہ مکاتب فکر معیار عقل کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے مذہبی عقائد اور اپنے زمانے کے معیار عقل میں تطبیق قائم کرنے کے اصول وضع کئے اور انہیں تطبیق دینے کی کوشش کی۔ موجودہ دور میں یہی کام اُثر نیشان اٹھیٹ آف اسلام کے تھا، سید حسین نصر (روایت کا مکتب فکر)، ضیاء الدین سردار (اجمالی مکتب فکر) اور مورس بالکل کے مکتب فکر کر رہے ہیں۔ بعض افرادی مذہبی سکالرز نے بھی اپنے طور پر اس سلسلے میں کوششیں کی ہیں۔ درج ذیل کا داش اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ پیشو و مفکرین کے نظریات کا جائزہ لینے کے بعد اپنے فہم قرآن کے مطابق کسی بھی زمانے کے معیار عقل کے ساتھ مذہبی عقائد کو مربوط کرنے کے اصول وضع کر کے اس کام کو آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ مسلمانوں میں قرآنی تناظر میں فلسفہ و سائنس کے مطالعہ اور تحقیق کی بصیرت پیدا ہو۔

**اہم اصطلاحات:** قرآن، سائنس، فلسفہ، قرآنی اصول، نظریہ ارتقاء، بدعت، تھیوری، مسلمہ سائنسی حقائق

فلوآف الیگزندریا (Philo of Alexandria c.20 BCE-40 CE) نے فلوجوڈیں بھی کہا جاتا ہے، ایک یہودی مذہبی سکالر تھا جو افلاطون (وفات 384 قم) کے فلسفے سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ وہ یہودیت کو صداقت کا الہامی اور افلاطونی فلسفے کو صداقت کا عقلی ورشن سمجھتا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ صداقت کا صداقت سے تناقض ممکن نہیں۔ (Truth cannot contradict truth.) عقائد مذہب کی فلسفیانہ اصطلاحات میں تعبیر، انہیں منطقی اصولوں اور فلسفیانہ نظریات سے ہم آہنگ ثابت کرنا اس کے نزدیک بڑا قبل قدر علمی کام تھا۔ اس کے زمانے میں ابھی کبھی علوم کی فلسفہ اور سائنس میں تقسیم وجود میں نہیں آئی تھی۔ صرف فلسفہ ہی تمام علوم کا مخزن سمجھا جاتا تھا۔ یہودیت کی فلسفہ افلاطون سے تطبیق کی بنیاد پر فلوتارخ فلسفہ میں مذہب کی عقلی تشكیل (reconstruction of religious thought) کے رجحان کا بانی قرار پاتا ہے۔ عیسائیت کے فروغ کے زمانے میں عیسائی علماء اور اسلام کے فروغ کے بعد مسلمان علماء بھی اس رجحان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور یہ کاوش آج تک چلی آرہی ہے۔

ٹالمی (پتو لمیوس-Ptolemy، 100-168ء) کا فلکیاتی ماذل ابن سینا (980-1037ء) کے زمانے کی سائنس تھی۔ بطیموسی تصور کائنات ارض مرکزی تھا۔ زمین کائنات کے مرکز میں واقع اور ساکن تھی۔ ارض مرکزی کائنات نو افلاک پر مشتمل تھی اور سورج، چاند اور معلوم سیاروں کو مختلف افلاک پر ظاہر کیا گیا تھا۔ پیشہ والوں نے فلکیات کی تحقیقات اور ارسٹو کے فلسفیانہ نظریات کے زیر اثر یہ کائناتی ماذل پیش کیا گیا جو تقریباً 1400 سال تک سائنسی نظریہ کائنات کی حیثیت سے رائج رہا۔ یقیناً اس کے کچھ عملی فوائد تھے تبھی یہ اتنا عرصہ قائم رہ سکا۔ مثلاً زرعی مقاصد اور تاریخی واقعات کا ریکارڈر کرنے کیلئے کینڈرو ضع کرنا ممکن ہو سکا۔ بابل کے لوگ سیاروں کو دیوتا مانتے تھے۔ چنانچہ علم النجوم اور سری علوم کی مختلف صورتیں وجود میں آئیں۔ اس ماذل کی بنیاد پر چاند اور سورج گر ہن اور موسوی کے بارے میں پیشین گوئیاں بھی ممکن تھیں۔

*Aristotle's Universe*Geocentric universe of Aristotle and Ptolemy<sup>34</sup>

ابن سینا قرآن کو صداقت کا 'الہامی' اور فلسفہ ارسطو اور بطیموس کے سائنسی فلکیاتی مائل کو صداقت کا 'عقلی درشن، سمجھتا تھا۔ فلو اور عیسائی علماء کی طرح اس کی بھی خواہش تھی کہ اسلام اور فلسفہ و سائنس میں مطابقت ثابت کر کے اسلام کو عقلی مذہب ثابت کر سکے۔ لیکن ہفت افلاک پر مشتمل قرآنی تصور کائنات اور نو افلاک پر مشتمل بطیموسی سائنسی تصور کائنات میں تطبیق کیونکر ممکن تھی! ابن سینا کو قرآنی فلکیات کو چھوڑ کر بطیموسی فلکیات کا اثبات کرنا پڑا۔ ارسطو اپنے فلسفہ میں خدا اور مادہ دونوں کو قدیم (eternal) ٹھہراتا ہے۔ کائنات کی ہر شے ان دونوں کے امتران سے وجود میں آتی ہے۔ اس طرح مادہ خدا کا ہمسر بھی ٹھہرتا ہے اور شریک بھی۔ جبکہ اسلام کا خدا واحد ہے۔ نہ کوئی اسکا ہمسر ہے اور نہ شریک۔ واحد یعنی تمام تینیت سے پاک ہے اور تمام تینیت کا ابداء کرنے والا ہے۔ جو کچھ بھی کائنات میں ہے وہ یا تو اس کی خلق کی کینیگری سے تعلق رکھتا ہے یا اس کے امر کی کینیگری سے، یا دونوں اس طرح کیجا ہیں کہ خلق، اللہ کے امر سے متحرک ہے۔ اب قرآن کے خدا کی ارسطو کے خدا سے تطبیق کیونکر ممکن تھی! ارسطو کا نظریہ ہے کہ

اپنے اندر کسی کمی کو پورا کرنے یا اپنے اندر کسی نقص کو دور کرنے کی تدبیر کی صلاحیت کا نام ارادہ ہے۔ اس طویل استدلال کرتا ہے کہ دونوں صورتوں میں صفتِ ارادہ اپنے موصوف کے نقص (imperfection) پر دلالت کرتی ہے۔ خدا کا تصور ایک کمال مطلق کی حامل ہستی (Absolutely Perfect Being) کی دلالت کرتی ہے۔ خدا کا تصور ایک کمال مطلق کی حامل ہستی (Absolutely Perfect Being) کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ لہذا صاحبِ ارادہ ہونا خدا کی شان کے منافی ہے۔ قرآنی پاک صفتِ ارادہ کو خدا کی شان قرار دیتا ہے۔ قرآنی خدا کی صفتِ ارادہ کو کسی اور صفت میں تحویل کئے بغیر ان دونوں قص نعم تصوراتِ خدا میں مطابقت قائم کرنا ممکن نہیں تھا۔ اسلام کی عقلی تشکیل کیلئے ابن سینا کو بھی کچھ کرنا پڑا۔ ابن سینا نے خدا کی صفتِ ارادہ کو اسکی صفتِ علم کے مترادف ٹھہرایا۔ صفتِ علم کا یہ تصور بھی قرآنی تصور نہیں تھا۔ تخلیق کائنات ارادے اور اسکی مطابقت میں امر کی متفاضلی ہے۔ جو خدا صاحبِ ارادہ اور صاحبِ امر نہ ہو وہ کائنات کا خالق کیوں نکر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ابن سینا کو قرآنی نظریہء تخلیق کی عقلی تعبیر کر کے اسے یونانی فلسفی فلاطینوس کے نظریہ سے مماش نظریہ صدور میں تحویل کرنا پڑا۔ وجود باری پر استدلال کرتے ہوئے ابن سینا خدا کا تصور علتِ العلل (prime cause / uncaused first cause) کی حیثیت سے کرتا ہے۔ کیا اس تصور خدا کو صاحبِ ارادہ اور صاحبِ امر خدا کے ساتھ ہم آہنگ کرنا ممکن ہے! فلسفی کسی مذہب کا پیروکار ہو تو بھی فلسفہ آرائی کرتے ہوئے وہ ظاہر یہی کرتا ہے کہ وہ اپنے مذہبی عقائد کو بالکل غیر جائز دار عقلی استدلال کی بناء پر ہی مانتا ہے۔ خدا کو علتِ العلل متصور کر کے ابن سینا علت اور معلول میں منطقی لزوم کے تعلق کو مانتے پر مجبور ہوا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ خدا آزاد رہانے انسان؛ خدا کا علم جزئیات سے انکار لازم ٹھہرا۔ دعا، مججزات، الہتی استعانت، حشر اجساد ہر چیز بے معنی ہو گئی۔ فلسفہ و سائنس کو صداقت کا عقلی معیار مانتے ہوئے وہ ان کا اثبات کر بھی کیسے سکتا تھا۔ ابن سینا، بطیموس کی نو افلک پر مشتمل فلکیات میں کسی بنیادی تضاد کی نشاندہی کر کے اسے مسترد کرنے، ہفت افلک پر مشتمل کوئی نیا نظریہء کائنات وضع کرنے، اس طویل فلسفیانہ تصورات کی ایسی تعبیر جو اسلامی عقائد سے متصادم نہ ہو، یا عقلی علوم کو قرآنی عقائد سے ریلیت کرنے کے بنیادی اصول وضع کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ (ابن سینا کے نظریات کے تفصیلی مطالعہ کیلئے دیکھئے ہمارا مضمون: ”تخلیق، صدور اور ہم ازیست“)

نظریات، اصطلاحات پر استوار ہوتے ہیں اور انھیں پر سوار ہو کر تاریخ میں اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔ اگر نظریات کی تشکیل یا تعبیر کیلئے غیر موزوں اصطلاحات کا اختیار کر لیا جائے تو وہ ان نظریات کے علاوہ دیگر نظریات کے صحیح فہم میں بھی رکاوٹ بنتے ہیں، اور بعض اوقات اس غلطی کے سبب کا ادراک ہونے اور

اس کا تدارک کر سکنے میں صدیاں گذر جاتی ہیں۔ اس طوکے تقریباً چودہ سو سال بعد امام غزالی صاحب (1111-1058ء) نے اس طوکے 'ارادے' کی تعریف میں پائی جانے والے نقش کا دراک کر کے 'ارادے'، کی وہ تعریف پیش کی جس کے مطابق صاحب ارادہ ہونا ایک شان قرار پاتا ہے اور خدا کی عظمت پر دلالت کرتا ہے۔ امام غزالی صاحب نے ابن سینا کے فلسفے میں پائے جانے والے دیگر نقائص کی بھی نشاندہی کی جو اس طوکی ما بعد الطیعت، منطق اور علیت کے تصورات کو قبول کر لینے سے اس کے نظریات میں در آئیں تحسیں (تحقیق، صدور اور ہم ازیت)۔

## نیوٹن کا نظریہ کائنات اور نیپھرل ازم

گیلیلیو، کوپر نیکس، اور جوہانس کپلر کی تحقیقات سے استفادہ کرتے ہوئے آئزیک نیوٹن (1643-1727) نے 1687ء میں ایک لامحدود، ازلی، مشین نما، سہ العادی مادی کائنات کا عظیم الشان نظریہ پیش کیا جس میں مقدار مادہ اور مقدار قوت ہمیشہ یکساں رہتے ہیں۔ مادہ اور قوت صرف شکلیں بدلتے ہیں لیکن کبھی مطلق طور پر فنا نہیں ہوتے۔ کائنات میں کوئی چیز داخل ہوتی ہے نہ خارج ہوتی ہے۔ قوانین فطرت بھی قدیم ہیں۔ کائنات ازل سے قوانین فطرت کے مطابق چلتی چلی آ رہی ہے۔ کائنات میں ما فوق الفطرت واقعہ (supernatural event) ممکن نہیں۔ کائنات اٹویک مشین کی مانند اپنے قوانین فطرت کے مطابق از خود چلتی چلی آ رہی ہے، اور چلتی چلی جائے گی۔ حرکت از خود نہیں ہو سکتی۔ مشین کو چلانے کیلئے سب سے پہلی حرکت کہاں سے آئی، صرف اس سوال کے جواب کیلئے نیوٹن خدا کو ماننے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اس مفروضے کے مطابق خدا وہ ہستی ہے جس نے کائنات کو پہلی بار حرکت دی۔ اس کے بعد خدا کا کائنات میں کوئی رول نہیں۔ کائنات کے پارٹ آپس میں اس طرح متعلق ہیں کہ ایک پارٹ میں کوئی تبدیلی دیگرا جزا میں ان کے نتائج کے مطابق خود بخود منتقل ہوتی چلی جاتی ہے۔ سہ العادی مادی کائنات میں تمام چیزیں اقید سی جیو میٹری کے مطابق ہیں۔ نیوٹن کے نظریے کو ما قبل نظریات پر یہ فوکیت حاصل تھی کہ اگر کسی مظہر کے بارے میں قانون فطرت معلوم کر لیا جائے تو ترقی یا نتائج ریاضیاتی نظام اور تجربی تصدیق کے ذریعے دنیا کے کسی بھی حصے میں اس کی توثیق کی جاسکتی تھی۔ زمان (Time) سہ العادی مادی کائنات کے یکساں طور پر متوازی، ایک یک بعدی، حقیقت کے طور پر ہمیشہ سے اس طرح موجود ہے کہ کسی لمحے زمین پر ہونے والا ایک واقعہ اور کروڑوں نوری سالوں کے فاصلے پر ہونے والا واقعہ ہموقت (simultaneous) ہوتے

ہیں۔ اس کائناتی ماذل میں تمام مقداریں، فاصلے اور وقت مستقل حیثیت رکھتے تھے۔ نیوٹن کے کائناتی ماذل میں، اسلام کے ہفت افلاک کے قصور کے مقابل، افلاک کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔<sup>35</sup> قرآن پاک جس خدا کے اسماء الحسنی بیان کرتا ہے، نیوٹن کے نظریہ کائنات میں اس کا کوئی مقام نہیں۔ اس کائناتی ماذل میں عبادت، دعا، انجام، مناجات، مجرمات اور الوہی ایڈمنیستریشن کی کوئی گنجائش نہیں۔ مادے، حیات، ذہن، روح، آزادی ارادہ وغیرہ کی تشرح کیلئے قوانین فطرت ہی کافی اور واحد ذریعہ ہیں۔ وحی والہام، روحانی تجربات سب خالصتاً فطری واقعات ہیں۔ کچھ بھی مافق الفطرت نہیں۔ وحی والہام کے مافیہ کو صرف اسی حد تک مانا جا سکتا ہے جس حد تک ان کی تشرح قوانین فطرت کے مطابق خالص عقلی انداز میں کی جاسکتی ہو۔ مذہب کا جواز یہی ہے کہ اسے راجح الوقت فلسفہ و سائنس کی بنیاد پر مانا ممکن ہو۔ نیوٹن کا مکینیکل ورلڈ یا ایک میکانیکی کائنات کا تصور پیش کرتا ہے جبکہ اسلام ایک الوہی طور پر ایڈمنیسترڈ کائنات (divinely administered universe) کا تصور پیش کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ نیوٹن کے نیچرل ازم کی بنیاد پر نہ تو شخصی خدا کو مانا جا سکتا ہے جس نے کائنات کو اپنے ارادے سے تخلیق کیا ہو، جو اپنے علم اور قدرت میں کائنات کا احاطہ کئے ہوئے ہو، اور نہ ہی ایسی کائنات کو مانا جا سکتا ہے جو حادث ہو اور اللہ کے علم اور امر سے ایڈمنیستر کی جا رہی ہو۔ نہ ہی فرشتوں کو مافق الفطرت ہستیوں کی حیثیت سے اور وحی والہام کو مافق الفطرت ذریعہ علم کی حیثیت سے، اور نہ ہی جنت، دوزخ، حیات بعد الممات اور جزا کے تصورات کو مافق الفطرت حقائق کی حیثیت سے مانا ممکن ہے (Evolving a Qur'anic Paradigm, 275-79)۔

## سرسید احمد خان کا جدید علم الکلام

### (Work of God overrides the Word of God)

سرسید احمد خان (1817-1898ء) کے زمانے میں نیوٹن کی سائنس کے وارث ہندوستان فتح مرچے تھے۔ حاکم کو مکھوموں پر ویسے ہی ایک فوقيت حاصل ہوتی ہے، اگر وہ محض جنگی قوت ہی میں فائقت نہ ہو بلکہ فی زمانہ برتر علمی قوت سے بھی لیس ہو تو مکھوموں کیلئے اپنے عقائد کا دفاع کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ہندوستانی مسلمان بھی اسی صورتحال سے دوچار تھے۔ انگریزوں کے ساتھ ان کے سکالر اور پادری بھی آئے جو مسلمانوں کے دعا، مجرمات، کائنات کی خدائی ایڈمنیستریشن، رسم و رواج، تاریخی واقعات، مذہبی روایات اور

دیگر بہت سے عقائد کو عقلی حوالوں سے چیلنج کر رہے تھے۔ وہ مسلمانوں کو معاشری اعتبار سے کھل ڈالنے کی پالیسی پر بھی عمل پیرا تھے۔ انہوں نے فارسی زبان کی جگہ، جو صدیوں سے مسلمانوں کی علمی، سرکاری درباری اور ثقافتی زبان کی حیثیت اختیار کر پچکی تھی، انگریزی زبان کو راجح کر کے مسلمانوں کو ان کے علمی اور ثقافتی ورثے سے محروم اور سرکاری ملازمتوں کیلئے نااہل کر دیا۔ اس صورتحال میں سید احمد خان مسلمانوں کی مدد اور رہنمائی کیلئے آگے بڑھے۔ اسوقت ہم اس چیلنج پر توجہ مرکوز کریں گے جو برٹش انڈیا میں علمی اور مذہبی حیثیت سے مسلمانوں کو درپیش تھا اور سر سید احمد خان نے اس کا جو حل پیش کیا اس کی قدر و قیمت کا جائزہ لیں گے۔

نیوٹن کا میکانیکی نظریہ کائنات سر سید احمد خان کے زمانے کی سائنس اور اس کے ساتھ ابھرنے والا نیچرل ازم ان کے زمانے کا فلسفہ تھا۔ یہ دونوں بہت سے بنیادی نکات پر اسلام سے تناقض تھے۔ سر سید احمد خان جدید فلسفہ و سائنس، برطانوی قوم کے معاشرتی، سیاسی اور ثقافتی انصباط، ان کے تعلیمی اداروں اور عقلی علوم سے بہت متاثر تھے۔ قرآن پاک کی عقلی تعبیر کر کے جدید فلسفہ و سائنس سے ہم آہنگ ثابت کرنا انہوں نے مسلمانوں کو ذہنی ہریت سے نکالنے کیلئے ضروری سمجھا۔ انیسویں صدی کے برٹش انڈیا میں مسلمانوں کو درپیش علمی چیلنج کی نوعیت یہ تھی کہ (۱) ثابت کیا جائے کہ نیچرل ازم غلط نظریہ ہے یا یہ مشکوک مفروضات پر مشتمل ہے؛ یا (۲) مسلمان ایسا نہ کر سکیں تو پھر طے کر لیں کہ ہمیں آنکھیں بند کر کے اپنے عقائد پر قائم رہنا ہے؛ یا (۳) فلو، عیسائیوں، اور ابن سینا کی طرح اپنے عقائد کی عقلی تعبیر کر کے انھیں اپنے زمانے کے معیار عقل (فلسفہ و سائنس)، ان کے بنیادی مفروضوں، نتائج اور مضمرات کے ساتھ ہم آہنگ ثابت کیا جائے۔ سر سید احمد خان نے اس آخری کام کا بیڑہ اٹھایا اور پندرہ نکات پر مشتمل ایک فریم و رک پیش کیا جسے انہوں نے 'جدید علم الكلام' (Theology of modernity) کا نام دیا۔

ابن سینا کی طرح سر سید احمد خان بھی خدا کا اثبات کو نیاتی استدلال کے ذریعے علت العلل (Uncaused First Cause) کی صورت میں کرتے ہیں، اس علت العلل کو وحدت الوجودی انداز میں متصور کرتے ہیں، اور صفات باری کی تعبیر مغزلہ کے انداز میں، الوہی فعلیت کے طور پر، کرتے ہیں۔ اس نظریہ کو سر سید احمد خان کے 'ریشنل سپر نیچرل ازم' کا نام دیا جاتا ہے۔ Muhammad Khalid Masud (2007) علت العلل کے صاحب شعور، صاحب ارادہ، خالق کائنات ہونے کا جواز کیے پیش کیا جا سکتا ہے۔

علت اعلل کس طرح ”دو دن میں زمین کو تخلیق کرنے، کل چار دن میں زمین سمیت اس پر رکھے گئے وسائل تخلیق کرنے، دو دن میں سات آسمان تخلیق کرنے“ کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ (القرآن، 41:9-12)

اس عقیدے کی بنیاد پر وحی والہام، نبوت و رسالت، روحانیت، ہفت افلاک، حیات بعد الالمات، حشر، اخلاقی آزادی اور ذمہ داری وغیرہ عقائد کا اثبات کیونکر ممکن ہے، ان کا کچھ ذکر ہم شیخ الرئیس ابن سینا کے ضمن میں کر آئے ہیں۔ قرآن پاک خدا کو احتیاج سے پاک، اور اپنے علم، ارادے اور امر سے کائنات کو تخلیق کرنے والا ٹھہر اتا ہے۔ فطرت، قوانین فطرت، قانون علیت اسکے مقرر کردہ اور اس کی قدرت کے تابع ہیں ناکہ وہ خود علت ہے، یا قانون علیت کے تابع ہے۔ قرآن پاک اپنے کو ’الحق‘، یعنی معیار حق قرار دیتا ہے۔ جو نظریہ، تصور، تعقل اس سے ہم آہنگ ہے وہ حق ہے، جو اس سے تناقض ہے، باطل ہے، جو اس کے خلاف ہے ’بغیر الحق‘، ہے، اس سے انحراف ’اصلال‘ ہے، اسکی سند کے بغیر بات کرنا ’ظلن‘ (conjecture) ہے اور ظلن کسی کو حق سے مستغنی نہیں کر سکتا۔ اللہ کے بارے میں ایسا دعویٰ کرنا جس کی تصدیق قرآن پاک سے نہ ہوتی ہو، ’افتری‘ (concoction) ہے۔

قرآنی تعلیمات کو نیوٹن کی میکانیکی سائنس اور اس سے اخذ ہونے والے نیچرل ازم کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کیلئے سر سید احمد خان نیچر کیلئے صفتِ الہی (Work of God) اور قرآن پاک کے لئے ’کلام الہی‘، (Word of God) کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں اور استدلال کرتے ہیں کہ چونکہ دونوں کا منبع ایک ہی ذات باری ہے اس لئے ان میں تناقض ممکن نہیں۔ اپنے ’جدید علم الکلام‘ کا، ہم ترین اصول پیش کرتے ہوئے سر سید استدلال کرتے ہیں کہ ’سائنس و فلسفہ‘ اور ’کلام الہی‘ میں تناقض کی صورت میں کلام الہی کو استعاراتی تعبیر کے ذریعے کائنات کی سائنسی تعبیر کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے گا (Iqbal's Approach to Islamic Theology of Modernity 2007)۔ یہ اصول، قرآن پاک، ہو اسلام میں معیار حق کا درجہ رکھتا ہے، کی تعبیر کو نیچر کی سائنسیک سڑی کے تابع کر دیتا ہے۔ سر سید احمد خان کے نزدیک نیوٹن کا نظریہ کائنات، ہی کائنات کی سائنسیک سڑی کا معیار تھا۔ سر سید احمد خان ۱۸۹۸ء میں دنیا سے رخصت ہوتے ہیں اور آئن سائنس کا پیش نظریہ اضافت ۱۹۰۵ء میں اور جزل نظریہ اضافت ۱۹۱۵ء میں نیوٹن کے میکانیکی نظریہ کائنات اور اسکی معیت میں پیدا ہونے والے نیچرل ازم کی جگہ لے لیتے ہیں جس کے ساتھ قرآن پاک کو عقلی

تشکیل کے ذریعے ہم آہنگ کرنے میں سر سید احمد خان نے زندگی کی بہترین صلاحیتیں اور وقت صرف کر دیا تھا۔ (Evolving a Qur'anic Paradigm, 278-80)

## آئن شائن کا نظریہ کائنات اور نیچرل ازم

نیوٹن کے نیچرل ازم میں مکان اور زمان میں کوئی تعلق نہیں تھا۔ فزیکل سپس ایک فلیٹ، سد العادی، لا محدود مادی مسلسلہ (three dimensional continuum) اور زمان، یک بعدی مسلسلہ کے طور پر ازل سے سپس کے متوازی حقیقت کے طور پر موجود تھا۔ نیوٹن کی کائنات، ایک لا محدود سپس تھی جو ایک لا محدود یونیفارم ٹائم کے متوازی موجود تھی۔ آئن شائن نے نیوٹن کے بر عکس اپنے نظریہ، اضافیت میں تجویز کیا کہ ٹائم، الگ حقیقت نہیں بلکہ سپس ہی کی ایک ڈائمنشن ہے۔ آئن شائن کا نیچرل ازم سپس کو چهار العادی حقیقت کے طور پر دیکھتا ہے۔ اس میں ٹائم مطلق نہیں، تجربہ لئنہ کے اعتبار سے اضافی ہے۔ آئن شائن کی مکانی-زمانی کائنات کی بنیادی اکائیاں واقعات (events) ہیں جبکہ نیوٹن کی میکانی کائنات میں بنیادی اکائیاں چیزیں (things) تھیں۔ آئن شائن نے یہ بھی تجویز کیا کہ مکان-زمان فلیٹ نہیں بلکہ کروی ہے۔ آئن شائن یہ بھی کہتا ہے کہ بہت بڑے ماس والی چیزیں ٹائم کو تیزیاب ہم کر سکتی ہیں۔ کائنات کل کتنے العاد پر مشتمل ہے، حتی طور پر کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ چند ہم عصر نظریات تجویز کرتے ہیں کہ کائنات کے العاد اس سے کہیں زیادہ ہو سکتے ہیں جتنے آئن شائن نے تجویز کئے تھے۔ نیوٹن کی طرح، آئن شائن بھی شخصی خدا پر یقین نہیں رکھتا تھا، نہ ہی کائناتی معاملات میں کسی ماوراء فطرت ہستی کے عمل دخل کو مانتا تھا

<sup>36</sup>—(Space-time in Encyclopaedia Britannica)

## اقبال کا جدید علم الکلام: مذہبی علم کی سائنسی تشکیل

آئن شائن کا نیچر اور کائنات کے سڑکجر کے بارے میں نظریہ، جیسے کہ ہم دیکھ آئے ہیں، نیوٹن کے نظریہ سے یکسر مختلف تھا۔ ایک بہت بڑا فرق یہ تھا کہ نیوٹن کے نزدیک کائنات ازلی جبکہ آئن شائن کے نزدیک حادث تھی۔ سر سید کے مخولہ بالا اصول کو ماننے کی صورت میں قرآن پاک کی ان آیات کو جو کائنات کو حادث قرار دیتی تھیں، نیوٹن کے ازلی کائنات کے سائنسی نظریہ سے ہم آہنگ کرنے کیلئے استعاراتی تعبیر کر کے کائنات کو ازلی ثابت کرنا ضروری تھا۔ نیوٹن کے نزدیک کائنات کلوژڈ جبکہ آئن شائن کے نزدیک

مسلم پھیلتی ہوئی تھی۔ قرآن پاک بھی کلوڈ کائنات کا تصور نہیں دیتا۔ چنانچہ وہ آیات جو کلوڈ یونیورس کے خلاف جاتی تھیں، ان کو بھی استعاراتی تعبیر کے ذریعے کلوڈ یونیورس کے تصور سے آہنگ کرنا ضروری تھا۔ نیوٹن اور آئنسٹائن، دونوں کے نظریہ کائنات میں آسمانوں کا کوئی تصور نہیں۔ چنانچہ وہ آیات جن میں سات آسمانوں کا تصور ہے، انکی استعاراتی تعبیر کر کے انھیں ان کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے گا۔ یہ صرف تین مثالیں ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی مثالیں قارئین خود سوچ سکتے ہیں۔

نظریہ اضافیت کے بعد سر سید احمد خان کی قرآن پاک، فلسفہ اور سائنس کو مربوط کرنے کی کاوش فرسودہ اور غیر متعلق ٹھہری۔ اب ایک نئے سکالر کی ضرورت تھی جو کلام الہی کی نئی تعبیر کر کے ثابت کرے کہ یہ آئن سائنس کے سائنسی نظریہ کائنات، نئے نیچرل ازم، دیگر فلسفیانہ اور عقلی علوم کے ساتھ آہنگ ہے یا انھیں ریلیٹ کرنے کے نئے اصول پیش کرے۔ یہاں اقبال، اپنے خطبات کی صورت سامنے آتے ہیں جو 1932ء میں بعنوان "Reconstruction of religious thought in Islam" شائع ہوئے۔ ان خطبات میں اقبال، قرآن پاک کی نئی تعبیر کے ذریعے جدید عقلی علوم کی طرز پر "مذہبی علم کی سائنسی تشكیل" (scientific form of religious knowledge) کا تصور پیش کرتے ہیں۔ جناب باسط بلال کو شل اپنے مضمون "Muhammad Iqbal's reconstruction of the philosophical arguments for the existence of God" پر علامہ اقبال کے نظریات کو بڑے موزوں الفاظ میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

1۔ اگر مذہب ایسے طالیں علم کو متوجہ کرنے کا خواہشند ہے جو ایمان کے لئے، روایت، ثقافت اور عقیدہ، کی بجائے ذاتی تجربہ کو اہمیت دیتے ہیں، تو اسے اپنے آپ کو سائنسی تشریح کیلئے پیش کرنا ہو گا۔  
2۔ اگر سائنس، تجربے اور مشاہدے پر بنی حقیقت کا ایک کلیق بیانیہ (coherent and holistic account) پیش کرنا چاہتی ہے تو اسے اپنے آپ کو مذہبی تشریح کیلئے پیش کرنا ہو گا۔

اقبال سمجھتے ہیں کہ ایمان کی بنیاد ایک خاص قسم کے داخلی تجربہ پر ہوتی ہے۔ تصوف، نفسیاتی اور روحانی مشقیں وضع کر کے صدیوں مذہبی افراد کیلئے اس داخلی تجربہ کے ارتقاء کیلئے سہولت فراہم کرتا رہا ہے۔ جدید علوم اور سائنسی تجربے کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ کر سکنے کی بناء پر اب تصوف اس ضرورت کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ اس سے اقبال کے جدید علم کلام کا دوسرا نکتہ اخذ ہوتا ہے کہ "جدید کلچر کی یونیک خصوصیات کے پیش نظر اس داخلی تجربے کو ممکن بنانے کیلئے جس پر ایمان کی بنیاد ہوتی ہے،

مذہبی فکر کی سائنسی تشكیل (scientific form of religious knowledge) از بس ضروری ہے۔ ”ڈاکٹر باسط بلاں کو شل کے خیال میں ”سائنسی فکر کی قرآنی تناظر میں تشریح اور مذہبی فکر کی جدید سائنسی تناظر میں تشریح کے ذریعے ان دونوں میں ہم آہنگی پیدا کر کے ہم مذہبی فکر کا وہ سائنسی ورش تشكیل دے سکتے ہیں، جسے اقبال اس داخلی تجربے کے لئے لازم سمجھتے ہیں جس پر ایمان کی بنیاد ہوتی ہے۔“

(Koshal, 127)

درج بالا نظریہ کے ثابت یا منفی حاصلات و مضرمات پر کوئی بحث بے سود ہو گی تاؤ قتیک اقبال کے بنیادی تصور کے درست یا نادرست ہونے کا جائزہ نہ لے لیا جائے۔

ہمارا احساس یہ ہے کہ اگر نیچر کا خدا کے ساتھ ویسا ہی تعلق ہے جیسا کہ کیر یکٹر کا انسان سے ہوتا ہے، اگر یہ الہی ذات کے ساتھ اسی طرح متعلق ہے جیسے اعضاء کی وجود سے متعلق ہوتے ہیں، اگر نیچر کو اللہ کی عادت کے طور پر متصور کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ اقبال کہتے ہیں، پھر لازم ہے کہ نیچر بھی ازلی اور غیر تخلیق شدہ ہو۔ اور یہ بات قرآنی تعلیمات کے صریحاً خلاف ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا نہیں ہے کہ ”کوئی شےء اسکی مثل نہیں۔“ (42:11) الہذا وہ کسی کے مثال ہونے سے یکسر پاک اور انسانی خیال، وہم، تصور، تخیل، تعقل سے ماوراء ہے۔ پھر حیات باری کو کیونکر انسانی حیات پر قیاس کیا جاسکتا ہے! قرآن پاک فرماتا ہے: ”وہی ہے جس نے تخلیق کیا ہے زمین و آسمان کو اور جو کچھ اُنکے مابین ہے۔“ (اقرآن، 30:8) کیماں اور نیچر، حیات اور کردار، ذہن اور شعور، سماج اور سیاست غرض انسانی تجربہ کے تمام ڈو میں جنہیں فزیکل، بائیولوجیکل اور سائینکلوجیکل، سو شل سائنسز اور دیگر علوم سٹڈی کرتے ہیں، اللہ کے تخلیق کردہ نہیں! پھر کیسے اسی کی تخلیق کردہ نیچر کو اس کے ساتھ آر گینک قرار دیا جاسکتا ہے!

## قرآنی تناظر میں نیچر کو سٹڈی کرنے کا جینسٹن طریقہ — امام غزالی سے

### ایک مثال

الفارابی اور ابن سینا، ارسٹو کے زیر اثر، خدا کو عملت العلل متصور کرتے ہیں، اور اسکی صفت ارادہ کو اسکی صفت علم میں تحويل کر دیتے ہیں۔ اب انھیں ایک ایسے نظریہ کی ضرورت تھی جس میں وہ کائنات کو ارادہ الہی کے بغیر خدا سے منصہ شہود پر آتا ہوا دکھائیں۔ یہاں فلاطینوس کا نظریہ صدور of (theory of

(emanation) جس میں کائنات ذات باری کی شان امکلیت سے اس کے ارادہ اور امر کے بغیر صادر ہوتی ہے، ان کی مدد کیلئے آگے آتا ہے اور ابن سینا اس میں کچھ تبدیلی کر کے برآ راست صدور کی بجائے درجہ بدرجہ صدور کا نظریہ پیش کرتا ہے جس میں کائنات خدا کے شعور ذات سے دسویں مرحلے پر ظہور پذیر ہوتی ہے۔ شیخ الرئیس ابن سینا فلاسفہ بھی ہے اور فرمیں ہونے کے ناطے سائنسدان بھی ہے۔ جبکہ امام غزالی متكلّم ہیں، فلاسفہ ہیں اور شاہدین میں سے ہیں۔ نظریہ علت، ابن سینا کے فلسفہ کے دو بنیادی تصورات میں سے ایک ہے۔ ابن سینا کے تصور خدا کی لازمی صفت اس کا "علم" ہے نہ کہ "ارادہ"۔ لہذا یہ قطعاً تصور نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا علم کسی بھی مقام پر منطق کے اصولوں کی خلاف ورزی کرے گا۔ منطق میں نتیجہ اپنے مقدمات سے منطقی لزوم کے ساتھ اخذ ہوتا ہے۔ ابن سینا کے خدا سے جو بھی صادر ہو گا وہ منطقی لزوم کے ساتھ ہو گا۔ ابن سینا کا نظریہ علت، علت اور معلول میں منطقی لزوم کے تعلق پر استوار ہے۔ ایسی کائنات جس میں تمام معاملات بشمول نفیاتی اور اخلاقی معاملات، منطقی لزوم سے وجود پذیر ہوتے ہوں، وہاں جبریت کا دور دورہ ہو گا۔ خدا بھی آزاد نہیں رہے گا۔ انسان کو اخلاقی آزادی سے محروم کرنے کا نتیجہ اخلاقی جبریت کی صورت میں نکلتا ہے۔ جواب ہی اور جزا کے تصورات بے معنی ہو جاتے ہیں، دعا و استغاثت کی کوئی حقیقی اہمیت نہیں رہتی، خدا کی قدرت مطلق بھی علت معلول کی منطقی جبریت کے تابع ہو جاتی ہے۔ خدا، کائنات سے صرف منطقی طور پر متقدم اور کائنات خدا سے صرف منطقی طور پر متاخر ٹھہرتی ہے، زمانی اعتبار سے دونوں ہم ازلی (co-eternal) ہے۔ قانون علیت ایک ایسی کلی جبریت کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے جو خدا اور انسان سمیت ہر شے کو اپنی گرفت میں جگڑ لیتی ہے۔ ارسٹوکی ما بعد الطبیعت جس کا ارشاد الرئیس ابن سینا اتباع کرتے ہیں، کے مطابق ہر چیز مادہ اور صورت کے دو اصولوں سے مرکب ہے۔ ہر شے میں ہیئت (essence) اور وجود (existence) کی دوئی پائی جاتی ہے۔ صرف خدا کی ذات ہی مطلق طور پر سادہ ہے، جس میں نہ مادہ اور صورت کی دوئی پائی جاتی ہے اور نہ ذات اور صفات کی کثرت۔ اسے خدا کی "مطلق سادہ نوعیت" کہا جاتا ہے۔ ابن سینا توحید باری کے قرآنی اصول کی فلسفیانہ تعبیر "خدا کی مطلق سادہ نوعیت" (Absolute Simplicity of God) کی صورت میں کرتا ہے۔ جب منطقی طور پر کوئی چیز اس سے متقدم ہے، ہی نہیں تو اس کا علم اپنے شعور ذات سے سوا ہو ہی کیا سکتا ہے۔ چنانچہ اس کا علم ذات بھی مطلق طور پر سادہ اور کثرت

سے پاک ہو گا۔ اور اس کا شعور ذات مشتمل کس چیز پر ہو گا، یہ کہ صرف وہی واجب الوجود ہستی ہے اور ہر ممکن الوجود ہستی اسی پر منحصر ہے۔ یہاں شیخ الرئیس ابن سینا اپنے نظریہ علت کا ایک اہم اصول ”ایک سے ایک کا صدور“ متعارف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خدا کے مطلق سادہ اور واحد علم سے ایک ہی چیز صادر ہو گی جسے ابن سینا عقل اول کا نام دیتا ہے۔

ابو حامد محمد ابن محمد الغزالی (1058-1111ء) اپنے زمانے کے مشہور مذہبی سکالر اور متكلم تھے جو بعد میں تصوف کی طرف چلے گئے۔ الغزالی، مذہبی بنیاد پر ابن سینا کے نظریہ علیت سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کا ایمان تھا کہ جو کچھ اللہ، اسکے اسماء الحسنی، اور نیچر کے بارے میں قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے، وہ قطعاً غلط نہیں ہو سکتا اور یہ کہ جو نظریہ قرآنی تعلیمات سے متصادم ہو، کتنی بھی فلسفیہ قابلیت کے ساتھ کیوں نہ تشکیل دیا گیا ہو، قطعاً درست نہیں ہو سکتا۔ وہ ارسٹو کے فلسفہ کو قرآن پاک کے مقابل صداقت کا درجہ کبھی بھی نہیں دے سکتے تھے۔ انھیں ذرہ بر ابر شک نہیں تھا کہ شیخ الرئیس ابن سینا کی کمال ذات (پر فیکشن) اور ارادے کی تعریف، جس کی بنا پر وہ اللہ کے صاحب ارادہ ہونے سے انکار پر مجرور ہوا، خدا کی مطلق سادہ نو عیت کا نظریہ، جس سے وہ علم الہی کی وحدت، کلیت اور ازادیت اخذ کرتا ہے، علم الہی کی کلیت اور ازادیت کا نظریہ جس سے وہ خدا کے علم جزئیات کے انکار پر مجرور ہوا، خدا کا بطور علت العلل تصور اور نظریہ علیت، اپنے تمام جبریتی مضررات کے ساتھ صریحًا باطل تھے۔ الغزالی کو مطلق یقین تھا کہ قرآن پاک کے ہفت افلاک پر مشتمل تصور کائنات کے مقابل ٹو افلاک پر مشتمل فلکیات کبھی بھی درست نہیں ہو سکتی۔ ایمان کی یہ پختگی الغزالی کو وہ قابلیت عطا کرتی ہے جس سے وہ ارسٹو اور شیخ الرئیس ابن سینا کے نظریات میں پائے جانے والے تناظرات اور منطقی تضادات کو پیچان لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور قرآن پاک کی مطابقت میں ان تصورات کی تشکیل نواس طرح کرتے ہیں کہ ”ارادہ الہی“ ذات باری کی شان بن جاتا ہے۔ اس تعبیر کے مطابق ”ارادہ الہی“ دو تناقض یا متقابل ممکنات میں سے کسی ایک کو، بغیر کسی اصول ترجیح کے، اختیار کر لینے کا نام ہے۔ کائنات نہیں تھی۔ اس کی تخلیق سے اللہ تعالیٰ کی شان میں کوئی اضافہ نہ ہوتا، اور تخلیق نہ کرنا شان میں کسی کی کا باعث نہ ہوتا۔ بغیر کسی اصول ترجیح کے اللہ تعالیٰ نے چاہا اور اسے تخلیق کر دیا۔ یہ تعریف ارادہ الہی کو ایک شان بنادیتی ہے اور کمال مطلق (پر فیکشن) کے اس یونانی تصور کو جو خدا کے عدم تغیر (immutability) پر مبنی ہوتا ہے، مسترد کرتی ہے۔ الغزالی، ابن سینا کے تصور خدا بطور علت العلل اور

اس کے تمام مضمرات کا بھی استرداد کرتے ہیں۔ الغزالی کا ایمان تھا کہ قرآن الحق ہے۔ جو نظریہ قرآن پاک سے متصادم ہے، وہ یقیناً ناقص ہے اور اس کا تضاد اسکے اپنے اندر موجود ہے۔ قرآن پاک کی صداقت پر ایمان الغزالی کو اس قبل بناتا ہے کہ وہ نہایت آسانی کے ساتھ ابن سینا اور ارسطو کی فکر میں ان تضادات کی نشاندہی کر لیتے ہیں۔ اس تنقیدی جائزہ کے دوران الغزالی کا اپنا نظریہ وجود پذیر ہوتا ہے۔ الغزالی خدا کا تصور پیش کرتے ہیں جو اپنے ارادے اور امر سے نظام کائنات ایڈ منٹر کر رہا ہے۔ ابن سینا کے ازیت کائنات کے تصور کو مسترد کر کے الغزالی ایک حادث کائنات کیلئے استدلال کرتے ہیں، جس کے ساتھ ہی زمان کا آغاز ہوتا ہے۔ ابن سینا کے علت۔ معلوم کے منطقی لزوم کے تعلق کا استرداد کر کے وہ نفسیاتی لزوم کا تعلق پیش کرتے ہیں۔ الغزالی یہ نظریہ گیارہویں صدی عیسوی میں پیش کر رہے ہیں، جب کہ ایک جدید مغربی فلسفی ہیوم اٹھارویں صدی عیسوی میں اسی نظریہ کی تصدیق کرتا ہے۔ جدید فلسفہ اور سائنس علت اور معلوم کے ماہین کسی منطقی لزوم کو تسلیم نہیں کرتے۔ اسی طرح الغزالی اس بات کو مسترد کرتے ہیں کہ علت کوئی سادہ، وحدانی، واقعہ (unitary event) ہوتی ہے۔ وہ استدلال کرتے ہیں کہ علت ایک مرکب واقعہ (composite event) ہوتی ہے۔ وہ استدلال کرتے ہیں کہ یہ بھی قطعاً ضروری نہیں کہ ایک معلوم ہمیشہ ایک ہی خاص علت سے پیدا ہو۔ برٹنیڈر سل (1872-1970ء) اسی نظریہ کا اثبات بیسویں صدی میں کرتا ہے۔ الغزالی، مسلم فلسفیوں کے ایک سے ایک کے صدور، کے نظریے کا بھی استرداد کرتے ہیں۔ الغزالی استدلال کرتے ہیں کہ ایک ہی معلوم کے مختلف علتوں سے پیدا ہونے (multiple realization of effects) میں کوئی منطقی تضاد واقع نہیں ہوتا۔ ایکیسویں صدی کے مشہور فلسفی اور اکانومسٹ جان سٹوارٹ مل (1806-1872ء) نے اپنے علتوں کی تکثیر (plurality of causes) کے نظریے کے ذریعے اسی بات کی تصدیق کی۔

مسلم فکر کی تاریخ میں یہ بہترین مثال ہے حضرت علامہ اقبال کے اس تصور کی جسے باسط بلاں کوشل قرآنی تناظر میں سائنسی اور فلسفیانہ فکر کی تعبیر، اور سائنسی اور فلسفیانہ فکر کے تناظر میں مذہب کی تعبیر کا نام دیتے ہیں اور جو حضرت علامہ کے خیال میں ہمیں مذہبی علم کا وہ سائنسیک ورشن (scientific form) مہیا کر سکے گا جس کا ہونا اس باطنی تجربہ کیلئے لازم ہے جس پر ایمان کی حقیقتی بنیاد ہے۔ آئیے اس تناظر میں حضرت علامہ کے نظریہ کا جائزہ لیتے ہیں۔

## علامہ محمد اقبال کے نظریات کا تنقیدی جائزہ

آنٹائن کے نظریہ اضافت کے ساتھ جنم لینے والے بیچرل ازم کا زمان۔ مکان مسلسلہ-space (space-continuum) جو زمان کو مکان کا چوتھا بعد قرار دیتا ہے، عالم طبعی کے تجربہ کی، جدید سائنسیک تعبیر ہے۔ اس سے آئنٹائن (1879-1955ء) کے نظریہ زمان کے مضرات کے طور پر ہم وقتیت (simultaneity) کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ حضرت علامہ کا ایک مشہور ہم عمر فلسفی برگسال (1859-1941ء) آئنٹائن کے نظریہ زمان کے مضرات کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اس کے ساتھ اتفاق نہیں کرتا اور زمان اور حقیقت مطلق کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کرتا ہے۔ چنانچہ 'تصور زمان'، حضرت علامہ کے دور کے سائنسی اور فلسفیانہ غور و فکر کے موضوعات میں بنیادی اہمیت حاصل کر لیتا ہے۔ حیاتیات اور نفیا (modernity) زمان، حیات، سیلف (خودی) اور خودی کی خود اختیاری (autonomy of self) کے مسائل کی صورت میں حضرت علامہ کے سامنے منکشف ہوتی ہے۔ مسلم مفکر کی حیثیت سے حضرت علامہ نے یہ چاہا کہ جدیدیت کے ان نمائندہ مسائل کی اسلامی تناظر میں تشکیل نو کریں۔ برگسال، زمان کو حقیقت مطلق کی اصلیت (time as essence of ultimate reality) کے طور پر دیکھتے ہیں۔ علامہ اقبال، برگسال کے اس تصویر سے متاثر ہوتے ہیں۔ نفیات نے فرد کے باطنی کو انس و احوال کے مطالعہ کیلئے درون بینی (introspection) کا طریقہ متعارف کرایا تھا۔ حضرت علامہ کو، ان دو تصویرات میں فلسفہ خودی کی تشکیل اور وجود باری کے اثبات کا امکان دیکھائی دیتا ہے۔ وجود باری کے اثبات کے روایتی استدلال کو وہ پہلے ہی مسترد کر چکے تھے۔ سوال یہ تھا کہ زمان اور ذات کو کیسے متصل کیا جائے۔ درون بینی (انٹرو پیسکشن) کے ذریعے علامہ اقبال 'سیلف' کا تصور 'خودی' کی حیثیت سے کرتے ہیں یعنی وہ چیز جو اپنا شعور ذات 'میں' (I-am) کہہ کر کرتی ہے۔ انکا استدلال یہ ہے کہ 'حیات' اور 'سیلف' کا 'زمان' کے بغیر تصور محال ہے۔ اسکے خیال میں 'زمان'، ہر شے کی ایسنس ہے۔ اسی بات کو وہ خدا پر بھی عائد کرتے ہیں۔ انسانی خودی کی مثالیت پر جب وہ خدا کو خودی 'مطلق' کہتے ہیں، ابدی حال (eternal now) یا دورانِ خالص (pure duration) کی حیثیت سے 'زمان الہی'، کا تصور کر کے اسے خودی 'مطلق' کا لازمی

فیکٹر قرار دے دیتے ہیں۔ قرآن پاک سے اپنے نظریہ کی تصدیق نہ پاسنے کے بعد وہ ذخیرہ حدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جہاں انہیں ایسی ایک روایت مل جاتی ہے جس کی بنیاد پر وہ خدا اور زمان کو ایک دوسرے کا عین قرار دیتے ہوئے، مذہبی علم کو سائنسیف فارم (scientific form of religious knowledge) میں تشکیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ روایت معمولی اختلاف کے ساتھ پانچ مختلف صورتوں میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مردی ہے۔ ہم اپنے مضمون ”کیا اللہ الدّھر ہے!“ میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ پانچویں روایت سے اگر صریحایہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ اور الدّھر (زمان) ایک دوسرے کا عین ہیں، تو پہلی اور چوتھی روایت سے اس کے بالکل متفاہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے یعنی یہ کہ اللہ اور الدّھر (زمان) ایک دوسرے کا عین نہیں ہیں۔ (دوسری اور تیسری روایت کی تاویل دونوں طرح ممکن ہے۔) اگر پہلی اور چوتھی روایت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فرمائی ہوئی ہیں تو پھر آخری یعنی پانچویں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فرمائی ہوئی نہیں ہو سکتیں۔ یا پھر لازم ہے کہ روایت کے دوسرے، تیسرا اور پانچویں درشن کی تاویل مکملات کی مطابقت میں اس طرح کی جائے کہ پہلی اور چوتھے درشن کے ساتھ ان کا تضاد باقی نہ رہے (صحیح مسلم، 421-22)۔<sup>37</sup>

کیا کوئی روایت جس کی قرآن پاک سے تصدیق نہ ہو سکے، جو لفظی معنوں میں قرآن پاک سے متناقض ہو، حضور نبی پاک ﷺ کی فرمائی ہوئی بات ہو سکتی ہے! اکیا ایسی روایت سند ہو سکتی ہے؟ اکیا ایسی روایت کو بنیاد بنا کر مذہب اور سائنس کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش صحیح سمت میں ہو گی؟ کیا ضروری نہیں کہ عقائد سے متعلق روایت کی ایسی تاویل کی جائے جو مکملات سے ہم آہنگ ہو؟ اگر ”زمانہ اللہ ہے / اللہ زمانہ ہے“ تو کیا زمانہ، غیر مخلوق اور قدیم نہیں بن جاتا۔ کیا زمان کی ازیت اور غیر مخلوق ہونا کائنات کو غیر مخلوق اور قدیم نہیں بنادیتا! کیا اتنی سینا، سر سید احمد خان اور علامہ اقبال کے فسے میں کوئی فرق رہ جاتا ہے؟ اگر ”زمان ذات باری کا ایک لازمی فیکٹر ہے۔“ تو کیا برگس اور اقبال ذات باری کے ایک لازمی جزو دریافت کرنے میں کامیاب نہیں ہو گئے، جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَيَسْ كَمْثُلُهُ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴿القرآن، 42:11﴾ کیا انسانی عقل، ذات باری کا احاطہ کر سکتی ہے؟

فلسفہ اقبال کے اصولوں میں سے ایک جس پر انکے ”تشکیل جدید الہیات اسلامیہ“ کی بنیاد ہے، ”انسانی خودی کی مثالیت پر خدا کو خودی، مطلق متصور کرنا ہے۔“ فلسفہ اقبال کا دوسرا اصول ”خدا اور زمان

کی عینیت ہے۔ یہ دونوں اصول بحوالہ آیت نمبر ۱۱:۴۲ خلاف حق ہیں۔ اسی اصول عینیت کو ڈاکٹر باسط بلاں کو شل ”اقبال کا زمانے کا قرآنی سائنسی تصور“ (Iqbal's Qur'anic-scientific conception of time) قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر کو شل ”تحرک، خلاقت، اور آزادی کی صفات کو خدا اور زمان کی مشترک خصوصیات قرار دے کر اقبال کے ’خدا اور زمان کی عینیت‘ کے نظریے کو جواز مہیا کرتے ہیں۔ ”چونکہ یہ مضمون صرف اقبال ہی کی ”تفکیل جدید الہیات اسلامیہ“ کے تقدیمی جائزہ پر مشتمل نہیں ہے، اسلئے زیادہ تفصیل میں جائے بغیر اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ اگر حضرت علامہ کی ’اللہ اور زمانہ کی عینیت‘، قرآن پاک سے ثابت ہو جاتی ہے تو اس عینیت کے اخلاقیتی، وجودیاتی و دیگر فلسفیانہ مضمرات بھی۔ جو اقبال اخذ کرتے ہیں درست قرار پاسکیں گے اور اگر معاملہ اس کے بر عکس ہو تو کیا حضرت علامہ کے اخلاص نیت، اور علمی درجے کے اعتراف کے باوجود ہم یہ کہنے میں حق بجانب نہیں ہو گئے کہ حضرت علامہ کی مسامی بھی الشیخ الرئیس ابن سینا اور سر سید احمد خان کی مسامی کی طرح درست سمت میں نہیں تھیں، اس اصول کے مضمرات جو حضرت علامہ اخذ کرتے ہیں، بھی محل نظر ہیں اور جن علماء نے نہایت اخلاص اور محنت کے ساتھ حضرت علامہ کے ”خدا اور زمان کی عینیت“ کے نظریے کی ”قرآنی۔ سائنسی تصور زمان“ جیسی اصطلاحات میں تو ضجع کر کے اسے عین قرآنی تعلیمات کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وہ اپنی قابل قدر مسامی کے باوصف کامیاب نہیں ہو سکے۔ آئیے قرآن پاک کے تناظر میں اس ’اللہ۔ زمان‘ عینیت کا جائزہ لیتے ہیں۔

باسط بلاں کو شل صاحب فرماتے ہیں کہ ”اقبال یہ ثابت کرنے کیلئے کہ قرآن پاک ’زمان‘، کو خدا کی عظیم ترین علامت (symbol) قرار دیتا ہے، قرآن پاک کے تین مقالات سے حوالے دیتے ہیں، پھر اسے پانچ مرید حوالوں سے سپورٹ کرتے ہیں۔ باسط بلاں صاحب کہتے ہیں کہ ان آیات سے خدا اور زمان کا جو تعلق سامنے آتا ہے اسے اقبال ایک حدیث کے ذریعے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ”زمان ہی خدا ہے۔“ ہم نے اپنے مضمون ”کیا اللہ الدّھر ہے!“ میں قرآن پاک کے ان آٹھ مقالات کا جائزہ لیا ہے کہ کیا واقعی ’خدا اور زمان کی عینیت‘ کا نظریہ دہا سے اخذ ہو سکتا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ کسی بھی معقول تفسیر یا تاویل کے ذریعے ان آیات سے ”زمانہ ہی خدا ہے۔“ کے مفہوم کو اخذ نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح ہم نے مذکورہ حدیث کی اس تاویل کی، جسے حضرت علامہ نے اپنے لیکچرز میں استعمال کیا ہے، تو تیکیلے قرآن پاک سے رجوع کیا تو ہم نے دیکھا کہ ’الدّھر‘ کا لفظ پورے قرآن پاک میں صرف دو مقالات پر آیا ہے، ایک سورہ الجاثیہ میں (۴۵:۲۴) اور دوسرے سورہ الدّھر میں (۷۶:۱۱) جسے سورہ الانسان بھی کہا جاتا ہے، اور ان میں سے کسی بھی مقام پر ’الدّھر‘ سے مراد اللہ لینے کا قطعاً کوئی ترجیح نہیں۔ جب اللہ قرآن پاک میں اپنے لئے ’الدّھر‘ کا لفظ استعمال ہی نہیں کرتا تو حضرت

علامہ کس اخلاقی پر ایک حدیث کی پانچ مختلف روایات میں سے اس روایت کو قبول کرنے یا اسکی ایسی تاویل کرنے میں حق بجانب ہو سکتے ہیں جو قرآن پاک میں اللہ کے تصور سے متصادم ہے یا ذاکر باسط بال کو شل کس اخلاقی پر اللہ اور الدھر میں عینیت کو جائز ٹھہر انے میں حق بجانب ہیں۔ ثابت یہ ہوتا ہے کہ ’زمان اور اللہ کی عینیت کا نظریہ، قطعاً خلاف حق ہے۔ جہاں تک تعلق ہے اس بات کا کہ حضرت علامہ صاحب نے جو حدیث بیان کی ہے وہ صحابہ میں بیان ہوئی ہے، اس سے صرف یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ سند (authority) کا درج صرف اور صرف قرآن پاک کو حاصل ہے۔ (القرآن، ۶:۷۳، ۲:۴۲) کسی بھی نظریہ، اصول، عقیدہ، روایت، ارشاد، قول، گمان، خیال، احساس، وہم، قیاس، تصور، تخلیق، متاثر، وجود ان، واردات، حال، کشف، شہود، تشریح، تعبیر، تاویل، تفسیر کی صداقت کا حصہ میعاد قرآن پاک ہی ہے۔ قرآن پاک جس کی تصدیق کرتا ہے وہ حق ہے، جس کو رد کرتا ہے وہ خلاف حق (بغیر الحق) ہے۔ (القرآن، ۳:۲۱، ۲:۶۱) قرآن پاک کے حوالے کے بغیر کی گئی بات محض رائے، قیاس، گمان یا ظن کا درج رکھتی ہے، اور ظن کسی کو حق سے مستغنی نہیں کر سکتا، (القرآن، ۲8:۵۳، ۳۶:۱۰) قرآن پاک الحق ہے اور حدیث پاک اسکی تاویل ہے۔ قرآن پاک حکم ہے اور حدیث پاک اسکی تفہید۔ تاویل کلیلہ لازم ہے کہ وہ قرآن پاک کی مکملات سے ہم آہنگ ہو۔ تفسیز حکم ہمیشہ وقت، مقام اور مقدار کے مطابق ہوتی ہے۔ حضرت علامہ محمد اقبال صاحب کی توجہ اس طرف نہیں جا سکی کہ اس آیت کی تاویل اس طرح کی جائے کہ یہ مکملات کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے اور اس حدیث کی جو دیگر روایات موجود ہیں ان کے ساتھ بھی اضافہ باقی نہ رہے۔ علمی کاموں میں تمام تر خلوص نیت اور قابلیت کے باوجود سہو کا امکان تو موجود رہتا ہے۔ خود حضرت علام منے اپنے خطبات میں حضرت امام غزالی صاحب اور دیگر علمائے عظام سے اختلاف کا اظہار کیا ہے۔ ”قوانین فطرت کو سنت اللہ قرار دیکر اللہ کی عادت قردار دینا بھی درست نہیں۔ اللہ عادات کا باند نہیں۔ اللہ نے ہر چیز کو ایک فطرت پر پیدا کیا ہے، قوانین فطرت اسی کا اظہار ہیں۔ اللہ نے قوانین فطرت کی صورت میں نچھر میں آہنگ اور نظم رکھا ہے، لیکن یہ قوانین فطرت اللہ کی مشیت اور ارادہ کے تابع ہیں نہ کہ اس کے بر عکس (کیا اللہ الدھر ہے! 13-1)۔

## نظریہ تخلیق اور نظریہ ارتقا کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش ۔۔۔ ڈاکٹر

### اسرار احمد

حضرت علامہ کی اسلامی الہیات کی تکمیل جدید کی کوشش سے متاثر ہو کر جن صاحبان علم نے اس سمت میں اس کام کو آگے بڑھانے میں اپنی صلاحیتیں استعمال کیں ان میں ایک نمایاں نام ڈاکٹر اسرار احمد کا بھی ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب (1932-2010ء) نے ایک کتابچہ بنوائی ”ایجاد و ابداع عالم سے عالمی“

نظام خلافت تک تنزل و ارتقاء کے مرافق“ لکھا جس کا انگریزی ترجمہ ان کے برادرِ خورود، مشہور پاکستانی فلسفی اور نمذہبی دانشور، ریٹائرڈ چیئرمین شعبہ فلسفہ جامعہ پنجاب، جناب ڈاکٹر البصار احمد (پ 1945ء) نے بعنوان ”The Process of Creation: A Qur'anic Perspective“ کیا ہے۔ ڈاکٹر البصار احمد کے الفاظ میں

”اس میں ڈاکٹر اسرار احمد نے قرآن اور حدیث سے مختلف حوالوں کے مابین تقابل، تطابق اور ممااثلت کے ذریعہ نظریہ تحلیق کائنات اور سائنسی نظریہ ارتقاء میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔“ ڈاکٹر البصار احمد مزید لکھتے ہیں۔ ”اس تحقیق کا منشاء تحقیق اور ارتقاء کے تمیز لیکن بعض اعتبار سے مماثل دائروں، جن کا وجود میں لانے والا ایک ہی قادر مطلق ہے، پرسوالات کے ضمن میں قرآنی پوزیشن کو واضح کرنا ہے۔“ وہ مزید لکھتے ہیں: ”ڈاکٹر اسرار احمد انسان کی وجود یا تقویت (ontological dualism of man) کے قائل ہیں اور عمل ارتقاء کو انسان کے صرف جسمانی پہلو تک محدود کرتے ہوئے، اسکی توہین کرتے ہیں۔“

اس مسئلہ پر بالکل یہی نظریہ کیتھوک چرچ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے بہت پہلے دے چکا ہے، جس کا کوئی ذکر نہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے کیا اور نہ انگریزی ترجمے میں ڈاکٹر البصار احمد صاحب نے کوئی نوٹ دیا۔ ڈاکٹر اسرار احمد مسئلہ زیر بحث کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

”مسلم الہیات کے مطابق [صرف ذات باری تعالیٰ] واجب الوجود، اور تدیم، ہے۔ جبکہ کل کون و مکان اور انسان سمیت جملہ موجودات ”ممکن“ اور ”حادث“ ہیں۔۔۔۔۔ لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ ”وجوب“ سے ”امکان“ اور ”قدم“ سے ”حدوث“ کا سفر کیسے اور کن مرافق سے گذر کر طے ہو۔۔۔۔ اور اس طویل سفر میں ”تنزل“ ہی ”تنزل“ ہے یا کوئی مرحلہ ارتقاء کا بھی آیا ہے (ایجاد و ابداع عالم 5, n.d., 2005)؟“

یہ وہ مسائل ہیں جو متكلمین اور فلسفیوں میں موضوع بحث رہے ہیں۔ درج بالا اصطلاحات جو ڈاکٹر اسرار احمد نے استعمال کی ہیں یوں نامی ما بعد الطبیعت کی اصطلاحات ہیں۔ جب انھیں قرآنی ما بعد الطبیعت کے تناظر میں اٹھائے گئے سوالات میں استعمال کیا جاتا ہے تو صرف الجھاؤ کا باعث بنتی ہیں۔ یہ دو قطبی تعلقات (polar concepts) ہیں اور جائز طور پر صرف ایک ہی دائرہ حقیقت سے تعلق رکھنے والی ہستیوں کیلئے استعمال کئے جانے چاہئیں۔ قرآنی ما بعد الطبیعت سے پیدا ہونے والی وجودیات (Qur'anic ontology) تین کیمیگریز پر مشتمل ہے۔ اللہ (خدا)، خلق، اور امر۔ ذات باری کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ اس کی ”خلق“ کی کیمیگری سے تعلق رکھتا ہے یا اس کے ”امر“ کی کیمیگری سے۔ ”خلق“ کسی بھی اعتبار سے اللہ کی الہیت میں شریک ہے، نہ ”امر“۔ خدا تمام تعینات، اور ”خلق“ اور ”امر“ کے ساتھ ہر قسم کی ممااثلت

سے سکرپاک ہے (The Qur'anic ontology and status of al-Haqq)۔<sup>38</sup> اصل بات یہ ہے کہ جب آپ خدا، اسکی صفات یا اسماء کے بارے میں غیر قرآنی اصطلاحات اختیار کر لیتے ہیں، تو آپ تناقضات اور الجھاؤ میں مبتلا ہونے سے نج نہیں سکتے۔ مسلم الہیات میں اسماء الحسنی میں کوئی بھی اسم الہی، 'eternity'، 'timelessness'، 'immutability'، 'perfection' and 'un-caused cause' کے مترادف قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مسلم فکر میں یہ غیر قرآنی اصطلاحات یونانیوں سے براہ راست آئیں یا عیسائیت کے واسطے سے داخل ہوئیں، اور ان میں سے کوئی بھی قرآنی تصور خدا کیلئے موزوں نہیں۔ مثال سے بات صحنه میں آسانی ہوتی ہے چنانچہ مسلم کلام سے 'ذات و صفات باری میں تعلق کی نوعیت' کے مسئلہ کا محض جائزہ لیتے ہیں۔

قرآنی ما بعد الطبیعت میں اللہ کے اسکی 'ذات' (Essence) اور 'صفات' (Attributes) میں تقسیم کا کوئی تصور نہیں۔ یہ فلسفہ ارسطو کی اصطلاحات ہیں اور اسلامی ما بعد الطبیعت سے غیر مطابق ہیں۔ اسلامی ما بعد الطبیعت کی اصطلاح تو 'ذات مسمی' (Named) اور 'اسماء الحسنی' (Names) ہیں۔ جب مسلمانوں نے فلسفہ پڑھے ہوئے عیسائیوں سے مکالمے کے دوران 'ذات' اور 'صفات' کی اصطلاحات، انکے مضمرات کو جانے بغیر، قبول کر لیں، تو وہ مسائل میں الجھ گئے۔ 'ذات و صفات باری میں تعلق کی نوعیت' کا مسئلہ اسی الجھاؤ کے نتیجہ میں پیدا ہوا، جس سے پھر خلق قرآن کے مسئلہ نے جنم لیا (مسئلہ ذات و صفات، 28-43)۔

ایجاد و ابداع عالم کے مسئلہ پر ہماری دانست کے مطابق ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے دلائل کا خلاصہ یہ

ہے کہ:

وَحْيُ إِلَيْيَ "إِيجاد وَابْدَاعٍ" كَيْ اسَاسُ اللَّهِ تَعَالَى كَيْمَهُ "كُنْ" كَوْ قَرَارِ دِيَتِيْ ہے۔ اور جب اللَّهُ تَعَالَى كَيْ اسَاسُ کَيْمَهُ "كُنْ" کَوْ قَرَارِ دِيَتِيْ ہے۔ اور فیصلہ کر لیتا ہے تو اس کیلئے اس کا "کن" کہنا ہی کافی ہوتا ہے تو وہ ہو جاتا ہے۔" (بجوالہ، یہیں: 82) (ایجاد و ابداع عالم، 6) اب ڈاکٹر اسرار احمد بغیر کسی سند کے، محض استعارتی استدلال کے ذریعے، کلمہ "کن" کو "كلمات اللہ" کے مترادف ٹھہرای دیتے ہیں۔ آیات کریمہ نمبر "القرآن، 117:19، 3:47، 16:40، 19:35، 40:68، 36:82" جن کا ڈاکٹر صاحب نے حوالہ دیا ہے وہ "کن" کو امر الہی کے طور پر ریغز کرتی ہیں تاکہ لازماً "كلمة الله" کے طور پر۔ قرآن پاک میں 'كلمة الله' سے مراد لازماً 'امر' یا 'امر' 'کن' نہیں ہے ہر مقام پر۔ ہم یہاں صرف ایک آیت کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ اور یہ وہ ترجمہ ہے جو ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے اپنے کتاب پر سے لیا گیا ہے۔

”اس کے امر (کی شان) تو اس یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا رادہ فرمایتا ہے تو (بس یہ) کہتا ہے کہ ”ہو جا“ تو وہ ہو جاتی ہے!“ (بلیغین: 82)

لفظ ”کن“ کا صحیح ترجمہ ”امر“ ہے نہ کہ ”کلمہ“۔ اللہ تعالیٰ نے خود بھی امر ”کن“ کیلئے ”کلمۃ اللہ“ کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ کلمۃ اللہ کی جمع ہے کلمات اللہ۔ سورہ الکھف: 109 میں ”کلمات ربی“ اور سورہ لقمان: 27 میں ”کلمات اللہ“ کے لامعداد ہونے کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے امر ”کن“ کو ”کلمۃ اللہ“ پر منطبق کرنے کے بعد ڈاکٹر اسرار احمد کوہہ بالا آیات کے حوالہ سے اللہ تعالیٰ کے فرائیں و فرمودات، اوامر و احکام، نوامیں و قوانین، فیصلوں اور طے شدہ امور کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کو بھی اس کے ”کلمات اللہ“ میں شامل ٹھہراتے ہوئے، اللہ کی ہر مخلوق کو اللہ کے ایک کلمہء ”کن“ کا ظہور قرار دیتے ہیں (ایجاد و ابداع عالم: 7-8)۔ اس کے علاوہ اللہ نے تقدير و پدایت کا جو وعدہ فرمایا ہے، ڈاکٹر اسرار احمد آیت نمبر 3-1: 87 کے حوالہ سے جمادات کی سطح پر قوانین طبیع، نباتات کی سطح پر حیاتیاتی قوانین، حیوانات کی سطح پر جلی قوانین، اور انسان کے معاملہ میں استدلالی قوانین، جس سے بالاتر سطح ہے وحی، اربانی کی۔ جملہ مخلوقات کے معاملہ میں جہاں تک کام ان قوانین کے تحت چلتا رہے، اللہ تعالیٰ کے کسی اضافی امر ”کن“ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن جہاں ان میں کوئی بنیادی تبدیلی مطلوب ہو، یا اللہ تعالیٰ سلسلہء اسباب کو توڑ کر لبندی کسی خصوصی مشیت کا اٹھا کرنا چاہے، تو ایک نئے امر ”کن“ کی ضرورت ہوتی ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد، امر ”کن“ کو ”کلمۃ اللہ“ اور وہاں سے ”کلمات اللہ“ میں تحولی کرنے کے بلا جواز اقدام کے مضرات، پھر ان کے مضرات اخذ کرنے کے غیر مختتم سلسلے میں داخل ہو جاتے ہیں اور فرشتوں، ارواح، جنوں وغیرہ کی تخلیق کے موضوعات پر اس طرح بات کرتے ہیں کہ دیومالائی دور کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، اس بات کا بھی دھیان نہیں کرتے کہ بعض باتیں بے ادبی کے زمرے میں آسکتی ہیں۔ ”ایجاد و ابداع عالم“ سے ایک اقتباس پیش ہے۔

”اگر غرض! ایجاد و ابداع سے تخلیق و نسوانی تک کے طویل سفر کا مرحلہ اول، بالفاظ دیگر سلسلہء ”تترات“ کی پہلی منزل، جس سے قرآن حکیم کی اہم اصطلاحات: کلمہ و کلمات، روح و حی اور امر و نور متعلق ہیں، اغلبًا یہ تھی کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے امر ”کن“ نے ایک ایسے نہیت لطیف و بسیط، اور خنک و پر سکون ”نور“ کی صورت اختیار کر لی جس میں نہ حرارت و پیش تھی نہ حرکت و تہوّج اور اس مرحلہ پر اسی نور بسیط سے تخلیق کی گئیں دو صاحب تشخص، اور صرف صاحب شعور و ارادہ ہی نہیں بلکہ حال شعور ذات (self conscious) مخلوقات، یعنی: ایک ”روح القدس“ اور ”الروح الامین“ یعنی حضرت جرج میل امین علیہ السلام سمیت جملہ ملائکہ

عقلام۔۔۔ اور دوسرے روح آدم اور روح محمدی ﷺ سمیت ان تمام افراد کی ارواح جو تا قیامت پیدا ہونگے۔“ (ایجاد و ابداع عالم، 19)

یہ کیوں بلا جواز اقدام (illegitimate move) ہے، واضح کرنے کیلئے خلق قرآن کے مسئلہ پر اشاعرہ سے اسی قسم کی ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

## اشاعرہ سے ایک متوازی مثال

”معترض کا عقیدہ تھا کہ قرآن پاک ”خلوق‘ اور ’حادث‘ (created and accident) ہے۔ وہ قرآن کے کلام الہی ہونے کے منکرنہ تھے لیکن قرآن مجید کے ’غیر مخلوق‘ اور ’قدیم‘ (uncreated) (and eternal) ہونے کے نظریہ کو عقیدہ توحید سے متصادم سمجھتے تھے۔ اشاعرہ کا عقیدہ تھا کہ قرآن پاک ’کلام اللہ‘ ہے۔ (9:06) کلام اللہ، مخلوق نہیں ہو سکتا۔ ابو الحسن الاشرعی نے سورہ الاعراف آیت نمبر 54 میں اس فرمان الہی سے ”سِنْ لَوْ! خَلْقٌ بُهْيٌ أَسِيْكِيْرَىْ“ کی اسی کاہے۔ ”استدال کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ’خلق‘ اور ’امر‘ دو الگ کینیگریزیز ہیں۔ سورہ الرّوم کی آیت نمبر 25 میں اس فرمان الہی سے کہ ”اور اس کی نشانیوں سے ہے کہ زمین اور آسمان اسی کے امر سے قائم ہیں۔“ استدال کرتے ہوئے نتیجہ اخذ کیا کہ اللہ کا کلام ہی اس کا ’امر‘ ہے، اللہ کی ’خلق‘ اس کے ’امر‘ سے قائم ہے۔ قرآن پاک ’کلام اللہ‘ ہے۔ اسلئے یہ ’خلق‘، نہیں بلکہ ’امر‘ کی کینیگری سے تعلق رکھتا ہے۔ ’امر‘ کا ’خلق‘ سے پہلے ہونا لازم ہے۔ ’امر‘ سے پہلے کسی ’امر‘ کو ماناجائے تو کسی اور ’امر‘ کا اس سے بھی پہلے مانا لازم آئے گا۔ اس کو ماننا ہی طور پر بڑھانا مفظی طور پر ناقابل فہم ہے۔ لہذا اللہ کا ’امر‘ اسکی صفت کلام میں مضمرا ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ سے اللہ کے ساتھ تھا۔ اس طرح حضرت ابو الحسن الاشرعی کلام الہی کو (کلام نفسی کی صورت میں) اللہ کی صفت کلام کے اندر مضمرا قرار دیکر استدال کرتے ہیں کہ قرآن پاک قدیم ہے۔ ’غیر مخلوق کلام الہی‘ ازل سے خدا کی صفت کلام کے طور پر خدا کے ساتھ تھا، جسے ابتدائے آفرینش سے ایک ’غیر مخلوق ازلی قرآن‘ (pre-existent Quran) کی صورت میں لوح محفوظ پر رکھ دیا گیا جہاں کلام لفظی کی صورت میں اپنے نزول تک یہ موجود رہا۔ (H. A. Wolfson and A. H. Kamali, 81-96)

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا اللہ کے امر ”کن“ کو ”کلمۃ اللہ“ اور ”کلمات اللہ“ کے ساتھ، اور پھر اسکے فرائیں و فرمودات، او امر و احکام، نوامیں و قوانین، فیصلوں اور طے شدہ امور کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی

مخلوقات کے ساتھ منطبق کرنا دیسا ہی خلاف حق (illegitimate) ہے جیسا اشعارہ کا کلام اللہ کو اللہ کا امر قرار دیکر اسکی صفت کلام میں مضمر قرار دینا، اور صفت کلام کو ازال سے خدا کے ساتھ قرار دینا، کلام اللہ کو کلام نفسی کی صورت میں خدا کے ساتھ ازی قرار دینا، اس طرح کلام اللہ (قرآن پاک) کے قدیم اور غیر مخلوق ہونے پر استدلال کرنا خلاف حق تھا (The Qur'an: Creation or Command, 75-83)۔

اس کتاب میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے کام کا تعلق قرآن پاک کی بعض آیات تشبیہات کی تاویل اور انکے مضمرات اخذ کرنے سے ہے۔ آئیے دیکھتے ہیں قرآن پاک اس سلسلے میں کیا رہنمائی دیتا ہے، کیا ڈاکٹر صاحب اسے ملحوظ رکھ پائے ہیں، بلکہ کیا انھیں اس اصول کا ادراک بھی ہے۔ سورہ آل عمران میں فرمایا گیا ہے:

”وہی ہے جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی۔ اس کی کچھ آیات حکمات ہیں۔ وہ اُمّۃ الکتاب ہیں۔ اور دوسری تشبیہات ہیں۔ وہ جن کے قلوب میں کجی ہے، تشبیہ کے پیچھے پڑتے ہیں، فتنہ چاہئے کو اور اسکی تاویل چاہئے کو۔ اور اسکی تاویل کا علم تو اللہ ہی کو ہے۔ اور علم میں رانح حضرات یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اس پر۔ سب ہمارے رب کے پاس سے ہے۔ اور نصیحت نہیں مانتے مگر عقل والے۔“ (آل عمران، 3:7)

کتاب اللہ کی آیات دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ ہیں جو بر اہ راست احکام کی شکل میں ہیں۔ دوسری وہ ہیں جن کے پڑھ لینے سے اور سن لینے سے اس بیان کے مطابق ہم پر حق عاید ہو جاتا ہے۔ پہلی حکمات ہیں، اور دوسری تشبیہات۔ اُمّۃ الکتاب کا درجہ حکمات کو حاصل ہے، کہ ہر فیصلے میں معیار یہی حکمات ہیں۔ کیا اس آیت پاک سے تشبیہات کی تاویل کا یہ اصول اخذ نہیں ہوتا کہ تشبیہات کی وہی تعبیر درست ہو گی جس کی بنیاد حکمات پر ہو! ورنہ اس تعبیر کی صحت کا کوئی ثبوت نہیں ہو گا۔ اب ملاحظہ فرمائیں کیا ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اس اصول کو ملحوظ رکھا ہے۔

سورہ یسین کی آیت کریمہ ”اس کے امر (کی شان) تو بس یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ فرمائیتا ہے تو (بس یہ) کہتا ہے کہ ”ہو جا“ تو وہ ہو جاتی ہے!“ (یسین: 82) جس سے ڈاکٹر صاحب نے اپنی فلسفیانہ تیاض آرائی کا آغاز کیا ہے، کیا یہ آیت تشبیہات میں سے نہیں! اگر زمین کے کل درخت قلم بن جائیں اور سمندر (سیاہی کا کام دے اور) اسکے بعد سات سمندر اور ہوں مدد کیلئے، تب بھی ’اللہ‘ کے کلمات، ختم نہ ہوں گے۔“ (لئن: 27) کیا یہ آیت کریمہ بھی تشبیہات میں سے نہیں! پہلی تشبیہ آیت میں امر ”گُن“ کو دوسری تشبیہ آیت کریمہ کے ”کلمات اللہ“ سے حکمات میں سے کس آیت کریمہ کی بنیاد پر مطابقت دی گئی

ہے! ہماری دانست میں یہ ساری کتاب متشابہات کی متشابہات، روایات، اقوال و اشعار صوفیاء اور قیاسات کی بنیاد پر تاویل کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اور اس کا مقصد تنزل کے غیر قرآنی اور ارتقاء کے تھیو۔ یہیکل سائنسی تصور کیلئے گنجائش پیدا کرنا ہے۔

### تلقیدی جائزہ

اس مطالعہ کا مقصد ان صاحبان علم و دانش کی تلقیص نہیں جنہوں نے اپنے شب و روز' الہامی علم، اور 'علم کسب'، کے مابین رشتہ و تعلق کے بنیادی اصول وضع کرنے میں صرف کردے۔ یہ سب علمی حکما کہمہ ہے جس پر ہمیں حتمیت کا کوئی دعویٰ نہیں۔ ذاتی حیثیت میں الشیخ الرئیس ابن سینا، سر سید احمد خاں، حضرت علامہ محمد اقبال اور ڈاکٹر اسرار احمد قابل تاشیش ہیں کہ انہوں نے ایک علمی مسئلہ کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس کا حل تلاش کرنے میں اپنی بہترین صلاحیتوں کو صرف کیا۔ مقصد کام کو آگے بڑھانا اور اپنی صلاحیت کے مطابق حق کو روشن کرنا ہے۔ ابن سینا کے نظریات پر کافی بحث ہو چکی ہے۔ سر سید احمد خاں کے معاملہ میں یہ کہنا ضروری ہے کہ ان کا پیش کردہ اصول 'کلام اللہ' اور 'ما کائنات کی سائنسی تعبیر'، میں اختلاف کی صورت میں سائنسی نقطۂ نظر کو فوقیت حاصل ہو گی، اور کلام اللہ کی بیٹھا فاریکل تعبیر اس طرح کی جائے گی کہ تناقض باقی نہ رہے۔ "درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ علم الہی کو کبی علوم کے تابع کرنے والی بات ہے جس کا مظاہرہ ہم الشیخ الرئیس ابن سینا کے معاملہ میں دیکھ چکے ہیں۔ کبی علوم (سائنسی اور فلسفیانہ علوم) اور ان کے ساتھ وجود میں آنے والا نظریہ کائنات (ورلڈ ویو) بدلتا رہتا ہے۔ تو عقلی علوم میں ہر تبدیلی کے ساتھ کیا ہم از سر نو قرآن کی نئی تعبیر کر کے اسے نئے عقلی علوم سے ہم آہنگ کرنے میں جت جایا کریں گے۔ سر سید احمد خاں نیوٹن کے میکانی نظریہ کائنات اور نیچرل ازم کی مطابقت میں قرآن پاک کی تعبیر کر کے فارغ ہوئے ہی تھے کہ آئن سٹائن نے نیا اور لذ و یو اور نیا نیچرل ازم دے دیا، نئے سائنسی اور فلسفیانہ علوم کو علم الہی کے ساتھ از سر نو مطابقت دینے کیلئے حضرت علامہ اقبال کو زندگی کی بہترین صلاحیتیں صرف کرنا پڑیں۔ ایسے نظریہ کائنات کی جس میں آسمانوں کا کوئی تصور نہ ہو، ایسے نظریہ کائنات سے مطابقت جو ٹھیک سات آسمانوں پر لیکیں رکھتا ہو، کیسے ممکن ہے۔ چنانچہ اصل سوال یہ نہیں ہونا چاہئے کہ 'کلام اللہ' اور 'ما کائنات کی سائنسی تعبیر' میں اختلاف کی صورت میں فوکیت کس کو ہونی چاہئے۔ "بلکہ یہ ہونا چاہئے کہ وحیء الہی پر مبنی علم (جسے ہم علم الہی کہیں گے) اور علم کسب (کسی بھی زمانے کے سائنسی اور

فلسفیاتہ علوم) کے مابین رشتہ و تعلق کے بنیادی الہیاتی اصول کیا ہونے چاہئیں۔ اس مضمون میں اسی سلسلہ میں اپنا حق ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

## عصری نظریات:

### ڈاکٹر اسرار احمد، ڈاکٹر اسحاق ظفر انصاری، مولانا حید الدین خاں ودیگر۔

ڈاکٹر اسرار احمد، ڈاکٹر اسحاق ظفر انصاری، مولانا حید الدین خاں اور بہت سے دیگر حضرات عقلی و تجربی علوم (فلسفہ و سائنس) میں مسلمانوں کے دیگر قوموں سے پچھے رہ جانے کی وجہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی غیر درست تعبیر کو قرار دیتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاک ﷺ سے فرماتا ہے کہ ”آپ مومنین سے فرمادیجئے کہ اگر وہ اللہ کی حب چاہتے ہیں تو آپ کا اتباع کریں؛ اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو اللہ انھیں اپنا حبیب بنالے گا۔“ (آل عمران: 31) وہ سمجھتے ہیں کہ اس حکم کی غیر مشروط تعبیر ایک مسلم سائنسدان کو کھلے ذہن کے ساتھ ریسرچ کرنے کی آزادی نہیں دیتی۔ اسے ہر وقت فکر کھائے جاتی ہے کہ کہیں اس حکم کی خلاف ورزی نہ ہو جائے۔ اس مسئلہ کا حل وہ نبی پاک کی ذات گرامی کی مختلف حیثیتوں میں تقسیم کی صورت میں تجویز کرتے ہیں۔ انکی دانست میں نبوت و رسالت آپ ﷺ کی ذات اقدس کی ایک حیثیت ہے اور صرف اسی حیثیت میں فرمائے گئے حکم میں آپ ﷺ کا اتباع لازم ہے، اور وہ بھی صرف معاملات دین میں۔ دنیاوی معاملات میں، ان کا خیال ہے کہ، کوئی شخص (اللہ انھیں معاف فرمائے) حضور پاک ﷺ سے زیادہ علم والا ہو سکتا ہے۔ یہ ان حضرات کی پیراڈام کے اہم نکات ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ نظریہ قرآنی تعلیمات کے یکسر منافی ہے۔ رسالت و نبوت کو آپ ﷺ کی ذات اقدس کی صرف ایک حیثیت بنانکر دراصل دین میں اپنی پسند اور ناپسند کو داخل کرنے کی بہت گنجائش پیدا ہو جاتی ہے (خلافت کے اقتصادی نظام کی اصولی اساس، 10)۔<sup>39</sup>

### قرآن کی سائنسی تعبیر \_\_\_\_\_ مورس بکائل (1998-1920ء)

یہ پوزیشن ”مسلمہ سائنسی حقائق“ (established scientific facts) اور ”سائنسی تھیوریز“ (scientific theories) میں فرق کرتی ہے۔ اور قرآن پاک میں سائنسی اہمیت کے حامل بیانات کے

جدید سائنس کے دریافت کردہ مسلمہ سائنسی حقائق کے ساتھ تقابل کے ذریعے قرآن پاک کے الہامی (divine origin) ہونے پر اتدال کرتی ہے۔ جو شخص پہلے سے ہی قرآن پاک کو الہامی مانتا ہو، اس قسم کے مطالعات سے اس کے ایمان کو یقیناً تقویت پہنچتی ہے اور جو ایسا نہ ہوا سے قرآن پاک پر سنجیدہ غورو فکر کی تحریک ملتی ہے۔ جو سائنسی حقائق ہم آج دریافت کر رہے ہیں، تقریباً سو اچودہ سو سال پہلے وجود میں آنے والی کتاب میں ان کا پایا جانا یقیناً خو شگوار حیرت کا باعث ہی ہو سکتا ہے۔ اور اگر اس کتاب کا دعویٰ الہامی ہونے کا ہو تو اس کتاب کی باقی تعلیمات اور دعاویٰ بھی سنجیدہ مطالعہ و تحقیق کے مقاضی ٹھہرتے ہیں۔ گذشتہ صفحات میں دیکھ آئے ہیں کہ سائنسی نظریہ کائنات حتیٰ نہیں ہوتا اور سائنسی تحقیق کے نتائج اور ان کی تعبیر بدلتی رہتی ہے، سوال پیدا ہوتا ہے اگر قرآن پاک کے چودہ سو سال پہلے کے بعض بیانات کسی زمانے کی سائنسی تحقیق کے بعض نتائج کے ساتھ ہم آہنگ پائے بھی جائیں تو اس تطابق کی اہمیت کیا رہ جاتی ہے؟ مورس بکائل مکتب فکر ”مسلمہ سائنسی حقائق“ اور ”سائنسی تھیوریز“ میں فرق واضح کر کے اس سوال کا جواب اس طرح دیتا ہے کہ: ”سائنسی تھیوری، حتیٰ نہیں ہوتی، جبکہ مسلمہ سائنسی حقائق، حتیٰ اور ثابت شدہ حقائق ہوتے ہیں۔“ قرآن کے الہامی بیانات مسلمہ سائنسی حقائق سے کبھی بھی متناقض نہیں ہوئے اور نہ کبھی ہوں گے۔ سائنسی تھیوری کو کبھی بھی سائنسی صداقت تصور نہیں کیا جانا چاہئے اور ناقرآن کے الہامی بیانات کو اس کے ساتھ تطبیق دینے کی کوشش کرنی چاہیے، اور نہ ان کے قرآن پاک سے تناقض کو قرآن پاک کے خلاف عقل ہونے پر محمول کرنا چاہئے (The Islamization of Science 1996, 240)۔ سائنسی تھیوری، سائنسی مشاہدات اور مظاہر کی قیاسی تعبیر ہوتی ہے جو واقعات کی پیش گوئی، فطرت پر کنٹرول اور ٹینکنالوجی کی ترقی میں معاونت کی حد تک اہم ہوتی ہے۔ ان تھیوریز سے جو نظریہ کائنات تفصیل پاتے ہیں وہ بھی قیاسی ہوتے ہیں۔ بطیموسی نظریہ کائنات، ابن سینا کا نظریہ صدور، نیوٹن کا میکانیکی نظریہ کائنات اور آئن سٹائن کا نظریہ، اضافیت سائنسی نظریہ کائنات کی مثالیں جبکہ ابن سینا، ہیوم، رسول، مل کے علمت۔ معلوم کے بارے میں نظریات، ایتھر، یا میٹریل فیلڈ کی تھیوری، کشش ثقل، بلیک ہولز، کہکشاوں وغیرہ کے بارے میں تھیوری، بگ-بینگ، کوانٹم مکینکس وغیرہ سائنسی تھیوری کی مثالیں ہیں۔ اب آتے ہیں مسلمہ سائنسی حقائق کی طرف۔ ایک زمانے تک زمین کو طشتري کی طرح چپٹی خیال کیا جاتا تھا۔ پھر سائنسدانوں کا یہ نظریہ بنا کہ زمین کروی یا مدور ہے۔ لیکن ابھی بھی یہ صرف تھیوری تھی۔

سائنس کی کتابوں میں زمین کے کروی ہونے کے ثبوت کیلئے عقلی دلائل بیان کئے جاتے تھے۔ ابھی تک زمین کا کروی ہونا صرف ایک سائنسی تھیوری تھی۔ پھر جہاز اور خلائی سیارے ایجاد ہو گئے جو زمین کے گرد چکر لگا سکتے تھے۔ اب ہمارے خلائی سٹیشن خلاسے زمین کے ہر حصے کی تصویریں لے کر بھیجتے رہتے ہیں جنہوں نے زمین کے گرد چکر لگا کر ناقابل تردید طور پر ثابت کر دیا ہے کہ زمین کروی / بیضوی (elliptical) ہے۔ اب زمین کا کروی / بیضوی ہونا ایک مسلمہ سائنسی فکٹ ہے۔ مسلمہ سائنسی فکٹ کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیں۔ ایک مدت تک سائنسدار یہ نہیں جانتے تھے کہ ماڈل اور انرجنی دوالگ جو ہری حقیقتیں ہیں یا ایک ہی طبیعی حقیقت کے دور پر۔ چنانچہ مختلف تھیوریز موجود تھیں۔ آئن شائئن نے ماڈل اور انرجنی کو ایک ہی حقیقت کے دور پر قرار دیا اور ان دونوں کے ایک دوسرے میں تبادل پذیری (convertibility) کی پیمائش کیلئے ایک ریاضیاتی فارمولہ وضع کیا۔ لیکن ابھی تک یہ تصور صرف ایک تھیوری تھا۔ سائنسی تجربات کے ذریعے اس تھیوری کی حقیقی تصدیق کے بعد ماڈل اور انرجنی کی تبادل پذیری (interconvertibility) ایک مسلمہ سائنسی حقیقت بن چکی ہے۔ ایٹم کی تقسیم پذیری یا عدم تقسیم پذیری کے بارے میں مدت تک صرف تھیوریز تھیں۔ اب یہ بات اس حد تک کہ ایٹم کا ایک سڑک پر ہوتا ہے، اور اسے توڑا جا سکتا ہے، ایک مسلمہ سائنسی حقیقت ہے۔ کائنات کی ساخت (structure) کے حوالے سے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ”ہم نے ٹھیک سات آسمان بنائے۔“ (القرآن، 78:12) فرمایا: ”تَخْلِيقَ سَهْلَةَ آسَمَانَ دَحْواَلَ تَحْتَهُ۔“ (لُمْ سَجْدَه / فصلت، 41:12) یہ بھی ارشاد ہے: ”پھر ہم نے انھیں دو دن میں پورے سات آسمان کر دیا، اور آسمان میں اس کے امر کی وجہ فرمائی۔“ (41:12) ”ہم نے انھیں دو دن میں تخلیق کیا۔“ (لُمْ سَجْدَه / فصلت، 41:12) یہ بھی ارشاد ہے: ہم نے آسمانوں کو تھاما ہوا ہے کہ گرنہ جائیں۔ (حج، 22:65) اس طرح اور بھی کئی ارشاد ہیں۔ یہ بھی ارشاد ہے: ”زمین کو فرش اور آسمان کو چھپت بنایا گیا۔“ (القرآن، 21:32) زمین کو دو دن میں بنایا گیا۔ (القرآن، 41:9) زمین، اس کے اوپر پہاڑ، برکات، خوارکیں ٹھہرائیں گیں، کل چار دن میں۔ (41:10) کائنات کی تخلیق کے متعلق فرمایا گیا ہے، کہ زمین اور آسمان بند تھے، اللہ نے انھیں کھولا۔ (انبیاء، 30:21) آسمان کو ابتدائی صورت میں بھی اللہ ہی نے پیدا کیا تھا۔ ”زمین کو فرش بنایا۔“ (زوح، 71:17) زمین اور آسمان، دونوں سے فرمایا گیا، ”طوعاً مانو یا کرہاً مانو، دونوں نے برضا و رغبت احکام الہی کی تعمیل کا وعدہ کیا۔“ (41:11)

آسمان کائنات کی مادی ساخت کا حصہ ہیں۔ یہ کائنات کی مادی ساخت کے بارے سائنسی اہمیت کے حامل قرآنی بیانات ہیں۔ بظیوسی سائنسی تھیوری میں تو آسمانوں کا تصور تھا۔ یہ محض قیاسی نظریہ (تھیوری) تھی۔ نیوٹن کی میکانیکی تھیوری میں آسمانوں کا کوئی تصور نہیں تھا۔ نیوٹن کامیکا لگنی کائنات کا نظریہ ماضی کا واقعہ بن چکا ہے۔ آئن شائن کے نظریہ اضافیت (theory of relativity) میں بھی آسمانوں کا کوئی تصور نہیں۔ نظریہ اضافیت کوئی مسلمہ سائنسی حقیقت نہیں۔ یہ کائنات کے سڑک پر کے بارے میں اسی طرح کی تھیوری ہے جیسی کہ اس سے پہلے نیوٹن کی تھیوری تھی۔ جب کبھی سائنس، کائنات کے سڑک پر کی تحقیق کرتے ہوئے آسمانوں کو دریافت کر لیتی ہے اور 'مادہ۔ ازجی' کی تباہل پذیری کی طرح سات آسمانوں کے وجود کی حقیقی تصدیق کر لیتی ہے تو یہ مسلمہ سائنسی حقیقت (established scientific fact) بن جائے گا اور ثابت ہو گا کہ یہ بات سینکڑوں سال پہلے وجود میں آنے والی کتاب میں بغیر کسی ابہام کے موجود ہے۔ قرآن پاک میں فرعون کے بارے میں بیان ہے کہ غرق دریا ہوتے ہوئے اس نے ایمان لانا چاہا۔ فرمایا گیا ب تیرا ایمان قبول نہیں۔ ہم تیری لاش کو عبرت کیلئے باقی رکھیں گے۔ (القرآن، 92:91-10) صدیوں تک یہ سوال انھیا جاتا رہا کہ کدھر ہے فرعون کی لاش جسے عبرت کیلئے باقی رکھے جانے کا ذکر ہے قرآن پاک میں۔ اور پھر انیسویں صدی کے آخری ربع میں فرعون، جو غرق آب ہو کے مر اتھا، کی لاش دریافت ہو گئی اور قرآن پاک کے ایک بیان کی تیرہ سو سال بعد ایک سائنسی حقیقت کی حیثیت سے تصدیق ہو گئی۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے "ساعت قریب آگئی اور قمر شق ہوا۔" (القرآن، 54:1) اگر شق القمر ہو چکا ہے تو سائنس پوری حیثیت کے ساتھ اسی طرح ثابت کر لے گی جیسے فرعون کی لاش کے بارے میں ثابت کر چکی ہے، اگر یہ واقعہ ہونا باقی ہے قرب قیامت میں، تو اس طرح ہو گا کہ اس کا انکار ممکن نہیں ہو گا۔ اور بھی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ قرآن پاک کے بیانات کو کسی بھی زمانے کے سائنسی اور فلسفیانہ علوم سے ہم آہنگ کرنے کا بنیادی اصول جو مورس بکائل کی کتاب سے اخذ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ 'مسلمہ سائنسی حقائق'، "اہنگ کرنے کا بنیادی اصول جو مورس بکائل کی کتاب سے اخذ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ 'مسلمہ سائنسی حقائق'، اور 'سائنسی تھیوری' (scientific theory) میں فرق ملحوظ رکھا جائے۔ 'مسلمہ سائنسی حقائق'، کبھی نہیں بدلتے اور کتاب اللہ کو الہامی مانے والے کو ایمان رکھنا چاہئے کہ کبھی ان کا تضاد کتاب اللہ سے ہوا ہے، نہ ہو گا۔ سر سید احمد خان اپنے 'جدید علم الكلام' کے اس اصول کہ "سائنس و فلسفہ، اور 'کلام اللہ'، میں تناقض کی صورت میں کلام اللہ کو استعارتی تعبیر کے ذریعے سائنسی

نقٹے نظر کے مطابق بنایا جائے گا۔” میں ”مسلمہ سائنسی حقائق“، اور ”سائنسی تھیوری“ کے فرق کو ملحوظ نہ رکھ سکے۔ سر سید کی مجبوری تھی کہ سائنس ابھی بالکل نئی نئی ڈولیپ ہونا شروع ہوئی تھی، پیچیدہ ریاضیات پر مبنی نیوٹن کی مکینکس کی طرح کاسائنسی نظریہ اس سے پہلے معلوم ہستہری میں موجود نہیں تھا، اس نظریہ سے ترقی پانے والے دنیا میں سیاسی اور فوجی غلبہ حاصل کرچکے تھے اور ہم اس وقت ان کے مکوم تھے۔

جناب ڈاکٹر اسرار احمد کی کتاب میں ایک اہم عصری سائنسی تھیوری ”نظریہ ارتقاء“ (theory of evolution) کے حوالے سے اسلامی موقف کو جاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمارا احساس یہ ہے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب بھی وہی غلطی دھرا رہے ہیں جس کا ارتکاب سر سید احمد خان سے ہوا یعنی (1) مسلمہ سائنسی حقائق، اور ”سائنسی تھیوری“ میں فرق ملحوظ نہ رکھنا، اور (2) قرآن پاک کی استعاراتی تفسیر کر کے اسے سائنسی تھیوریز کے ساتھ ہم آہنگ کرنا۔ آئیئے ”تھیوری آف ایولوشن“ پر ڈاکٹر صاحب کے خیالات کا جائزہ لیتے ہیں۔

نظریہ ارتقاء ایک تھیوری ہے جس طرح نیوٹن کا کائنات کے میکانی، اور سے ابعادی ہونے، نام کے یک بعدی حقیقت کی جیشیت سے کائنات سے الگ متوازی حقیقت ہونے کا نظریہ ایک سائنسی تھیوری تھا۔ جتنی مضبوط ریاضیاتی سپورٹ نیوٹن کی تھیوری کو حاصل تھی اور جو صفتی انقلاب اس کے نتیجے کے طور پر بالکل تھوڑے سے عرصے میں ہی آگئی، نظریہ ارتقاء کو نہ تو اتنی مضبوط ریاضیاتی سپورٹ حاصل ہے اور نہ اس کے محدود دائرے میں کوئی ایسا انقلاب برپا ہو سکا ہے۔ اس کے باوجود صرف دو صدیوں میں آئن سائنس نے نظریہ اضافیت کی صورت میں کائنات کا یکسر مختلف نظریہ، ویسی ہی مضبوط ریاضیاتی سپورٹ کے ساتھ پیش کر دیا۔ کسی بھی وقت ویسی ہی ریاضیاتی اور تجرباتی سپورٹ کے ساتھ ایک یکسر مختلف تھیوری نظریہ اضافیت کی جگہ لے سکتی ہے۔ نظریہ اضافیت کوئی مسلمہ سائنسی حقیقت ہے، نہ ہی گ۔۔۔ بینگ۔ یہ مخف سائنسی تھیوریز ہیں۔ بعض کے نزد یک بڑی وااثق (well-accredited) ہو سکتی ہیں۔ آج بھی ایسے سائنسدان ہیں جو ان کے مقابل دیگر سائنسی تھیوریز کو ترجیح دیتے ہیں۔ نظریہ اضافیت کے بنیادی مفروضوں میں سے ایک یہ ہے کہ کائنات میں روشنی کی سلسلہ سب سے زیادہ ہے اور مستقل ہے۔ اگر کسی وقت یہ نظریہ، یا نظریہ اضافیت کے بنیادی مفروضوں میں سے کوئی اور، غلط ثابت ہو جاتا ہے، تو کائنات کے سڑک پر، اور بینگ اور نام کی نوعیت کے بارے میں ہمارے نظریات میں بنیادی تبدیلیاں آ جائیں گی۔ ڈاکٹر اسرار احمد گ۔۔۔ بینگ کو

ایک مسلمہ سائنسیٹ فیکٹ کے طور پر لیتے ہیں اور بعض احادیث، صوفیاء کے اقوال یا اشعار کے ذریعے مثابہ آیات مبارک میں سے بعض کی استعاراتی تاویل کر کے اسے اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ثابت کرنا اپنا اہم مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں۔ اسی طرح مادے میں حیات کی نمود کو اللہ کے امر کی کرشمہ سازی قرار دیکر آپ حیات کی کیاسائمنی یا فلسفیانہ تشریح کر رہے ہیں جو دیگر تشریفات کے مقابلے میں بہتر قرار پاسکے! اللہ کا فرمان ہے کہ اس نے حیات کو خلق فرمایا، اس نے موت کو خلق فرمایا۔ (المک: 1) حیات اور موت 'خلق' ہیں، 'امر' نہیں ہیں۔ عین ممکن ہے انسان میکائیکی ذرائع سے حیات پیدا کر لے، موت کو کسی درجے میں موخر کر لے، یا مصنوعی اعضا تیار کر لے۔ پھر آپ اللہ کے امر کیا تشریح کریں گے۔ انسان کے حیوانی حیاتیاتی وجود کیلئے وہ تھیوری آف آیولوشن کا منا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ نظریہ مخفی تھیوری ہے جو کسی بھی وقت مسترد ہو سکتی ہے۔ خود مغرب میں آج بھی ایسے ماہرین حیاتیات ہیں جو انسانوں کے بارے میں اس تھیوری کو درست نہیں مانتے۔ کیا تھیوری آف آیولوشن کا درست منانا ہمارے ایمان کا جز ہے، یا کیا اسے درست نامانے سے ہمارے ایمان میں کوئی خلل واقع ہو جاتا ہے۔ قرآن پاک کی جن آیات کی استعاراتی تعبیر سے ڈاکٹر صاحب نظریہ ارتقا کو ثابت کرتے ہیں، اس سے زیادہ بہتر طور پر آدم علیہ السلام کی بحیثیت آدم تخلیق کو ثابت کیا جاسکتا ہے۔ ارشاد باری ہے : ”اور بے شک ہم نے انسان کو خلق کیا ہے، اور ہمیں اس کے نفس کے وسوسوں کا علم ہے، اور ہم اسکی رگِ جاں سے بھی اس کے زیادہ تریب ہیں۔“ (سورہ ق، 50:16۔)

مزید ارشاد ہے: **لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ** ﴿۱﴾ کہ ہم نے انسان کو احسن تقویم میں خلق کیا ہے الفرق آن، 95:4 ”احسن تقویم پر خلق ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس میں کبھی کسی اضافے یا ترمیم کا مقام نہیں آئے گا۔ انسان اللہ کا محبوب ہونے کی الہیت رکھتا ہے۔ تعلق مع اللہ کے حوالے سے انسان کے اندر جو کچھ ہونا چاہیے، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رکھا گیا ہے۔“ (تفسیر ناضلی منزل ہفتمن، 449)

حضرت انسان کی صورت بھی اللہ نے بنائی ہے اور اللہ نے اس صورت کو احسن بنایا ہے۔ (۔۔۔وَصَوَّرَ كُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَ كُمْ۔۔۔ 64:3)

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے: **أَلَّا تَمُّرْ أَشْدُ خَلْقًا أَمِ السَّمَاءَ بَتَاهَا** ﴿۲﴾ کیا تمہاری تخلیق مشکل ہے یا آسمان کی۔ اللہ نے ہی اسے اٹھایا۔“ (الفرقان، 79:27) جس نے دو دن میں ٹھیک سات آسمان بنادیئے اس کے لئے انسانوں کو تخلیق کر دینا کتنا مشکل ہو گا کہ اس کو سمجھنے کیلئے ڈارون یا مالتوس کے قیاسی نظریات کو بنیاد بنا�ا جائے۔ نطفے سے تخلیق سے پہلا درجہ تعین سے تعلق نہیں رکھتا۔ کیا عدم سے وجود کا خلق فرمان، مالک یوم

الدین کی شان نہیں! فرمان الٰہی ہے: وَالْجُنَاحُ فَاهْجِرْ ﴿۱﴾ ”اور ناپاکی سے دور رہئے۔“ (اقرآن، 74:5) کیا قیاسی نظریات کو حق کے مقابل و قعْت دینا عالمًا ناپاکی نہیں! قرآن پاک میں ارشاد ہے: مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ﴿۱﴾ أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِي هَذِهِ الشَّوْنِ ﴿۲﴾ ”تمہیں کیا ہو گیا ہے، کیسا حکم لگاتے ہو۔ کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں یہ پڑھتے ہو؟“ (القرآن، 36:37-68) جو حالہ قرآن پاک میں موجود نہیں وہ قابل ذکر ہی کیوں ہو۔ علم کے زعم میں مبتلا لوگ ہی بے سند باتیں کرتے ہیں۔

کیا اللہ کے اس فرمان کے مقابل کہ ”اس نے انسان کو خلق کیا ہے۔“ یہ گمان کہ موجودہ صورت انسانی، حیاتیاتی ارتقاء کے مدارج طے کرنے کے بعد وجود میں آئی ہے، بے حقیقت بات نہیں! جو خدا اپنے بندے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ طاقت عنایت کر سکتا ہے، کہ وہ مٹی سے پرندے کی مورت بنانے کر پھونک ماریں اور وہ، حیوانی ارتقاء کے کسی مرحلے سے گذارے بغیر، جاندار پرندہ بن جائے، جو اپنے ایک بندے کے مردہ گدھے کی گلی ہوئی ہڈیوں کو، ان کی آنکھوں کے سامنے، ارتقائی مرحلے سے گذارے بغیر استوار کر کے ان پر گوشت پوست چڑھا کر کھڑا کر سکتا ہے، تو آدم علیہ السلام کو ارتقائی مرحلے سے گذار کرہی پیدا کرنے میں اسے کیا مجبوری تھی۔ جن حیوانات کو ارتقاء کے مرحلے سے گذار کر اپنے سے بر تنوع میں تبدیل کیا جاتا رہا، کیا وہ صرف مذکور ہی ہوتے تھی اور موئث بعد میں کسی ارتقائی تکنیک سے اس سے علیحدہ ہوتی، جوڑا بنتا اور نئی نوع (specie) وجود میں آنے لگتی۔ اگر ایسا نہیں تھا تو پھر آدم علیہ السلام کے معاملے میں ایسا کیوں ہوا! حیواناتی ارتقاء کے وہ کیا مرحلے تھے جن سے گذار کر خدا نے حضرت آدم سے آپکی زوجہ محترمہ کو ان سے نکالا۔ آدم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ کو آدم علیہ السلام سے علیحدہ کرنے کے بارے میں نا ڈاکٹر اسرار احمد اللہ تعالیٰ کے کسی نئے کلمہ ”کن“ کا تذکرہ کرتے ہیں، نہ ہی عیسائیت اس کے بارے میں کچھ بتاتی ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی یہ ساری کاوش حضرت علامہ صاحب کے ”سائنس فارم آف ریلبیجیس نالج“ کے تصور کی تقلید کے سوا کچھ اور نہیں لگتی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں یہی مسئلہ عیسائیت کو در پیش تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے بہت پہلے، پوپ پاکس XII نے 1950 میں Humani generis کے ٹائل سے ایک سر کلر میں اور پھر نصف صدی بعد پوپ جان پال - II نے ”Truth cannot contradict truth.“ کے عنوان سے 22 اکتوبر 1996 میں پوٹنیل اکیڈمی آف سائنس کو ایڈریس میں یہ موقف اختیار کیا کہ انسان کے حیوانی وجود کے بارے میں یہ ماننا کہ وہ ارتقائی مدارج سے ہوتے ہوئے وجود میں آیا ہے، اور روح انسانی کو

خدا نے کسی ارتقائی مدارج سے گزارے بغیر، راہ راست تخلیق کیا ہے، اور یہ کہ خدا نے اعلیٰ ترقی یافتہ نوع کے فرد کو سلیکٹ کر کے اس میں روح پھونگی، اس کا جوڑا بنایا، جس سے بنی نوع انسان وجود میں آئے، تخلیق کے مذہبی عقیدے سے کوئی تضاد نہیں رکھتا (Gould 2001, 499-508)۔ یہ وہی بات ہے جسے ڈاکٹر ابصار احمد انسان کی وجودی ثنویت (ontological dualism of man) کا نام دیتے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مسئلہ تخلیق اور مسئلہ ارتقاء میں مطابقت کے حوالے سے یہی نقطہ نظر اختیار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنی کتاب اور جناب ڈاکٹر ابصار احمد صاحب نے اسکے انگریزی ترجمے میں اس کا کہیں حوالہ نہیں دیا۔<sup>40</sup> نظریاتِ ارتقاء کو کائنات، حیات اور انسان کے وجود میں آنے کی تسلیع کیلئے استعمال کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد بھی اپنی کتاب میں ان نتیجوں پہلوؤں پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ بالعموم تین موقوف اختیار کئے جاتے ہیں جن میں سے ایک ارتقاء کا سائنسی نظریہ ہے جو کائنات، حیات اور انسان کی تسلیع خدا کے حوالے کے بغیر کرتا ہے۔ فی الواقع ہمیں اس سے تعریض نہیں ہے۔ 1) کائنات، حیات اور انسان کی پیش، اور فوری تخلیق۔ یہ عام روایتی نظریہ ہے۔ 2) الہیاتی ارتقاء (theistic evolution)۔ عیسائیت اور ڈاکٹر اسرار احمد اپنے عقائد کے مطابق یہ نظریہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ اپرووچ ڈاروون اور لے مارک کے نظریات کے تنازع میں ابھری ہے۔ (مولناروم کا نظریہ جوانکے روحانی تجربات پر مبنی ہے نظریہ ارتقاء کے سائنسی تصور سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔) کسی بھی درجے کی سائنسی تھیوریز کو قرآن پاک کے ساتھ ہم آہنگ کرنے، غیر قرآنی اصطلاحات وضع کر کے یا آیات تشابہات کی آیات تشابہات کی بنیاد پر استعاراتی قیاس آرائی کے ذریعے قرآن پاک میں اپنی تجویز داخل کرنے اور اپنی خواہش read کرنے کے بارے میں ہم اپنا موقوف تفصیل سے پیش کر چکے ہیں۔ یہاں یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اللہ کے امر 'کن' کا مفہوم لازماً صرف 'فوری تخلیق' (instantaneous creation) سمجھنا درست نہیں۔ یہ 'عنوان' (caption) ہوتا ہے۔ امر 'کن'، اللہ کا امر ہے۔ اس کی کسی دوسرے کلمہ (یا کلمات) کے ساتھ تطبیق خلاف ہے۔ اللہ اپنے امر 'کن' کے ذریعے جو 'عنوان' رکھ دیتا ہے، اسکی حکمت کے مطابق اس کے ارکان وجود میں آنا شروع ہو جاتے ہیں، اور اللہ کے علم مطلق کے مطابق وہ شےء وجود میں آجائی ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے مابین ہے، کی تخلیق چھ دن میں نہیں کی۔

اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ اور اس کے امر 'گُن'، کی کار فرمائیوں کو 'تنز'، اور 'ارتفاع' کی غیر قرآنی اصطلاحات کے ذریعے فہم میں لانے کی کوشش محض الجھاؤہ کی باعث بن سکتی ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی اس فلسفہ آرائی کی علمی قدر و قیمت کے تعین کیلئے چند سوال قارئین کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔

1۔ کیا ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی کاوش پر موجود کائنات، حیات اور انسان کے ماخنے، کی سائنسی تحریکریز پر کوئی واقعی اور حقیقی اضافہ کرتی ہے؟ یا اس کے متوازی لیکن اس سے بدرجہا بہتر نظریہ پیش کرتی ہے؟

2۔ کیا اس کاوش سے قرآنی تناظر میں سائنسی تحقیق کی کوئی نئی راہیں وابھوئی ہیں یا کوئی بہتر اپروج متعارف ہوئی ہے؟

3۔ کیا اس کاوش میں مسلمانوں کیلئے قرآنی تعلیمات کے مطابق سائنسی ترقی کا کوئی فریم ورک دیا گیا ہے؟ اور مسلمانوں کی سائنسی ترقی پر اس کے بڑے ثابت اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

4۔ کیا اس کے مطالعہ سے کسی کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے؟ ایسا پر نجات کا انحصار ہے!

## سید حسین نصر

سید حسین نصر (پ 1933) مغرب کی ملکانہ سائنس (پروفیشن سائنس) کے مقابل ایک مقدس سائنس (سیکرڈ سائنس) کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ ان کی عمر کا بڑا حصہ الہامی علم کی بنیاد پر اسلامک سائنسٹک تحاث کی تشكیل کی کاوش میں گذر رہا ہے۔ وہ الہامی علم کی بنیاد پر ایسی سیکرڈ سائنس کی فلسفیانہ بنیادیں تشكیل دینا چاہتے ہیں جسکا مطہر نظر فطرت کی تفسیر نہیں ہو گا، بلکہ احکام الہی کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اسے استعمال میں لانے پر مشتمل ہو گا۔ لیکن ابھی تک کوئی قابل قدر تناخ سامنے نہیں آسکے۔ سید حسین نصر کے فکر کا نقص ان کی پیر ادائم میں پایا جاتا ہے۔ ان کی پیر ادائم کے بنیادی نکات درج ذیل ہیں۔

1۔ انسان، خدا سے مماثل ہستی (theomorphic being) ہے۔

(یہ عقیدہ قرآن پاک کے ارشاد کہ ”کوئی شے اسکے مثل نہیں۔“ کے صریح خلاف ہے۔)

2۔ سید حسین نصر اپنے مکتب فکر کو روایت پسند مکتب فکر (Traditionalist school) کا نام دیتے ہیں۔

روایت سے ان کی مراد وہ سب کچھ ہے جو مقدس (sacred) ہے۔ وہ سب کچھ جو انسان کو بذریعہ وحی (revelation) حاصل ہوا۔ علوم و فنون اور ثقافت میں وحی کے اظہار اور ڈیلپیٹ کی تمام صورتیں اور ان کا حاصل بھی روایت میں شامل ہے اور سیکرڈ ہے۔ اس کے مقابل انسانی فلسفہ و سائنس سے وجود میں آنے والا تمام علم، تہذیب، علمیاتی اور ان کا حاصل سب غیر مقدس (profane) اور غیر فطری ہے۔

(سید حسین نصر نہ تو مقدس علم، کی بنیاد پر 'غیر مقدس علم'، کے متوازی کوئی علم، سائنس یا فکرناوی پیش کر سکے ہیں جو اس سے بہت اعلیٰ ہو اور نہ ہی ' المقدس علم' کے دائرے میں رہتے ہوئے 'غیر مقدس علم'، (انسانی فکر و تجربہ کے حوصلات) سے استفادہ کے الہامی اصولوں کی تشکیل کر سکے ہیں۔)

3- نصر کا نظریہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو توحید کا الگ الگ تصور دیکھ نہیں بھیجا۔ دیگر ادیان اس سے انحراف کے مرتكب ہوئے۔ اسلام توحید کے اصل تصور ہی کی تکمیل ہے۔ نصر اس تصور دین کو eternal sophia, or religio perennis یا الہامی الخفیف (the primordial religion) کا نام دیتے ہیں۔ سید حسین نصر کا عقیدہ ہے کہ ہر الہامی مذہب میں "حق" اور "حق کو پانے کا طریقہ" پایا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر، ہر وہ مذہب جس میں ڈاکٹر ان اور میٹھڈ پائے جاتے ہیں، یقیناً الہامی ہیں۔ مذاہب میں فرق انکے ڈاکٹر ان کے اظہار کی زبان اور میٹھڈ کی تشکیل کے زمانے، کلچر اور روایت کا ہے۔ سید حسین نصر ہندو اسلام کو ایسے مذاہب میں شامل کرتے ہیں جن میں یہ دونوں بنیادی جزپائے جاتے ہیں۔

(فرمان الٰہی ہے: وَهَا هُوَ إِلَّا ذُكْرُ لِعَالَمِينَ ﴿٦﴾ وَهُوَ نَبِيُّ مُّكَرَّبٌ مِّنَ الْمُّبِينِ ﴿٧﴾ 68:52 ہمارا نظریہ ہے کہ صرف قرآن پاک ہی ساری کائنات کیلئے نصیحت ہے۔ کوئی علم اس کے مقابل عالمین کو بیکھرنیں کر سکتا، یہک سو نہیں کر سکتا، مقتد نہیں کر سکتا۔ جو قول قطعاً درست ہو وہی سند کا درجہ رکھ سکتا ہے۔ اور قرآن پاک ہی کے بارے میں ارشاد ہے: إِنَّهُ لِقَوْلِ فَضْلٍ ﴿٨﴾ يَقْطَعُ عَوْرَسَتْ قَوْلَهُ - 13:86 "جو لوگ قرآن پاک کو عالمین کیلئے نصیحت نہیں مانتے، مذاہب عالم کو بھلائی کے راستے کہتے ہیں، اور ان کو یکساں اہمیت دیتے ہیں، وہ بھی قرآن پاک کو جھلانے والے ہیں، اور ارشاد باری ہے: إِنَّا لَقَلْمَنْ أَنْ وَنْجُمْ مُمْكِنَيْنَ ﴿٩﴾ اور یقیناً ہم جھلانے والوں کا علم رکھتے ہیں۔ وَإِنَّهُ لَحُكْمُ الْيَقِينِ ﴿٤٩﴾ اور بے شک یہ یقیناً حق ہے۔ 13:69")

4- سید حسین نصر کا پورا نظام فکر مختلف مذاہب، زبانوں اور فلسفے سے اخذ کر کے وضع کی گئی انتہائی غیر مانوس، غیر واضح، پچیدہ اصطلاحات سے تشکیل پذیر ہے۔ چند اصطلاحات درج ذیل ہیں:

Tradition, sapiential dimentions, symbolism, sophhia perennis, philosophia perennis, traditional wisdom= al-hikma= theosophy, macrocosmos, microcosmos, prima materia. alchemy, horizontal, vertical, doctrine, method etc.

(ہمارا نظریہ ہے کہ دین کو اصطلاحات کا نظام بنانا، غیر قرآنی تصورات داخل کرنا، دین سے خداری ہے اور اسکا منشاء حق کے اختاء کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ قرآن پاک میں کوئی اصطلاح نہیں۔ قرآن پاک کتاب ہدایت ہے۔ اپنا منشاء نہیات آسان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ قرآن پاک قول ہے، عمل کی طریقت کا معیار نبی پاک ﷺ کے بعد آپ کے تصدیقانتہ شاہدین ہیں۔ عمل کے بعد عطا ہونے والی کیفیت کا نام علم ہے۔ عقل کا منشاء اصطلاحات سازی

کے ذریعے دین کو فلسفہ بنا نہیں، بندے کو تضاد سے پاک کرنا ہے۔ بعض سکالر فلسفے کو آئینہ یا لائز کر کے دین کو فلسفہ بنانا چاہتے ہیں۔ بھول نادانستہ تو ہوتی ہی ہے، دانستہ بھی ہو جاتی ہے۔ اللہ ہم سب کی مغفرت فرمائے۔ ۵۔ ”مطلق حقیقت“ اور ”اضافی حقیقت“ کے درمیان حقیقت کے درجات ہیں۔

(یہ قرآن پاک سے بالکل متفاہرات ہے۔ یہ اصطلاحات خدا اور ما سوا کو درجات کے اعتبار سے مختلف لیکن نوعیت کے اعتبار سے یکساں بنا دیتی ہیں، جو قطعاً خلاف ہوتے ہیں۔ کائنات بیشتر اور دیگر تمام مخلوقات وغیرہ مکمل طور پر حقیقت ہیں، خلق اور امر پر مشتمل ہیں۔ اللہ حقیقت کو منصہ شہود پر لانے والا، Originator of reality ہے۔

6۔ حکمت، علم اور سائنس کا منشاء یہ ہے کہ وہ کائنات میں سیکڑ کو منکشف کر کے توحید کے الہامی تصور کی توثیق کرے۔ نیچرل سائنسز کا مقصد یہ ہے کہ وہ نیچر کو سیکڑ کے ساتھ مر بروٹ کریں۔ نصر کے مطابق اسلام میں علوم اور فنون کا مقصد موجودات میں وحدت اور ربط کو آشکار کرنا ہے۔ نصر کے مطابق جدید نیچرل سائنس فطرت کے صرف مقداری پہلو کے مطالعے (quantitative study) اور نیکنالوجی کی ڈیلپینٹ تک محدود ہے، جبکہ نصر کا نظریہ ہے کہ اسلامی سائنس کا ناصب العین ایسا علم ہو گا جو طالب علم کو روحانی تکمیل سے ہمکار کرے۔ نصر کے مطابق تمام سائنس یکساں اہمیت کی حامل نہیں۔ ریاضی (mathematics) کو دیگر علوم پر فوقیت حاصل ہے۔ وہ میڈیل سائنس کو بھی فوقیت دیتے ہیں۔ علم الاعداد کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔

(ان پیش فرضیوں کی بنیاد پر سید حسین نصر (پ 1933) سوائے ماحولیاتی توازن (ecology) پر کچھ بامعنی گفتگو کر سکنے کے مغربی سائنس اور فلسفیانہ علوم کے مقابل ان سے بہتر یا کم از کم ان جیسی کوئی سیکڑ سائنس، فلسفہ یا نیکنالوجی وجود میں نہیں لاسکے جو اپنے طالب علموں کو روحانی تکمیل سے بھی نوازے۔)

(S. H. Nasr 1966, 97-151)

## اجمالی مکتب فکر—ڈاکٹر ضیاء الدین سردار

اجمالی مکتب فکر مختلف نظریات کے حامل سکالر زکا گروپ تھا جو سائنس کی معروضیت کے منکر تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ سائنس ایک کلچرل ایکٹوٹی ہے جو سائنسدان اور اس کے نظریہ کائنات سے گہرے طور پر جڑی ہوئی ہوتی ہے۔ ضیاء الدین سردار کی سربراہی میں اس گروپ نے اپنے نقطہ نظر کو ثابت کرنے کی کافی کوشش کی لیکن کامیابی حاصل نہ کر سکا اور مدت ہوئی اس کے ارکان بکھر چکے ہیں۔

## انظرِ نیشنل انسٹیوٹ آف اسلامک ٹھٹ (آئی آئی آئی ٹی)

اس پوزیشن کی بنیاد جن مقدمات پر ہے وہ یہ ہیں کہ (1) مسلم اُسہ بہت الْجَهَاوَی کی حالت میں ہے۔ یہ الْجَهَاوَی نسلیکچوں کی قسم کا ہے۔ اس کی جڑیں اسلام سے متغیر ویژن پر مبنی نظریات سے مسلم فکر پر مرتب ہونے والے اثرات میں ہیں۔ اس مکتب فکر کے مطابق بنیادی مقدمات جن پر اسلامک سائنس کو استوار کیا جا سکتا ہے، وہ مشتمل ہیں (1) ایسے نظریہ کائنات پر جو تسلیم کرتا ہو کہ قرآن پاک انسانی سرگرمی کے ہر میدان میں رہنمائی دینے کی اہلیت رکھتا ہے؛ (2) یہ کہ خدا نے کائنات کو بے مقصد نہیں بنایا اور اس نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ [؟] اجل مسکی تک۔ حضور ﷺ کی ذات اقدس وہ نمونہ ہے جس کا اتباع لازم ہے۔ (3) نیچر کو بے جا ضائع نہیں کیا جانا چاہئے بلکہ اسے اپنے خالق کی طرف سے ایک امانت سمجھ کر استعمال میں لانا چاہئے (Stenberg, 166)۔

(انسان 'خَلِيفَةُ اللَّهِ فِي الْأَرْضِ' نہیں ہے۔ اللہ پاک ہے اس بات سے کہ کائنات کے کسی حصے میں کوئی اس کا خلیفہ، نائب یا قائم مقام ہو۔ انسان کو اللہ نے 'فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً' (2:30) یا 'خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ' (38:26) 'خَلِيفَ فِي الْأَرْضِ' (10:14) بنائے ہیں۔" خلافت کی حقیقت اختیار ہے جس کا نشانہ یہ ہے کہ زمین پر موجود تمام توفیق کو حق کے مطابق استعمال میں لا جائے، لوگوں کے درمیان حق کے مطابق حکم کیا جائے، اور زمین پر انفرادی، اجتماعی اور میان الاقوامی سطح پر خواہش کی پیروی کو رانج نہ ہونے دیا جائے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ خلاف حق مفروضوں پر کسی صحیح اور مضبوط فکر کی بنیاد رکھی جاسکے!) آئی آئی ٹی بھی کوئی ایسی واضح پیراذ امام دینے میں کامیاب نہیں ہو سکا جو مسلمانوں میں فطرت کے سائنسی مطالعہ (نیچرل اور سوشل دونوں) کا ایسا شعور اجاگر کر سکتا کہ وہ بہت اعلیٰ عبادت سمجھ کر یکسوئی کے ساتھ اس میں مصروف ہوتے جیسے کہ سرسید اور اقبال چاہتے تھے۔ لیکن کسی کو ان حضرات کے اخلاص اور قابلیت پر شک کرنے یا ان کی کاوش کی تحقیر کرنے کا حق قطعاً نہیں ہے۔ انہوں نے اپنا حق ادا کرنے کی مخلصانہ کوشش کی۔ جن چیزیں کا مقابلہ کیا، و قتی اعتبار سے وہ یقیناً قبل ستائش ہے۔ لیکن بہترین کی گنجائش ہر مقام پر رہتی ہے۔ ہم نے اس کا خیر میں اپنا حصہ ڈالنے کی کوشش میں، سائنس، فلسفہ اور اسلام کا آپس میں تعلق و اخراج کرنے کیلئے قرآن پاک سے اصول وضع کئے ہیں جو قارئین کیلئے پیش خدمت ہے۔ حتمیت کا دعویٰ قطعاً نہیں۔ عبادت سمجھتے ہوئے علم کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔

## ہماری مجوہ پیر اذام

۱۔) ہماری مجوہ پیر اذام کا بنیادی نکتہ بدعت کا اصول (principle of innovation) ہے۔ یہ وہ قرآنی اصول ہے جو اجتہاد کو بنیاد مہیا کرتا ہے۔ بدعت کا اصول انسان کی فکری کاوش اور تجربہ سے حاصل ہونے والے مفید اور مسلمہ علم کو قرآن کے الہامی علم سے نسبت دینے کیلئے بنیاد فراہم کرتا ہے۔ جس طرح ایک مدت تک مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ تصور چھایا رہا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا، اور ہم صدیوں اس کی برکات سے محروم رہے، اسی طرح بعض علماء کے اخلاص نیت کے باوصف، انکی کوتاه نظری سے، ہم ابھی تک بدعت کے قرآنی اصول کی برکات سے محروم چلے آ رہے ہیں۔

ب) سورہ الحمد میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اتباع کرنے والوں کی بات ہو رہی ہے کہ رحبانیت کی ابتدا (بدعت) انہوں نے از خود کی تھی۔ یہ اللہ نے ان پر نہیں لکھی تھی۔ ان کا منشاء اللہ کی رضا چاہنا تھا۔ پھر اس کی رعایت نہ رکھی جیسے اس کی رعایت کا حق تھا۔ فرمایا گیا: ”تو ان میں سے ایمان والوں کو اللہ نے ان کا اجر دیا، اور کثیر ان میں سے فاسق ہوئے۔“ (القرآن، ۲۷:۵۷) اللہ نے انھیں رحبانیت کی بدعت اختیار کرنے پر سرزنش نہیں کی۔ بدعت کے معاملے میں اس بات کا دھیان رکھنا ضروری ہے کہ منشاء، اللہ کی رضا کے سوا کچھ نہ ہو۔ (یعنی منکرات کے معاملے میں کوئی بدعت اختیار نہیں کی جاسکتی)، نفس کی رعایت کا حق رکھا جائے جیسے کہ اسکی رعایت کا حق ہو۔ ’الراسخون في العلم‘ ہی کسی معاملے میں بدعت کی حدود کا تعین کرنے کی الہیت رکھتے ہیں۔

ج) قرآن پاک حکم ہے اور حدیث، حکم کی تفہیز۔ حکم پر عمل درآمد کا طریقہ وقت، مقام اور مقدار کے مطابق ہوتا ہے۔

”اور لوگوں میں حج کی اذان دیجئے، کہ وہ آپ کے پاس آئیں، پیادہ اور دبلے دبلے اوٹو پر، دورا ہوں سے چلے آئیں۔“ (سورہ الحج، ۲۷:۲۲) کیا آج ہم اس حکم پر اسی طرح عمل پیراہیں! کیا یہ ممکن ہے! یہ حدیث نہیں، قرآن پاک میں اللہ کا حکم ہے۔ کیا اللہ کے حکم پر عمل درآمد کا طریقہ وقت، مقام اور مقدار کے مطابق ڈھل نہیں گیا! کیا یہ بدعت نہیں! عیسوی تقویم کی طرح آئندہ سالوں کیلئے قمری تقویم کو راجح کرنے اور اس کے مطابق مہینوں کے آغاز، اور مذہبی تھواروں کی تاریخوں کو راجح کرنے کے معاملے میں رویت ہلال سے متعلق احادیث پر عملدرآمد کا طریقہ وقت مقام اور مقدار کے مطابق

کیوں نہیں ہو سکتا۔ اللہ نے فرمایا نہیں قرآن پاک میں: ”بے شک بہت اقل جو لوگوں کے لئے وضع ہوا، وہ ہے جو مکہ میں ہے۔ مبارک اور عالمین کیلئے ہدایت۔“ (القرآن، 3:96) اس آیت پاک میں مکہ کو ”مکہ، کہا گیا ہے جس کا مطلب ہے ’مرکز‘۔ کیوں حرم کعبہ تمام عالم اسلام کا مرکز نہیں ہو سکتا رویت ہلال سمیت تمام قابل عمل معاملات میں! اللہ کے اس حکم کے ہوتے ہوئے کیا چیز مانع ہے سوائے اس کے کہ حدیث پاک جو تنفیذ ہے حکم کی، اسے حکم پر فوقیت دے دی گئی ہے! حدیث پاک کو ”حسن الحدیث، پر ترجیح دے دی گئی ہے!

رمی جمار حج کا ایک رکن ہے۔ صدیوں سے حاج کرام 10 / ذوالحج کو صحیح اشراق سے دوپہر تک، اور 11 اور 12 ذوالحج کو دوپہر سے غروب آفتاب تک، اس رکن کی ادائیگی کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اگرچہ اس حوالے سے قرآن پاک میں کوئی حکم نہیں، تاہم سنت پاک اور حدیث پاک کے حوالے سے یہ حج کا ایک لازمی رکن تصور کیا جاتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ حج کے باقی ارکان بذاتِ خود ادا کرنے ہوتے ہیں، جبکہ یہ رکن کسی دوسرے سے بھی ادا کرو یا جا سکتا ہے۔ حرم شریف کی انتظامیہ کی تمام کوششوں کے باوجود پچھلی چند دہائیوں میں کئی بار بہت بڑی تعداد میں حاج کرام اس رکن کی ادائیگی کے دوران حادثے کا شکار ہوئے ہیں۔ حاج کرام کی تعداد اتنی بڑھ چکی ہے کہ عملانہ کورہ وقت کے اندر اس رکن کی ادائیگی ممکن ہی نہیں رہی۔ چنانچہ علماء کرام نے اس رکن کی ادائیگی کا ثابت میتوں ایام میں پورے دن رات تک بڑھادیا ہے۔ اگر اس بات کو پیش نظر کھا جائے کہ حکم پر عمل درآمد کا طریقہ وقت، مقام، اور مقدار کے مطابق ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے ”بدعت“ کے اصول کی صورت میں اسکی گنجائش رکھی ہے تو ہم بہت پہلے اجتہاد کر کے بڑے بڑے نقصانات سے نجسکتے ہیں اور بہت بڑی برکات سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔ سورہ البقرہ میں ارشاد ہے: آپ حج کی نیت سے نکلتے ہیں۔ روکے جانے کی کوئی صورت باذن اللہ بن جاتی ہے اور اسے عبور کرنے کی وسعت نہیں۔ اگر قربانی بھیجی جا سکتی ہو تو بھیج دی جائے، اس کے اپنے محل تک پہنچ جانے کا اندازہ رکھا جائے، اس کے بعد اپنا سر منڈا یا جائے۔ اگر نہ بھیجی جا سکتی ہو، تو وہیں قربانی کر دی جائے۔ (القرآن، 2:196) کیا اس آیت مبارک سے یہ داعی اصول اخذ نہیں ہوتا کہ حکم پر عملدرآمد وقت، مقام، اور مقدار کے مطابق ہوتا ہے؟ (State and Statecraft, 17, 243-248)۔

2۔ اس کا دوسرا نکتہ ایک میکانیکی یا اضافیتی تصور کائنات کے مقابل الہی ایڈمنیسترڈ کائنات (divinely administered universe) کا تصور ہے۔ کائنات قوانین نظرت کے مطابق ہی چل رہی ہے لیکن ایک الہی ایڈمنیسترڈ کائنات میں قوانین نظرت اللہ کے مقرر کردہ اور اسکی قدرت کے تابع متصور ہوتے ہیں نہ کہ اس کے برعکس۔

3۔ 1) یہ پیراڈاٹم ”مسلمہ سائنسی تھیوری“ اور ”سائنسی تھیوری“ میں فرق کرتی ہے۔ یہ بات ملحوظ رکھی جانی چاہئے کہ تھیوریز آف سائنس (نیچرل، ریشنل، باولوجیکل، سوشن، میٹھے میٹھیکل وغیرہ) اور انسٹیپوکل دیو آرف نیلٹی (فلسفہ) آپس میں بہت قریبی طور پر جڑے ہوئے ہوتے ہیں اور دونوں ایک ہی کمیگری سے تعلق رکھتے ہیں۔ کسی بھی درجے کی واثق سائنسی تھیوریز (well accredited theories) کو قرآن پاک کے ساتھ ہم آہنگ کرنا، غیر قرآنی اصطلاحات وضع کر کے قرآن میں اپنی تجویز داخل کرنا، آیات مثالیات کی مثالیات کی بیاناد پر تفسیر یا استعاراتی (میثا فاریکل) قیاس آرائی کے ذریعے قرآن پاک کو اپنی خواہش کے مطابق بنانا خلاف حق ہے۔  
ب) کائنات کی نیچر اور سڑکچر کی کسی تھیوری کو تھیوری سمجھتے ہوئے کوئی رائے رکھنا، مطالعہ و تحقیق کرنا، تعلیم دینا، اللہ کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے کسی تھیوری کی مطابقت میں میکنالوجی ڈویلپ کرنا یا میکنالوجی سے استفادہ کرنا قطعاً خلاف حق نہیں ہے۔ یہ بات نظریہ ارتقا کے بارے میں بھی درست ہے۔

ج) ایک سائنسی تھیوری کائنات کے کس خاص پہلو کے بارے میں ایک سائنسی قیاس آرائی (conjecture) ہوتی ہے۔ مثلاً نظریہ علیتیت، تھیوری آف کوانٹم میکنیکس، کائنات کے وجود میں آنے کے بارے میں نظریات (گیک بیننگ تھیوری وغیرہ)، آغاز حیات اور حیاتیاتی انواع کے وجود و ارتقاء کی تھیوریز۔ اسی طرح سماج کے آغاز، ارتقاء اور سماجی تبدیلیوں اور تاریخی انقلابات کے متعلق سائنسی تھیوریز، پولیٹھیکل ایڈمنیستریشن اور گورننس کے متعلق نظریات۔ آنکام، سوشن اور پولیٹھیکل، یجوکیشن اور ایجوکیشنل ایڈمنیستریشن کے مسائل پر مختلف تھیوریز۔ حقوق انسانی کے بارے میں نظریات۔ جسمانی بیماریوں، انسانی مزاج اور ان کے علاج کی مختلف تھیوریز، نفیسیات، نفیسیاتی بیماریوں اور ان کے علاج کے متعلق نظریات۔ غرض انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں

نظریات۔ بعض تھیوریز کے بارے میں مصبوط شواہد سے لیس ہونے (well-accredited) کا دعویٰ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بات ذہنوں میں بٹھادی جانی چاہئے کہ یہ سائنسی تھیوریز ہیں، کائنات اور زندگی کے بارے میں سائنسی قیاس آرائی (conjecture) ہیں، مسلمہ سائنسی حقائق (established scientific fact) نہیں ہیں۔ مسلمہ سائنسی حقیقت نہ ہونے کے باوجود، یہ ہمیں کائنات کے مختلف مظاہر کے بارے میں پیشین گوئی کے قابل بناتی ہیں۔ ان کی بنیاد پر ایجاد کی جانے والی ٹکنیکالوجی متوقع نتائج پر بہتر کنشروں مہیا کر کے ہماری زندگیوں کو آسان بناتی ہیں۔ یہ علم انسانی یا علم کسب (man-made knowledge) ہے۔ یہ انسانی تجربے، تحقیق، اور غور و فکر کا حاصل ہے۔ ہماری زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس میں ہم پہلے سے ہی اس سے استفادہ نہ کر رہے ہوں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ علم میں رائخ حضرات معاملہ زیر بحث میں قرآنی حدود واضح کریں، علم اور شعور کے ساتھ علم الہی کے ساتھ ریلیٹ کریں، اور مسلمان اس کو بدعت کے قرآنی اصول کی روشنی میں قبول کریں۔ ایک مسلمان عبادت سمجھ کر کسی بھی میدان میں اعلیٰ درجے کی سائنسی تحقیق میں مصروف ہو سکتا ہے۔ قرآن پاک کے مطابق کائنات صرف تحریکی اور حسیاتی پہلو (empirical) ہی پر مشتمل نہیں، حقیقت کے اور بھی پہلو ہیں جو اپنے اپنے قوانین کے مطابق چلتے ہیں۔

4۔ اس پیراذ امام کا چوتھا نکتہ قرآنی وجودیات (ontology) کی تشكیل ہے۔ قرآنی وجودیات کے مطابق 'خدا' سمیت تمام کائنات تین عنوانات کے ذیل میں آتی ہے:

(ا) خدا؛ جو احد ہے۔ (مثال سے پاک) -

بے نیاز ہے۔ (احتیاج، نقص، خواہش سے پاک ہے۔ اس نے سب کچھ اپنے بندوں کیلئے بنایا ہے۔ اپنے لئے کچھ نہیں بنایا۔)

اس نے کسی کو جانہ اسے کسی نے جنا۔

کوئی اسکا ہمسر ہے نہ شریک۔

(ب) خلق

(ج) امر

(ماسوال اللہ جو کچھ ہے وہ خلق کی کیمگری سے تعلق رکھتا یا امر کی کیمگری سے۔ لیکن کسی بھی طرح الہیت میں شریک نہیں۔)

5۔ آیاتِ قرآن پاک کی تعبیر کیلئے لازم ہے کہ

ا) قرآن پاک کے تضاد سے پاک ہونے پر ایمان ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نازل کردہ کلام کو 'احسن' فرمایا ہے۔ (القرآن: 39:55) اس میں اگر تضاد نظر آئے، تو وہ خود بندے کے اپنے اندر ہی سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے نکلنے کا طریقہ بھی ارشاد فرمایا ہے۔ "اہل ذکر سے سوال کرو اگر تمھیں معلوم نہ ہو،" یہ بھی فرمایا ہے: "ہر علم والے سے اور ایک علم والا ہے۔" چنانچہ اگر تضاد دور ہو تو معلوم نہ ہو تو اہل ذکر میں سے کسی کو، کسی اپنے سے بہتر جانے والے کو، تلاش کرنے کا حکم ہے۔

ب) قرآن پاک 'الحق' (the standard of truth) ہے۔ سند (authority) کا درجہ صرف اور صرف قرآن پاک کو حاصل ہے۔ (القرآن، 6:73، 2:42) کسی بھی نظریہ، اصول، عقیدہ، روایت، ارشاد، قول، گمان، خیال، احساس، وہم، قیاس، تصور، تخيّل، تاثر، وجود ان، واردات، حال، کشف، شہود، تشریح، تعبیر کی صداقت کا حتمی معیار قرآن پاک ہی ہے۔ قرآن پاک جس کی تصدیق کرتا ہے وہ حق ہے، جس کو رد کرتا ہے وہ غلای حق (بغیر الحق) ہے۔ (2:61, 3:21) قرآن پاک کے حوالے کے بغیر کی گئی بات محض رائے، قیاس، گمان یا ظن کا درجہ رکھتی ہے، اور ظن کسی کو حق سے مستقین نہیں کر سکتا۔ جس بات کا کوئی حاصل نہ ہو، وہ لا حاصل ہوتی ہے، لا حاصل بات ہی لغو ہوتی ہے، اور مومن لغو سے اعراض کرتے ہیں۔ (القرآن، 10:36, 53:28) ذات باری کے بارے میں وہی تصور، خیال، احساس، تشییہ، تعبیر، روحانی تجربہ، روایت، ظن، قیاس، نظریہ، فلسفہ درست ہو گا جو قرآن پاک کی سند کے ساتھ بیان کیا جاسکے۔

پ) اللہ نے احسن الحدیث کتاب نازل فرمائی، ایک جیسی دوہرے بیان والی۔۔۔ اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُّتَّشَايِهً مَثَانِي تَقْشِيرُ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رِبَّهُمْ حُجَّةٌ تَلَيْنٌ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ طَرِيقٌ هُدَى اللَّهُ يَهْدِي بِمَنْ يَشَاءُ طَرِيقٌ وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ (الزمر: 23:39)

احسن الحدیث کتاب سے بہتر بات کا تصور بھی درست نہیں۔ احسن بات وہی ہو گی جس کی قرآن پاک

سے تقدیق ہو۔ ضروری ہے کہ کسی بات کے درست یا غیر درست ہونے کیلئے قرآن پاک سے کم از کم دو حوالے ضرور پیش کئے جائیں۔ محسن ایک حوالے سے الجھاؤ دور نہ ہو گا۔

(ج) بندے کی نیت کا علم اللہ سے بڑھ کر کسی اور کو نہیں ہو سکتا۔ کس سے در گزر کرنا ہے یہ بھی اللہ ہی جانتا ہے، اور اللہ بہت در گزر فرمانے والا ہم بان ہے۔ علم کی حد تک کسی بھی نظر یے یا اسکی تشریع کے درست ہونے کیلئے اسکا قرآن پاک کی محکمات سے مطابقت رکھنا لازم ہے۔

(د) قرآن پاک، حدیث پر حکم ہے، نہ کہ اس کے بر عکس۔ حدیث پاک کی تعبیر کے درست ہونے کیلئے لازم ہے کہ وہ قرآن پاک سے متناقض یا متصادم نہ ہو۔ قرآن پاک حکم ہے، حدیث حکم کی تفییز ہے۔ حکم داعی ہے۔ تفییز حکم، وقت، مقام، اور مقدار کے مطابق ہوتی ہے۔ حدیث پاک، قیامت تک کیلئے تفییز حکم کی نظر (precedent) ہے جسے ملحوظ رکھا جانا ضروری ہے۔

6۔ انسان خلیفة اللہ فی الارض، نہیں ہے، 'فی الارض خلیفة' ہے۔ "انسان کو اللہ نے زمین میں خلیفہ بنا کر بھیجا ہے یہ دیکھنے کیلئے کہ وہ کیا کام کرتے ہیں۔" (لَمْ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِتَنْتَظِرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ - ) سورہ یونس، 10:14۔ مزید حوالوں کیلئے دیکھئے: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً۔ "اور جب تمہارے رب نے ملائکہ سے فرمایا: میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔" 2:30 / وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفِيعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ درجاتِ لِتَبْيَثُوكُمْ فِي مَا آتَيْنَاكُمْ۔ "اور اسی نے تصییں زمین میں خلافت دی، اور بعض کو بعض پر رفتہ درجات دی ہے، کہ تمہیں اپنی عطا کے حوالے سے دیکھئے۔" 166: (ایاد اور وہد ایضاً جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحُقْقِ وَلَا تَنْتَهِي الْهُوَى۔ "اے داؤد (علیہ السلام) بے شک ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ ٹھہرایا۔ تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکم کیجئے اور خواہش کی پیر وی نہ کیجئے کہ وہ آپ کو اللہ کی راہ سے ہڑا دے گی۔" 38:26) خلافت کی حقیقت اختیار ہے جس کا منشاء ہے کہ زمین پر موجود تمام توفیق کو حق کے مطابق استعمال میں لا یا جائے، لوگوں کے درمیان حق کے مطابق حکم کیا جائے، اور زمین پر انفرادی، اجتماعی اور بین الاقوامی سطح پر خواہش کی پیر وی کو پر و موت نہ ہونے دیا جائے۔ تحقیق کی صلاحیت بھی اللہ کی عطا ہے۔ تحقیق کا منشا قول کو قرآن پاک کی سند سے روشن کرنا ہونا چاہئے۔ حق کو روشن کرنا اور اسکی روشنی کو پھیلانا اللہ کو پسند ہے۔ حق کو پانے کیلئے علم

والوں سے سوال کیا جائے تو اس سے بھی یہ روشنی پھیلتی ہے۔ (تفسیر آیات سورہ الطور 3:1-52) (تفسیر ناضلی منزل ہفتم، 46) حق کے روشن ہونے سے معاشرتی اکائی خوف سے پاک ہوتی ہے۔ معاشرے کا آغاز میاں۔ بیوی پر مشتمل خاندانی اکائی سے ہوتا ہے۔ باقی سب رشتے اسی رشتے سے وجود میں آتے ہیں۔ یہ رشتہ قول پر استوار ہوتا ہے۔ قول، حق کی سند سے روشن ہو گا تو معاشرتی اکائی خوف و حزن سے پاک ہو گی۔ تمام تحقیق کا حتمی منشا اور حاصل معاشرتی اکائی کے قول، عمل، علم اور اخلاق کی حفاظت ہوتا ہے۔

---

# قرآن پاک اور سائنس: آویزش یا ہم آہنگی

## قرآنی وجودیات (Qur'anic Ontology)

اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے علاوہ جو کچھ بھی ہے، قرآن پاک اسے دو کینیگریز: خلق اور امر، میں تقسیم کرتا ہے۔ ارشاد ہے:- **أَلَا كَذَّابٌ إِلَّا خَلْقٌ وَالْأَمْرُ**۔ ”سن او! خلق بھی اسی کی ہے، امر بھی اسی کا ہے“ (القرآن، 7:54) ساری کائنات اللہ کی تخلیق ہے اور اسی کے امر سے چل رہی ہے۔ کائنات کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو اللہ کی خلق اور اس کے امر کے ارتباً سے خالی ہو۔ امر، علم الہی میں پہلے وجود پذیر ہوتا ہے اور خلق، تدبیر الہی سے، اس کے مطابق صورت اختیار کرتی ہے۔ خلق جب امر کو سنبھالنے کے قابل ہو جاتی ہے تو امر اس سے وابستہ کر دیا جاتا ہے یا اس کے اندر پھونک دیا جاتا ہے۔ امر وہ ہدایت اور رہنمائی ہے جو اللہ نے اپنی خلق کی ہر شے کے اندر اور بجیشت جموعی پوری کائنات کے اندر ودیعت کر دی ہے۔ اللہ کا امر ہر شے کے اندر اس کی بنیادی فطرت (essential nature) کے طور پر موجود ہے اور اسکی مقصودیت کا تعین کرتا ہے۔ خلق کے اندر امر ودیعت ہونے سے ہی نفس شے اپنی فطرت کے مطابق فعلیت کے قابل ہتا ہے۔ (The Qur'anic ontology and status of

(58) al-Haqq، ارشادِ بانی ہے: **فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلَّدِيْنِ حَنِيفًا طَفْرَةَ اللَّهِ الْيَعْلَمُ فَطْرَةَ الْأَقَاسِ عَلَيْهَا طَلَبَتِيْلَهُ**  
**خَلْقِ اللَّهِ طَلَبَكَ الدِّيْنِ الْقَيْمُلَا وَلَكُنْ أَنْكَثَرَ الْقَاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٠﴾** تو اپنا رخ دین حنیف کیلئے سیدھار کو۔ اللہ کی رکھی ہوئی فطرت پر جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا۔ اللہ کی خلق تبدیل نہ کرو۔ یہی سیدھادیں ہے، ولیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔ (القرآن، 30:30) اللہ نے لوگوں کو دین حنیف کی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ اللہ ہر ایک کو پاک فطرت پر پیدا کرتا ہے۔ فطرت کا تعلق پاکی ہی سے ہے۔ اللہ کی خلق کو تبدیل نہ کرنے کا حکم ہے۔ اپنی پسند کو خلاف حق نافذ کرنا، اللہ کی خلق کو تبدیل کرنا ہے۔ (تفہیم، 5:229-30) زمین و آسمان اور ان کے مابین ہر شے کی بھی فطرت ہے۔ **فَاطِرُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ**۔ (14:6)۔ **فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ**۔ (80:6)

تو ائمین فطرت کی تلاش، دراصل شے کی فطرت کو دریافت کرنے کی کوشش ہے۔ کائنات نیوٹن کی کلوڑ، خود کا رہیں نہیں ہے جو بھی بنائی ہے اور اب اللہ کے کرنے کا کوئی کام باقی نہیں رہا۔ قرآن پاک کے مطابق، اللہ اس کائنات کا صرف خالق ہی نہیں، حکمران، مالک، بادشاہ (مالکُ الملک) بھی ہے۔ وہی اپنی کائنات کو ایڈ منستر کر رہا ہے۔ وہ اپنی تخلیق میں اضافہ پر بھی قادر ہے اور جو چاہے اضافہ کرتا ہے۔ (القرآن، 35:1) اشیاء کو ایک بنیادی فطرت عطا ہونے کے بعد بھی رہنمائی کی ضرورت رہتی ہے۔ مزید رہنمائی جو وہ پسند کرتا ہے، امر الہی کی صورت میں آسمانوں اور زمینوں میں نازل ہوتی رہتی ہے۔ کائنات میں جو نظم اور بربط نظر آتا ہے، وہ اس بنیادی فطرت کی وجہ سے ہے جو اسے عطا کی گئی ہے اور اس امر کی وجہ سے ہے جو اس میں نازل فرمایا گیا ہے۔

## اُلوہی انتظام کے تحت چلنے والی کائنات

قرآن پاک اُلوہی انتظام و انصرام کے تحت چلائی جانے والی کائنات (Divinely administered universe) کا تصور دیتا ہے۔ “The dilemma of an interventionist” نظر کائنات کے غلط تصور کی پیداوار ہے۔ پہلے سے یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ کائنات ایک خود کار نظام ہے جو قوانین فطرت کے مطابق چل رہا ہے اور مجرمات کا مطلب خدا یا مافق الغفرت ہستی کا نظام کائنات میں دخل انداز ہو کر قوانین فطرت کے عمل کو معطل یا تبدیل کر دینا ہے۔ اللہ کے علم کو مطلق نہیں سمجھا جاتا۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ اس طرح واقعات کی فطری علتوں کے نظام پر انسانوں کا اعتناد متزلزل ہوتا ہے۔ واقعات کی قوانین فطرت کے مطابق سائنسی تشریح کے رجحان کو نقصان پہنچتا ہے۔ واقعات کی سپر نیچرل ایجنسی کے حوالے سے تشریح کا رجحان پیدا ہوتا ہے جو سائنسی پیش بینی اور مظاہر فطرت پر کنٹرول کی صلاحیت کو کمزور کرتا ہے۔ لیکن یہاں تو معاملہ بالکل ہی مختلف ہے۔ اسلام میں کائنات بے خدا نہیں، اللہ کی تخلیق ہے۔ کائنات صرف طبیعی حقیقت نہیں، اللہ کا امر بھی اس کے اندر ودیعت ہے۔ اللہ تعالیٰ خود خلق ہے نہ امر۔ وہ فزیکل ہے اور نا، نا فزیکل۔ وہ نیچرل ہے نا سپر نیچرل۔ وہ ‘خلق’ اور ‘امر’ اور ان سے وابستہ ہر چیز کو عدم سے وجود میں لانے والا (Originator) ہے اور خود ان کے ساتھ کسی طرح کی ممااثلت سے ماوراء ہے۔ تمام تعینات کا خالق ہے مگر خود تمام تعینات سے ماوراء ہے۔ کائنات کو ایڈ منستر ہی وہ کر رہا ہے۔ مداخلت کا سوال تو بپیدا ہو جب کائنات کوئی خود کار نظام ہو۔ کائنات تو قوانین فطرت کے مطابق چلتی ہی اسلئے رہے ہیں کہ اللہ کا امر قوانین فطرت کو اللہ کی قدرت، علم، حکمت اور ارادے سے معین کرتا ہے اور قائم رکھتا ہے۔ اللہ امر کی تدبیر فرماتا ہے۔ جس چیز کو وجود میں لانا چاہتا ہے وہ پہلے اس کے علم کی خلوت میں تعین اختیار کرتی ہے۔ اللہ کے امر ‘کن’ سے اسکا عنوان رکھا جاتا ہے، اسکے ارکان جمع ہونے لگتے ہیں اور حکمت الہیہ کے مطابق وہ جلوت میں وجود پذیر ہوتی ہے۔ قوانین فطرت تو قائم ہی اس کی قدرت سے ہیں، اور اسکی قدرت کے تابع ہیں۔ اسلام تو کائنات کی ہر ہرشے اور پوری کائنات کو اللہ کی آیت قرار دیتا ہے۔ ساری کائنات اللہ کی نشانیوں سے بھری پڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اگر تمام سمندر روشنائی ہو جائیں اور تمام درخت قلم، کائنات میں اللہ کے کلمات ختم نہیں ہو گے بے شک روشنائی کے سات سمندر اور آجائیں۔ (القرآن، 31:27)

## توانین فطرت اور معجزات

کائنات کی بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہے۔ وہ بے مثال ہے۔ بادشاہی میں کوئی اسکا شریک نہیں۔ اس نے ہرشے کو خلق فرمایا ہے اور ہرشے کی ساخت میں اس کے منشا تخلیق کے حوالے سے ایک تقدیر ٹھہرائی ہے: ﴿وَخَلَقَ مُلْكًا شَيْءٍ فَقَدِّرَهُ تَقْدِيرًا﴾ (القرآن، 2:25) یعنی کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ کی حدود، فطرت شے کے اظہار کیلئے سازگار حالات، موزوں مقدار، اور اشیاء کے درمیان درست توازن (optimums) کا تعین رکھا ہے۔ ﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِي بِعِسْتَقَرٍ هَذِهِ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيِّ﴾ ”اور شمس اپنے معین مدار پر چلتا ہے۔ یہ تقدیر ہے، عزت والے، علم والے کی۔“ (القرآن، 36:38) اللہ نے فرمایا ہے کہ اس نے ہرشے کی تخلیق میں قدر کا تعین کیا ہے۔ کوئی شے اس قدر سے تجاوز نہیں کر سکتی جو اللہ نے اس کے لئے مقرر کی ہے۔ اسی ”قدر“، کو جب سائنس کسی درجے میں دریافت کر پاتی ہے، تو اسے قانون فطرت کا نام دیتی ہے۔ فطرت، قدر، تقدیر، امر الہی ہی کے مختلف پہلوؤں اور امر کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ تمہیں اس کا علم قليل ہی دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے: ﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ طُقِلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِينُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا﴾ ”اور آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ فرمادیجھے، روح اللہ کے امر (کی چیزوں) سے ہے اور تمہیں اس کا قليل ہی علم عطا ہوا ہے۔“ (القرآن، 17:85) ﴿وَأَحْصَى مُلْكًا شَيْءٍ عَدِيدًا﴾ ۔۔۔ اس نے ہرشے کو گن رکھا ہے۔“ (القرآن، 28:72) اپنے مقرر فرمائے ہوئے تو انین کے اندر وہ امر کی تدبیر فرماتا ہے۔ ارشاد ہے: ﴿اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا يَنْهَا مِنْ فِي سَيَّرَةِ أَيَّامِنِئِمْ ثُمَّ أَنْشَوَى عَلَى الْعَرْشِ طَـــ يَدِيهِ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ﴾ ۔۔۔ ”اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں خلق فرمایا، پھر عرش پر استوی فرمایا۔۔۔ آسمان سے زمین کی طرف امر کی تدبیر فرماتا ہے۔۔۔“ (القرآن، 4:32) اسی طرح ارشاد ہے: ﴿إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سَيَّرَةِ أَيَّامِنِئِمْ ثُمَّ أَنْشَوَى عَلَى الْعَرْشِ يَدِيهِ الْأَمْرَ طَـــ﴾ ۔۔۔ ”بے شک تمہارا رب اللہ ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں خلق فرمایا، پھر عرش پر استوی فرمایا۔ امر کی تدبیر کرتا ہے۔۔۔“ (القرآن، 10:3) عالمین کی رو بیت اللہ ہی کو زیبایا ہے۔ رو بیت کے لوازمات کا کلی علم اللہ ہی کو ہو سکتا ہے۔ وہ ہر ایک کو پالتا ہے اور بڑے علم سے پالتا ہے۔ اللہ نے سب کچھ چھ دن میں بنایا اور پھر عرش پر استوی فرمایا۔ اس بڑے انتظام کو چلانا بھی اسی کا کام ہے۔ کام کی تدبیر بھی وہی

کرتا ہے۔ ارشاد ہے: اللہ اپنے بندوں کو اساب کو عطا کرتا ہے۔ وہ اللہ کی رضا کیلئے ان اساب کو استعمال میں لاتے ہیں۔ حضرت ذوالقرنین علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے کہ ہم نے اسے ہر طرح کے اساب عطا کئے۔ (القرآن، 18:83-98) اللہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کیلئے ہواں کو مسخر کر دیا۔ (القرآن، 12:34، 36:38) وہ آپ کے امر سے ساز گار ہو کر چلتی تھیں اس سے آپ کا سفر بہت آسان ہو جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جنون کو آپ کے تابع کر دیا۔ وہ آپ کیلئے کام کرتے تھے جو آپ چاہتے۔ محابیں، تمثیلیں، حوضوں جیسے لگن اور لنگر انداز دیگیں بناتے تھے۔ (القرآن، 12:11-34) اللہ تعالیٰ نے آپ کو منطق الظیر کا علم بھی عطا فرمایا تھا۔ آپ چیوتیوں کی بات بھی سن اور سمجھ لیتے تھے۔ جنون کی طرح پرندے بھی آپ کے لشکر میں شامل تھے اور آپ ان سے مختلف کام لیتے تھے۔ (القرآن، 18:16-27) ان میں کون سی چیز قوانین فطرت کے خلاف ہے! اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کیلئے چاہتا ہے اپنے پاس سے خصوصی علم عطا فرمادیتا ہے۔ جب ملکہ سبا حضرت سلیمان علیہ السلام سے ملنے کیلئے آرہی تھی، حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ چاہا کہ اس کے پہنچنے سے پہلے اس کا تخت آپ کے پاس لا یا جائے۔ جس تخت کو آپ کا درباری جن آپ کی مجلس برخاست ہونے تک لانے کا وعدہ کر رہا تھا، آپ کے ایک انسان درباری نے، جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب میں سے ایک علم عطا کیا گیا تھا، (قَالَ الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ أَتَأْتِيْكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ يَرَكَ إِلَيْكَ طَرْفًا ۚ۔۔۔) پہل جھنکنے میں آپ کی خدمت میں لا حاضر کیا۔ (القرآن، 40:27) حضرت خضر علیہ السلام کا نام لئے بغیر یہ کہا گیا ہے کہ ہم نے انہیں ایک خاص علم (عِلْمُ الْمُنْفَعٍ) سے نوازا تھا۔ اسی طرح انبیاء کرام کو بھی اللہ تعالیٰ اپنے پاس سے خصوصی علم سے نوازتا ہے جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا موسیٰ علیہ السلام کو نوازا گیا۔ ہر زمانے میں ایسے لوگ ہوئے ہیں اور آج بھی ہیں جن کے پاس کتاب میں سے ایسے علوم ہیں جن کی تشریح سے انسانی علم عاجز رہتا ہے۔ (بابا سچی خان d.n.) ان میں سے کوئی علم یا کوئی نشانی آسانوں، زمین اور ان کے مابین ہر شے کے اندر رکھی گئی قدر کی خلاف ورزی نہیں کرتی اسلئے کہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ہم نے ہر شے کی تخلیق میں قدر رکھی ہے۔ کائنات میں اللہ تعالیٰ نے جو عالمین یا دواڑ وجود، realms of existence، (domains) رکھے ہیں، ہر عالم کی ابی تقدیر یا اپنے قوانین ہیں۔ اٹاک لیوں کے اپنے قوانین ہیں، جنیشک سطہ کچھ اور سب اٹاک لیوں کے اپنے ہیں۔ انسان کا علم عالمین کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا علم اور اس کی قدرت ہی تمام عالمین کا احاطہ کرنے ہوئے ہے۔ اسلئے اسکی تدبیر ہی پکی ہوتی ہے۔ (القرآن، 7:183) انسان

اللہ کی جن نشانیوں کو مجذہ سمجھتا ہے، جن واقعات کی تشریح سے انسانی علم عاجز ہوتا ہے، وہ کوئی سپر نیچرل واقعات نہیں ہوتے۔ یہ عین نیچرل واقعات ہوتے ہیں، جو عالمیں میں رکھی گئی ایسی قدر یعنی قوانین فطرت کے مطابق ہوتے ہیں جو انسان کے احاطہ اور اک میں نہیں ہوتے۔ ان نشانیوں یا مجذرات سے نظام کائنات میں قوانین فطرت کی کار فرمائی قطعاً متاثر نہیں ہوتی، انسان کا قوانین فطرت پر اعتبار مجرور ہونے کا کوئی قرینہ نہیں ہوتا۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کے علم اور قدرت میں مطابقت کو ثابت کرتے ہیں۔ ان سے نظام کائنات کبھی درہم برہم نہیں ہوا۔ جن کو اللہ تعالیٰ کتاب کے کسی علم سے، یا اپنے پاس سے کسی پیش نالج (علوٰ لدُنِ) سے نوازتا ہے ان کیلئے یہ عین فطری واقعات ہوتے ہیں، دوسروں کیلئے یہ مجذہ یا خرق عادت واقعات ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر عبد الخالق صاحب کہتے ہیں انگریزی کا لفظ 'مر یکل'، وسیع مفہوم میں کرامت اور مجذہ دونوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ مر یکل ایک غیر معمولی فعل یا واقعہ ہوتا ہے جس کی تشریح سے انسانی علم عاجز رہتا ہے۔ اس فعل یا واقعہ کو "قوانین فطرت کی خلاف ورزی" یا مذہبی تناظر میں 'کائنات میں الوہی مداخلت' پر محول کیا جاتا ہے۔ مجذہ کی اس تعریف میں دو صفات تسلیم کی گئی ہیں: 1) قوانین فطرت کا پایا جانا؛ 2) فعل یا واقعہ جو ان قوانین کی خلاف ورزی سمجھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر عبد الخالق صاحب نیچرل اور سپر نیچرل، اور آرڈنری اور ایکٹر آرڈنری دائرہ ہائے وجود میں فرق کرتے ہوئے مر یکل کو نیچرل کے سپر نیچرل میں، اور آرڈنری کے ایکٹر آرڈنری میں ادغام (fusion) کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ اس ادغام کی تشریح کیسے کی جاسکتی ہے، اور اسکا جواز کیسے پیش کیا جاسکتا ہے، یہ انکے نزدیک اصل مسئلہ ہے۔ ڈاکٹر عبد الخالق صاحب اس سلسلہ میں سرسید احمد خان اور اشاعرہ کی صورت میں دو اخصاصی (exclusive) مکاتب فکر کا حوالہ دیتے ہیں۔ یہ دونوں مکاتب فکر، اپنے اپنے انداز میں 'نیچرل' کے، 'سپر نیچرل' میں اور 'آرڈنری' کے، 'ایکٹر آرڈنری' میں ادغام کے نظریے سے انکار کرتے ہیں کیونکہ یہ کسی ایک دائرہ وجود ہی کو اخصاصی طور پر منتہ ہیں، اور دوسرے سے انکار کرتے ہیں۔

1- الوہی فعلیت کے تسلیل پر اصرار اور قائم بالذات فطرت سے انکار: اشاعرہ کے نزدیک کائنات بر اہ راست الوہی فعلیت کے تسلیل پر مشتمل ہے۔ یہ تصور اشاعرہ کے نظریہ جواہر سے اخذ ہوتا ہے۔ اشاعرہ کے جواہر روحانی / سپر نیچرل نوعیت کے حامل ہیں اور ہر وقت تخلیق اور عدم سے دوچار ہوتے ہیں۔ وہ قائم بالذات قوانین فطرت یا اشیاء کی قائم بالذات فطرت کو نہیں مانتے۔

2۔ اللہ کے وعدہ، اور 'قانون فطرت' میں مماثلت: سر سید احمد خان صرف 'نجپرل' کو ہی مانتے ہیں اور 'پر نجپرل' سے انکار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک قوانین فطرت ہی حقیقی ہیں، اور ان کے خلاف کوئی ماقول الفطرت فعل یا واقعہ ممکن نہیں۔ سر سید احمد خان، اشاعرہ کے بر عکس، قوانین فطرت کو اسی طرح کے خدا ہم سے تعمیر کرتے ہیں، جیسے کہ اس کے وعدے کلام اللہ میں پائے جاتے ہیں اور جن کے بارے میں فرمان الٰہی ہے کہ اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔ مثلاً قرآن پاک میں ارشاد ہے: "اللہ اپنے بندوں پر قطعاً ظلم نہیں کرتا۔" سر سید احمد خان، اللہ کے وعدہ اور قوانین فطرت میں مشاہدہ قائم کر کے نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ خدا اپنے قائم کئے ہوئے نظام کائنات میں مداخلت نہیں کر سکتا۔ (Khaliq 2012, 187)

ڈاکٹر عبد الخالق صاحب کے مطابق سر سید احمد خان اور اشاعرہ، میں سے کسی کے نظریات بھی، مجرموں واقعہ کی محولہ بالا دو شرائط پر پورا نہیں اترتے۔ ڈاکٹر عبد الخالق کے نزدیک ان میں سے ایک نظریہ مذہبی اور دوسرا سائنسی / فلسفیانہ نقطہ نظر کی نمائندگی کرتا ہے۔ (Khaliq 2012, 188) ڈاکٹر عبد الخالق صاحب کے نزدیک مجرموں مذہبی تصور ہے، اور جسے بالغیب مانا مذہبی ایمان کا تقاضا ہے۔ اگر ہم نے اسے عقلی طور پر سمجھ کر ہی اختیار کرنا ہے تو ہمیں مذہبی - فلسفیانہ (theo-philosophical) روایہ اختیار کرنا ہو گا جو ڈاکٹر عبد الخالق صاحب کے نزدیک اس طرح ہے:

1۔ نجپر میں باقاعدگی کی تشریح کیلئے قوانین فطرت میں باقاعدگی کا ہونا از لس لازم ہے۔ اگر چیزوں کی کوئی نجپر ہی نہیں تو ہم نے دریافت ہی کیا کرنا ہے۔ اس لحاظ سے اشاعرہ غلطی پر ہیں اور سر سید احمد خان کا نجپرل ازم درست ہے۔

2۔ فطرت میں ایک ہی دائرہ وجود نہیں، نہ ہی دوائر وجود سب ایک سطح کے ہیں، اور نہ ہی قوانین فطرت کا ایک ہی سیٹ ہے۔ کئی مختلف سطح کے دوائر وجود اور ان سے متعلق قوانین کے سیٹ ہیں۔

3۔ فرنکس، کیمیسٹری، بائیولوچی، سائیکیا لوچی وغیرہ کے مسلمه دوائر وجود کے علاوہ، خیر اور شر کے حوالے سے اخلاقی قوانین بھی فطرت کا حصہ ہیں۔ ہر سائنس کے اندر (ا) یہ تین پایا جاتا ہے کہ اس کے دائرے میں کچھ قوانین فطرت ہیں۔ (ب) نیز یہ قوانین جلد یا بدیر دریافت کئے جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس اس سمت میں اپنی کاوش جاری رکھتی ہے۔

سائنسی ڈو مین اور اسکے متعلقہ قوانین ایک دوسرے سے مختلف، میز اور کسی درجے میں آزاد ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مطلق طور پر علیحدہ نہیں ہیں۔ کائنات، جس کے یہ مختلف ڈو مین ہیں، ایک عضویاتی وحدت ہے۔ اس کے مختلف ڈو مین ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر عبد الخالق صاحب کہتے ہیں جب کسی دائرہ وجود پر کسی دوسرے دائرہ وجود سے کوئی اثر، اثر انداز ہوتا ہے، اس دائرے کے قوانین تغیر پذیر ہو جاتے ہیں اس دائرہ کے وجود کے قوانین کے حق میں جس کا اشتغال ہوتا ہے۔

4۔ دائرة نہب میں ہمارا ایمان ہے کہ خدا ایک انواع شعور ذات، جس کے اپنے مقاصد، اور منصوبے، اور عمل کے قوانین ہیں۔ خدا چونکہ اعلیٰ و بر ترقیتی ہے، اس لئے اس کے قوانین بھی اعلیٰ اور ذلیلی دواز وجود۔ مادی، حیاتیاتی، نفسیاتی، اور اخلاقی وغیرہ۔ کے قوانین پر چھا جانے اور غالب آنے والے ہو گکے۔ لہذا مجرمات، ادویہ فعالیت (divine activity) ہے جو پیغمبر یا ولی اللہ کے ذریعے ظہور پذیر ہوتی ہے۔ پیغمبر یا ولی مشیت الہی کے ساتھ کم و بیش مطابقت اختیار کر چکا ہوتا ہے۔ (Khaliq 2012, 189-91).

سوال یہ ہے کہ اللہ کا یہ فرمان کہ ”ہم نے ہر فرد کو فطرت پر پیدا کیا ہے، یا یہ کہ ”اللہ نے لوگوں کو دین حنف کی فطرت پر پیدا کیا ہے، اور یہ ارشاد کہ ”اللہ کی خلق کو تبدیل نہ کرو،“ کے کیا معنی ہیں۔ فاطر السّماوات والأَرْض (6:79) کا مطلب یہی ہے کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو فطرت دی ہے، یہ اپنے اپنے دائرة فطرت میں متحرک ہیں۔ اشیاء کی فطرت سے انکار اور اللہ کے قدرت و اختیار کا اشاعرہ کا تصور درست نہیں۔ ”تَنَحَّىٰ پَرَّ اللَّهِ كَمْلَقَ كَثُرُول، اسکی قدرت ہے۔“ تو انہیں فطرت اللہ نے بنائے ہیں اور اسکی قدرت کے تابع ہیں نہ کہ اسکی قدرت ان کے تابع ہے۔ قرآن پاک نہ تو ایسی کائنات کا تصور دیتا ہے جس کی کوئی مستقل فطرت ہی نہ ہو، جیسا کہ اشاعرہ سمجھتے ہیں، اور نہ ہی ایسی کائنات کا تصور دیتا ہے جس کے دواز وجود کے قوانین فطرت ایک ہی بار قائم کر دیئے گئے ہوں، اور اب یہ مطلق طور پر خود کار ہوں۔ قرآن پاک ایک الوہی طور پر چلائی جانے والی کائنات (Divine universe) کا تصور دیتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

”امر کی تدبیر فرماتا ہے اللہ، آسمان سے زمین تک کے۔“ (القرآن، 32:5)

(8:42) ”امر اللہ کا پورا ہو کر رہتا ہے۔“ (القرآن، 10:3, 13:2)

”امر نازل ہوتے رہتے ہیں ساتوں آسمانوں اور زمین کے بیشل دیگر زمینوں میں،“ (القرآن، 12:65)

”امرو حی فرمائے اللہ نے سات آسمانوں میں، ہر آسمان کیلئے۔“ (القرآن، 41:12)

لہذا اشاعرہ اور سر سید احمد خان، دونوں مکاتب فکر کا نقطہ نظر قرآن پاک سے مطابقت نہیں رکھتا۔ مججزہ کی تعریف کا یہ پہلو کہ یہ ایسا واقعہ ہوتا ہے جو قوانین فطرت کے خلاف ہوتا ہے، درست نہیں۔ مججزہ کا مطلب ہے انسانی عقل کو عاجز کر دینے والا واقعہ۔ اللہ نے قرآن پاک میں غیر معمولی واقعات کے لئے مججزہ کا لفظ استعمال کرنا پسند نہیں فرمایا۔ اپنی آیات (نشانیوں) کا لفظ استعمال کرنا پسند فرمایا ہے۔ نظام کائنات اللہ کے امر کے تابع ہے۔ عرف عام میں جنہیں سپرنجرل واقعات یا مجرمات کہا جاتا ہے، اللہ کے امر

کے تحت ہونے کے اعتبار سے یقیناً فطری واقعات ہوتے ہیں۔ ہمیں ان کے قوانین کو معلوم کرنے کی کوشش ضرور کرتے رہنا چاہئے۔ اگر انسان اُنکی تشریع سے قادر بھی رہتا ہے تو اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ انسان اللہ کے علم مطلق کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ عین ممکن ہے اس کو شش میں فطرت کے اور بہت سے پہلو آشکار ہو جائیں۔ کیا انسان یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اسے تمام دوازدھ وجود کا علم ہے۔ ابھی بگ۔ بینگ کے نظر یہ معروف ہونے سے پہلے تک ہمارے سامنہ دان کائنات کو ازالی مانتے تھے، اس کے حادث ہونے کے منکر تھے۔ بگ۔ بینگ کی تھیوری کے معروف ہونے کے بعد کائنات کے حادث ہونے کے تصور نے سامنے تھیوری کی حیثیت اختیار کر لی۔ بیسویں صدی کے آغاز تک ہم کائنات کو سہ العادی سمجھتے تھے اور زمان کو مادی کائنات سے الگ حقیقت جانتے تھے، نظریہ اضافت کے رانج ہونے کے بعد سے ہم کائنات کو چہار العادی مانتے ہیں۔ کیا کائنات کے اور العاد ممکن نہیں۔ ابھی نصف صدی پیشتر تک ہمیں کو انظم فرزس کے دوازدھ وجود اور اسکے احتمالی قوانین کا علم نہیں تھا۔ اپنے سارے علم و تحقیق کے باوجود کائنات کی وسعت اور سرحدوں کا ہمارا علم، اندرازے قیاس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ صرف ایک دوازدھ وجود کی بات ہے۔ یہی حال چند اور دوازدھ ہائے وجود۔ سایکالوجی، مالکیکوری، بائیولوچی، جنیک انجینئنگ وغیرہ۔ کے ہمارے علم کا ہے، جنہیں ہم قدرے جانتے ہیں۔ مائیڈ کی نویعت، مائیڈ کے ذیلی ڈو مین۔ شعور، تحت الشعور، لا شعور۔ مائیڈ اور بادی کا آپس میں تعلق، اس تعلق کو یکو گلیٹ کرنے والے قوانین، کے بارے میں ہمارا علم قیاس آرائیوں سے زیادہ نہیں۔ کیا انسان کبھی بھی تمام دوازدھ وجود اور ان کے قوانین فطرت کو جانے کا دعویٰ کر سکے گا۔ تمام دوازدھ وجود اور ان کے قوانین، اور دیگر دوازدھ پر اثر انداز ہونے کی شرائط اور حدود کا علم صرف اللہ ہی کو ہے۔ ان کے قوانین بھی اسی کے قائم کر دہ ہیں۔ وہ اپنے قائم کر دہ دوازدھ موجود میں اپنا امر صادر کر کے، مزید جن قوانین کو متعارف کروانا چاہے، کرواتا رہتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالخالق صاحب کا یہ نقطہ نظر کہ ”خداء کے اپنے مقاصد، اور منصوبے، اور عمل کے قوانین ہیں،“ اعلیٰ و بر ترہستی ہونے کی حیثیت سے اس کے قوانین بھی اعلیٰ اور ذیلی دوازدھ پر چھا جانے اور غالب آنے والے ہوتے ہیں، لہذا مجذرات، الوہی فعلیت ہے جو پیغمبر یا ولی اللہ کے ذریعے ظہور پذیر ہوتا ہے جو کہ کم و بیش مشیت الہی کے ساتھ مطابقت اختیار کر چکا ہوتا ہے۔ ” الوہی انصرام کے تحت چلنے والی کائنات (divine administered universe) کے تصور سے مطابقت نہیں رکھتا۔ یہ تصور، خدا کو بھی دوازدھ

وجود (realms of existence) میں ایک برتر دائرہ وجود کی تینیت دیتا ہے، جبکہ خدا تمام دوائر وجود اور انکے قوانین کو صفحہ ہستی پر لانے والا ہے، تمام دوائر وجود پر مطلق قدرت رکھتا ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے کسی بھی دائرہ وجود کا علم اور اس پر قدرت عطا کر دیتا ہے۔ لیکن خود کسی شے یا دائرہ وجود سے مماثلت سے پاک ہے۔

## مسئلہ شر (Problem of evil)

جو کائنات اس کی نشانیوں سے بھری پڑی ہے، اس میں الہی دخل (Divine intervention) ایک بے معنی اعتراض ہے۔ صرف یہی نہیں فلسفہ مذہب میں زیادہ تم سائل اسی طرح کے غلط تصورات کے خلط بحث کا نتیجہ ہیں۔ بات کو واضح کرنے کیلئے ہم صرف ایک مسئلہ کا ذکر کریں گے جو فلسفہ مذہب کی کتابوں میں 'مسئلہ شر' کے نام سے ڈسکس کیا جاتا ہے۔ فلسفی کسی شے کے اقرار یا انکار کیلئے عقلی استدلال کو ضروری سمجھتے ہیں۔ فلسفی اگر صداقت تک پہنچنے کیلئے عقل کی الہیت کو ناکافی بھی سمجھتا ہے تو وہ اسے عقلی استدلال کی بنیاد پر ہی پیش کرتا ہے۔ فلسفیوں نے اللہ تعالیٰ کے ہونے، اور نہ ہونے، دونوں کے ثبوت پر عقلی استدلال قائم کئے ہیں۔ خدا کے عدم وجود پر جو دلائل وضع کئے گئے ہیں، مسئلہ شر، ان میں سے ایک ہے۔ اس استدلال کی بنیاد اس مقدمہ پر ہے کہ کائنات میں شر (evil) موجود ہے۔ انسانوں سے انسانوں کو پہنچنے والے دکھ جیسے جنگیں، نا انصافی، قتل و غارت وغیرہ کو سماجی یا انسانی شر (human evil) کہا جاتا ہے اور کائنات میں ہونے والی فطری تبدیلوں کے نتیجے میں پہنچنے والے دکھ جیسے وباں، بیماریاں، زلزلے، سیلا ب وغیرہ کو کائناتی شر (cosmic evil) کہا جاتا ہے۔ استدلال کیا جاتا ہے کہ کائنات میں شر کا وجود ثابت کرتا ہے کہ کائنات کا کوئی خالق اور ایڈمنیسٹریٹر نہیں۔ یا پھر وہ علیم مطلق (omniscience) نہیں کہ کائنات تخلیق کرتے ہوئے اسے علم ہو جاتا کہ یہ مخلوقات کیلئے شر کا باعث ہو گی۔ اگر وہ علیم مطلق ہے، تو پھر وہ قادر مطلق (omnipotent) نہیں ہو گا کہ شر کا تدارک کر سکتا۔ اگر وہ قادر مطلق بھی ہے، تو پھر وہ گذگاؤ (good god) نہیں۔ چنانچہ شر کا وجود خدا یا اسکی صفات میں سے کسی صفت، یا اسکے گذگاؤ ہونے سے انکار کا ثبوت ہے۔ (Attacks on religious belief 2004)

خدا اور اسکی صفات کا ایک تصور وہ ہے جو انسان اپنی سمجھ کے مطابق بناتے ہیں۔ یہ اپنا معبود خود تراشنے یا تخلیق کرنے کے مترادف ہے۔ ظاہر ہے کہ مخلوق اپنے خالق کی ذات و صفات کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ اسکے

یہ تصور لازماً ناقص ہی ہو سکتا ہے۔ ایک تصور وہ ہو گا جس کے بارے میں دعویٰ کیا جائے گا کہ یہ خدا کا اپنا دیا ہوا تصور ہے۔ اسی طرح کائنات اور مقصد تخلیق، انسان، اور مقصد حیات کو وہ تصور ہے جو انسان اپنے لئے خود وضع کرتا ہے اور ایک وہ تصور ہے کہ جس کے بارے میں دعویٰ ہے کہ وہ خدا کا دیا ہوا ہے۔ انسانی قیاس اور گمان سے بننے والے تصور خدا اور دیگر تصورات کو معیار مان کر انسانی حقائق کا تجزیہ کرنا، اور اسکی بنیاد پر مذہبی تصور خدا کی ذات اور صفات کے بارے میں نتائج اخذ کرنا کسی بھی طرح جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مسئلہ شر کے حوالے سے مذکورہ بالا استدلال کا جائزہ ہم قرآن پاک میں دیئے گئے تصور خدا اور دیگر تصورات کی روشنی میں لیں گے۔

”گُلَّهُ گَاؤْ“ سے کیا مراد ہے، کچھ واضح نہیں۔ قرآن پاک میں اللہ کے جو صفاتی نام دیئے گئے ہیں، یہ ان میں سے کسی کام تر ادف نہیں۔ الہذا خدا کے ساتھ یہ تصور منسوب کرنا ہی غیر درست ہے۔ قرآن پاک یہ بتاتا ہے کہ یہ دنیا ابدی نہیں ہے۔ یہ تو دارالعمل ہے۔ اس کے بعد دارالجزایا آترت ہے۔ دنیاوی زندگی کو پاکیزگی سے گذارنے والوں کیلئے ابدی راحتوں کی نوید ہے جہاں کبھی دکھ نہیں ہو گا۔ یہ بھی وعدہ ہے کہ: ...وَأَنَّ اللَّهَ لِيَسِ بِظَّلَامٍ لِلْعَيْبِيْدُ اور اللہ اپنے بندوں پر قطعاً ظلم نہیں کرتا۔ (القرآن، 10:182، 8:51، 22:10) یا ”گُلَّهُ گَاؤْ“ کا کوئی ایسا تصور ممکن ہے جس پر سب متفق ہوں؟ ہر شخص کے نزدیک گاؤ تبھی گُلَّہ ہو سکتا ہے اگر وہ اس کی خواہشات اور آرزوں کے مطابق کائنات کو بنادے اور قائم رکھے۔ انسانوں کو انسانوں سے پہنچنے والے دکھ / شر کی بنیادی وجہ ان کی خواہشات کا ٹکراؤ ہی تو ہے۔ انسان اپنے، اور اپنے اقرباء کے لئے، اسی دنیا میں ابدیت کی زندگی چاہے گا۔ بڑھاپانہ ہو، بیماری نہ ہو، جو چاہے وہ بلا مشقت دستیاب ہو، سماجی حقوق اور ذمہ داریاں اور اخلاقی پابندیاں نہ ہوں، مقصدیت نہ ہو، ماں کو بچے کی پیدائش اور پرورش میں جن تکالیف سے گزرنا پڑتا ہے وہ نہ ہوں وغیرہ وغیرہ۔ کیا ہم سب کی خواہشات یکساں ہیں؟ غور کر کے دیکھا جائے کہ دنیا کا ہم میں سے ہر ایک کی خواہشات کے مطابق ہونا ممکن ہے؟ کیا ایسی دنیا اس قابل ہو گی کہ اس میں رہا جاسکے؟ ماں کا بچے کیلئے پیار مثالی ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ بچے کو خطرے کے قریب جاتے ہوئے دیکھتی ہے تو اسے منع کرتی ہے، نہ رکے تو سختی بھی کرتی ہے۔ قرآن پاک میں اللہ نے اپنے جو صفاتی نام بیان کئے ہیں ان میں سے ایک رحمٰن بھی ہے۔ جب وہ بندے کو اللہ کی نافرمانی کر کے خطرے کی طرف بڑھتے ہوئے، اور اپنے سے دور ہوتے ہوئے دیکھتا ہے، تو سختی بھی کرتا ہے۔ جب وہ خطرے کی حدود سے نکل جاتا ہے تو پھر وہ رحیم ہوتا

ہے، اسکا رحم ہی رحم ہوتا ہے۔ اللہ نے انسانوں کو توفیق دی ہے۔ توفیق کو استعمال کرنے کی آزادی سے نوازا ہے۔ انبیاء کرام کے ذریعے رہنمائی سے نوازا ہے۔ شعور دیا ہے۔ ہر ہر فرد پر اسے دی گئی شعوری استعداد کے مطابق حق کو روشن کرنا اپنے ذمے لیا ہے۔ نادانستہ اور دانستہ ہونے والی کوتاہیوں سے معافی اور درگزر کارستہ بھی کھلا رکھا ہے۔ آسرادیکر مشکلات سے نکالتا بھی رہتا ہے۔ چھوٹی سی زندگی میں پورا اتر نے کیلئے ابدی راحتوں کی نوید بھی ہے۔ وہ رزق کو قبض اور بسط بھی کرتا ہے۔ اگر کوئی نافرمانی پر پختہ ہو جائے تو اس نے بتایا ہے کہ وہ منتقم بھی ہے، جبار اور قہار بھی ہے۔ اتنی عظیم الشان کائنات کے بغیر کسی مثال کے ابداء کرنے والے کا علم کائنات کی ہر ہرشے کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ایک پتہ بھی جو گرتا ہے اللہ کو اس کا علم ہوتا ہے۔ (القرآن، 6:59) زمین کی اندر ہیری گہرائیوں یا آسمان کی پہنائیوں میں کوئی چیز اس کے احاطہ علم سے باہر نہیں۔ (The Qur'an: Creation or Command, 119-129) اس کی قدرت ہر شے کو محیط ہے۔ کائنات کے سب اثامک لیوں سے گیلکیز اور بلیک ہولز اور ان سے پرے نامعلوم و سمعتوں تک ہر چیز اس کے احاطہ قدرت میں ہے۔ اس کی کرسی آسمانوں اور زمینوں پر محیط ہے۔ کائنات میں کوئی نتیجہ نہیں لکھتا مگر اس کے اذن سے۔ (القرآن، 2:102, 249) کیا مسئلہ شر کی بنیاد پر تشكیل کئے گئے اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات سے انکار کے استدلال کی کوئی حیثیت رہ جاتی ہے اس تصور خدا کے سامنے جو قرآن پاک بیان کرتا ہے۔

## سائنس کی وجودیات

کلاسیکل سائنس یا جدید سائنس اپنی میتھڈاوجی کے مطابق صرف قابل مشاہدہ و تجربہ اور قابل پیاسش حقائق تک اپنے کو محدود رکھتی ہے۔ خدا کی ذات، اسکے وجود یا عدم سے تعریض، سائنس کا کام نہیں سمجھا جاتا۔ سائنس کی وجودیات صرف فزیکل کورسیلیٹ تسلیم کرتی ہے۔ کائنات کو خلق اور امر کے مربوط نظام کی حیثیت سے دیکھنا سائنس کی وجودیات میں شامل نہیں۔ کائنات، سائنس کے نزدیک ایک خود کار نظام ہے جو اپنے طبعی قوانین فطرت کے مطابق از خود چل رہی ہے۔ سائنس اسی حیثیت سے کائنات کو سٹڈی کرتی ہے۔ سائنس، دعا اور مجذرات (آیات الہی) سے انکار ہی اسلئے کرتی ہے کہ سائنس میں مریکل سے مراد ایسا واقعہ لیا جاتا ہے جس کا معلوم قوانین فطرت کے نعلیٰ یا تبدل سے وجود میں آنا بیان کیا جائے۔ ایسا کیوں نہیں سوچا جا سکتا کہ کائنات کو عدم سے تخلیق کرنے والا، ہر شے کو اس کی کیتا خلقت عطا کرنے والا، ہر شے کو امر عطا کرنے والا، نظام کائنات کو اپنے ارادے، علم اور قدرت سے چلانے والا، اپنے بنائے ہوئے قوانین

فطرت کے کسی مختلف نظام کو، جو انسانوں کے ابھی علم میں نہیں یا کبھی بھی علم میں نہ آسکے، کیوں متحرک نہیں کر سکتا۔ کیا یہ اس کی قدرت کے خلاف ہے۔ کیا اسکی قدرت اپنے بنائے ہوئے قوانین فطرت کے تابع ہو گئی ہے۔ کائنات میں صرف اسکی ربویت پر ہی غور کر لیا جائے۔ اللہ کائنات میں ہر ایک کو پالتا ہے اور علم سے پالتا ہے۔ کیا یہ مجرہ نہیں۔ کیا انسان اللہ کی مخلوقات کا، جن کی وہ ربویت کر رہا ہے، احاطہ کر سکتا ہے۔ اللہ کی آیات (جنہیں عرف عام میں مجررات کہا جاتا ہے) انسانوں کو علم عطا ہونے کی ایک اور صورت نہیں۔ انسان اللہ کی قدرت اور علم کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ جس طرح آج ہم سرن (CERN) میں مصنوعی طور پر بگ بینگ کی کنڈی شنر کا مطالعہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس تحقیق کے نتیجے میں ہم پر علم کے نئے درکھل رہے ہیں، ہم کو انہم مکینکس میں سب اٹاک آجیکٹ ٹڈی کر رہے ہیں، اسی طرح اللہ کی نشانیوں (مجررات) کو علم الہی کی ایک نئی صورت سمجھتے ہوئے اس کے قوانین دریافت کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ جس نے کائنات کا ابداء کیا ہے بغیر کسی مثال سے، وہ سب سے بھی پیدا کر سکتا ہے اور بے سبب بھی۔ اس نے کائنات کو بے سب سے تخلیق کیا، وہ کائنات کو سب سے چلا رہا ہے۔ سائنس دان اب کو انہم مکینکس کی صورت میں جو کچھ مشاہدہ کر رہے ہیں، کیا یہ علم الہی کا ایک بہت ہی مختلف اظہار نہیں۔ کو انہم مکینکس کے حقائق دریافت ہونے سے پہلے، اگر مذہب نے انھیں حقائق کا ذکر کیا ہوتا تو کیا سائنس دان اسے قبول کر سکتے تھے! جس طرح کائنات کے حادث ہونے کا تصور چند دھایاں قبل سائنسدانوں کیلئے بالکل غیر سائنسی بات تھی اور آج نہیں ہے۔ اسی طرح آج آسمانوں کا ہونا اور وہ بھی سات آسمانوں کا طبقاً عن طبق ہونا سائنسدانوں کو ایک غیر سائنسی بات لگتی ہے، جب وہ اسے دریافت کر لیں گے تو وہ عین سائنسی نظریہ ہو جائے گا۔ اس مضمون میں خود سائنس کی اپنی تحقیقات کی روشنی میں درج ذیل سوالوں کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

- 1۔ کیا قرآنی تصور خدا کو مدعا خلقت کار (interventionist deity) کہنا درست ہے۔
- 2۔ کیا سائنس تمام عالمیں (نظمہائے حقیقت) کا احاطہ کرتی ہے اور کیا سائنس کو، صداقت کے حقیقی حوالے کے طور پر مانا جاسکتا ہے!

- 3۔ کائنات حادث ہے یا قدیم؟ کیا یہ ممکن ہے کہ کائنات از خود وجود میں آجائے!
- 4۔ خالق کائنات، کائنات کو چلا رہا ہے، یا یہ قوانین فطرت کے مطابق از خود چلتی چلی جا رہی ہے۔
- 5۔ کیا قوانین فطرت، خدا کی جگہ لے سکتے ہیں!

- 6۔ اگر کائنات قوانین نظرت کے مطابق چلتی جا رہی ہے تو کیا خدا کے بغیر ایسا ہونا ممکن ہے۔  
 7۔ یہ وہ چند سوالات ہیں جن کا اس آرٹیکل میں جواب تلاش کرنا مقصود ہے۔

## جدید کا سمولوچی

جدید کا سمولوچی کا آغاز بیسویں صدی میں ہوا اور اسٹر دنوی کے بارے میں ملنے والی معلومات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ماضی میں محدود زمانی فاصلے پر ایک اساسی حالت سے کائنات کا آغاز ہوا۔ بعد ازاں کائنات مسلسل تغیر و ارتقاء کے مرحلے سے گزر رہی ہے۔ مسلسل ارتقا اپنے طور پر مسلسل تخلیقی عمل کا مظہر ہے۔ کائنات ہر لمحے تکوین کے مرحلے میں ہے۔ (Altaie 2008, 151) یہ سوال کہ کائنات حادث ہے یا بے خدا اور قدیم، ہماری اخلاقی اقدار اور ان کے معنی، اس دنیا میں ہماری زندگی اور موت کی معنویت، ہمارے وجود کے معنی اور مقصدیت کے تعین کے حوالے سے بہت اہم ہے۔ (Altaie 2008, 149) جدید کا سمولوچی کے فلسفیانہ مضمرات، بیشمول پرائمری سنگولیریٹی کے رول اور کو انتم افیکٹ کے ذریعے سنگولیریٹی سے اجتناب کے امکانات کا جائزہ لیا جانا بہت ضروری ہے۔ کائنات کی ابتدائی کیتا حالت جس کے ساتھ بگ۔ بینگ کو منسوب کیا جاتا ہے اسے سنگولیریٹی کہا جاتا ہے۔ (Altaie 2008, 149)

کائنات کے حدوث (origination, creation) اور قدم (eternity, uncreatedness) پر بات کرنے کیلئے 'تخلیق' اور 'اور بجن' کی اصطلاحات کے معنی و مفہوم کا واضح کیا جانا نہایت ضروری ہے تاکہ 'تخلیق' اور 'اور بجن' کے فرق کو ملحوظ رکھا جاسکے۔ خدا کے بارے میں بات کرتے ہوئے یہ واضح ہونا ضروری ہے کہ ہم لفظ 'خدا' کو 'خالق خدا' (Personal Creator) کے معنی میں استعمال کر رہے ہیں، یا کسی یونیورسل قانون فطرت کے معنی میں، یا کسی یونیورسل کنڈیشن کیلئے جسے ہم ناگزیر خیال کرتے ہیں۔ کائناتی سڑکچر، قوانین، اور منطق کے حوالے سے درج بالا ہر تصور کے اپنے مضمرات ہوں گے، اسلئے اگر یہ واضح نہ ہو کہ لفظ 'خدا' کس معنی میں استعمال کیا جا رہا ہے تو اس سے بہت کنفیوژن پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ (Altaie 2008, 151)

## قرآنی کامسولوجی

قرآن پاک کے مطابق کائنات حداثت ہے۔ کائنات کی تخلیق، اللہ جو کہ قادر مطلق خدا ہے، کے ارادہ وامر کی مرہون منت ہے۔ قرآن پاک کے مطابق خدا کائنات کا خالق بھی ہے اور قیوم بھی۔ ربوبیت ہر مقام پر اسی کے امر سے ہو رہی ہے۔ عرش وہ مرکزی مقام ہے جہاں سے کائنات کو چلایا جا رہا ہے، اور اللہ ہی ہے جو کائنات کو چلا رہا ہے۔ قرآن پاک ایک الٰہی طور پر چلائی جانے والی کائنات (Divinely administered universe) کا تصور دیتا ہے۔ آئیے دیکھتے ہیں قرآن پاک کائنات، اسکی تخلیق، مقصد تخلیق، نظام کائنات اور خالق کائنات، کے بارے میں کیا ارشاد فرماتا ہے۔

### تخلیق کائنات

- 1۔ ”خلق کی ابتداء اللہ ہی نے فرمائی۔ اللہ اسے پھر دوبارہ پیدا کر دے گا۔“ (النکبوت، 19:29)
- 2۔ ”عدم سے (بغیر کی مثال کے) وجود میں لانے والا آسمانوں اور زمین کا، جب امر فرماتا ہے، تو یہی فرماتا ہے، کہ ’ہو‘، جبکہ وہ ہو جاتا ہے۔“ **بَيْنَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طِيلًا قَصْمٍ أَنْرَأَيْنَا مَا يَقُولُونَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ** ﴿40﴾ (القرآن، 40:68)
- 3۔ ”اور آسمانوں اور زمین کا غیب اللہ کے پاس ہے، اور امر تمام رجوع کرتے ہیں اللہ ہی کی طرف۔۔۔“ (القرآن، 11:123)
- 4۔ ”امر تو سب اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔۔۔“ (القرآن، 3:154)
- 5۔ ”ہم نے ہر شے کو ایک مقدار کے ساتھ خلق کیا ہے۔“ (القرآن، 54:49)
- 6۔ ”فَمَا دَبَّجَنَّ كَيْا تم اس سے کفر کرتے ہو، جس نے دو دن میں زمین خلق فرمائی، اور تم اس کے ہمسر ٹھہراتے ہو۔ وہی تو رب العالمین ہے۔“
- 7۔ ”اور اس میں اس کے اوپر سے لٹکر ڈالے اور اس میں برکت رکھی اور اس میں انکی خوراکیں ٹھہرائیں، یہ سب چار دن ہوئے، سائلین کی ضرورت کے مطابق۔“
- 8۔ ”پھر آسمان کی طرف استوئی فرمایا، اور وہ دخان تھا، تو اس سے اور زمین سے فرمایا، کہ تم دونوں طوعاً یا کرہاً ہمارے حکم کی تعمیل کرتے رہو۔ دونوں نے عرض کی، ہم رضاور غبت سے حاضر ہیں۔“
- 9۔ ”پھر انہیں دو دن میں پورے سات آسمان کر دیا، اور ہر آسمان میں اس کے امر کی وحی فرمائی۔“

- 10۔ ”اور ہم نے دنیا کے آسمان کو چار اغوش سے مزین کیا، اور اسے محفوظ بنایا۔ یہ عزت والے علم والے کا تھبہ ریا ہوا ہے۔“ (القرآن، 41:9-12)
- 11۔ ”بے شک ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے مابین ہے، چچہ دن میں خلق فرمایا، اور ہمیں تھکان نے مس نہیں کیا۔“ (القرآن، 50:38)
- 12۔ ”اللہ ہی ہے جس نے سات آسمان بنائے اور زمین سے انہی کی مثل۔ امر انکے مابین نازل ہوتا ہے، تاکہ تمھیں علم ہو جائے کہ اللہ ہر شے ع پر قادر رکھتا ہے، اور اللہ کا علم ہر شے کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔“ (القرآن، 65:12)
- 13۔ ”اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چچہ دن میں خلق کیا، اور اس کا عرش پانی پر تھا۔“ (القرآن، 11:7)
- 14۔ ”کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے سات آسمان خلق کئے، ایک پر ایک۔“ (القرآن، 71:15)
- 15۔ ”اور بے شک ہم نے تم پر سات طریق خلق کئے۔ اور ہم خلق سے غافل نہیں ہیں۔“ (القرآن، 23:17)
- 16۔ ”تو پاپی ہے اسے جس کے ہاتھ ہر شے کا اختیار ہے، اور اسی کی طرف تم مراجعت کرو گے۔“ (36:83)
- 17۔ ”اور صور پھونکا جائے گا، تو جبھی وہ قبروں سے نکل کر اپنے رب کی طرف چل پڑیں گے۔“ (36:51)
- 18۔ ”کیا دیکھتے نہیں، کہ جو شے بھی اللہ نے خلق فرمائی ہے، اس کا سایہ اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے داکیں اور بائیں جھلتا ہے، اور وہ اظہار عجز کر رہے ہیں۔ اور اللہ ہی کو سجدہ کرتا ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے جاند اروں میں سے اور ملائکہ، اور وہ استکبار نہیں کرتے۔ اپنے اپر اپنے رب کا خوف رکھتے ہیں اور وہی کرتے ہیں، جس کا انہیں امر ہو۔“ (القرآن، 16:48-50)
- 19۔ ”اس کا امر تو یہی ہے کہ جب کسی شے کا ارادہ فرمائے تو کہتا ہے کہ ’ہو جا‘، تو وہ ہو جاتی ہے۔“ (36:82)
- 20۔ ”امر کی تدبیر فرماتا ہے اللہ، آسمان سے زمین تک کے۔۔۔“ (القرآن، 10:3، 13:2، 32:5)
- 21۔ ”امر اللہ کا پورا ہو کر رہتا ہے۔۔۔“ (القرآن، 42:8)
- 22۔ ”امر نازل ہوتے رہتے ہیں ساتوں آسمانوں اور زمین کے بخشش دیگر زمینوں میں،۔۔۔“ (القرآن، 65:12)
- 23۔ ”امر وحی فرمائے اللہ نے سات آسمانوں میں، ہر آسمان کیلئے۔“ (القرآن، 41:12)
- 24۔ ”امر ہر ایک کے لئے۔۔۔ ایک وقت مقرر ہے۔“ (القرآن، 54:3)

## مقصد تحلیق

”وہ جس نے موت و حیات کو خلق فرمایا کہ دیکھے تم میں سے کس کا عمل احسن ہے۔ اور وہی عزت والا، بخشش والا ہے۔“ (القرآن، 67:2) ”اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چچہ دن میں خلق کیا، اور اس کا عرش پانی پر تھا۔ کہ تمھیں دیکھے کہ تم میں کس کے عمل احسن ہیں۔ اور تم کہو کہ تم لوگ موت کے بعد اٹھائے جاؤ گے تو کافر ضرور کہیں گے یہ تو کھلا جادو ہے۔“ (القرآن، 11:7) ”اور تم کسی حال میں ہو، اور تم اس

کی طرف سے قرآن پاک کی تلاوت کرو۔ اور تم لوگ کوئی بھی عمل کرو، ہم تم پر گواہ ہوتے ہیں، جب تم اس میں مصروف ہوتے ہو۔ اور تمہارے رب سے ذرہ بھی چھپا ہوانہیں زمین میں اور نہ آسمان میں، نہ اس سے چھوٹا اور نہ بڑا، مگر وہ کتاب ممین میں ہے۔“ (القرآن، 61:10)

## خالق کائنات

اللہ یہ بھی کہتا ہے کہ ”انسانوں کی تخلیق کے مقابل آسمانوں کی تخلیق بہت بڑا کام ہے۔“ (القرآن، 40:57، 79:27) اور ”ہم نے انسان کو چنی ہوئی مٹی سے خلق فرمایا۔ پھر اسے قرار مکین میں نطفہ ٹھہرایا۔ پھر ہم نے اس نطفے کو علقہ بنایا، پھر مضمضہ سے ٹدیاں بنائیں، پھر ڈیوں کو گوشت پہنایا، پھر اسے آخری شکل دی۔ تو بڑی ہی برکت والا ہے اللہ جو احسن الخلقین ہے۔“ (القرآن، 14:12-23) ”خلیفہ بنایا ہے اللہ نے تحسیں، کہ دیکھے کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔“ (القرآن، 14:10) ”تو یا ہم خلق اول سے عاجز رہے ہیں۔ بلکہ انھیں خلق جدید میں شبہ ہے۔“ (القرآن، 15:50) – ”اور وہی آسمان کو تھامے ہوئے ہے کہ کہیں اس کے اذن کے بغیر یہ زمین پر گر پڑے۔“ (القرآن، 22:65) ”اللہ چاہے تو موجودہ نسل انسانی کی جگہ نئی مخلوق بھی لاسکتا ہے۔“ (القرآن، 14:19، 17:99) قرآن پاک یہ بھی کہتا ہے کہ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے۔

(وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ وَإِنَّا لَكُوْسْعُونَ ﴿١﴾) اور آسمان کو ہم نے قدرت سے بنایا اور ہم ہی وسعت دینے والے ہیں۔“ (القرآن، 47:51) قرآن پاک کے مطابق یہ کائنات دارالعمل کے طور پر تخلیق کی گئی ہے اور اپنے خاتمے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ایسا دن بھی آئے گا جب آسمانوں کو لپیٹ دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتا ہے کہ جس طرح ہم نے پہلی بار کائنات کو تخلیق کیا تھا، اسی طرح ہم دارالجزا کے طور پر ایک نئی کائنات تخلیق کریں گے۔ یہ وعدہ ہے جسے پورا کرنا ہمارے ذمے ہے۔ (القرآن، 104:24) جہاں تک انسانوں کی تخلیق کا تعلق ہے قرآن پاک انسان کی مرحلہ وار تخلیق کا ذکر کرتا ہے۔ انسان کی تخلیق بھتی ہوئی مٹی سے ہوئی۔ جب انسان کو بناسنوار لیا گیا تو اللہ نے اس میں روح پھونک دی جو کہ اللہ کے امر کی چیزوں میں سے ہے۔ (القرآن، 12:23، 29:15) جہاں تک اللہ تعالیٰ کی صفات کا تعلق ہے، اللہ، ارسطو کے لفظ کی اصطلاح attribute کی طرح کی صفات سے پاک ہے۔ مسلم متكلمین، اشاعرہ اور معتزلہ نے 'صفت' کے لفظ کو غلطی سے فلسفہ ارسطو کے اصطلاحی مفہوم میں استعمال کیا اور مسئلہ ذات و صفات باری میں الجھ گئے۔ قرآن پاک

اللہ کے لئے صفت، یا صفات، کا لفظ ہی استعمال نہیں کرتا۔ قرآن پاک اللہ کے اسماء الحسنی کا ذکر کرتا ہے جو اس کے صفاتی نام ہیں۔ (H. A. Wolfson and A. H. Kamali)

قرآن پاک کے مطابق، جو اسلامی تعلیمات کا الہامی ذریعہ ہے، زمین کی تخلیق دو دون میں ہوئی، مزید دو دن میں اس کے اوپر پہلاً تخلیق کئے گئے اور مخلوقات کے لئے خوارک کا احتمام کیا گیا۔ یہ سب چار دن ہوئے۔ (زمیں پر کوئی ایسی مخلوق موجود نہیں جس کی ربویت کا احتمام موجود ہے)۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آسمان کی طرف توجہ فرمائی اور دون میں انہیں ٹھیک سات آسمان کر دیا۔ سات آسمانوں کی تخلیق سے پہلے آسمان دھواں تھا۔ یہ دھواں بھی اللہ ہی کی تخلیق تھی۔ اس طرح زمین آسمان اور جو کچھ ان کے مابین ہے انہیں چھ دن میں تخلیق کیا گیا۔ زمین کی تخلیق آسمانوں کی تخلیق سے پہلے ہے۔ زمین بھی آسمانوں کی مثل سات ارضی طبقات کی صورت میں ہے۔ سات براعظم تو معروف ہیں۔ ساتوں آسمان اور زمین کے ساتوں طبقات کے مابین ہر شے اللہ کے احاطہ قدرت میں ہے اور احاطہ علم میں ہے، اللہ ان کو اپنی قدرت اور اپنے علم سے چلا رہا ہے۔ عرش بھی اللہ کی تخلیق ہے۔ عرش کی بھی ربویت ہو رہی ہے۔ زمین و آسمان کی تخلیق سے پہلے اللہ کا عرش پانی پر تھا، یعنی پانی موجود تھا۔ نیوٹن، آئن سائنس اور کو انظم فرکس کسی میں بھی اس بات کا ذکر نہیں کہ زمین کی تخلیق سے پہلے پانی ہی پانی تھا۔ آسمانوں کا تصور، اور پھر طبقاً عن طبق سات آسمانوں کا کوئی تصور جدید کا سمو لوگی میں نہیں۔ چھ دن میں زمین و آسمانوں کی تخلیق، یہ قرآنک کا سمو لوگی ابھی اس حقیقت کی تصدیق سے قاصر ہے۔ سات آسمانوں کی صورت میں تخلیق سے پہلے آسمانوں کے دھواں ہونے کا جدید کا سمو لوگی میں کوئی تصور نہیں۔ یہ پانی بھی کوئی ازلی مادہ نہیں تھا جس سے اللہ نے کائنات بنادی۔ پانی بھی اللہ کی تخلیق ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ ہائیڈروجن اور آئسیجن، دو گیسوں کا کیمیکل کمپاؤنڈ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ زمین اور سات آسمانوں کی تخلیق سے پہلے یہ گیسیں اور کیمیکل کمپوزیشن کے قوانین تکمیل ہو چکے تھے۔ زمین کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے زمین کو فرش اور آسمان کو چھپت بنایا۔ زمین کے ہر حصے پر آسمان موجود ہے۔ آسمانِ دنیا کے بارے میں فرمایا گیا کہ ہم نے اسے چراغوں سے زینت دی۔ آسمانوں کی تخلیق کے بعد ہر آسمان میں اس کے فناش کے مطابق قوانین و دیعت کئے گئے۔ جس خلق ارض و سماء نے ان کی تخلیق سے پہلے کیمیکل کمپوزیشن کے قوانین فطرت تخلیق کئے وہ مزید قوانین فطرت کی تخلیق سے قاصر تو نہیں ہو سکتا۔ آسمانوں اور زمین میں اب بھی امر الہی و حی فرمائے جاتے رہتے ہیں۔<sup>41</sup> نہش و قمر اور نجوم

کے اللہ کے امر سے مختصر ہونے یا اللہ کے امر کے آمانوں اور زمین میں وحی کئے جانے کا انسانوں کیلئے قابل فہم مفہوم یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اللہ کے بنائے ہوئے قوانین فطرت کے مطابق اپنے دائرہ کار میں مصروف ہیں یا اللہ کا امر قوانین فطرت کی صورت ان پر عائد کیا جاتا ہے۔ جس اللہ پاک نے احتیاج، تقصی، خواہش، عیب اور کمزوری سے پاک ہوتے ہوئے کائنات کی تخلیق کی، اس نے کچھ بھی اپنے لئے نہیں بنایا، سب کچھ اپنے بندوں کیلئے بنایا ہے۔ کائنات کی تخلیق، انسانوں کیلئے اس کے احکام، کوئی چیز اللہ کی کسی غرض کو پورا نہیں کرتی اسلئے کہ وہ پاک ہے غرض و غایت سے۔ پھر اس نے کائنات کیوں تخلیق کی؟ مقصد تخلیق یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے موت و حیات کو خلق فرمایا یہ دیکھنے کیلئے کہ تم میں سے کس کا عمل احسن ہے۔ (سورہ الملک: 1) اور ہم کوئی بھی عمل کریں اللہ ہم پر گواہ ہوتا ہے، جب ہم اس میں مصروف ہوتے ہیں۔ اور اللہ سے ذرہ بھی چھپا ہوا نہیں زمین میں اور نہ آسمان میں، نہ اس سے چھوٹا اور نہ بڑا۔ سب کچھ ایک کتاب میں میں لکھا ہوا ہے۔ قرآن پاک چودہ صدی پہلے سے کائنات کے حادث ہونے کا تصور دے رہا ہے، جبکہ تمام یونانی فلسفی بشمول افلاطون اور ارسطو اور سائنسداران بشمول بطیموس (Ptolemy)، اور نیوٹن ایک ازلی کائنات ہی کا تصور پیش کرتے چلے آ رہے ہیں۔ نظریہ اضافیت کی بگ بینگ تھیوری کی صورت میں جدید سائنس نے نزول قرآن کے چودہ صد سال بعد کائنات کے حادث ہونے کی تصدیق کی ہے۔ جس طرح آج جدید سائنس سات آمانوں، اور قرآنی کاسمو لو جی کے دیگر حقائق کی تصدیق تک نہیں پہنچی ہے، کیا یہ صدیوں قرآن پاک کے کائنات کے حادث ہونے کے تصور کی نفی نہیں کرتی رہی۔

قرآن پاک سے واضح ہے کہ افلاطون کے امثال کی مانند کوئی ازلی سانچے (eternal ideas / patterns) علم الہی میں موجود نہیں تھے جن کے مطابق کائنات اور اشیاء کائنات وجود میں آئی ہوں۔ کائنات کی تخلیق عدم سے ہوئی ہے بغیر کسی مثال کے۔ اشیائے کائنات کی طرح اللہ خالق ہے ان نمونوں کا بھی جن پر اس نے اشیاء کو خلق فرمایا۔ خلوت کا مقام پہلے ہے، جلوت کا مقام بعد میں۔ جلوت میں تخلیق ہونے سے پہلے چیزیں علم الہی کی خلوت میں وجود میں آتی ہیں۔ متكلمین نے حدوث کائنات پر دلائل بھی وضع کئے ہیں۔ یہ دلائل متكلمین کی وضع کردہ نیچرل فلاسفی، جسے دقيق الكلام کہا جاتا ہے، کا حصہ ہیں۔<sup>42</sup> مسلم فلسفیوں الفارابی اور ابن سینا نے ارسطو کے تین میں ازیلت کائنات کا نظریہ پیش کیا جبکہ امام غزالی صاحب نے ان دلائل کا استرداد کر کے کائنات کے حدوث پر استدلال کیا۔ مسلم فلسفیوں کا ایک استدلال یہ

بھی تھا کہ اگر کائنات حادث ہے تو پھر اللہ تعالیٰ نے تخلیق کے لئے لمحے کا انتخاب کیا۔ انتخاب کیلئے اصول ترجیح کا ہونا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کیلئے تمام لمحات یکساں ہیں۔ اس لئے کائنات حادث نہیں بلکہ اذی ہے۔ امام غزالی صاحب نے تخلیق کائنات کے لمحے کے انتخاب پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ نامم اور سپسیں دونوں کائنات کے ساتھ ہی تخلیق ہوئے۔ لمحہ تخلیق سے پہلے کوئی لمحہ نہیں اگرچہ خدا تخلیق کائنات سے پہلے موجود ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے غزالی آج Adolf Grünbaum کی طرح کے استدلال کا استردادر ہا ہو جو یہ کہتا ہے کہ چونکہ بگ-بینگ سے پہلے وقت نہیں تھا، لہذا بگ-بینگ کی علت ممکن نہیں کیونکہ علت کیلئے نامم کا ہونا ضروری ہے۔ (Grünbaum 1991:233-254) (Altaie 2008, 157) قرآن پاک میں ایک خوفناک دھماکے کی حیثیت سے بگ بینگ کا تصور کہیں سے اخذ ہوتا نظر نہیں آتا۔ اسی لئے متکلمین اور مسلم فلسفیوں کے مباحثت میں بھی اس کا کہیں تذکرہ نہیں ملتا۔ مسلمانوں کو اسے محض ایک ایسی سائنسی تھیوری کی حد تک ہی اہمیت دینی چاہئے جس نے کائنات کے حادث ہونے کے قرآنی تصور کی تصدیق کی ہے۔

## جدید کا سمو لو جی

جدید کا سمو لو جی کے مطابق کائنات تقریباً ایک بھل نامم پہلے وجود میں آئی۔<sup>43</sup> (Hubble time (~1010 years is the inverse of Hubble constant) تمام ماہ / انر جی کی طرح سپس اور نامم بھی اسی خوفناک دھماکے میں تخلیق ہوئے ہے بگ-بینگ کہا جاتا ہے۔<sup>44</sup> بگ-بینگ سے پہلے کچھ نہیں تھا، سپس تھی نہ نامم، نہ مادہ نہ انر جی۔ اس لئے یہ کہنا درست ہے کہ کائنات کی تخلیق عدم سے ہوئی۔ ایک سب اٹاک پارٹیکل کے سائز کا ماہ پھٹ کر سیکنڈ کے بہت ہی چھوٹے حصے میں وکیوم کی نیکیتو از جی کے پریشر سے ناقابل تصور حد تک بڑا سائز اختیار کر گیا۔ سپس اور نامم کے ساتھ ہی فرکس شروع ہوئی۔ کائنات بہت تیز پھیلاوے کے دور سے گزرنے لگی۔ اور اس کا نمبر پر اسکے ریڈ لیس کے معکوس (fell in inverse proportion to its radius) گرنے لگا۔ اس طرح مادی ذرے اکٹھا ہونے لگے، الیکٹرون، پروٹون سے ملے اور آغاز سے تقریباً 3000، 00 سال بعد ہائیڈروجن اور ہیلیم کے ایٹم تشکیل ہوئے۔ چنانچہ ابتدائی کائنات ہائیڈروجن ہیلیم گیسی غبار (nebulae) پر مشتمل تھی۔ اس نیبولا میں مادے کے جمنے سے ستارے پیدا ہوئے۔ بالآخر ٹپر پر اس لیول پر آگیا جہاں سے نیوکلیر ری ایکشن شروع ہوا جس سے

ہائینڈر و جن کے نیو گلنس آپس میں مد غم ہو کر بھاری ایٹم وجود میں آئے۔ George Gamow اور اسکے ساتھیوں نے بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں ہلکے ایٹموں کے وجود میں آنے پر اپنی ریسرچ پیش کی جس میں ایک کاسک مانیکر و یو بیک گراونڈ ریڈائلشن (CMB) کا تصور بھی پیش کیا۔ پیزیاز اور رابرٹ ولسن نے 1965 میں اس کی تصدیق کی اور آج ہم کائنات کے بارے میں جو صحیح معلومات رکھتے ہیں وہ CMB کی پیمائش ہی سے حاصل شدہ ہیں۔

## کوانٹم فزکس

کوانٹم فزکس، کوانٹم تھیوری کے ساتھ متعلق ہے۔ اس کے مطابق ایک پارٹیکل ایک وقت میں دو مقامات پر پایا جاسکتا ہے۔ یہ تھیوری کوانٹم ملینکس بھی کہلاتی ہے۔ ہماری کائنات کی عمر اسوقت تقریباً 13 ارب 80 کروڑ سال ہے۔ جبکہ زمین کو تشکیل پائے تقریباً پانچ ارب سال ہو چکے ہیں۔ (NASA 2012) کائنات تقریباً 350 ارب بڑی اور 720 ارب چھوٹی کہشاویں پر مشتمل ہے جن میں سے ہر ایک کہشاں میں زمین سے کئی گناہرے اربوں سیارے اور کھربوں ستارے ہیں۔ یہ کائنات ابھی تک پھیل رہی ہے۔ یہ کہاں تک جائے گی، یہ کتنی بڑی ہے اور اس میں کتنے بھید چھپے ہیں، ہم اسکا صرف 4 فیصد جانتے ہیں۔ کائنات کے 96 فیصد راز ابھی تک ہمارے احاطاء علم و شعور سے باہر ہیں۔ یہ 96 فیصد نامعلوم بھی دو حصوں میں تقسیم ہیں۔ چوالیں (44) فیصد حصہ وہ ہے جس کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ ہم اسے نہیں جانتے۔ سائنسدان اس 44 فیصد حصے کو ”ڈارک میٹر“ کہتے ہیں۔ یہ ”ڈارک میٹر“ پرانی بھی ہے۔ ہمارا سورج اس ارزی بھی کے سامنے ریت کے ایک ذرے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ سائنسدان کائنات کے باقی 52 فیصد نامعلوم کے بارے میں کہتے ہیں ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ ہم اسے نہیں جانتے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے مادے کی اس دنیا کا آدھا حصہ غیر مادی ہے۔ یہ غیر مادی دنیا ہماری دنیا میں تو انائی کا مأخذ ہے۔ سائنسدان اس غیر مادی دنیا کو ”اینٹی میٹر“ کہتے ہیں۔ یہ اینٹی میٹر پیدا ہوتا ہے، کائنات کو تو انائی کا مأخذ ہے اور سینکڑے کے اربویں حصے میں فنا ہو جاتا ہے۔ لیکن سرن لیبارٹری (CERN) کے سائنس دانوں نے چند ماہ قبل اینٹی میٹر کو 17 منٹ تک قابو میں رکھا ہے۔ اگر سائنسدان اسے لمبے عرصے تک قابو میں رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ممکن ہے پوری دنیا کی تو انائی کی ضرورت بہت مختصر وقت میں پوری ہو سکے۔<sup>45</sup>

## بگ-بینگ ماذل

بگ-بینگ ماذل جو جدید کا سماںوجی کے ایک سٹینڈرڈ ماذل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے، کے کچھ مسائل بھی ہیں جنہیں جزوی طور پر انفلیشن کے ذریعے حل کر لیا گیا ہے۔ تاہم ابھی تک کوئی اور تبادل ماذل اس سے بہتر تنائج پیش کرنے سے قادر ہے۔ بگ-بینگ ماذل بھی ہر اعتبار سے مکمل نہیں ہے۔ مثلاً یہ ماذل ہمیں اس سوال کا جواب دینے سے قادر ہے کہ لارجیسٹ سکیل پر کائنات کیوں اتنی یونیفارم ہے اور سالیست سکیل پر کائنات اتنی نان یونیفارم کیوں ہے۔ بگ-بینگ تھیوری اس بات کی بھی تشریح نہیں کرتی کہ سازار اور ملکیکری کیسے وجود میں آئیں۔) (Wollack, NASA 2010) بگ-بینگ کے تبادل تھیوریز بھی پیش کی گئی ہیں جن میں Steady State Theory, Eternal Inflation Theory, Oscillating Model شامل ہیں لیکن ابھی تک زیادہ سائنسی شواہد بگ-بینگ تھیوری ہی کو سپورٹ کر رہے ہیں۔ (Tate 2014)

اکثر مذہبی لوگ اس ماذل کی بنیاد پر تخلیق کائنات کے الوہی تصور کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاہم بعض فلاسفہ اس کے بر عکس تنائج بھی اخذ کرنے کی کوشش کرتے چلے آ رہے ہیں۔ (Altaie 2008, 160) سنگولیریٹی (singularity) یعنی بگ-بینگ سے پہلے کی وہ بے مثل صور تحال، وہ ابتدائی کنڈیشن جس میں نہ زمان ہے نہ مکان، نہ مادہ، انجی نہ علیت ایک گہری فلسفیانہ اہمیت کا تصور ہے۔ سپس، ٹائم کی غیر موجودگی میں کوئی فرکس ممکن نہیں اسلئے ہم یہ سوال نہیں پوچھ سکتے کہ بگ-بینگ سے پہلے کیا کنڈیشن تھیں۔ بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ کائنات کا آغاز سنگولیریٹی یعنی لاحدہ دکھافت، پریشر اور ٹپر پچر کی حالت میں ہوا۔ لیکن جب فرکس یعنی ایسی سائنس ہی دستیاب نہیں جو اس یونیک صور تحال کو سٹندرڈ کر سکے تو اس مفروضے کی تصدیق کیسے ممکن ہے۔ جو ماذل، کائنات کا آغاز سنگولیریٹی سے کرتے ہیں وہ کو انظم ایئنٹ کو قابل توجہ نہیں سمجھتے۔ جو ماذل کو انظم ایئنٹ کو قابل توجہ سمجھتے ہیں وہ کائنات کے نان۔ سنگولر آغاز سے وجود میں آنے کی تشریح کرتے ہیں۔<sup>46</sup> سٹیون ہاکنگ اور ہرٹل کی تجویز کہ کائنات بگ-بینگ سے لا محدود ٹائم پہلے ایک تخیلی تی زمان (imaginary time) میں موجود مانی جا سکتی ہے، کا مطلب ہے کہ یونیورس فریکل حالت میں وجود نہیں رکھتی تھی کیونکہ تخیلی تی زمان (imaginary time) ایک طبیعی طور پر قابل پیمائش مقدار نہیں ہے۔ اس لئے معقولیت کے ساتھ اس تجویز کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔ مزید یہ

کہ ہانگ - ہرٹل تجویز حد درجہ قیاسی ہونے کے باوجود ایسی اذی کائنات کا قابل قبول جواز پیش کرنے سے قاصر ہے جو خدا کے بغیر ازل سے چل رہی ہو۔ بعض مذہبی لوگ، جیسے کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، آغاز کائنات میں سنگولیریٹی کا ہنا و جود خالق کے لئے ایک ثبوت کے طور پر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر الطائی کا خیال ہے کہ یہ ایک بے خدا کائنات کے نظریے کو زیادہ سپورٹ کرتی ہے کیونکہ ایک نان سنگولر کائنات کو، سنگولر کائنات (جو فرض کرتی ہے کہ آغاز میں ڈنسٹری، پریشر، ٹپریچر لا محدود تھا) کی نسبت اپنا مکملہ ڈیزائن متعین کرنے کیلئے ایک خالق خدا کی احتیاج زیادہ ہو گی۔ اگرچہ ایک سنگولر یونیورس میں بھی خدا کارول بالکل زیر و نہیں ہو جاتا۔ علمیاتی نقطہ نظر سے ایک سنگولر یونیورس زیادہ جبریتی ہو گی ایک نان سنگولر یونیورس کی نسبت۔

اوولف گربنام (Adolf Grünbaum) بگ بینگ کو محض ایک غیر حقیقی واقعہ سمجھتا ہے کیونکہ  $T=0$  پر شارٹ کیلئے کوئی ٹائم ہی نہیں تھا۔ اس کے مطابق بگ بینگ ایک زمانی و مکانی طبعی واقعہ ہونے کی شرائط پوری نہیں کرتا۔ الطائی اتفاق کرتا ہے کہ یہ بات درست ہے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کوئی بگ بینگ نہیں ہوا یا یہ کہ بگ بینگ ایک غیر علی واقعہ تھا۔ یہ درست ہے کہ یہ سوال فزکس کے بجائے میٹا فزکس سے متعلق ہے۔ ایک فزیکل یونیورس میں عملت کیلئے زمانی تقدم ضروری ہے معلوم سے۔ اگر اسے بگ بینگ پر اپلاں کیا جائے تو پھر کہنا پڑے گا کہ بگ بینگ کی کوئی نان فزیکل کا ز تھی۔ کیونکہ ہماری موجودہ فزکس کوئی ٹھیک فزکس نہیں ہے۔ ممکن ہے آئندہ یہ کسی نان فزیکل کا ز کا تصور دریافت کر لے۔ (Altaie 2008, 161)

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ فزکل و کیکوم بکسر خالی نہیں ہوتا۔ یہ ورچو میل پار ٹیکل انٹی پار ٹیکل کے جوڑے ہوتے ہیں جو ابھرتے ہیں اور بہت ہی شارٹ ٹائم میں ابھرتے اور منٹہ رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہی اچانک بگ بینگ کا سبب بنے ہوں۔ الطائی کا نظریہ ہے کہ اس پر کوئی سالد تھیوری ڈیولپ نہیں کی گئی، نیز جو لوگ اس فیلڈ سے تعلق رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ کوئی ورچو میل سٹیٹ حقیقت کا روپ نہیں دھار سکتی جب تک کہ ایک سڑاگنگ فیلڈ آف ایکسٹرٹل فورس موجود نہ ہو۔ چنانچہ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے فیلڈ کا منع کیا تھا جو کائنات کے وجود میں آنے سے پہلے ورچو میل سٹیٹ کو ایکچو میل سٹیٹس میں تبدیل کر سکنے کی توجیہہ کر سکے۔

## فائلن میونڈ یونیورس

جدید کا سمولو جیکل دریافت کی بنیاد پر ماہرین طبیعت کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی ہے کہ کائنات میں بہت ہی انتیلیجنسٹ اور ترقی یافتہ مخلوقات کا ہونا ثابت کرتا ہے کہ ہماری کائنات ایک tuned fine یونیورس ہے۔ فائلن ٹیونگ کی تعریف بعض ماہرین طبیعت نے اس طرح کی ہے کہ یہ کائنات انسان حیسی مخلوقات کو سنبھال سکنے کیلئے ڈیزائن کی گئی معلوم ہوتی ہے۔ مشہور سائنسٹ وینبرگ اس بات کی مخالفت کرتا ہے کہ کائنات ارادی طور پر اس مقصد کیلئے ڈیزائن کی گئی تھی اور کہتا ہے کہ نیچرل سلیکشن کے اصول کی بنیاد پر انسانوں نے اس کائنات میں ایڈ جسٹ کرنا سیکھا ہے۔ (Weinberg 1999) ڈاکٹر باصل الطائی کا نظریہ ہے کہ یہ بڑی قبل افسوس بات ہے کہ وینبرگ جیسا سائنسدان اس بات کو جان نہیں سکا کہ مفظی اور علمیاتی دونوں اعتبار سے نیچرل سلیکشن، کی اصطلاح قبل اعراض ہے کیونکہ سلیکشن کیلئے نیچر میں ارادہ کو مانا ضروری ہے۔ مختلف فیکٹرز کو آرڈینینٹ کرنے کا مطلب ہے مائندٹ کا ہونا۔ تو کیا نیچر کامائندٹ ہے؟ یہ مائندٹ آف گاؤ کو ماننے والی بات نہیں! جس کا وینبرگ انکار کرتا ہے۔ (Altaie 2008, 163)

## لاز آف نیچر

آخری سوال لاز آف نیچر کے بارے میں ہے۔ کیا لاز آف نیچر جو ہم دریافت کرتے ہیں یا وضع کرتے ہیں، مائندٹ آف گاؤ کو ظاہر کرتے ہیں؟ جواب حاصل کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اس سوال کا جواب دیں کہ سائنسی تھیوریز حقائق (fact and realities) کو بیان کرتی ہیں یا ہمارے مائندٹ اور ایمجینیشن کا اظہار ہیں؟ جدید سائنس کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ سائنسی تھیوری وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ اگرچہ نئی اور پرانی تھیوریز کی کیلکولیشنز میں مطابقت قائم کر لی جاتی ہے، تاہم تعلقات (concepts) تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ دو بہت اہم مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

1- کو ائم تھیوری بمقابلہ کلاسیکل ریڈی ایشن فزکس اور

2- نظریہ اضافیت بمقابلہ نیوٹونیں میکنیکس اور تھیوری آف گریویشن

ہم دیکھے چکے ہیں کہ کس طرح کلاسیکل پارٹیکل کنسپٹ تبدیل ہوا، ویو پارٹیکل ڈولیٹی کے تصور نے اس کی جگہ لے لی جو کو ائم تھیوری کے سب سڑیم کی تشکیل کرتا ہے۔ اسی طرح کو ائم میرمنٹ کے عدم

جبیریت (indeterminism) نے کلاسیکل فزکس کے نظریہ جبریت (determinism) کی جگہ لے لی۔ ان نئے تصورات نے لاز آف نیچر کے فلسفہ کو بالکل تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ علی جبریت (determinism) کو خدا کی ضرورت نہیں رہتی اگر نیچر کے قوانین خود کار ہوں۔ لیکن غیر جبریتی (indeterministic) یا آزاد کائنات میں مختلف، اور بسا اوقات متفاوت، قوانین فطرت کو کو آڑ دینیٹ کرنے اور انکا رزلٹ فائل کرنے کیلئے یقیناً خارج میں پر سنل گاؤ کی ضرورت رہتی ہے۔ اگر قوانین فطرت جبریتی ہوں اس طرح کہ کائنات از خود چل سکتی ہو تو کسی خارجی ایجنت کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس کے بر عکس اگر عدم جبریت قوانین فطرت کی بنیاد ہے تو خارج میں خدا کی ضرورت ناگزیر ہو گی۔ یہاں عقل اور نیچر میں آویزش پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ نیچر ان قوانین کا اتباع نہیں کرتی جو ہمارا ہے اس کے لئے اختراع کرتا ہے بلکہ ان قوانین کا اتباع کرتی ہے جو خدا نے اس کے لئے بنائے ہیں۔ فزیکل لاز آف نیچر جو ہم دریافت کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں، دراصل ہمارے ذہن کی اختراع ہوتے ہیں، ذہنی خدا کی تخلیق نہیں ہوتے۔ قوانین فطرت کی دریافت کے ذریعے دراصل ہم اپنے ذہن کو (ذہن کے ذہن کو) دریافت کرتے ہیں کہ وہ کیسے کام کرتا ہے۔ تقریباً دو صد سال تک ہم سمجھتے رہے کہ نیوٹن کا قانون قوت ثقل (Newton's law of gravity) دراصل نظام شمسی کو کنٹرول کرنے کا خدائی قانون ہے۔ پھر یہ آشکار ہوا کہ نیوٹن کے قانون کی ریاضیاتی تکمیل درست ہے اور نہ ہی اس کا کشش ثقل کا تصور، حالانکہ خلائی سائنس دان نہایت کامیابی کے ساتھ ان کے ذریعے سیاروں کے مدار کی پیمائش اور ان سیاروں کی پیش گوئی کرتے رہے جو بعد میں دریافت ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ آئن سائنس سمیت کوئی بھی سائنس دان ذہن خدا کو جان نہیں سکا کہ وہ کیسے کام کرتا ہے۔ آئنسٹائیں کا تصور خدا اپوری کائنات کے نظام اور تنظیم کے حوالے سے تھا۔ کائنات میں indeterminism کے پہلو کو مانا اس کیلئے مشکل تھا۔ اسی لئے وہ احتجاجاً پار اٹھا کہ یہ نہیں مانا جاسکتا کہ خدا اس کھلیتا ہے۔

از خود کام کرنے والے مختلف، متفاوت اور علیحدہ قوانین فطرت کائنات کے نظام اور خوبصورتی کی توجیہ نہیں کر سکتے۔ انہیں کسی کو آڑ دینیٹنگ میکانزم کی ضرورت ہو گی جو اپنے طور پر ایک اور لاء آف نیچر ہو گا۔ ورنہ ہمیں کسی ایسے ایکسٹر نل ایجنت کی ضرورت ہو گی جو نیچر کی حد بندیوں کا پابند نہ ہو۔ کسی بھی طرح کسی ایسے قانون فطرت کو پایا نہیں جاسکتا جو تمام قوانین فطرت کو آپس میں کو آڑ دینیٹ کر سکے کیونکہ مانا

پڑے گا کہ اس میں ایسا میکانزم موجود ہے، اور یہ ناقابل تصور ہے۔ اس صورت میں ہمیں ایک اور ایسا قانون چاہئے جو اس سمیت تمام قوانین کو کامیکانزم رکھتا ہو اور اس سلسلہ کا لامحدود طور پر بڑھتے چلے جانا، نظام کائنات کو ناقابل فہم بنادیتا ہے۔ چنانچہ ایک ایسے ایکسٹر مل ایجنسٹ کا ہونا جو نیچر کے تابع نہ، اس معضلہ (dilemma) کے حل کیلئے لازم ہے، ایسا ایجنسٹ جو نہ سپسیں کا پابند ہونہے ظاہر کا اور نہ ہماری لا جگ اور فہم کا۔ ماہرین طبیعت کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے تصور خدا پر غور کریں اور ایسی ایکسٹر مل پاور، ارادہ اور وزڈم کی حامل ہستی کے امکان پر غور کریں جو کائنات کو کنٹرول کر رہی ہے اور قائم رکھے ہوئے ہے۔ خدا کا تصور ایسی ہستی کی حیثیت سے کیا جانا چاہئے جو کائنات کو ایڈمنیستر کر رہی ہے لیکن خود فزیکل سپسیں اور ظاہر سے ماوراء ہے۔ اگر ہم خدا کا ایسی ہستی کی حیثیت سے ادراک کریں گے جو ہماری فزیکل یونیورس کے اندر موجود ہے تو اس سے کائنات اور پیچیدہ ہو جائے گی، ایسے خدا کو فزیکل لاز آف نیچر کا پابند ہو کر رہنا پڑے گا اور پھر ایک ایسے سپر نیچر ل خدا کی ضرورت ہو گی جو اسکی پاور اور ارادہ اور عمل کو باقی قوانین کے ساتھ کو آرڈینیٹ کرے۔ (Altaie 2008, 164)

## لامحدود تخيلاٰتی زمان — سٹیون ہاگنگ

سٹیون ہاگنگ اپنی کتاب A Brief History of Time میں کہتا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ کائنات طبیعی طور پر وجود میں آنے سے پہلے، لامحدود تخيلاٰتی زمان (imaginary time) میں موجود رہی ہو۔ چنانچہ کائنات کے وجود میں آنے کیلئے کسی خالق خدا کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ڈاکٹر الطائی کا نظریہ ہے کہ ہاگنگ اس حقیقت کو نظر انداز کر رہا ہے کہ مفروضہ مقداریں (imaginary quantities) ریاضیاتی حقیقتیں (mathematical entities) ہوتی ہیں، فزکس کی ریاضیاتی تشکیل میں اہم کردار ہونے کے باوجود ان کی براہ راست پیمائش ممکن نہیں ہوتی۔ (Altaie, M. Basil 2015, 1)

خلاء کی کوئی نہیں پر تحقیق سے ہاگنگ اخذ کرتا ہے کہ کائنات صرف قوتِ ثقل (gravity) کی بنیاد پر عدم سے وجود میں آسکتی تھی۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب "The Grand Design" میں دعویٰ کرتا ہے کہ کائنات کیلئے کسی خالق خدا کی ضرورت نہیں۔ لارنس کراس بھی اپنی کتاب Something from Nothing میں اسی قسم کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر الطائی یہ کہتا ہے ہاگنگ اور کراس دونوں اس حقیقت کو نظر انداز کر رہے ہیں کہ عدم کو ہست کرنے کیلئے ایک بہت سڑاگ گریوٹی یا سپسیں۔

ٹائم وارپ کی ضرورت ہے۔ ورچوکل پار ٹیکلز جن کے بارے میں فرض کیا جاتا ہے کہ وہ کو انٹم و بیکوم میں موجود ہوتے ہیں، ایک سڑ انگ گریٹیشنل فیلڈ کے بغیر اچانک رونما نہیں ہو سکتے۔ پال ڈیویز اس حقیقت کو تسلیم تو کرتا ہے لیکن کہتا یہ ہے کہ یہ صرف زبان (سمینگلکس) کا مسئلہ ہے۔ وینبرگ اور کراس خدا کے وجود کو اسی صورت مانے کیلئے تیار ہیں اگر کائنات مجرمانہ طور پر چلتی ہوئی دھماکی جاسکتی ہو۔ مثلاً آسمان پر ستارے ایسی ترتیب اختیار کر لیں کہ ”لکھا ہوا نظر آئے یا آگ کی توار آئے اور اس کا سر قلم کر دے، تو یہ خدا کو مانے کیلئے تیار ہونگے۔ ڈاکٹر محمد باصل الطائی کا کہنا ہے کہ مجرمانہ طور پر چلنے والی کائنات نظم و ترتیب سے خالی ہو گی، کسی واقعہ کی سائنسی توجیہہ ممکن نہیں ہو گی، ایسی کائنات میں خدا کے بجائے محض ایک قوت کی ضرورت ہو گی جو اس بلا سند نیچر کے chaos کو قائم رکھ سکے۔ وینبرگ کے ریمارکس یہ ہیں کہ خدا کو نہ مانے والوں کی مشکل یہ ہے کہ ”لازم نہیں ہے کہ کنسٹنٹ ریاضیاتی نتائج حقیقی صور تھال کو ہی بیان کر رہے ہوں، کیونکہ ایسی بہت سی کنسٹنٹ ریاضیاتی تکالیفات ہیں جو نیچر میں حقیقی طور پر وجود نہیں رکھتیں۔“ (Altaie, M. Basil 2015, 2)

## کیا سائنس، خدا پر اعتقاد کو ختم کر دیتی ہے؟ — محمد باصل الطائی

الطائی کہتے ہیں کہ ”کیا سائنس، خدا پر اعتقاد کو ختم کر دیتی ہے؟“ بڑا تازک سوال ہے۔ اس میں بہت سی اصطلاحات ایسی شامل ہیں جن کے معنوں کا تعین نہایت ضروری ہے۔ یہ سوال فلسفیانہ اور تھیو لو جیکل، دونوں تناظر میں اٹھایا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر الطائی کا کہنا ہے کہ ”خدا“ کے ایک خاص تصور کیلئے جواب ہاں میں دیا جاسکتا ہے، جبکہ ”خدا“ کے ایک مختلف تصور کیلئے جواب نہیں ہو سکتا ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ پہلے طے کر لیا جائے کہ ہم ”خدا“ سے کیا مراد لے رہے ہیں۔ دیکھنے والی دوسری بات یہ ہے کہ کیا خدا کے وجود پر اعتقاد اور کائنات کے چلنے کیلئے خدا کا ہونا ہماری نفسیاتی، طبیعی، علمیاتی ضرورت ہے یا پھر عملی ضرورت ہے۔ یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ کیا کائنات کے بارے میں مکمل معلومات نہ ہونے کی وجہ سے یہ ہماری وقتی ضرورت ہے، یا یہ اعتقاد ہمارے کائناتی صداقت کے علم کا بنیادی جز ہے۔ یہ بات پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہے کہ حال پر ہمارے سائنسی نظریات ہمیشہ ہماری معلومات کی حد تک ہی ہوتے ہیں۔

خدا کو نہ ہے! کیتھ وارڈ کہتا ہے کہ ”خدا ایک نان۔ فریکل، صاحب شور، صاحب علم و فہم ہستی ہے، جس نے ممیز اقدار (distinctive values) کو وجود میں لانے کیلئے کائنات کو تخلیق کیا۔“ ڈاکٹر الطائی کا

تبصرہ ہے کہ خدا کی یہ تعریف اس مفروضے کو تقویت دیتی ہے کہ شعور غیر طبیعی شکل میں بھی موجود ہو سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ طبیعی کیا ہے اور غیر طبیعی کیا ہے؟ اپنے موجودہ فہم کی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فزیکل ہستی وہ ہوتی ہے جسے حقیقی زمان کے اندر صائب علیٰ رشتوں میں بیان کیا جاسکے۔ اور علت سے ہماری مرادوہ قبل تصدیق رشتہ ہے جس میں علت، زمانی اعتبار سے اپنے معلول سے لازماً پہلے ہوتی ہے۔ ایک فزیکل چیز لازماً قبل پیمائش ہوتی ہے۔ البتہ کمپلیکس اعداد، قبل پیمائش نہیں ہوتے، اسلئے نان۔ فزیکل قرار دیئے جا سکتے ہیں لیکن کمپلیکس نمبر ہماری ریاضیاتی فارمولیشن کا لازمی حصہ ہوتے ہیں جن سے ہم فطرت کو سمجھتے ہیں۔ اسلئے خدا کے فہم کا ایک آسان تصور یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ ”خدا ایک سمبل ہے جو ایک سپر نیچرل ایجنسی کی طرف اشارہ کرتا ہے جو خلق کی پشت پر ہوتی ہے، اسے سنبھالنے اور قائم رکھنے کیلئے، اگرچہ اسے صرف اسی تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔ خدا ایک نظام ہے جو قوانین فطرت کو صائبیت عطا کرتا ہے۔ سپر نیچرل ہونے کی بناء پر اس ایجنسی کا محض عقلی مطالعہ کرنا ممکن نہیں اور اسے مکمل طور پر اپنے احاطہ شعور میں لانا بھی ممکن نہیں ہو گا۔“ (Altaie, M. Basil 2015, 3)

نظاموں کا خالق ہے اور خود ان کے ساتھ ہر مشابہت سے پاک ہے۔

### کیا قوانین فطرت خدا کی جگہ لے سکتے ہیں۔

الاطائی کا خیال ہے کہ خدا کے عدم وجود، یا کائنات میں خدا کی عدم ضرورت پر، اس سے زیادہ مضبوط دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ نظام کائنات خود کار ہے اور قوانین فطرت کے مطابق چل رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ قوانین فطرت کیا ہیں اور کیا وہ خدا کی جگہ لے سکتے ہیں؟ آئیے دیکھتے ہیں جدید فلسفہ و سائنس کی ترقی کے دوران مختلف فلسفیوں اور سائنس دانوں نے قوانین فطرت کے بارے میں کیا نقطہ نظر اختیار کیا ہے۔ فلسفہ جدید کا بانی ڈیکارت (1596-1650) قوانین فطرت کو ایک اور اراء اور ناقابل تغیر خدا کی فعلیت قرار دیتا ہے۔ جبکہ اسکا ہم عصر فلسفی ہابس (1588-1679) نہیں سمجھتا کہ نیچرل فلاسفی میں خدا کا کوئی روٹ ہو سکتا ہے۔ قوانین فطرت کے کائنات میں عمل کو واضح کرنے کیلئے وہ جیو میٹری کے قوانین کا حوالہ دیتا ہے۔ ڈاکٹر الاطائی جیو میٹریکل آر گومنٹ کی مثال زمین پر آزادانہ گرتے ہوئے ایک پتھر سے دیتا ہے جس کے بارے میں کہا جائے کہ یہ اسلئے زمین پر گرتا ہے کیونکہ پتھر اور زمین کے درمیان قوتِ نقل کا فرمایا ہے۔ لیکن کیا ہم یہ بھول نہیں رہے کہ قوتِ نقل کا منبع کیا ہے اور کون اسے متحرک کر رہا ہے؟ ایک

غیر جانبدار مفکر کو آپ اس قسم کے سوال پوچھنے سے روک نہیں سکتے۔ آپ اس قسم کے سوال کی پیش بندی قوتِ ثقل کے عمل کو کسی اور عمل کے ساتھ منسوب کر کے بھی کر سکتے ہیں۔ مثلاً جیسے نیوٹن قوتِ ثقل کے عمل کو مادے کے ساتھ منسوب کرتے ہوئے کہ جہاں ماہہ ہو گا، قوتِ ثقل بھی ہو گی۔ یا جیسے آئن شائن اسے سپسیں۔ ظالم کروپر کے ساتھ منسوب کرتا ہے۔ یا جیسے ہابس خدائی عمل دخل سے اسلئے انکار کرتا ہے کہ ایک غیر طبیعی حقیقت، طبیعی حقیقت پر کس طرح اثر انداز ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر محمد باصل الطائی نان فریلک رئیٹی کے فریلک رئیٹی پر اثر انداز ہونے کے مسئلہ کو سائنس اور مذہب کی موجودہ ڈیبیٹ میں بڑا چیلنجنگ سوال قرار دیتا ہے۔ ڈاکٹر الطائی کا خیال ہے کہ جدید سائنس باخصوص بائیولوچی اور فزکس نے اس مفروضے کی بنیاد پر کہ، علتی لزوم (deterministic causality) کا اصول کائنات کی قابل اطمینان تشریح کیلئے بالکل کافی ہے، وجود خدا پر اعتقاد کو کمزور کرنے میں اہم روول ادا کیا ہے۔ کلاسیکل فلکیاتی مکینکس نے، مثال کے طور پر، علتی لزوم کے نظریے کی اس حد تک توثیق کی ہے کہ پائرلے پلاس (1747-1827ء) دعویٰ کرتا ہے کہ اگر کسی نظام کی بنیادی شرائط معلوم ہو جائیں، تو اس سُتم کی آئندہ تمام ڈولپمنٹ کی، کسی الوہی حوالے کے بغیر، حیثیت کے ساتھ پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔ مثلاً ہمیں کائنات کی موجودہ حالت کو اسکی متقدم حالت کا معلوم، اور اسکی متأخر حالت کی علت سمجھنا چاہئے۔ ایک ذہین ہستی جو کسی متعین لمحے نیچپر عمل پذیر قوتوں، اور تمام اشیائے کائنات کی پوزیشن کا علم رکھتی ہو، تو وہ صرف ایک ہی فارمولہ کے ذریعے بڑے سے بڑے اجسام یعنی ستاروں اور چھوٹے سے چھوٹے اجسام یعنی ایٹموں کی حرکت کا ادراک کر سکتی ہے بشرطیکہ اسکی ذہانت اس لمحے تمام ڈیٹا کا تجزیہ کرنے کی الہیت رکھتی ہو۔ ایسی ہستی کیلئے کائنات کی کسی سابقہ، موجودہ یا آئندہ حالت کے بارے میں یقینی علم بالکل ناممکن نہیں ہو گا۔ علم فلکیات کو ذہن انسانی نے جس پر فلکیشن سے ہمکنار کیا ہے، اور خلاؤں کا سفر ممکن ہوا ہے، وہ اس ذہانت کی چھوٹی سی مثال ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ علیقی جبریت (deterministic causality) پر اسی یقین نے آئن شائن کو یہ کہنے کا حوصلہ دیا کہ ”کیا کائنات کی تخلیق کے علاوہ بھی خدا کے پاس کوئی چوائس تھا؟“ یعنی کائنات کا وجود میں آنا ایک طے شدہ امر تھا۔ (Altaie, M. Basil 2015, 4-5)

## جدید نظریہ: غیر جبریتی علیت (Indeterministic causality)

### تصور خدا کی ٹرانسفارمیشن

مذہب اور سائنس میں آویزش پر گفتگو کرتے ہوئے یونیورسٹی آف کیلگری کے بائیو کمپلیکسٹی اینڈ انفار میٹکس کا ڈائریکٹر سٹوارٹ کافین کو تجویز کرتا ہے کہ اس آویزش کے خاتمے کیلئے تصور خدا میں تبدیلی ضروری ہے۔ کافین کا خیال ہے کہ نیچرل یونیورس میں ایک پر نیچرل مذہبی خدا کی جگہ، مسلسل فطری علیت (ceaseless activity in natural universe) کے روپ میں ایک خالصتاً نیچرل گاؤڈ کا تصور متعارف کرایا جانا ضروری ہے۔ تاہم مذہبی تصور خدا کی جگہ ایک غیر مختتم فطری ایکٹیوٹی کی حیثیت سے خالصتاً نیچرل گاؤڈ کی یہ تبدیلی ایک تدریجی عمل کی مقاضی ہے۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ سائنس کو ایک ایسے سائنسی ورلڈ ویو میں تبدیل کر دیا جائے، نیچرل گاؤڈ کا مذکورہ بالا تصور جس کا لازمی حصہ ہو۔ وہ اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ 'مقدس' (sacred) کے تصور کو از سر نو وضع کیا جائے۔ تصور خدا میں تبدیلی کی تاریخ کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ خدا کا تصور انسانوں کا ساختہ ہے، نہ کہ کسی خدا کا ساختہ، اور انسانوں نے ہی خدا کے ساتھ تقدس کا تصور وابستہ کیا ہے نہ کہ خدا نے یہ تصور دیا ہے۔ لہذا خدا کے تصور کو پھر تبدیل کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

ڈاکٹر الطائی کا کہنا ہے کہ یہ بات عیسائیت اور یہودیت کے تصور خدا کے بارے میں تدرست ہو سکتی ہے کیونکہ انکی الہامی کتابیں تحریف سے پاک نہیں رہ سکیں۔ لیکن یہ بات اسلام کے بارے میں قطعاً درست نہیں مانی جاسکتی، اسلئے کہ قرآن پاک کلام اللہ ہے اور تحریف سے قطعاً پاک ہے۔ اسلام کا تصور خدا وہی ہے جو قرآن پاک بیان کرتا ہے۔ قرآن پاک خدا کو الخالق کہتا ہے جو القیوم، القادر، امسیع، العلیم، المکلم بھی ہے۔ تاہم ڈاکٹر الطائی یہ بھی کہتا ہے کہ "ایسے خدا کا شخصی صفات کی حامل پر سن ایجنسی کی حیثیت سے پیش کیا جانا وجود، فعلیت، اور مقصد کے حوالے سے ذات باری کی تفہیم میں بہت سی مشکلات کا باعث بھی بنتا ہے۔ لیکن کیا خدا کے بارے میں جو کہ غیر طبیعی (nonphysical) ہے، یہ سوچنا کہ وہ طبیعی دنیا کو متاثر کر سکتا ہے، بہت سمجھیدہ سوال نہیں!" (Altaie, M. Basil 2015, 6)

نیچرل تمام اشیاء کو وجود عطا کرنے والے کی حیثیت سے اشیاء کے ساتھ کسی بھی مماثلت سے پاک ہے۔ وہ نیچرل ہے اور نہ سپر نیچرل۔ جس نے طبیعی اور غیر طبیعی، نیچرل اور سپر نیچرل تمام اشیاء کو عدم سے بغیر کسی مثال کے خلق کیا ہے، جسکی قدرت اور علم انھیں محیط ہے۔ جو ہر جگہ موجود ہے، کوئی تین لوگ نہیں ہوتے مگر چوتھا وہ ہوتا ہے، اور کوئی چار لوگ نہیں ہوتے پانچواں وہ ہوتا ہے اس کے بارے میں یہ کہنا کہ کہ وہ طبیعی اشیاء کو متأثر کیسے کر سکتا ہے، نہایت نامناسب بات ہے۔ اسلام کا تصور خدا شخصی ہے۔ وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی پوشیدہ اور ظاہر کا علم رکھنے والا ہے، اور وہ رحمٰن اور رحیم ہے۔ (59:22) اللہ وہی ہے، جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بادشاہ، تدوں، سلامتی دینے والا، امان بخشنے والا، حفاظت فرمانے والا، عزّت والا، عظمت والا، صاحب کبریاء۔ اللہ کو پاکی ہے ان کے شرک سے۔ (59:23) اور اللہ وہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسماء الحسنی اس کے ہیں۔ (20:8) اور اللہ کو اس کے اسماء الحسنی ہی سے پکارو۔ اور انہیں چھوڑ دوجو اس کے اسماء میں الحاد کرتے ہیں۔ وہ جلد ہی اپنے کئے کی جزا پائیں گے۔ (180:7) قرآن پاک اللہ کے اور بھی بہت سے صفاتی نام بیان کرتا ہے۔ قرآن پاک میں درج ذیل اسماء الحسنی کا ذکر ہے۔

### اسماء الحسنی

الرَّحْمَنُ، الرَّحِيمُ، الْعَزِيزُ، الْجَيَّارُ، الْمَلِكُ، الْقَدُّوسُ، السَّلَامُ، الْمُؤْمِنُ، الْمَهِيمُ، الْمُتَكَبِّرُ، الْخَالِقُ،  
الْبَارِيُّ، الْمَصْوُرُ، الْفَقَارُ، الْقَهَّارُ، الْوَهَّابُ، الرَّزَاقُ، الْفَتَّاحُ، الْعَلِيمُ، الْقَابِضُ، الْخَافِضُ،  
الرَّافِعُ، الْمَعْزُ، الْمَذْلُّ، السَّمِيعُ، الْبَصِيرُ، الْحَكَمُ، الْعَدْلُ، الْلَّطِيفُ، الْحَبِيرُ، الْحَلِيمُ، الْعَظِيمُ، الْغَفُورُ،  
الشَّكُورُ، الْعَلِيُّ: الْكَبِيرُ، الْحَفِيظُ، الْمَقِيتُ، الْحَسِيبُ، الْجَلِيلُ، الْكَرِيمُ، الرَّقِيبُ، الْمَجِيدُ، الْوَاسِعُ،  
الْحَكِيمُ، الْوَدُودُ، الْمَجِيدُ، الْبَاعِثُ، الشَّهِيدُ، الْوَكِيلُ، الْقَوِيُّ، الْمُتَبَّعُ، الْوَلِيُّ، الْحَمِيدُ، الْمَحْصُونُ، الْمَعِيدُ،  
الْمَبْدُى، الْمَعِيدُ، الْمَحِيدُ، الْمَمِيتُ، الْحَقِّ، الْقَيْوَمُ، الْوَاجِدُ، الْمَاجِدُ، الْوَاحِدُ، الْاَحَدُ، الْصَّمَدُ، الْقَادِرُ،  
الْمَقْدِرُ، الْمَقْدِمُ، الْمَؤْخِرُ، الْاَقْلُ، الْآخِرُ، الظَّاهِرُ، الْبَاطِنُ، الْوَالِيُّ، الْمَتَعَالُ، الْبَرُّ، التَّوَابُ، الْمَنْتَقِمُ،  
الْعَفْوُ، الرَّؤْفُ، مَالِكُ الْمَلَكِ، ذُو الْجَلَالِ وَالْاَكْرَامِ، الْمَقْسُطُ، الْجَامِعُ، الْغَنِّيُّ، الْمَغْنِيُّ، الْمَانِعُ، الْقَبَارُ،  
الثَّاقِعُ، التَّوَرُ، الْهَادِيُّ، الْبَدِيعُ، الْبَاقِيُّ، الْوَارِثُ، الرَّشِيدُ، الصَّبُورُ، لِإِلَهِ الْاَهْوَ. (تفیر فاضلی منزل دوم،  
تفسیر آیت 180:7)

اللہ کے افعال سے اس کے مزید صفاتی نام اخذ کئے جاسکتے ہیں جیسے رب وغیرہ۔ وہ دعاوں کا سننے، قول کرنے والا ہے۔ ”اور تمہارے رب کا فرمان ہے، مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا۔“ (القرآن، 40:60) ”اور جب آپ سے میرے بندے مجھ پوچھیں، تو بے شک میں قریب ہوں، پکارنے والے کی دعا کو قبول کرتا ہوں جب مجھ پکارے۔“ (القرآن، 18:2) وہ اپنی مخلوق سے کلام کرنے پر قادر ہے۔ اس نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا جیسے کلام کیا جاتا ہے۔ (Altaie 2008, 154) وہ القادر ہے۔ تمام نتائج پر اسے قدرت ہے اور تمام نتائج اس کی مشیت کے تابع ہیں۔ وہ ’المبدی‘ ہے۔ جس نے عدم سے کائنات کی بغیر کسی مثال کے تخلیق کی اس کیلئے مجرمات صادر کر دینے میں کیا مشکل ہے۔ قرآن پاک میں ایسے واقعات بیان کئے گئے ہیں جنہیں مجرمات کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک ان واقعات کو اللہ کی ’آیات‘ یا ’آیات بینات‘ (روشن نشانیاں) کہتا ہے۔ قرآن پاک مجرمه کیلئے ’آیت‘ یا اسکی جمع ’آیات‘ یا ’آیات بینات‘ کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ مثلاً فرمایا: مجرمہ دکھایا اللہ نے ابراھیم علیہ السلام (کوچار پرندوں کا، جنہیں اللہ نے دوبارہ زندہ کر دیا) ابراھیم علیہ السلام کے اطمینان قلب کی خاطر۔۔۔ (القرآن، 2:260) ہم نے فرمایا: اے آگ ٹھنڈی ہو جا، اور ابراھیم علیہ السلام پر باعث سلامتی ہو۔ (القرآن، 21:68) ”مُجْرِمَةٌ لَا يَنْهِيْسْكَلْتَأَكُونَيْ رَسُولُ اللَّهِ كَذَنْدَهُ كَرْدَيْا (آیات) سب اللہ کے پاس ہیں۔۔۔“ (القرآن، 109:6) ”مُجْرِمَه لَا يَنْهِيْسْكَلْتَأَكُونَيْ رَسُولُ اللَّهِ كَذَنْدَهُ كَرْدَيْا (آیات کبریٰ)، 40:78) اللہ نے حضرت عزیز علیہ السلام کو مرے رہنے کے سوال بعد دوبارہ زندہ کر دیا۔ ان کے گھرے کی ہڈیاں ان کے سامنے استوار ہوئیں، گوشت چڑھایا گیا، اور گدھا زندہ ہو گیا۔ ان کا کھانا جو محض چند گھنٹے میں خراب ہو جاتا ہے، ابھی تک صحیح حالت میں تھا۔ (القرآن، 2:259) ”مُجْرِمَه بُرْتَه بُرْتَه (آیات کبریٰ) دکھائے اللہ نے فرعون کو، مگر اس نے سبھی کو جھٹلادیا اور نافرمانی کی۔“ (القرآن، 21-20:79) ”اور بے شک ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو روزن نشانیاں [مُجْرِمَه] عطا فرمائیں۔“ (القرآن، 17:101) ان شخصی صفات کے ساتھ قرآن پاک یہ بھی فرماتا ہے کہ لَيْسَ كَوْنِلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴿كُوئی شےء اسکی مثل نہیں۔ وہ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔“ (القرآن، 11:42) ذات باری کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ یا تو اس کی ’خلق‘ ہے یا اسکا ’امر‘ ہے۔ ’امر‘ سے تعلق رکھنے والی چیزیں غیر طبیعی ہو سکتی ہیں۔ لیکن خلق اور نہ امر، کچھ بھی اللہ کی الوہیت میں شریک نہیں۔ اور اللہ خلق اور امر دونوں کے ساتھ کسی مشابہت سے پاک ہے۔

## خدا کا مخدانہ نظریہ

سکلپٹک میگرین کا پبلشر ماٹھیل شریر (Michael Shremer) کہتا ہے کہ ”سامن سنجھرل سے تعلق رکھتی ہے نہ کہ سپر سنجھرل کے ساتھ۔ سائنس جس خدا کو دریافت کر سکتی ہے وہ ایک فطری ہستی (natural being) ہی ہو سکتا ہے یعنی جو سپس اور ٹائم میں وجود رکھتا ہو اور قوانین فطرت اس پر لاگو ہوتے ہوں۔ ایک سپر سنجھرل گاؤٹا نام مختلف ہو گا کہ سامن کے دائرہ تحقیق میں نہیں آسکے گا۔“ جبکہ کیتھے وارڈ کا کہنا ہے کہ اگر ہم شریر کی خدا کی درج بالا تعریف کو مان لیں تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ”ایک غیر طبعی صاحب شعور انتیلیجنس کے وجود کو ممکن مانا پڑے گا۔ اس صورت میں تمام موجودات کے سپس۔ ٹائم میں ہونے، سپس۔ ٹائم کے قوانین فطرت کے دائرے میں ہونے کا مادہ پرستانہ نظریہ غلط قرار پائے گا۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ خدا کے مختلف تصورات بین جو اس سوال کے جواب میں اختلاف رائے کا باعث بنتے ہیں۔“ (Altaie, M. Basil 2015, 7)

براون یونیورسٹی کا بائیو آلوجی کا پروفیسر کینٹھ ملر (Kenneth Miller) سنجھرل خدا کے ماننے والوں پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ ان کی غلطی ہے کہ وہ خدا کو سنجھرل ورلڈ کا حصہ تصور کرتے ہیں اور جب اسے وہاں نہیں پاتے تو کہتے ہیں کہ خدا ہے ہی نہیں۔ لیکن خدا نہ تو سنجھر کا حصہ ہے اور نہ ہی ہو سکتا ہے۔ خدا چیزوں کے ہونے کی دلیل ہے۔ وہ وجود کائنات کی توجیہ ہے۔ وہ خود وجود کائنات کا حصہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ”الطائی کا نظریہ ہے کہ آپ خدا کو مانے والے ہیں یا اسکے منکر ہیں، اس بات کو سمجھنا بہت اہم ہے کہ خدا خود فطرت کا حصہ نہیں ہو سکتا۔ خدا کے سنجھر کا حصہ ہونے کی صورت میں، خدا کو قوانین فطرت کا پابند ہونا پڑے گا اور اس طرح اسے لیبارٹری میں لا یا جاسکے گا یا ہمارا سائنسی مشاہدہ اسے ٹریک کر سکے گا۔ ملرباکل درست طور پر اعتراض کرتا ہے کہ وجود خدا کا مفروضہ سائنس کو مسترد کرنے سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ اس تجسس سے ابھرتا ہے کہ آخر قوانین فطرت ممکن ہی کیسے ہیں، آخر قوانین فطرت کے ہونے کی توجیہ ہی کیا ہے۔“ (Altaie, M. Basil 2015, 8)

## کو انٹم فرکس: کیا قوانین فطرت خدا کی جگہ لے سکتے ہیں؟

کو انٹم فرکس نے، جو کہ پچھلی صدی کے پہلے کوارٹر میں سب اٹاک ریلم، میں ہونے والی تحقیقات کے دوران سامنے آئی، علیقی جبریت (deterministic causality) پر انسانوں کے اعتقاد کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ ماںگرو سکوپ ذرات کے ویولاںک ریسپونس نے یمنیکل سسٹم کی ڈائناکس میں بالکل نئے تصورات متعارف کرائے ہیں۔ ہائزن برگ ائرٹنی پر نیپل (Heisenberg uncertainty principle) کے دعویٰ کرتا ہے کہ کسی ماںگرو سکوپ پارٹیکل کے مومنٹ اور پوزیشن کا یک وقت مطلق یقین (principle of complementarity) کے ساتھ تعین ممکن نہیں۔ یعنی sub-atomic لیول پر کوئی واقعہ 100 فیصد ایکوریسی کے ساتھ وقوع پذیر نہیں ہوتا۔ کائنات نان لوکل ہے اور اشیاء، ایک یادوسری طرح، آپس میں ابھی ہوئی (entangled) ہیں۔ یہ فیکٹ، تھیوریز اور ان کی تعبیرات سے انڈینڈنڈنٹ ہے اور deterministic view کے دفاع میں جو بھی دلائل دیئے جائیں، یہ بات ثابت شدہ حقیقت ہے اور بہت سے لیبارٹری ایکسپریمنٹ اس کی تصدیق کر چکے ہیں کہ نیچر غیر جبریتی (indeterministic) ہے۔ کو انٹم میکنیکس کی عدم جبریت کی موجودگی میں ہم یہ سوال پوچھ سکتے ہیں کہ کیا قوانین فطرت خدا کی جگہ لے سکتے ہیں؟<sup>47</sup>

(Basil 2015, 8-1) (Orzel 2015, 8-1)

## 2۔ اشاعرہ کا نظریہ جواہر، اور کو انٹم میکنیکس:

قدیم مسلم کلام میں اشاعرہ نے نظریہ جواہر کی صورت میں ایک نظریہ پیش کیا جس کے مطابق کائنات مادی ذرات پر مشتمل ہے۔ ہر ایٹم، جوہر (atom) اور اعراض (set of accidents) پر مشتمل ہے۔ جوہر ناقابل تغیر ہے جبکہ اعراض، ہر لمحے متغیر خصوصیات ہیں جو کہ جواہر حاصل کر سکتے ہیں۔ اعراض ایک لمحے سے زیادہ قائم پذیر نہیں ہیں۔ کائنات کی یہ ساخت ایک ایسی ہستی یا ایجنٹسی کی محتاج ہے جو تمام جواہر اور اعراض میں ہونے والی تبدیلیوں کا اپنے علم اور قدرت میں احاطہ کرنے ہوئے ہو اور کائنات کی تمام ڈولپیمنٹ اس کے قبضہ قدرت میں ہو۔ کائنات کا طریق عمل کچھ قوانین کا پابند ہے جسے ہم مظاہر قدرت کے اظہار کی یکسانیت کی صورت سے دریافت کر لیتے ہیں۔ مسلم الہیات کے مطابق کائنات بے نظم و ترتیب،

مجاز و افعال کا مجموعہ نہیں، تاہم غیر جریتی نوعیت رکھتی ہے۔ جدید کو انٹم مکینکس میں بھی اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے اگرچہ ان دونوں کی اپروچ اور فہم میں بہت فرق ہے۔ (Altaie, M. Basil 2015, 9)

## کیا کائنات اپنے ہونے کیلئے خدا کی محتاج ہے؟

سین کیرل (Sean Carroll)، تھیوریٹیکل کاسمولو جسٹ، کے مطابق ایک بے خدا کائنات کا تصور، جو بغیر کسی خدائی احتیاج کے چل رہی ہو، میتھڈ آف سائنس کے مطابق بالکل قابل تصور ہے۔ (Carroll 2012) الاطائی کہتا ہے کہ اس قسم کا دعویٰ اور بھی لوگوں نے کیا ہے۔ لیکن قوانین فطرت کو خدائی کے مقام پر فائز کرنے بغیر میتھڈ آف سائنس کیسے ایک خود منحصر کائنات کا تصور دے سکتا ہے۔ اگر ہم تسلیم کرتے ہیں کہ قوانین فطرت اصل میں فطری کائناتی مظہر ہیں، اور مظاہر کائنات (phenomena) 'سب اٹاک لیوں' پر غیر متعین (indeterministic) ہیں، تو کیا یہ قوانین فطرت از خود رو بعمل ہو سکتے ہیں۔ جب کو انٹم مکینکس ثابت کر رہی ہے کہ تمام مظاہر اپنی بنیاد میں احتمالی (probabilistic) ہیں، تو ان قوانین کا عمل کیسے متعین اور از خود یقینی ہو سکتا ہے؟ احتمالی (probabilistic) ہونے کی حیثیت میں ان قوانین کا اپنا روکی اور ایجنسی کے فیصلے پر منحصر ہو گا۔ لہذا کائنات کیسے خود انحصار اور خود کار ہو سکتی ہے اور بغیر کسی کنٹرولنگ ایجنسی کے از خود چل سکتی ہے۔ نیشنی کارٹ رائٹ اپنی کتاب "How the Laws of Physics Lie" اور آرٹیکل "No God, No Laws" (Cartwright 1983) میں استدلال کرتی ہے کہ "خدا کے بغیر قوانین فطرت بالکل بے معنی اور بلا جواز تصور ہیں۔" (2008) کارٹ رائٹ فلسفیانہ تناظر میں اس مسئلے کو دیکھ رہی ہے الاطائی اسے سائنسی تناظر میں کو انٹم مکینکس کی دریافتیں کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس بات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کیا سائنس کو صداقت کے مطلق معیار کی حیثیت دی جاسکتی ہے؟ الاطائی کہتے ہیں کہ ہمارا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ سائنس معروضی حقیقت نہیں بلکہ ہمارے وقوف کی پیداوار ہے اور لازم آف نیچر بھی معروضی حقیقت نہیں بلکہ نیچر کے مشاہدات کی ہماری اپنی سائنسی تشکیل (construction) ہیں۔ آئن شائن کا نظریہ اضافت، گریویٹی (قوت نقل) کی تعقلاتی اعتبار سے اس سے بالکل مختلف نیچر پیش کرتا ہے جو نیوٹن نے پیش کی تھی حالانکہ نیوٹن کی مکینکل تھیوری صدیوں سے نظام شمسی میں شامل سیاروں کی موجودت کی بالکل ایکیوریٹ کیلکیو لیشنز مہیا کرتی چلی آ رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ ہماری اپنی منطق اور وقفي استعداد

ہے جو ہمیں خدا کی ضرورت کا احساس دلاتی ہے؟ الاطائی کا جواب ہے: یقیناً ایسا ہی ہے۔ ”یہ ہماری built-in لا جک ہی ہے جو ہمیں بتاتی ہے کہ پریسا نس سٹمز مثلاً گ-بینگ، بائیولو جیکل ایو ولیو شن، ستاروں کی حرکت، بلیک ہولز کی دوسری دنیاوں میں کھلنے والے دروازوں کی حیثیت سے موجود گی، اور ان نظام ہائے کائنات کی ڈائریکٹو-ڈولپمنٹ، اس سب کے لئے لازم ہے کہ اسے کسی ایسی پاورنے ڈیزائن کیا ہو جو سپریم ہو اور علم کے اعتبار سے بھی سپریم ہو۔ چانس اور لزوم سڑک پر کا حصہ ہوتے ہیں لیکن نظام کائنات محض چانس اور لزوم پر نہیں چل سکتا۔“ اسلئے ڈاکٹر الطائی، ڈاکٹر کیتھ وارڈ سے اتفاق کرتا ہے کہ یہ سائنس نہیں ہے جو خدا پر یقین کو ماضی کافر سودہ تھے قرار دیتی ہے، بلکہ یہ کائنات کی مادی تعبیر ہے جو خدا پر اعتقاد کو فر سودہ قرار دیتی ہے، جس سے بعض لوگ سپورٹ لیتے ہیں۔ (Altaie, M. Basil 2015, 10)

# جرائم شنیعہ (Heinous Crimes) اور انکاتدار ک

## قانون سازی کی قرآنی بنیاد

قرآن پاک کی سورہ المائدہ میں ارشاد ہے:

إِنَّمَا جَزَاءُ الظَّالِمِينَ يُجَاهِرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادُ أَنْفُقُلُوا أَوْ يُصَبِّلُو أَوْ تُقْطَلَعَ أَيْدِيهِمْ وَأَجْحَلُهُمْ  
مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُفَعَّلُو هُنَّ أَنْجَدُوْنَ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ

جو اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں، اور زمین میں فساد مچاتے ہیں، انکی بھی جزا ہے کہ وہ [1] قتل کئے جائیں، یا [2] صلیب / سولی دیئے جائیں، یا [3] مخالف سمت سے ان کے ہاتھ اور پاؤں کاٹے جائیں، یا [4] زمین سے دور کر دے جائیں۔ یہ انکی رسوائی ہے دنیا میں، اور آخرت میں ان کیلئے عذاب عظیم ہے۔ (القرآن، ۵:۳۳)

کسی کو بغیر جان کے بد لے کے قتل کرنا، قتل ناحق ہے۔ معاشرے کے امن و امان کو بر باد کرنا، احساس تحفظ کو عدم تحفظ سے بدل دینا، فساد ہے۔ (القرآن، ۵:۳۲) قتل ناحق یا فساد سے عدم تحفظ کا احساس پیدا کرنا ہی، اللہ اور اس کے رسول سے لڑنا ہے۔ حکم الہی کی بنیاد علم الہی پر ہوتی ہے۔ علم الہی کے مطابق رہنے سے لوگوں کو دامنی تحفظ کا احساس حاصل ہوتا ہے۔ خلاف حق کرنے والے، علم الہی کے مقابل اپنی خواہشات پر مبنی عمل کو جاری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ فساد فی الارض ہے۔ ایسے مفسدین کی جزا کی جو چار صورتیں اس آیت پاک میں بیان فرمائی گئی ہیں، وہ قرآن پاک کے مجموعی پس منظر میں اس طرح بتی ہیں:

1- اگر انہوں نے قتل ناحق کا ارتکاب کیا ہو، تو انہیں قتل کر دیا جائے گا۔

2- جان تلف کرنے کی دیگر صورتوں میں صلیب / سولی (زیادہ افیت دہ اور سرعام موت) دی جائے گی۔

3- فساد فی الارض کے مرتكبین کے مخالف سمت سے ہاتھ اور پاؤں کاٹے جائیں گے۔ آج کے حالات میں درج ذیل جرائم سے متعلق پیشہ ور مجرم اور اجرتی قاتل ہی وہ لوگ ہیں جن پر مخالف سمت کے ہاتھ اور پاؤں کاٹے جانے کا فرمان لا گو ہوتا ہے، یہی وہ لوگ ہیں جو اس عبرت ناک سزا کے مستحق ہیں:

(ا) دہشت گرد، انکے دانستہ سہولت کار، ٹریز، بھرتی کرانے والے، فنڈنگ کرنے والے؛

(ب) نومولود بچوں کو مجرمانہ مقاصد کیلئے اغوا کرنے والے، انغا کرانے والے، دانستہ سہولت کار، گدگروں کو بیچنے یا دیگر مجرمانہ مقاصد کیلئے خرید و فروخت کرنے والے، اور ان فتح جرائم کی سرپرستی کرنے والے؛

ب) بچوں، بچیوں کو ریپ، ریپ اور قتل، اذیت دینے، جنسی مقاصد، بیگار لینے، لگاگری و دیگر مجرمانہ مقاصد از قسم حصول تاداں وغیرہ، یافروخت کرنے، بچوں کے اعضا نکالنے اور انکے اعضا کی خرید و فروخت کرنے، معدود بنانے؛ والدین یا سرپرستوں سے دشمنی کے اظہار یا بدله لینے کی مجرمانہ نیت سے انداز کرنے، انداز کرانے یا خرید و فروخت کرنے والے۔

ت) جواں سال لڑکوں، لڑکیوں، کسی بھی عمر کی عورتوں، مردوں کو دہشت گردی کی ترغیب، تربیت دینے، مجبور کرنے، دہشت گردی میں استعمال کرنے، دشمنی کے اظہار یا بدله لینے، حصول تاداں یا زنا با مجرم کیلئے انداز کرنے، قید کرنے والے؛ سیریل رپسٹ، گینگ رپسٹ، سیریل ملر؛ پیشہ و راجتی قاتل؛ جسم فروشی پر مجبور کرنے، جسم فروشی کے اذے پر بھانے، زخما بنانے، فروخت کرنے، خریدنے والے؛ ان اڈوں کو چلانے والے، اڈوں اور جرائم پیشہ لوگوں کی سرپرستی کرنے والے، ان جرائم کے دانستہ سہولت کار؛ عورتوں یا لڑکوں کی نازیب، عریاں، نجاش تصاویر یا دیویز بنا کر تشہیر کرنے، اپ لڈ کرنے یا ملک میلگ کرنے والے، ان جرائم کی سرپرستی کرنے والے بھی اس میں شامل سمجھے جائیں۔

ج) ڈرگ ٹریننگ، منیات کی غیر قانونی خرید و فروخت، کسی بھی عمر کے افراد، تعلیمی اداروں میں طلباء کا باغیر، دھوکے، ترغیب، بیالرضا منشیات کا عادی بنانے والے، دانستہ سہولت کار، سرپرست اور مفاد گر و ندہ۔ (سرکاری اجازت کے ساتھ طبعی اور تحریقی مقاصد کیلئے مدد و پیمانے پر انکا تیار کرنا، استعمال کرنا، استعمال کرنا اس میں شامل نہیں ہو گا۔ منیات کے عادی لوگوں کی ضرورت پورا کرنے کا قانونی بندوبست بھی ضروری ہے۔)

د) دشمن کا اجیخت یا جاسوس بن کر ملک و قوم سے غدری کرنے والے؛

س) مجرمانہ نیت سے کسی پر تیزاب پھینکنے والے، کسی کو آگ لگانے والے؛

ش) مجرمانہ ذہنیت سے راہوں راستوں کی سلامتی کو خطرے میں ڈالنے والے؛ راہنما؛ ڈاکہ زنی، قتل اور آبرو ریزی؛ بریلوے ٹریک اکھائنے، بارودی مواد نسب کرنے والے؛ نو گو ایریا ز قائم کرنے والے؛ ہائی جیکرز، غیر قانونی ہیو من ٹریننگ میں ملوث افراد۔

حضور پاک ﷺ کی حیات طیبہ میں اس حکم الہی کی شنسنگر 3 کے مطابق عبرتناک سزادینے کا موقعہ

تب آیا جب حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق 'قبیلہ عکل یا عرینہ کے چند لوگ مدینہ پاک آئے۔ وہاں کی آب و ہواں کو موافق نہ آئی اور وہ بیوار ہو گئے۔ حضور ﷺ نے انہیں وہاں چلنے کا حکم دیا جہاں بیت المال کی او منیاں چرتی تھیں، اور فرمایا کہ تم ان او منیوں کا بول اور دودھ پیا کرنا۔ وہ وہاں چلنے کے لئے اور ایسا کرنے سے جب وہ صحت مند ہو گئے تو انہوں نے چڑا ہے کو قتل کر دیا اور انہیاں لے کر بھاگ گئے۔ صح سویرے اسکی اطلاع حضور ﷺ کو ہوئی تو حضور ﷺ نے ان کے تعاقب میں سوار بھیجے۔ طبقات ابن سعد کے مطابق حضور ﷺ نے ان کے تعاقب میں حضرت کرز بن جابر الفہری کی سر کر دیگی میں بیس سواروں کا ایک دستہ روانہ کیا۔ ان اہل عرینہ کی تعداد آٹھ تھی۔ وہ انہیاں ذوالحدر میں چرتی تھیں۔ یہ جگہ مدینہ پاک سے چھ میل دور قبا کے نواح میں تھی۔ سب سے پہلے حضور ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت یسرا رضی اللہ عنہ نے اپنے

چند رفقاء کے ساتھ انہیں جالیا، اور ان سے اٹھنا شروع کر دیا۔ ان غالموں نے حضرت یاہر صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے اور ان کی زبان اور آنکھوں میں کانٹے چھوڈ دیئے اور اس حالت میں انہیں پچینک دیا اور انہوں نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ جب انہیں گرفتار کر لیا گیا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ وہی بر تاؤ کرنے کا حکم دیا جو انہوں نے کیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے اور ان کی آنکھوں میں گرم سلامیٰ پھیری گئی، اور انہیں دھوپ میں ڈال دیا گیا۔ وہ پانی مانگتے تھے لیکن انہیں پانی نہیں دیا جاتا تھا۔" (سنّت خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام, 254-256)

قرآن پاک حکم ہے، حدیث پاک تفہیز حکم کی نظیر (precedent) ہے۔ حکم دائیٰ ہے۔ تفہیز حکم وقت مقام اور مقدار کے مطابق ہوتی ہے۔ آیات محکمات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ یہ قرآن پاک کی بنیاد ہیں۔ جس طرح آیات تشبیہات کی تاویل کیلئے لازم ہے کہ وہ آیات محکمات کے ساتھ ہم آہنگ ہو، اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کسی حدیث یا اسکی تاویل کیلئے بھی لازم ہے کہ وہ آیات محکمات کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ سورہ المائدہ کی مذکورہ بالا آیت کے محکمات میں سے ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اس حکم الہی پر عمل کی نظیر کے حوالے سے بیان کی گئی روایت کے اس آیت پاک اور دیگر محکمات کے ساتھ ہم آہنگ ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں۔ اللہ ارحم الرحمین ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم رحمت اللعالمین ہیں۔ جو ارحم الرحمین یا رحمت اللعالمین سے زیادہ رحم دل ہونے کا دعوے دار ہو، اس کے اظہم ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ اگر واقعی معاشرے کو اللہ اور اسکے رسول سے لڑنے اور زمین میں فساد مچانے والوں سے پاک کرنا ہے تو لازم ہے کہ حکم الہی اور اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی نظیر کو سامنے رکھتے ہوئے موجودہ حالات کے مطابق مجرمین کیلئے عبرتناک جزا تعین کیا جائے اور اس کیلئے قانون سازی میں دیرینہ کی جائے۔ ایسے مجرمین کی دنیا میں رسوائی بھی، اللہ کے حکم کے مطابق، انکی جزا کے اندر شامل ہے۔ مجرمین کی جزا کو عبرتناک اور انکی رسوائی کو یقینی بنانے کیلئے اس پر سر عام عمل درآمد ہونا نہایت ضروری ہے۔ بچوں پر اس کے برے نفسیاتی اثر کا واپیلا مچا کر، ان مجرمین کی رسوائی کو روکنا فرمان الہی کے خلاف ہو گا۔ میڈیا چینلز کو پابند کیا جا سکتا ہے کہ وہ جزا پر عمل درآمد ہوتا ہو ابار بار نہ کھائیں۔ اگر فوری قانون سازی کی جائے تو ہمیں یقین ہے کہ درج بالا جرائم کے تدارک میں بالکل بھی دیر نہیں لگے گی۔

4) جو لوگ ارتکاب جرم سے قبل ہی کپڑ لئے جائیں، ان کو قید کر کے ساکن کر دیا جائے اور اصلاح کا موقعہ فراہم کیا جائے، یہ انہیں زمین سے دور کرنے کی صورت ہو گی۔ اور جیسا کہ اس سے اگلی آیت پاک إِلَّا الْأَدَيْنَ قَاتُوا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَقْدِيرُهُوَا عَلَيْهِمْ يَأْغْلِمُهُمْ أَنَّ اللَّهَ يَعْفُوْرُ هُوَ حَسِيْعٌ "مگر وہ جنہوں نے توبہ کی قبل اس کے

کہ تم ان پر تدرست پاؤ، تو معلوم رہے کہ اللہ بخششے والا رحم فرمانے والا ہے۔” (القرآن، 5:34) سے اخذ ہوتا ہے کہ اگر ان مفسدین پر قابو پائے جانے سے پہلے کسی کی توبہ ثابت ہو جائے تو اسے بخش دینا اور اس پر رحم کرنا اس فرمان الہی کے مطابق مومنین کی شان ہے۔ قانون میں اس کی رعایت رکھی جانی فرمان الہی کے عین مطابق ہو گی۔ (جیسا کہ تھیار ڈالنے والوں کیلئے معافی کی گنجائش رکھی جاتی ہے۔)

اجھاؤ پیدا کرنے کے ماہر لوگوں کو جرائم کے تعین کی شرائط میں قانونی موشک گفایاں یا اس حکم الہی کے دائرے میں اور بہت سے جرائم کے شامل کئے جانے کی بحث چھپیر کر طوالت دینے کا موقعہ دیا جائے گا تو شاید قانون سازی ہونے تک کتنے اور بیٹھیاں، بیٹھے درندگی کا شکار ہو جائیں۔ جن جرائم کی شرائط کے تعین میں کوئی اجھاؤ نہیں، فی الحال آپ اللہ کے اس فرمان کی روشنی میں قانون سازی کو صرف ان تک محدود کر لیں باقی جرائم بعد میں شامل ہوتے رہیں گے۔

بعض اوقات سرکاری سطح پر خاموشی سے ایسے اقدام کر لئے جاتے ہیں جو کسی اعلیٰ سے اعلیٰ قانون کو بے اثر کر کے رکھ دیتے ہیں۔ مثلاً اگر صدر پاکستان کے سیکرٹریٹ میں وفاقی محتسب کے فیصلوں یا صوبائی گورنزوں کے سیکرٹریٹ میں صوبائی محتسبوں کے فیصلوں کے خلاف بھیگی گئی عرضہ اشتتوں پر فیصلے کا کوئی طریق کار اور مدت مقرر نہ ہو تو نہایت اہم معاملات پر کئے گئے فیصلوں کو ڈمپ کر کے ان محتسب اداروں کو بے وقعت بنانے کیلئے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔ یا قومی اسمبلی کو، اسلامی نظریاتی کو نسل جیسے ادارے کی ملکی قوانین کو اسلام کے مطابق ڈھانے کی سفارشات پر، مقررہ مدت میں قانون سازی کا پابند بنانے والی شق کو معطل کرنے کے بعد، اس ادارے کو بے اثر یا بے وقعت کرنے کیلئے کسی اور اقدام کی ضرورت ہی کہاں رہ جاتی ہے۔ اسی طرح اگر فرازک لیب کائنات مجرموں یا پولیس والوں کے ساتھ ملی بھگلت کر کے روپورٹ بنانے میں سالہا سال گاڈے، تو اللہ کے اس فرمان کے مطابق بنائے گئے قانون کو بے اثر کرنے کیلئے بھی مزید کسی چیز کی ضرورت نہیں ہو گی۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم میڈیا کی نفعیت کے دور میں زندہ ہیں اور وہ اس قسم کے اقدامات کو کھونج نکالتا ہے اور دفن نہیں ہونے دیتا۔ اس کے باوجود ضروری ہے کہ ہم بھی بیدار اور فعال رہیں۔ ہم نے اپنا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے، اگر آپ اس تجویز کو مزید بہتر بناسکتے ہیں یا اس سے بہتر تجویز پیش کر سکتے ہیں تو سوسائٹی آپ کی رہنمائی کی منتظر ہے۔

## List of Articles Included in the Book

# “The Qur’anic Theology, Philosophy And Spirituality”

Is ‘Al-Haqq’ One Of Al-Asmâ’ Al-Husnâ!

The Qur’anic Ontology And Status Of Al-Haqq

The Qur'an: Creation Or Command!

Number Of Verses Of The Qur'an (Index And Argument)

The Way Of Shahidīn: The Construction Of A Qur’anic Theology Of Sufism In

Tafseer-E-Fâzli

The Qur’anic View Of Omnipotence And Human Freedom

Christian Theologians And Philosophers' View Of Omnipotence And Human Freedom

Iqbal's View Of Omnipotence And Human Freedom

Allah's Omnipotence And Freedom Of Will For Man

Free Will And Predestinarian Verses In The Qur'an

Free Will And The Appointed Term (Ajl-E Mussamma)

Knowledge Of Allah's Pleasure (Rađa) And Knowledge Of Allah's Will (Mashiyat)

Antinomy Of Free Will And Pre-Ordained Sustenance

H. A. Wolfson And A. H. Kamali On The Origin Of The Problem Of Divine Attributes In Muslim Kalam

State And Statecraft: Relationship Between Islamic And Western Paradigms

Ibn Sina, Al-Gazali And Ibn Taymiyyah On The Origination Of The World

Evolving A Qur’anic Paradigm Of Science And Philosophy: Ibn Sina, Sir Seyyed Ahmed Khan, Dr. Muhammad Iqbal, And Some Contemporary Scholars

## Summary Of Main Issues

## نام، اصطلاحات اور کتابیات

267 ,Qur'anic ontology	-ڈاکٹر اسرار احمد, 214
184,139 ,134 ,75 ,73 ,Reality	”بسم اللہ“ 190
132 ,standard of rationality	”مسلمہ سائنسی حقائق“ اور ”سائنسی تھیوریز“ میں فرق، 274
325 ,State and Statecraft	”اسم،“ 70
59 ,The Philosophy of the Kalam	”اویسیہ،“ 236
60 ,Trinity	”حادث،“ 270,87,79
184,75 ,73 ,Ultimate Reality	”خلق،“ اور ”امر،“ 87
العشرۃ لمبشر، 174	”طریقت شاہدین،“ 168,167
اللہ کے دوست، 174	”تفہما،“ 116
ابن تیمیہ، 162	”کلام اللہ،“ اور گانات کی سائنسی تغیر، میں اختلاف کی صورت میں فویت کس کو ہونی چاہئے، 272
ابن سینا، 57	”نور والے بابا جی،“ 225
,145,132,113,107,105,96,65	”یونیورس،“ 312 tuned fine
,250 ,161 ,158 ,157 ,156 ,155 ,151	323 ,How the Laws of Physics Lie
,265 ,264 ,261 ,259 ,255 ,253 ,251	279 ,Humanis generis
308,274,272	325 ,IBN SINA
ابن عربی، 239,238,137,135	75 ,Immanent
ابن عربی، 239,238,137,135	74 ,Immutability
ابو الحسن الاشتری، 125,124,121 ,111	74 ,Ineffable
ابو الحسن الاشتری، 270,84	74 ,Infinity
ابوہاشم، 68	62 ,intradeical
اتباع، 102 ,89 ,84 ,75 ,63 ,50 ,38 ,24 ,20 ,14	,KNOWLEDGE OF ALLAH'S WILL
,175 ,174 ,172 ,171 ,157 ,154 ,127	325
,195 ,194 ,192 ,191 ,188 ,183 ,177	280 ,267 ,ontological dualism of man
,212 ,211 ,209 ,202 ,199 ,197 ,196	325 ,Paradigms
,273 ,260 ,247 ,230 ,228 ,227 ,214	
314 ,285 ,284	
اکل، 284,141 ,120 ,116 ,114 ,83 ,58	

- احادیث, 277, 228, 137, 130, 109, 91, 48, 47  
,123, 121, 113, 111, 110, 109, 106, 96 285
- احتمالی (probabilistic), 323  
احمد, 251, 165, 164  
احسان اسلام, 214, 168  
احسن الحدیث کتاب, 289, 120, 91, 47, 41, 18  
احمد رضا خاں بریلوی, 26  
اخلاقی آزادی, 83, 110, 256, 149, 126, 110  
اخلاقی جریت, 260, 110, 83  
ادولف گرنباوم ((Adolf Grünbaum 312, 152, 151  
ارادہ الی, 151, 111, 94  
ارادی افعال, 58  
ارسطو کی مبادلہ الطیعت, 223  
استعارتی, 277, 276, 268, 256  
اسلحہ علیہ اسلام, 26  
اسرائیلی روایات, 26  
اسرائیلی روایات, 25  
اسلام, 52, 107, 105, 84, 79, 74, 69, 66, 59  
الصال, 3, 17, 187, 183, 142, 129, 90  
الغزالی (1058-1111ء), 261  
الفارابی, 57, 155, 145, 132, 113, 106, 96, 65  
الهیاتی مسکل, 54  
ام الکتاب, 41, 137, 119, 99, 86, 85, 81, 42  
امم, 271, 138  
امام احمد بن حنبل, 82  
امام حسین, 50, 191, 52, 51  
امام غزالی, 77, 308, 253, 160, 154, 149, 123  
امور دنیا, 194, 201, 200, 199, 198, 197, 196  
امور دنیا اور امور دین, 203, 208, 207  
اُمور دنیا اور امور دین, 196, 197, 203, 207

- |  |   |
|--|---|
| امور دین, 194                          | ,201,200,199,197,196,195,194            |
| پسند اور ناپسند, 195                   | ,207,203                                |
| پو شیل اکٹیکی آف سائنس, 279            | ائمن احسن اصلاحی, 26                    |
| تحریری, 28                             | انجیل, 206,205                          |
| تدریب قرآن, 21                         | انعام یافتہ, 89,189,180,179,177         |
| تمدیر کرنا حق ہے, 115                  | انٹلیشن, 310                            |
| تدوین حدیث, 139                        | اوی الالباب, 217                        |
| ترتکیب, 167                            | ایمان بالشہادت, 225                     |
| ,203 ,192 ,181 ,176 ,173 ,168 ,167     | ایمان بالغیب, 224,215,193,178           |
| ,227 ,225 ,218 ,215 ,214 ,213 ,204     | آئن شائن, 272 ,262 ,257 ,256 ,156 ,133  |
| 246,245,236,228                        | 324,318,317,314,307,277,274             |
| ترکیب فس, 198                          | ائمنی میٹر, 310                         |
| 218,217,216,198                        | بابا بھکی خان, 237                      |
| تشبیہ عینی, 65                         | باسط بلاں کوشل, 139,130                 |
| تشبیہ مع انتزیبہ, 65                   | باسط بلاں کوشل, 264,262,258,140,130,129 |
| تشکیل جدید البهیات اسلامیہ, 133        | 265                                     |
| ,47,43 ,26,25,23,22,20,17,15,14        | باطل, 3                                 |
| ,137 ,129 ,118 ,99 ,94 ,90 ,85 ,74 ,71 | ,188 ,183 ,142 ,141 ,129 ,90 ,256       |
| ,175 ,173 ,170 ,167 ,159 ,142 ,138     | باتیلیت, 191                            |
| ,205 ,201 ,195 ,192 ,187 ,181 ,177     | باتیلی, 122,57                          |
| ,229 ,228 ,227 ,224 ,222 ,214 ,213     | باشیلو جیکل ایولویوش, 324               |
| ,253 ,246 ,245 ,239 ,236 ,233 ,230     | بدعت, 52                                |
| ,289 ,275 ,266 ,264 ,263 ,262 ,256     | ,244 ,243 ,242 ,241 ,240 ,167           |
| 337,322,316,311,310,309,307            | 288,285,284,245                         |
| تعدد فی الذات, 66                      | برگسان, 108                             |
| تعدد قدماء, 66,57                      | بٹلیموس, 308,252,157,146,132            |
| تعمیر غل کے بارے میں روایت, 195        | بگ - بینگ, 309,303                      |
| تعمیر غل, 198                          | بگ بینگ کے مقابل تھورین: 311            |
| تفسیر بالروایت, 27                     | پروفیسر کینٹھ ملر, 322,(Kenneth Miller) |
| تفسیر رفاعی, 26                        | پروفنیں سائنس, 281                      |
| تقدیم, 207,206                         | پسند اور ناپسند, 102,195,193,178,173    |

- حضرت علام اقبال<sup>ج</sup>, 246  
 حضرت علی رضی اللہ عنہ, 190  
 حضرت فضل شام, 14, 18, 24, 27, 28, 72, 43  
 حضرت فضل شام, 14, 18, 24, 27, 28, 199, 202, 198, 191, 188, 169, 167, 234, 232, 228, 227, 224, 218, 215, 245, 241, 239, 238, 236  
 حقیقت مطلق, 263  
 حیات طیبہ, 119, 233, 231, 204, 198, 195, 196, 233  
 خبیث مرد, 21  
 خدا اور زمان کی عینیت, 140, 265, 264  
 خدا کی صفتِ ارادہ, 252  
 خلافت, 4, 51, 194, 169, 290, 284, 266  
 خودیٰ مطلق, 108, 134  
 دارہ عبدیت, 198  
 درون ہستی باری تعبیر, 61  
 دین میں اصطلاحات وضع کرنادین سے غداری ہے, 282  
 ڈاکٹر باصل الطائی, 313  
 ڈاکٹر احراق نظر انصاری, 273  
 ڈاکٹر الطائی, 311, 315, 316, 317, 318, 319  
 ڈاکٹر ڈاکٹر نایک, 106, 112  
 ڈاکٹر کوشنل, 264  
 ڈاکٹر کیتھ وارڈ, 324  
 ذات باری کی باورائیت, 69, 74, 75  
 ذکریا علیہ السلام, 27  
 رضا, 16, 102, 124, 245, 230  
 روایت, 3, 15, 17, 71, 90, 91, 92, 93, 99, 104  
 تقدیر, 48, 86, 91, 94, 95, 96, 99, 102  
 تقدیری, 27  
 تمثیل, 121, 177, 179, 181, 183, 189, 190  
 تناقض, 123  
 تنفس, 234  
 تنفسی حکم، وقت، مقام اور مقدار کے مطابق ہوتی ہے, 243  
 تغییز و وقت، مقام اور مقدار کے مطابق ہوتی ہے, 91  
 توریت, 206  
 تین میں کا تیر, 60  
 ثرید, 199  
 جاوید احمد غامدی, 25  
 جبر و اعتبار, 123  
 جہاد, 51  
 جہوا (Jehovah), 74  
 پچ دن میں تختیق, 307  
 حادث (contingent), 110  
 حدیث, 18, 47, 53, 48, 59, 89, 91, 94, 108, 118  
 حدیث مبارکہ, 42  
 حشر اجساد, 149, 150, 155, 158, 159  
 حضرت ابراہیم علیہ السلام, 26, 111, 125, 205  
 حضرت خضر علیہ السلام, 104, 212  
 حضرت خضر علیہ السلام, 228, 243

- سورہ النور آیت نمبر 21,26 ,192 ,187 ,172 ,143 ,142 ,138 ,136
- سورہ عبس, 47,27 ,212 ,207 ,203 ,202 ,199 ,198 ,196
- سورہ عبس, 203,30 ,281 ,265 ,264 ,263 ,258 ,220 ,213
- سورہ نور آیت نمبر 22,26 ,289,282
- سید حسین نصر, 213,190,185,184,181 ,178 ,172 ,167 ,158 ,75 ,64 ,60 ,59 ,51
- سید محمد عرب رفاغی, 24 ,279 ,269 ,254 ,245 ,216 ,215 ,190
- سید کاظم سانس, 283,281 ,306,293
- سین کرل (Sean Carroll) ,269,64,60 ,زمان (Time) اور خدا کا فلسفیانہ تصور, 134
- سینٹ اکونس, 76 ,زمانہ (خلق) ہے یا 'امر' لیکن خدا نہیں ہو سکتا۔ 129,143
- شاهدین, 178,173,172,168,167,129,119,51 ,سبحان ہریلک برت العزة عما يصفون, 65
- شہد, 205 ,197 ,195 ,192 ,189 ,183 ,181 ,315,311
- شہد, 227 ,225 ,219 ,216 ,215 ,212 ,211 ,سر سید احمد خان, 67
- شہد, 246,245 ,242,240 ,236 ,230 ,229 ,264,258 ,256 ,255 ,254 ,265
- شہد, 168 ,167 ,138 ,102 ,91 ,75 ,73 ,49 ,277,272 ,265
- شہد, 181 ,180 ,179 ,176 ,175 ,174 ,171 ,سر سید احمد خان, 133
- شہد, 212 ,211 ,203 ,195 ,193 ,190 ,188 ,سریانیت, 75
- شہد, 233 ,230 ,227 ,226 ,225 ,223 ,218 ,سعید یاشق, 95,93,89
- شہد, 259,246 ,245 ,240 ,239 ,236 ,234 ,سد, 3
- شہد, 188 ,183 ,181 ,180 ,177 ,84 ,48 ,80 ,74 ,58 ,53 ,51 ,50 ,47 ,21 ,17 ,12 ,3
- شہد, 247,193 ,167,142 ,136 ,130 ,129 ,118 ,110 ,89
- شہد کا مزان و دودھ کی مانند ہے۔ 179 ,190 ,187 ,184 ,178 ,176 ,172 ,168
- شہد، قدم ہے۔ طریقت، نقش قدم ہے۔ حقیقت  
قدم ہے۔ شریعت قدم کی ابتداء ہے اور معرفت  
قدم کی انتہا ہے۔ 225 ,218 ,217 ,214 ,207 ,204 ,193
- شہد، قدم کی ابتداء ہے۔ 264 ,256 ,246 ,239 ,238 ,233 ,227
- شہد، قدم کی ابتداء ہے۔ 290,289 ,268 ,265
- شہد، قدم کی ابتداء ہے۔ 311 ,311,303
- شہد، قدم کی ابتداء ہے۔ 325,141 ,136 ,129 ,126 ,103
- شہد، قدم کی ابتداء ہے۔ 207 ,265,141 ,136 ,135 ,129
- شہد، قدم کی ابتداء ہے۔ 265,141 ,136 ,135 ,129
- شہد، قدم کی ابتداء ہے۔ 265,136 ,136
- شیخ احمد سرہنی, 238 ,265,142 ,135 ,130
- صاحب حال, 247,246 ,245 ,233 ,232 ,27 ,265,142 ,135 ,130
- صحابہ مستقم, 189 ,صراط مستقیم, 265,136 ,136

- صفاتیہ, 109, 72, 67, 61, 57  
 صلح حسیبیہ, 211, 209, 202, 200  
 صمیت, 164  
 صیخہ واحد حاضر, 206, 205, 204, 28  
 طیب عورتیں, 21  
 ٹلن, 187, 183, 172, 143, 142, 129, 90, 3  
 عبد الحفظ, 289, 266  
 عدم, 56, 15, 2, 1  
 عدم, 118, 109, 98, 87, 79, 75, 70, 69, 62  
 عدم, 160, 155, 154, 151, 145, 124, 120  
 عدم, 304, 301, 299, 275, 261, 163, 161  
 عدم, 320, 319, 317, 315, 313, 309, 308  
 فتن, 322  
 عقلی تشكیل, 256, 252, 73, 69, 63, 62  
 عقیدۃ تبلیغ, 60, 59  
 علاج بالغذاء, 224, 199  
 علامہ محمد اقبال, 134, 133, 131, 130, 129, 108  
 علم میں رائخ, 272, 266, 142  
 علت اور معلول, 159, 158, 154, 151, 148  
 علت اور معلول, 262, 260, 252, 217  
 علم اپنی ایڈیشن, 108, 107, 102, 98, 97, 96, 95, 48  
 علم ایڈیشن, 202, 201, 171, 164, 117, 113, 112  
 علم ایڈیشن, 288, 272, 261, 240, 230, 210, 209  
 علم ایڈیشن, 308, 302, 291  
 علم جزئیات, 150, 149, 113, 106, 105, 96  
 علم میں رائخ, 48  
 علم ایڈیشن, 261, 252, 158, 156, 155  
 علم کسب, 287, 272, 240, 201, 48  
 علم لدنی, 295, 294, 212, 104  
 عنوان, 292, 279, 170, 116, 69, 49
- سیاسی متعلقین, 63  
 عامدی, 26  
 غزالی, 142, 132, 129, 123, 122, 107, 77, 57  
 غزالی, 161, 159, 158, 154, 152, 150, 149  
 غزالی, 308, 266, 259, 253  
 غیر جریتی, 313  
 غیر قرآنی اصطلاحات, 53  
 غیر قرآنی اصطلاحات, 110, 104, 82, 67, 65, 55  
 غیر قرآنی اصطلاحات, 287, 280, 267, 217, 120  
 غیر قرآنی فلسفیانہ اصطلاحات, 87, 82, 54  
 فاسق, 188, 129, 120, 98, 91, 17, 3  
 فاطرہ, 253, 157, 148, 123, 112, 110, 82  
 فاطمہ, 286, 284, 283, 281, 274, 266, 256  
 فاطمہ, 307, 303, 302, 301, 293, 292, 291  
 فاطمہ, 323, 322, 321, 317, 316, 314, 313  
 فاطمہ, 259, 252, 147  
 فاطمہ, 255, 251, 250, 132, 82, 63, 62  
 فاطمہ, 121, 118, 111, 83  
 قدمی, 107, 106, 104, 87, 84, 82, 80, 73, 61  
 قدمی, 160, 154, 151, 117, 110, 109, 108  
 قدمی, 270, 267, 264, 253, 251, 207, 162  
 قدمی, 323, 303, 302  
 قرآن, 167  
 قرآن پاک  
 حکم, 23, 22, 21, 20, 19, 18, 17, 15, 14, 3  
 حکم, 48, 47, 44, 43, 42, 27, 26, 25, 24  
 حکم, 59, 58, 57, 55, 53, 52, 51, 50, 49  
 حکم, 79, 75, 74, 73, 72, 71, 69, 67, 64

- کرائست, 61  
کرائست اور روح القدس, 61  
کرپشن, 52  
کشف و شہود, 176, 172  
کشف, شہود, 3, 15, 17  
کشف, شہود, 289, 266, 187  
کفر, 304, 230, 197, 185, 110, 82, 79, 71  
کلasseیکل پارٹیکل کنسپٹ, 313  
کلام تفسی, 270, 110, 109, 84, 82, 80, 72  
کلامی (الہبیانی) مسائل, 58  
کو پر ٹکس, 156  
کو انٹم ایٹمکٹ, 311, 303  
کو انٹم فرکس, 322, 310, 307  
کو انٹم ملکیٹس, 323, 322, 310, 302, 274  
کوئی نی قتل نہیں ہوا, 19  
کسپلر, 156  
کیتھولک انگلکوپیڈیا, 60  
گلیلیو, 253, 156  
لغو, 17  
لوح محفوظ, 98, 95, 94, 93, 89, 86, 85, 81, 79  
, 114, 112, 110, 109, 106, 102, 100, 99  
ما بعد الطیعت, 184, 65, 58  
مبتدی, 234, 201  
متناہیات, 138, 137, 119, 87, 86, 85, 42, 41  
287, 280, 271, 245, 209  
محمد اشرف فاضلی, 15  
محمد فتح اللہ گلن, 92, 91  
مخالف للحوادث, 70, 66  
محلصین, 228, 194, 192, 180, 179, 176, 98  
, 88, 87, 86, 85, 84, 83, 82, 81, 80  
, 100, 99, 98, 97, 96, 94, 91, 90, 89  
, 108, 107, 106, 105, 104, 103  
, 114, 113, 112, 111, 109, 110  
, 120, 119, 118, 117, 116, 115  
, 133, 130, 129, 127, 125, 124, 123  
, 139, 138, 137, 136, 135, 134  
, 163, 155, 146, 145, 143, 142, 140  
, 174, 173, 172, 170, 168, 167, 164  
, 183, 182, 180, 179, 178, 175  
, 190, 189, 188, 187, 185, 184  
, 203, 197, 196, 194, 193, 192, 191  
, 212, 211, 209, 208, 207, 206, 204  
, 224, 223, 220, 218, 217, 216, 214  
, 237, 236, 234, 233, 228, 227, 225  
, 246, 245, 243, 242, 241, 239, 238  
, 259, 258, 256, 255, 254, 249, 247  
, 270, 268, 266, 265, 264, 263, 261  
, 277, 276, 275, 274, 273, 272, 271  
, 286, 285, 283, 282, 281, 280, 278  
, 300, 292, 291, 290, 289, 288, 287  
, 309, 308, 306, 305, 304, 303, 301  
337, 321, 320, 319  
قرآن پاک ہی 'الحق' ہے, 15  
قرآنی ما بعد الطیعت, 267  
قلم, 315, 292, 271, 12, 11  
توانین فطرت, 317, 133, 114  
کاسک مانکرو بیک گراؤنڈریڈ ایشن(CMB), 309  
کامسولو گی, 310, 309, 307, 303, 156, 54  
کتاب مکنوم, 86, 81

- مشتی, 234,201  
 منطقی تصور, 152,150  
 منطقی لزوم, 147,154,158,252,260  
 262  
 ممکرین صفات, 57  
 مواخات, 210,200  
 موتوفی اثر (delayed effect), 152  
 مولانا روم, 280  
 مولانا وحید الدین خاں, 273  
 بیان فاریکل, 287,272  
 بیثاق, 210,205,200  
 بیثاق مدینہ, 210,200  
 میخائل شریر (Michael Shremper), 321  
 ناخ اور منسون, 42  
 نبی پاک کی حیثیتوں کا تین, 207  
 نبیوں کو نا حق قتل کرتے تھے, 18  
 نصر, 283,282,281,182,181,180  
 نظریہ جبریت, 313  
 نظریہ ارتقا, 277,266  
 نظریہ اضافت, 313,133  
 نظریہ امثال, 64,63,61  
 نظریہ صدور, 146,154,158,161,163,252  
 274  
 نظریہ سلسیل بالا ثابر, 160  
 نغاہ حکم کی نظیر, 48  
 نفیتی لزوم, 154,159,262  
 نیچر, 140,217,255,256,257,259,261  
 266,313,314,316  
 324,322,318  
 250,63,62,عقولی تشکیل, 250  
 مذہبی فکر کی سائنسی تشکیل, 258  
 مسکنکریں, 175  
 مسرفین, 175  
 مسکنی, 83,70,114,116,120,141,141  
 صحیح علیہ السلام, 25  
 مسئلہ شر, 300,299  
 مشیت, 89,97,110,113,115  
 116,117,119,122,126,269  
 111,112,113,114,115,116,117,118  
 119,110,109,108,107,106  
 105,109,108,107,106,105  
 104,103,102,101,100,101  
 100,99,98,97,96,95,94  
 93,92,91,90,89,88,87,86,85  
 84,83,82,81,80,79,78,77,76  
 75,74,73,72,71,70,69,68,67  
 66,65,64,63,62,61,60,59  
 58,57,56,55,54,53,52,51,50  
 50,49,48,47,46,45,44,43,42  
 41,40,39,38,37,36,35,34,33  
 32,31,30,29,28,27,26,25,24  
 23,22,21,20,19,18,17,16,15  
 14,13,12,11,10,9,8,7,6,5,4  
 3,2,1,0  
 معاشرتی اکائی کی حفاظت, 48  
 معتزلہ, 55,57,65,66,68,79,81,87,88  
 255,126,123,121,110,109,108  
 107,106,105,104,103,102,101  
 100,99,98,97,96,95,94,93  
 92,91,90,89,88,87,86,85,84  
 83,82,81,80,79,78,77,76,75  
 74,73,72,71,70,69,68,67,66  
 65,64,63,62,61,60,59,58,57  
 56,55,54,53,52,51,50,49,48  
 47,46,45,44,43,42,41,40,39  
 38,37,36,35,34,33,32,31,30  
 30,29,28,27,26,25,24,23,22  
 21,20,19,18,17,16,15,14,13  
 12,11,10,9,8,7,6,5,4,3,2,1,0  
 مجرمات, 133,149,150,155,158,159,252  
 255,126,123,121,110,109,108  
 107,106,105,104,103,102,101  
 100,99,98,97,96,95,94,93  
 92,91,90,89,88,87,86,85,84  
 83,82,81,80,79,78,77,76,75  
 74,73,72,71,70,69,68,67,66  
 65,64,63,62,61,60,59,58,57  
 56,55,54,53,52,51,50,49,48  
 47,46,45,44,43,42,41,40,39  
 38,37,36,35,34,33,32,31,30  
 30,29,28,27,26,25,24,23,22  
 21,20,19,18,17,16,15,14,13  
 12,11,10,9,8,7,6,5,4,3,2,1,0  
 مجرز (آیات), 321  
 معرفت, 69,77,101,177,184,217,227  
 230,301,295,320  
 مجرز (آیات), 321  
 معیت, 19,38,179,181,189,191,194  
 205,212,217,220,223,247,254,301,320  
 مفہوم, 24,27,51,52,55,66,67,70,79,87,88,99,114  
 مقام احمدیت, 69,164  
 مقام وحدت, 69,164  
 مقصد, 24,27,51,52,53,55,83,111,134,191  
 215,220,226,228,241,271,272  
 280,265,280,303,306,306,308,280,313,319  
 ملک شمس الدن قادری فاضلی, 17,24,24,17,169,229  
 ملک شمس الدن قادری فاضلی, 17,24,17,169,229

- نچرل ازم, 133, 253, 254, 255, 256, 257 ..... 48, 47, 27 وحدت الشہود, 237 ..... وحدت الشہود, 167
- نیسی کارت رائٹ, 323 ..... وحدت الوجود, 171, 167, 73, 65, 49, 48, 47, 27
- ہم از لیت (co-eternity), 160 ..... 246, 239, 238, 237, 222, 184 وحدت الوجودی تصور خدا, 62
- واثق سانی تھیوریز (theories), 287 ..... وحدت شاہدین, 48, 47, 27
- واجب الوجود ہستی, 260 ..... درجیں پارٹیکل ائٹی پارٹیکل, 312
- واحد, 20, 156, 147, 125, 68, 61, 59, 28, 22 ..... وہن, 239, 238, 133, 55, 53, 15, 213
- وہیم سی چک اور مرانتا چک, 197 ..... وہنس, 61
- وجود کی علم پر ماورائیت, 69 ..... دیو پارٹیکل ڈولیٹیٹی, 313
- وجودی شویت, 280 ..... سچی علیہ السلام, 27
- وجودیات (ontology), 58 .....

CASES

- (القرآن، سورہ العلق، 19:1) ..... 11
- لَيْسَ كَمِثْلُهُ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ۔ 42:11 ..... 87
- وَلَا يُجَادِلُ أَهْلُ الْكِتَابِ إِلَّا يَأْتِي هُنَّ أَحْسَنُ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَّمُوا مِنْهُمْ وَلَوْلَوْ أَمْتَأْنَى بِالَّذِي أُتُولَ إِلَيْنَا وَأُتْزَلَ إِلَيْنَا هُنَّ أَحْكَمُ وَاحِدٌ وَتَخْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿٤٢﴾ ..... 90
- وَمَا رَبِّكَ بِظَلَامٍ لِلْعَيْنِۏ ..... 98

OTHER AUTHORITIES

- (القرآن، 17:41) ..... 18
- (.JACKSON n.d) ..... 26
- (القرآن، 4:157) ..... 20
- (القرآن، 59:11) ..... 20
- ..... :- وَرَهْبَانِيَةً يَتَدْعُوهَا مَا كَتَبْنَا هَا عَلَيْهِمْ إِلَّا يَتَغَافِرُونَ إِلَيْهِمْ حَنَقَرٌ عَلَيْهِمَا كَاتِبَنَا الَّذِينَ آتَيْنَاهُمْ أَجْرًا مُحْمَدٌ وَكَيْدٌ مِنْهُمْ فَإِنَّهُمْ نُفَسِّرُونَ ﴿١١﴾ ..... 242
- ”اور جو پتا بھی گرتا ہے وہ اس کا علم رکھتا ہے۔“ (القرآن، 6:59) ..... 119
- Ideas thrive upon terms and travel in history ..... 108
- القرآن، 13:37 ..... 47
- القرآن، 2:106 ..... 42

196.....	اَللّٰهُ الْعَلِيُّ بِالْمُؤْمِنِينَ اَكْفَافُهُ ط ..
301.....	ایک پتا بھی جو گرتا ہے اللہ کو اس کا علم ہوتا ہے۔ (القرآن، 6:59)
135.....	لَا تَسْبِحُ الدَّهْرَ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الدَّهْرُ ط ..
42.....	مَانَسْخَهُ مِنْ آيَةٍ وَأُنْسِنَهَا تُبَخَّرُ مِنْهَا أَوْ مَقْلِهَا ط .. اَلَّهُ عَلَىٰ مُلْ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ ..
124.....	ذَلِكَ الْحَكْمُ وَمَا تَعْمَلُونَ (القرآن، 37:96) ..
300.....	وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَامٍ لِلْعَبْدِ ..
50.....	وَلَا تُطِعْ مَنْ أَنْهَلَ قَلْبَهُ عَنِ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ مُهُوتًا ۝ ..

---

<sup>1</sup> قرآن پاک میں گلیادہ سو سے زائد کلمات ایسے ہیں جو 6925 مرتبہ دہرائے گئے ہیں۔ قاری سلیم رفیق صاحب نے اپنی کتاب ”فہم القرآن کورس“ اور ”قرآن ڈائشنری“ کی صورت میں انھیں مرتب کیا ہے، جس سے جناب ملک شمس الدین صاحب کی بات کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔ (قاری محمد سلیم صاحب مؤلف ”فہم القرآن کورس“، ناشر مدرسہ حفظ القرآن، اسلام روڈ کراچی ص 211-211 ”قرآن ڈائشنری“، قرآن ایجوکیشن

(368) Mutashabihatulquran.org

<sup>2</sup> ہماری اسناد ہمارے مضمون ”وَحدَتُ شَاهِدِينَ“ میں ”اعنا میافتہ بندوں کی کیمیگریز“ میں دیکھ جاسکتی ہیں۔

<sup>3</sup> ان کا ایک اعتراض یہ ہے کہ قرآن پاک کو ”علم الہی“ کیوں کہا گیا ہے۔ اگر یہ کتاب علم الہی کا مأخذ نہیں ہے تو ”علم کتاب و حکمت“ کیوں فرمایا گیا ہے حضور ﷺ کو قرآن پاک میں؟ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ کیا قرآن پاک ”قدیم“ (eternal) ہے جو آپ لغت، گریسر، خوب کے علم کو ”حادث“، ”قرار دے رہے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ قرآن پاک ”کلام اللہ“ ہے۔ اللہ بے مثل ہے۔ کوئی شے اسکے مثل نہیں۔ وہ احسن امثال قیم ہونے کے باوجود تمام تحلیق کاروں، کے ساتھ ادنیٰ مماثلت سے پاک ہے۔ اسی طرح انسانی زبان میں ہونے کے باوجود بے مثل کلام بھی ہے مثل ہے۔ دور جاہلیت کا عربی ادب بھی نزول قرآن کے زمانے کا عربی ادب قرار دے کر اس کی صرف، خوب، اسلوب، تشبیہ و استعارہ وغیرہ کو ”کلام اللہ“ کے معنی اور مدعای کے تلقین اور وضاحت کا معیار بنایا جا رہا ہے، وہ مشرکانہ اور جاہلیہ قبائلی رسوم، فخر و غرور، تعلی، عورتوں اور تینیوں کے حسن، ائمہ بارے میں احساسات، اپنے آباء و اجداد کی دلیری، سفاکیت، احتمانہ سخاوت اور حکمت میں مبالغہ آرائی اور خواہشات میں لمحزی ہوئی انسانی حکمت و دانش کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ قرآن پاک کی تلاوت میں خیر اور غیر کو الگ رکھنے کیلئے وقف لازم کا انتظام ضروری ہوتا ہے، تو کیا پاک کلام اور ناپاک کلام کی معنویت میں وقف لازم کا انتظام ضروری نہیں۔ اللہ کے کلام کی شان تو یہ

ہے کہ یہ "الحق" ہے، "الفرقان" ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے معیار حق ہے، اللہ کی طرف سے حق اور ناحق میں فرق و امتیاز کا معیار ہے۔ قیامت کے دن "الحق" کی میزان پر پورے اتنے والے انسانی اعمال ہی باحقیقت ہوں گے۔ "الحق" کے خلاف اعمال بے حقیقت ہونگے، کیا وہ علم نہیں ہے، علم الہی نہیں ہے۔ یہ کلام تو آخرت کے بعد بھی قائم رہے گا۔ "کلام اللہ" تو اللہ کے امر کی کینگی سے تعلق رکھتا ہے۔ (حوالے کیلئے دیکھئے ہمارا مضمون: "قرآن: خلق یا امر")۔ فرمان الہی کی لغت اور گرامر، خود اس کے اندر سے اخذ کی جائی پاہے، اور اسے کسی بھی کلام کے اسلوب، تشبیہ و استعارہ کی معنویت اور حسن کلام کو جانچ کے معیار رکھنا چاہئے۔

<sup>4</sup> محمد اسد رحمت اللہ علیہ بھی اسی موقف کی تائید کرتے ہیں۔ ناخ اور منسون کی اصطلاح کے ساتھ کوئی تقدس وابستہ نہیں ہے جیسا کہ محمد اسد کہتے ہیں: "ایک بھی قبل اعتماد روایت نہیں ہے جس سے اخذ ہوتا ہو کہ حضور ﷺ نے کبھی قرآن پاک کی کسی آیت کو منسون قرار دیا ہو۔" (The Message of The Quran, verse 16:101, footnote no.97) ڈاکٹر محمود احمد غازی کے اس بیان سے کہ "یہ ایک عمومی اصطلاح ہے جس کے معنی محقق میں کے ہاں نہایت وسیع تھے، لیکن متاخرین نے اس کو ذرا محدود مفہوم میں استعمال کیا ہے۔" محمد اسد<sup>5</sup> کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے کہ۔ (محاضرات قرآنی، 297) یہ اصطلاحات بعد میں بنائی گئیں ہیں، جہاں دو آیات میں مطابقت ثابت کرنے میں دشواری محسوس ہوئی، انھیں ناخ-منسون قرار دے دیں۔

<sup>5</sup> اس سلسلہ میں ڈاکٹر طاهر القادری کی تصنیف "کتاب البدعات" میں بہت قابل تدریجی مواد موجود ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد بھی اپنی کتاب "ایجاد و ابداع عالم" سے نظام خلافت تک تزلیل و ارقاء کے مراحل میں "اسی قسم کے کلمات سے بات کا آغاز کرتے ہیں۔"

<sup>7</sup> Harry Austryn Wolfson was a scholar, philosopher, and historian at Harvard University, and the first chairman of a Judaic Studies Center in the United States. Born: 2 November 1887, Shchuchyn District, Belarus. Died: 20 September 1974, Cambridge, Massachusetts, United States.

<sup>8</sup> ابوہاشم کے نظریہ احوال کی بنیاد معمرا کے نظریہ معنی پر تھی۔ معمرا نے یہ نظریہ نویں صدی میں پیش کیا۔ اگرچہ معمرا کے اس نظریہ کا تعلق برادرست ذات و صفات باری کی نویعت کے مسئلہ سے نہیں ہے لیکن ابوہاشم کے نظریہ احوال کو سمجھنے کے لئے اس نظریہ کو سمجھنا ضروری ہے۔ معمرا کے پیش نظریہ سوال تھا کہ اشیا ایک دوسرے سے مختلف کیوں ہوتی ہیں؟ وہ سکون اور حرکت، سیاہی اور سفیدی اور زندگی اور موت کو اشیا کے بنیادی اختلاف سمجھتا تھا اور ان اختلافات کی وجہ پر غور و فکر کرتا تھا۔ یہ بات بھی زیر غور تھی کہ اشیاء کی صفات (Accidents)

میں اختلافات (Difference) اور مماثلت (Sameness) کی وجہ کیا ہے؟ عمر کے نزدیک صفات کا اختلاف اور مماثلت 'معنی' کی وجہ ہوتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق 'معنی' شے کے اندر موجود ہوتا ہے۔ عمر یہ بھی کہتا ہے کہ جب کسی جسم میں ایک 'معنی' کی وجہ سے کوئی عرض پیدا ہوتا ہے تو اس 'معنی' کے پیچے 'معنی' کا ایک لاحدہ سلسلہ ہوتا ہے۔ بعض روپروٹوں کے مطابق 'معنی' کے لئے اشیا کا لفظ بھی استعمال کرتا ہے۔ عمر تقریباً تمام متکلمین کی طرح جو بریت کا حावی تھا اس کا نظریہ تھا کہ اسٹم خود جسم نہیں بلکہ آٹھ مختلف جوہر ملکر جسم (Body) کی تشكیل کرتے ہیں۔ ایٹم کس طرح وجود میں آتے ہیں؟ اس کا جواب وہ دیتا ہے کہ خدا انہیں تحقیق کرتا ہے۔ جسم کس طرح وجود میں آتے ہیں؟ اس کا جواب وہ دیتا ہے کہ خدا انہیں تحقیق کرتا ہے۔ لیکن اعراض خدا تحقیق نہیں کرتا، وہ جسم کی اپنی فطرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ عمر کہتا ہے کہ ہر ایٹم کی اپنی فطرت ہوتی ہے اور جب ایٹموں کے ملنے سے جسم کی تحقیق ہوتی ہے تو ایٹم اپنی فطرت کی بنیاد پر اس جسم میں اعراض پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ عمر کے سوال بعد انہی سوالات پر غور و فکر کرتے ہوئے اور ان نظریات کا تنقید جائزہ لیتے ہوئے ابوہاشم نے نظریہ، احوال پیش کیا۔

<sup>9</sup> قرآن پاک میں اسماء الحسنی جو مفرد یا مرکب الفاظ کی صورت میں آئے ہیں یا انہیں کسی آیت کے مفہوم سے متعین کیا گیا ہے تفسیر فاضلی میں یہ ننانوے تحریر کئے گئے ہیں لیکن ان کی تعداد کا ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ قرآن پاک میں اسماء الحسنی کی تعداد متعین نہیں کی گئی۔ غلام احمد پرویز نے "اللہ تعالیٰ کی جو صفات قرآن پاک میں بیان ہوئی ہیں۔ خواہ وہ ایک لفظ ہوں یا انہیں کسی آیت کے مفہوم سے متعین کیا گیا ہو" کی تعداد 89 بیان کی ہے تاہم یہ بھی کہتا ہے کہ "اس فہرست میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے یعنی جو باتیں خدا نے اپنی طرف منسوب کی ہیں ان سے اس کی صفت متعین کر لی جائے جیسے تدبیر امور سے المدروغیرہ"۔ غلام احمد پرویز، توبیب القرآن (جلد اول) ادارہ طلوع اسلام، لاہور، 1977 ص 209 قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری کی تحقیق کے مطابق کتب روایات میں مختلف طرق میں جو نام بیان ہوئے ہیں ان کا شمار 158 ہے اور ان میں سے آٹھ نام مرکب اور 150 نام مفرد ہیں۔ قاضی سلیمان سلمان منصور پوری، شرح اسماء الحسنی، ادارہ اسلامیات، لاہور، ص 23 (سال اشاعت نہیں ہے) قاضی صاحب نے پناح اصل تحقیق یہ بیان کیا ہے کہ "بر سہ طرق روایات اور اسماء الحسنی کا عین و تفصیل نبی ﷺ سے ثابت نہیں ہے" بعد ایک تحقیق و متجسس بہ آسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ اسماء الحسنی کا عین و تفصیل نبی ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔ (ایضاً ص 14) قاضی صاحب نے ایسے کا اختیاب کرنے کی کوشش کی ہے جو مفرد ہیں اور قرآن پاک میں

بطور اسم آئے ہیں لیکن یہ ننانوے سے کم تھے چنانچہ چند ایسے اسماء جنہیں مستخرج از قرآن سمجھا گیا ہے شامل کر کے پہلے باب میں ننانوے اسماء کی تصریح کی ہے۔ (ایضاً، ص 207)

<sup>10</sup> Klein in his note writes: "In this section al-Ash'ari repeats himself frequently. He attempts to show, on the one hand, that the Qur'an is not created, because it has not the characteristics of a created thing and exists independently of creation, and, on the other hand, that it is eternal and uncreated because, it is in a sense, a predicate of God's attributes, like His Knowledge and His Will..."

<sup>11</sup> Whoso doth an ill-deed, he will be repaid the like thereof, while whoso does right, whether male or a female, and is a believer, all such will enter the Garden, where they will be nourished without stint.(40:40) and also 2:281; 3:25; 16:11; 10:44; 16:118; 73:76; 11:101; 2:62; 5:69; 16:98; 41:46; 45:15 and many other.

<sup>12</sup> الفاظ کی صورت میں اظہار سے پہلے ذہن میں پائے جانے والے تصورات کیلئے اشعری نے کلام نفسیٰ اور اظہار کے بعد 'کلام لفظیٰ' کی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے کہا کہ نزول سے پہلے قرآن پاک کلام نفسیٰ کی صورت میں اللہ کے ساتھ تھا اور نزول کے بعد اس نے کلام لفظیٰ کی صورت اختیار کی۔ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ غیر مغلوق ہے۔

<sup>13</sup> غلام احمد پرویز صاحب لوح محفوظ کو کتاب مکنوم سے اور دونوں کو نازل شدہ قرآن سے تطبیق دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ 1512. Tal' u e Islam, 1984, p. 1512. یہ بات درست نہیں۔ لوح محفوظ اور قرآن پاک ایک دوسرے سے ممیز ہیں۔ قرآن پاک کے مطابق لوح محفوظ ایسی کتاب ہے (i) : جس میں گزری ہوئی نسلوں کا حال درج ہے۔ (القرآن، 51-52) (ii) زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ درج ہے۔ (القرآن، 70:22) (iii) ام الکتاب یعنی وہ اصول جو اللہ نے انسانوں کی ہدایت و گمراہی کا فیصلہ کرنے کیلئے مقرر فرمائے درج ہیں۔ (القرآن، 13:39, 43:1-4)

<sup>14</sup> اللہ نے لوگوں کو دین حنف کی نظرت پر پیدا کیا ہے۔ اللہ ہر ایک کو پاک فطرت پر پیدا کرتا ہے۔ فطرت کا تعلق پاکی ہی سے ہے۔ (ماخوذ، القرآن، 30:30)

<sup>15</sup> - جاوید احمد غامدی کا نظریہ ہے کہ انسان کی آزادی و اختیار کا تعلق اس کے صرف اخلاقی وجود کے دائرے سے ہے۔ قیامت کے دن وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اسی بات کے لئے ماؤں ٹھہرایا جائے گا۔ تقدیر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ کیلئے ایک بات طے کردی گئی ہے۔ انسان کے طبی وجود سے متعلق چیزیں اسکے لئے مقرر ہیں کہ ان کا فیصلہ ہمارے پیدا کرنے والے نے از خود کر دیا ہوا ہے۔ یہ ساری چیزیں اللہ کے ہاں پہلے سے لکھی ہوئی ہیں۔ ہمارے اخلاقی وجود سے متعلق چیزیں خدا کے علم میں ہیں۔ علم کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو دونوں راستے بتادئے گئے ہیں۔ آپ کو نہادتہ اختیار کریں گے یہ خدا نے پہلے سے جان لیا ہے۔ آپ کی آزادی و اختیار سے متعلق وہ چیزیں جو علم الہی نے پہلے سے جان لی ہیں وہ بھی لکھی ہوئی ہوئی ہیں۔ جس دائرے میں آپ کو اختیار حاصل ہے اس میں خدا نے لکھا ہی یہ ہے کہ آپ اپنے آزاد ارادے اور اختیار سے یہ کام کریں گے۔ مثلاً میں نے دوڑ میں حصہ لیا تیری کی، ایک آدمی جو مجھے پہلے سے جانتا تھا اسے علم تھا کہ میری کیا پر اگر میں ہو گی۔ میرا نتیجہ اس کے علم کی وجہ سے نہیں تھا، میری کار کر دی کی بنا پر تھا۔ انسان کو اللہ نے صالح نظرت پر پیدا کیا ہے۔ انسان نئی اور بدی کا شعور لیکر آیا ہے، نیک یا بد بن کر نہیں پیدا ہو۔ خدا کا اڑی علم، جیل کل علم ہے۔ اس کا کوئی اzel اور ابد نہیں ہے۔ اس میں کوئی ماضی، حال اور مستقبل نہیں ہے۔ اس کا علم اسکی قدرت پر موثر ہے یا اس کی قدرت اس کے علم پر موثر ہے، اس کے بارے میں ہمیں قليل علم دیا گیا ہے۔ اس کیلئے آخرت میں ہی پہنچ پڑے چل گا۔

<http://tune.pk/video/3594054/kismat-taqdeer-aur-insan-ka-ikhtiyar-javed-ahmed-ghamidi>

<http://www.haniyas.com.pk/watch?v=i8PdQDTAgng>

<http://www.youtubes.pk/watch/7XiOaatEJ4o/22-qismat-aur-taqdeer-kia-hoti-hai-maslah-jabar-o-qadar-javed-ahmed-ghamidi.html>

ڈاکٹر ذاکر نائیک کا نظریہ ہے کہ اللہ سبحان و تعالیٰ غیب کا علم رکھتا ہے اس لئے اسے مستقبل کا بھی علم ہے۔ وہ پہلے سے جانتا ہے کہ کوئی شخص پیدا ہونے کے بعد کیا افعال سر انجام دے گا۔ یعنی بات وہ لکھ دیتا ہے، اسی کو تقدیر کہتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر ذاکر نائیک، قرآن پاک میں کہا گیا ہے کہ جیسے ہی پیدا ہوتا ہے، تقدیر اس کے گلے سے لٹکا دی جاتی ہے اور اللہ اسکی تقدیر لکھ دیتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ علم الہی فرد کے افعال کو متعین کرنے کا باعث بتتا ہے بلکہ معاملہ اس کے بر عکس ہے۔ آپ ایک راستے کا منتخب کرتے ہیں اس لئے نہیں کہ اللہ نے ایسا لکھ دیا ہوا ہے بلکہ اس لئے کہ اللہ کو علم غیب ہے اور پہلے سے جانتا ہے کہ آپ یہ کریں گے۔ اللہ نے ہمیں آزادی ارادہ سے نوازا ہے اور وہ اس میں مداخلت نہیں کرتا۔ آپ اپنی آزادی ارادہ سے وہی کام کرتے ہیں جو اس نے پہلے سے لکھ

رکھا ہوتا ہے۔ ذاکر نایک مثال یہ دیتے ہیں کہ استاد اگر یہ کہتا ہے کہ فلاں سٹوڈنٹ فرسٹ آئے گا، فلاں سینڈ آئے گا، اور فلاں پاس نہیں ہو سکے گا اور ایسا ہی ہوتا ہے تو اسکا مطلب یہ نہیں کہ استاد کے علم نے اس بات کو متعین کر دیا تھا، بلکہ یہ رزلٹ طالب علموں کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ مثال درست نہیں۔ استاد کا علم اندازے قیافے کا علم ہے، اللہ کا علم ناقابل خطاب ہے۔ طالب علم اپنی محنت سے اپنا مقدر بدل سکتا ہے، جب کہ دوسری صورت میں یہ ممکن نہیں۔ اللہ تحقیق کرتا ہے اور ساتھ ہی یعنی توفیق عطا کرنے سے پہلے جان بھی لیتا ہے کہ اس کا مقدر کیا ہے تو پھر آزادی ارادہ کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے، اگر اس کا مقدر برہا ہے تو اس کے لئے ذمہ دار کون ہے!

2:48 minutes video at "http://tune.pk/video/2949811/dr-zakir-naik-islamic-definition-of-destiny-taqdeerfate

تفہیم القرآن میں سورہ البروج (۸۵) اور سورہ الرازخ (۲۲) کے ضمن میں مودودی صاحب اوح محفوظ کے ایسے تصویر سے اتفاق نہیں کرتے جس کے مطابق یہ ایک کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور جس پر ازال سے ہی تمام بندی آدم کی تقدیر اور دنیا کی زندگی میں کئے جانے والے ارادی اخلاقی اعمال تحریر کر دیے گئے ہوں۔ اور کہتے ہیں کہ خدا نے انسان کی فطرت میں برائی اور سہلائی، دونوں کی تمیز و دیجت کر دی ہے۔ (تفہیم القرآن، تفسیر سورہ الشمس: ۸) اور نیکی اور برائی، دونوں کے رستے بتا دیے ہیں۔ (تفہیم القرآن، تفسیر سورہ الدھر: ۲۹) لیکن اس کے ساتھ ہی سورہ الحید کی آیت نمبر ۲۲ ”جو مصیبت بھی اختیار کرے۔ تفہیم القرآن، تفسیر سورہ الدھر: ۲۹) لیکن اس کے ساتھ ہی سورہ الحید کی آیت نمبر ۲۲ ”جو مصیبت بھی زمین میں آتی ہے یا خود تم پر نازل ہوتی ہے، وہ پیش آنے سے پہلے ہی کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔“ یہ تفسیر کے ضمن میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ کتاب سے مراد ہے نوشیہ تحریر اور اپنی مخلوقات میں سے ایک ایک کی تقدیر پہلے سے لکھ دینا اللہ کے لئے کوئی مشکل کام نہیں۔ (تفہیم القرآن، تفسیر سورہ الحید: ۲۲) اس کا مطلب یہ ہوا ہے یہ بھی مان رہے ہیں کہ ایک ایک فرد کی تقدیر پہلے سے لکھی ہوئی ہے۔ مودودی صاحب کے ہاں مسئلہ تقدیر پر انہار خیال کرنے والے اکثر علماء کرام کی طرح اللہ کی رضا اور مشیت کے تصورات اور ان میں فرق بھی واضح نہیں۔ (مسئلہ جبر و قدر، ص: ۷۵، اور ص: ۱۰۰) اپنی کتاب مسئلہ جبر و قدر، ص: ۱۱۱ پر یہ بھی کہتے ہیں کہ ”وہ مابعد الطبعی مسائل جن میں فلاسفہ اور متكلّمین الجھے ہوئے ہیں یعنی اللہ کے علم اور اسکی معلومات، اسکی قدرت اور اس کے مقدرات، اسکا ارادہ اور اسکے مرادات میں کس نوع کا تعلق ہے، اور اسکے ارادہ سابق، ارادہ ازلى، اور قدرت مطلق کے ہوتے ہوئے انسان کس طرح با اختیار اور اپنے ارادے میں آزاد ہو سکتا ہے، تو ان مسائل سے قرآن نے کوئی بحث نہیں کی کہ انسان ان کو سمجھنے نہیں سکتا۔“ قرآن پاک کی آیات قالَ أَتَقْبِلُونَ عَلَىٰ مَا تَحْمَلُونَ ۝۹۶۔ (الحلفت، ۳۷:۹۶-۹۷) کاتب جم ابو الحسن الاشمری اور انکے تبعین کی طرح مودودی صاحب بھی اس طرح کرتے ہیں جس سے یہ اخذ ہوتا ہے کہ وہ بھی اللہ ہی کو انسان اور اسکے اخلاقی اعمال دونوں کا خالق سمجھتے ہیں۔

(تفہیم القرآن، تفسیر سورہ الصفت، 96:95 آیات، مسئلہ جبر و قدر، سید ابوالاعلیٰ مودودی، لاہور: اسلامک پبلیکیشنز) (پرائیسٹ لمبیٹ، ایڈیشن 2000)

1۔ سورہ الاعراف کی آیت کریمہ الاستبریکم (7:173) کے حوالے سے تفسیر فاضلی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے بنی آدم اور بنی آدم سے ان کی ذریت بلوٹ میں ظہور پذیر ہونے سے پہلے خلوٹ کے مقام پر تھی۔ اس مقام پر بنی آدم کے ہر ہر فرد نے اللہ تعالیٰ کی ربویت کریں کہ شعور کے ساتھ تسلیم کیا اور عمل کیلئے دی گئی توفیق سے پہلے کیا۔ اس تسلیم کے مطابق ہر نفس پر یہ حق عائد ہوتا ہے کہ وہ جس طرح اس دنیا میں پاک پیدا ہوا تھا، حدود خداوندی کا احترام کرتے ہوئے اسی طرح پاک رہتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو جو رخ کوئی اختیار کرتا ہے، اپنے شعور کے ساتھ کرتا ہے۔ جو رخ اختیار کیا جائے گا اسی کی جزا دی جائے گی۔ مگر اسی بیان سے اپنی خواہشات کی پیر وی سے ہوتی ہے اور یہ ہر نفس کا ذاتی فعل ہے۔ کسی دوسرا سے کافل کسی نفس کو گراہ نہیں کرتا۔ ہر نفس کو اس کے عمل کی جزا دی جائے گی۔ (تفسیر فاضلی منزل دو، 299-299)

(301)

2۔ سورہ حود آیت، 105 یوہ میات لاتکلمُ نفساً الْبَاذِنَةَ فَمِنْهُمْ شَقِيقٌ سَعِيدٌ<sup>۶</sup> اور دیگر آیات جب وہ دن آئے گا، کوئی اس کے اذن کے بغیر بات نہیں کرے گا۔ تو ان میں کوئی بد بخت [شقیق] ہے کوئی نیک بخت [سعید] ہے۔ (القرآن، 11:105) اور جتنے لوگ ہیں، تمہارا بخوبی ان کے اعمال پورے دے گا۔ بیشک اسے خبر ہے، جو عمل وہ کر رہے ہیں۔ (القرآن، 11:111) تو یہ ہر رخ چیزی تحسیں امر ہے۔۔۔ اور سرکشی نہ کرو۔ بے شک وہ دیکھ رہا ہے جو عمل تم کرتے ہو۔ (القرآن، 11:112)۔۔۔ نیکیاں، برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔ یہ نصیحت ہے ذکر کرنے والوں کیلئے۔ (القرآن، 11:114) کے حوالے سے تفسیر فاضلی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ:

شقیق وہ ہے جو فلاخ سے دور ہے، سعید وہ ہے فلاخ کے رخ پر ہو۔ ہر ایک کو اس کے اعمال کی جزا دی جائے گی۔ جو خسارے میں پڑے تو اس کی بد بختی اس کے کئے کی بد دولت ہوگی، جو فلاخ پائے تو اس کی نیک بختی اس کے کئے کی بد دولت ہوگی۔ ہمارے ہر عمل میں مقدم اللہ کی رضاہو، حصول مقصود کیلئے جو سمجھی کی جائے وہ اسوہ رسول ﷺ کے مطابق ہو، اور پھر نتاں کج کو باذن اللہ مان کر اپنا تو اذن ٹھیک رکھا جائے، تو سب مقامات پر سلامی قائم رہتی ہے۔ (مانو، تفسیر فاضلی، منزل سوم ص 105، 109، 109)۔

3۔ سورہ پیغمبر کی آیت ”بے شک ہم مردوں کو حیات دیں گے اور لکھ رہے ہیں جو کچھ انہوں نے آگے بھیجا اور جو نشان پیچھے چھوڑ گئے اور ہر شے ہم نے لکھ رکھی ہے ایک بتانے والی کتاب میں۔ (القرآن، 12:36) کے ضمن میں تفسیر فاضلی کا نقطہ نظر ہے کہ: بعث بعد الموت یقیناً ہوگی اور بندوں کو ان کے کئے کی جزا دی جائے گی۔ اعمال پہلے سے لکھے ہوئے ہیں، حال پر لکھے جا رہے ہیں۔ ان کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک حصہ وہ ہوتا ہے جس میں توفیق ایزدی سے ایک راستہ اختیار کیا جاتا ہے اور شعور کے ساتھ مقاصد کے حصول کیلئے سمجھی کی جاتی ہے۔ دوسرا حصہ وہ ہے جس میں پیچھے آنے والوں کیلئے نشان

چھوڑے جاتے ہیں۔ ان دونوں کی جزا بندوں کو دی جائے گی۔ خالق کل کیلئے ہر شے کا حساب کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ اعمال نامے میں کچھ مخفی نہیں رہے گا (ت ۳۸۰، ف ۵)۔

4۔ سورہ الاسراء کی آیات اور ہر انسان کا نصیب ہم نے اس کے گلے میں لگا دیا۔ اور اس کیلئے قیامت کے دن ایک کتاب نکالیں گے، جسے کھلا ہو پائے گا۔ پڑھ لے اپنی کتاب۔ آج تو خود ہی اپنا حساب کرنے کیلئے کافی ہے۔ (الاسراء، ۱4-13:7)

کہ ضمن میں تفسیر فاضلی کا نقطہ نظر ہے کہ شعور کی موجودگی میں شریعت کا مانا لازم ہے۔ جو شعور کے ساتھ جملائی کی راہ اختیار کرے گا وہ بھی لکھا جائے گا، جو شعور کے ساتھ برائی کی راہ اختیار کرے گا وہ بھی لکھا جائے گا۔ یہ کتاب انسان کے رخ اور عمل کو صحیح طور پر سنبھالتی جا رہی ہے۔ قیامت کے دن اسے امر الہی سے نکالا جائے گا، تو صاحب عمل کو حیرت ہو گی کہ اس کا کوئی بھی عمل درج ہونے سے رہ نہیں گی۔ جس نیت کے ساتھ کوئی عمل کیا جا رہا ہے وہ بھی اللہ کے سامنے ہے۔ ہر انسان کا نامہ اعمال اس کے ساتھ ہے۔ انسان جو رخ اختیار کرتا ہے اسی کی کی جزا پائے گا۔

انسان کا نصیب اس کے عمل کے بعد لکھا جاتا ہے۔ نیت کو اللہ سے بڑھ کر کوئی نہیں جان سکتا، اس لئے شفاقت اور سعادت کا فیصلہ وہی کر سکتا ہے۔ عمل کے لئے مہلت اور توفیق سب کو ایک جیسی نہیں دی جاتی، اس لئے حسن عمل کو حسن نیت سے ہی دیکھا جاسکتا ہے (تفسیر فاضلی چہارم، 7)۔

5۔ سورہ الانفطار (82) کی آیات و آن عَلَيْكُمُ الْحِظْرَى۔ كَمَا أَكَانُتُمْ - بَغَلَمُونَ مَا تَعْلَمُونَ۔ ”بے شک تم پر حفاظت کرنے والے امور ہیں۔ معزز کا تین۔ وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔“ (القرآن، 12:10-12) کے ضمن میں تفسیر فاضلی کا نقطہ نظر ہے کہ موت کے وقت تک توفیق عطا کر کے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کی حفاظت کا بھی بندوبست کیا گیا ہے۔ ہمارا کیا محفوظ کیا جا رہا ہے۔ فعل سرزد ہونے کے بعد لکھا جاتا ہے۔ ہمیں ہمارے کئے کی جزا ہی دی جائے گی۔ اعمال نامہ تیار کرنے والوں کی صفت بیان فرمائی گئی ہے، کہ وہ معزز ہیں، اللہ کے امر کی تعیل میں قطعاً کو تابی نہیں کرتے (تفسیر فاضلی منزل ہفتہ، 386-387)۔

6. Abdul Hafeez Fazli, "Quranic View of Omniscience and Human Freedom", ibid.

7۔ بے شک اللہ آسمانوں اور زمین کو تھاے ہوئے ہے کہ کہیں مل نہ جائیں۔ اگر وہ مل جائیں تو کوئی انھیں تھامنے والا نہیں۔ بے شک اللہ حلیم ہے غفور ہے۔ (سورہ فاطر، 41:35)

<sup>16</sup> He (Hazrat Ibrahim (pbuh) said: Worship ye taht which ye yourselves do carve. (95) When Allah hath created you and what ye make? Mamaduke Pickthall (tr). the Meaning of the Glorious Qur'an Vol.II, Islamic Literature Publishing House, Basavangudi, Bangalore 4, 1952m P.840. He answered: “ Do you worship shomething that you yourself have carved, (96) the while it is god who has created

you and all your handiwork?" Muhammad Asad (tr. & explanation), The Message of the Quran' Dar Al-Andlaus, Gibral-tar, 1980, P.687.

'(واپس) آکروه لوگ بھاگے بھاگے اس کے پاس آئے۔ اس نے کہا۔ کیا تم اپنی ہی تراشی ہوئی چیزوں کو پوچھتے ہو؟ حالانکہ اللہ ہی نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور ان چیزوں کو بھی جنمیں تم بناتے ہو۔" (مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، جلد چہارم، طبع شتم 1974ء، ص 293۔)

"اللہ ہی نے پیدا کیا ہے تم کو بھی اور ان چیزوں کو بھی جن کو تم بناتے ہو۔" (37:96) "(تدبر القرآن جلد ششم، 474)" "اخنوں نے فریا کہ شامت زد و... تم جن کو اپنے باہموں تراشتے ہو انہی کی پوچا کرتے ہو۔... یاد رکھو کہ اللہ ہی ہے جس نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور ان لکڑیوں اور پتھروں کو بھی پیدا کیا ہے جن سے تم اپنے معبودوں کو تراشتے ہو۔... بعض متکلمین نے دو ما苍 عملوں سے استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی بندوں کے انعام و اعمال کا بھی خالق ہے۔ اس آیت سے یہ استدلال ہمارے تردیک بالکل بے محل ہے۔ ہم نے اسکی صحیح تاویل واضح کر دی ہے۔" (ایضاً، ص 482-483)

<sup>17</sup> مولانا امین احسن اصلاحی ان آیات شریفہ کا ترجیح اس طرح کرتے ہیں: "یہ ایک یاد دہانی ہے تو جو چاہے اپنے رب کی راہ لے۔ اور تم نہیں چاہکتے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ بے شک اللہ علیم و حکیم ہے۔" (تدبر القرآن جلد نمبر 102) "یہ سب اس سنت الہی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے توفیق یہاں کے بات میں مقرر کر کی ہے۔... کہ اللہ تعالیٰ کا ہر کام اس کے علم و حکمت پر مبنی ہے۔ وہ بدایت کی توفیق انہی کو بخختا ہے۔ جو اپنے سعی و یصر سے کام لیتے اور خیر و شر، حق و باطل کے درمیان امتیاز کی اس صلاحیت کی قدر کرتے ہیں۔ جو اس نے ان کے اندر و دیعت فرمائی۔" (ایضاً، ص 120۔ تم نہیں چاہو گے مگر یہ کہ اللہ عالم کا خداوند چاہے۔) (29:81) مولانا امین احسن اصلاحی سورہ التکویر کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "کہ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کا حوالہ دیتا ہے جو اس نے بدایت و ضلالت کے بارے میں ٹھہر ار کی ہے کہ وہ بدایت کی توفیق انہی کو بخختا ہے جو اس کے طالب بنتے ہیں اور اس کے لیے اپنی صلاحیتیں برتوئے کارلاتے ہیں۔" (ایضاً، ص 232) سورہ مدثر کی آیات نمبر 56, 55, 54 میں بھی یہاں کیا گیا ہے۔ سورہ الانسان اور التکویر کی محوالہ بالا آیات کے ضمن میں مولانا مودودی فرماتے ہیں: "ان آیات میں تین باتیں ارشاد ہوئی ہیں: یہ کہ انسان کو انتخاب کی آزادی حاصل ہے۔ تباہ کا انحدار اللہ کی مشیت پر ہے۔ انسان عملاً بھی وہی کچھ کر سکے جو وہ کرنا چاہتا ہے، اللہ کے اذن اور اسکی توفیق پر منحصر ہے۔ اللہ کی مشیت الیل ٹپ (arbitrary) نہیں۔ وہ علیم ہے اور حکیم ہے۔ جو کچھ کرتا ہے علم اور دلائلی سے کرتا ہے۔" (تفہیم القرآن، جلد ششم، نسیمہ نمبر 1، 576-577)

<sup>18</sup> Philo of Alexandria also Judaeus Philo (c.20 BCE-40 CE), a Jewish Scholar, got so much impressed by Plato that he referred to him as 'the most holy Plato'. Believing Judaism as the revealed truth, and the Platonic philosophy as the standard

---

of rationality, Philo set to developing a speculative and philosophical justification for Judaism in terms of Greek philosophy. In the history of philosophy this was the first attempt at the rational reconstruction of religious thought.

<sup>19</sup> Einstein's Special Theory of Relativity replaces Newtonian naturalism in 1905 and his General Theory of Relativity in 1915. Newtonian naturalism believed no connection between space and time. Physical space was held to be a flat, three-dimensional continuum (i.e., an arrangement of all possible point locations—to which Euclidean postulates would apply.) Time was viewed as absolute—i.e. independent of space, as a separate, one-dimensional continuum, completely homogeneous along its infinite extent. So Newtonian universe was an infinite space existing with an absolute time parallel to it. Albert Einstein in his Theory of Relativity suggested that time wasn't separate from space but connected to it. Time and space combined to form space-time, and everyone measures his or her own experience in it differently. Einsteinian naturalism sees the fabric of space as four-dimensional. In it time is not absolute, it is relative to the experiencing subject. The basic elements of space-time are events as compared to Newtonian naturalism which believes in static and steady state universe with things as its elements. In any given space-time, an event is a unique position at a unique time. Einstein also suggested that space-time wasn't flat, but curved or "warped" by the existence of matter and energy. Einsteinian naturalism states that objects with large masses can warp [bend/twist] time by speeding it up or slowing it down. How many dimensions are needed to describe the universe is still an open question. According to some modern theories, the universe can only be adequately described by using a system with many more dimensions than were originally proposed by Einstein.

<sup>20</sup> For Ibn e Arabi's reference as to 'ad-dahr' being one of the beautiful names of God, see p. 58-59.

<sup>21</sup> Referring to verse 54 of surah al-A'raf which says that: "133 all creation and command belong to Him." Abu al-Hasan al-Ash'ari argues that 'Creation' and 'Command' are two different categories. Abu 'L-Hasan 'Ali Ibn Isma'il Al-Ash'ari, Al-Ibaanah an Usul Ad-Diyaanah (Eng. tr. The Elucidation of Islam's Foundation by Walter C. Klein), American Oriental Society, New Haven, 1940, p. 66, 67, 76. According to our understanding Quranic ontology consists of three categories: Allah, the Creation (Khalq), and the Command (Amr). Whatever has come into being from God, either belongs to the category of Khalq or to the category of Command. Abdul Hafeez Fazli, "The Quran: Creation or Command!" International Journal of Humanities and Religion [IJHR], 2(10) December 2012: 75–83, India.

قرآن میں انسانی اعمال کی جزا کا تصور اسی عقیدہ پر مشتمل ہے۔ حوالے کیلئے چند آیات پر اتفاق رکن متناسب ہو گا۔  
ایضاً۔ (41:28, 17:63, 98)

<sup>22</sup> وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا خِيَالُ النَّاسِ مَحْوُثٌ وَتَخْيَا وَمَا يَفْلِحُ كُلُّ أَلَّا اللَّهُ هُوَ وَمَا هُوَ بِذَلِكَ مِنْ عَلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظْلَمُونَ ﴿٤٥﴾ (القرآن، 45:24-45) هُنَّ أَنَّى عَلَى الْإِنْسَانِ جِنِينٌ مِنَ النَّهْرِ لَمْ يَكُنْ سَبَبًا لِمَدْرُوكِهِ ﴿٧٦﴾ (القرآن، 76:01).

<sup>23</sup> مُنَافِقُينَ كَمَا شَارِقُيْنَ اَحَادِيبِ الشَّمَاءِ مِنْ هُوَ گا۔ مُنَافِق زبان سے مسلمان ہوئے کا دعوے دار ہوتا ہے لیکن دل میں وہ آپ کے کامانے والا نہیں ہوتا۔ سورہ المناقبون، قرآن پاک کی تریٹھ (63) نمبر کی سورہ ہے۔ پہلی آیت کا ترجمہ ہے۔ ”جب منافق ہے آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں، ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، اللہ کو علم ہے کہ بے شک آپ اس کے رسول ہیں، اور اللہ شہادت دیتا ہے کہ منافق یقیناً جھوٹ ہیں۔ (القرآن، 63:1) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ منافق حضور ﷺ کے زمانے میں تھے۔ اسی سورہ میں فرمایا گیا ہے: ”برابر ہے آپ منافقین کے لئے استغفار کریں یہاں کریں، اللہ ان کو نہیں بخشنے گا۔“ (6:63) اس کا مطلب ہے کہ منافق مسلمانوں کے اندر موجود تھے۔ قرآن پاک میں مسجد ضرار کا ذکر ہے جو بنائی ہی فراد پیدا کرنے کیلئے گئی تھی۔ حضور ﷺ نے اللہ کے فرمان پر اس کو مسماڑ کر دیا۔ لیکن اس کے بنانے والے مسلمان ہونے کے دعوے دار نہیں تھے۔ (القرآن، 107:9) فرمایا گیا ”نہ منافقین کے لئے کبھی دعا کریں جب وہ مر جائیں، اور نہ ان کی قبر پر کھڑے ہوں۔“ (القرآن، 9:79-84)

<sup>24</sup> کسی جن کے نبی یا رسول ہنا کر بھیجے جانے کا تصور نہیں ہے قرآن پاک میں۔

<sup>25</sup> <sup>26</sup> According to William C. Chittick the first clear and detailed formulation of wahdat al-wujud is usually ascribed to al-Shaykh al-Akbar, Muhyi al-Din Ibn al-Arabi (560/1165–638/1240). The term wahdat al wujud itself is not found in any

texts before the works of Ibn al-Arabi's school. Ibn al-Arabi himself never employs the term wahdat al-wujud in his enormous corpus of writings however he frequently discusses wujud and often makes explicit statements that justify that he supported the idea of wahdat al-wujud in the literal sense of the term.

<sup>27</sup> دیکھئے ہمارے مضمین: (A. H. Fazli, Is 'al-Haqq' one of al-Asma' al-Husna!, 2016) اور (A. H. Fazli, The Qur'anic ontology and status of al-Haqq, 2016)

<sup>28</sup> سیدنا حضرت علی علیہ السلام اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان مقاشت کی تاریخ پڑھتے ہوئے جس میں دونوں جانب سے ہزار بھی تعداد میں کلمہ گو جان بحق ہوئے، ڈاکٹر محمد اشرف فاضل علیہ السلام پر شدید گریے کی کیفیت آگئی۔ آپ اٹھے اور حضرت فضل شاہ قطب عالم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ آپ نے عرض کیا: "حضور! بتائیے ان دونوں میں سے کون حق پر تھا۔" حضرت فضل شاہ قطب عالم علیہ السلام نے فرمایا: "بیٹا! یہ بڑے ہیں۔ ان کے بارے میں ایسے بات نہیں کرتے۔" آپ نے عرض کیا۔ "حضور! ہمارا ان میں سے کسی سے کوئی مقابلہ۔ آپ کا حکم ہے کہ اگر کوئی سوال ذہن میں آئے تو پوچھ لیتا ہے۔ اگر کوئی سوال پوچھنے سے رہ گیا، تو قیامت کے دن جوابہ آپ ہو گے۔ حضور! مجھے اس سوال کا جواب چاہئے۔" آپ علیہ السلام نے پھر فرمایا: "بیٹا! یہ بڑے ہیں۔ ان کے بارے میں ایسے بات نہیں کرنی۔" آپ نے عرض کیا: "حضور! اجیسے بھی بات کرنی ہے، مجھے اپنے سوال کا جواب چاہئے۔" آپ نے فرمایا۔ "آپ بیٹھیں ہم ابھی آتے ہیں۔" اور خود تھیلا اٹھا اور ڈیرہ پاک کے مہمانوں کیلئے سبزی، گوشت، دیگر سامان لانے کیلئے تشریف لے گے۔ کافی دیر کے بعد جب تشریف لائے تو آپ ادھر ہی تھے اور اسی کیفیت میں تھے۔ پیر صاحب نے کسی خادم سے فرمایا: "ڈاکٹر صاحب کو چاہتے پاڑ۔ وہ دیکھو! وہ حلوہ بھی آگے کرو یہ مٹھائی بھی پیش کرو۔" ڈاکٹر اشرف فاضل صاحب نے عرض کیا۔ "حضور! آپ جو بھی کریں۔ آپ کا شکریہ۔ مجھے اپنے سوال کا جواب پھر بھی چاہئے۔" حضرت فضل شاہ علیہ السلام نے فرمایا: "اچھا یہ بات ہے۔" آپ نے کسی خادم کو حکم دیا۔ ڈیرہ پاک پر موجود سب کو بلا یا جائے۔ یہ آپ کا طریقہ تھا۔ جب کسی بہت اہم علمی مسئلہ پر علم عطا فرما منظور ہوتا تو آپ ایسے ہی کرتے تھے۔ سب لوگ آگے تو آپ نے ڈاکٹر صاحب سے فرمایا: "اب بات کریں۔" آپ نے اپنا سوال دہرا یا۔ حضرت فضل شاہ علیہ السلام نے فرمایا: "آپ خود جواب دیں، ہم اسکی تصحیح یا تصدیق کریں گے۔" ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ اس سے پہلے ہمارے ذہن میں قطعاً کوئی جواب نہیں تھا۔ حضرت فضل شاہ قطب عالم علیہ السلام کے فرمائے پر کہ آپ جواب دیں، ہمارے اندر از خود ایک جواب آگیا۔ ہم نے عرض کیا: "حضور! قرآن پاک میں ارشاد ہے: "خواہش کی پیر وی نہ کرو، کہ وہ آپ کو اللہ کی راہ سے بہکا دے گی۔" (القرآن: 26:38) آپ نے پھر عرض کیا: "حضور! ہم شہادت دیتے ہیں کہ سیدنا حضرت علی علیہ السلام نے اپنی پوری حیات طیبیہ میں کسی مقام پر بھی خواہش کی پیر وی نہیں کی۔ آپ خلوت اور جلوت کے ہر مقام پر پاک رہے۔" حضرت فضل شاہ قطب عالم علیہ السلام نے فرمایا: "ہم تصدیق کرتے ہیں کہ آپ

کی بات حق ہے۔ ”ڈاکٹر صاحب“ نے پھر عرض کیا: ”حضور اہم یہ شہادت حضرت امیر معاویہؓ کے بارے میں نہیں دے سکتے۔“ حضور حضرت فضل شاہ قطب عالمؓؒ نے فرمایا: ”ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ کی بات حق ہے۔“<sup>29</sup> اصل دستاویز پر نہ نہیں لگے ہوئے۔ اس لئے معابدے کی شتوں میں تقسیم مختلف بھی پائی جاتی ہے۔<sup>30</sup> ولیم سی چنک، و مر اتاچنک، ایضاً۔ ڈاکٹر اسرار احمد احسان، کو حسن ایمان کے معنی میں لیتے ہیں، جبکہ چنک اس حسن عمل کے معنی میں لیتی ہے۔

<sup>31</sup> قدرت اللہ شہاب، جزال ایوب خان کے دور حکومت میں ایک سینئر بیور و کریٹ تھے۔ وہ ادیب بھی تھے اور صوفی بھی۔ ۱۹۸۷ء میں فوت ہوئے۔ شہاب نامہ اُنکی خود نوشت سوانح حیات ہے جو اُنکی وفات کے بعد شائع ہوئی۔<sup>32</sup> شیعہ حضرات میں یہ بات پہلے سے ہی اسی طرح چلی آ رہی ہے، یہ اجتہاد وہاں بہت پہلے ہی کیا جا چکا ہوا ہے۔ اسلئے شیعہ حضرات رہی جبار کے موقع پر حادثات کا شکار ہونے سے بیشہ محفوظ رہے۔

<sup>33</sup> فقہ میں مکمل کتب فکر کے بانی حضرت امام مالک ابن انس (وفات ۹۵۷) بدعت کو خلاف سنت ہونے کی بناء پر باعث گمراہی سمجھتے تھے۔ جبکہ شافعی کتب فکر کے بانی حضرت امام محمد بن اوریس الشافعی (وفات ۸۲۰) سنت پاک کو قانون سازی میں اختاری سمجھنے کے باوجود، بدعت حسنہ اور بدعت یہہ میں فرق کرتے تھے اور بدعت حسنہ کو جائز اور ضروری سمجھتے تھے۔ (Farouk-Allii 2010)

<sup>34</sup> Source:Cartage.org: <http://www.cartage.org.lb/en/themes/sciences/mainpage.htm>

<sup>35</sup> Cf. The Physics of the Universe: Cosmological theories through history, <http://physicsoftheuniverse.com/cosmological.html>)

<sup>36</sup> Cf. ([http://www.skwirk.com/p-c\\_s-4\\_u-138\\_t-400\\_c-1407/einstein-s-theory-of-relativity-/nsw/einstein-s-theory-of-relativity-/the-big-bang-and-our-universe/the-origin-of-the-universe](http://www.skwirk.com/p-c_s-4_u-138_t-400_c-1407/einstein-s-theory-of-relativity-/nsw/einstein-s-theory-of-relativity-/the-big-bang-and-our-universe/the-origin-of-the-universe)

<sup>37</sup> یہ روایت معمولی اختلاف کے ساتھ درج ذیل پانچ مختلف صورتوں میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مردی ہے۔ ا۔ ”میں نے سارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے۔ آپ فرماتے تھے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: بُراؤ آدمی کہتا ہے زمانے کو، حالانکہ زمانہ میرے ہاتھ میں ہے، رات اور دن میرے اختیار میں ہیں۔“

۲۔ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: آدمی مجھے ایزد اپناتے ہے، راکھتا ہے زمانے کو اور میں خود زمانہ ہوں، پلٹتا ہوں رات اور دن کو۔“

۳۔ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اللہ جل جلالہ نے ارشاد فرمایا: تکلیف دینا ہے مجھ کو آدمی، کہتا ہے ہائے کم بخوبی زمانے کی اتوکوئی تم میں سے یوں نہ کہے ہائے کم بخوبی زمانے کی! اس لئے کہ زمانہ میں ہوں، رات اور دن میں لاتا

ہوں، جب میں چاہوں گا تورات اور دن مو قوف کر دوں گا۔“

۴۔ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کوئی تم میں سے یوں نہ کہے، اے کم بختنی زمانے کی! اس واسطے کے زمانہ تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔“

۵۔ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لَا تَشْبُهُ الدَّهْرَ قَائِمًا اللَّهُ هُوَ الدَّهْرُ طَمْتَ بِرَاكَبَةٍ كَوَئيْ تَمَّ مِنْ سَعَةِ الدَّهْرِ (یعنی زمانے کو اس واسطے کے اللہ تعالیٰ خودا در ہے۔“

<sup>38</sup> قرآنی وجودیات افلاطون اور ارسطو کی وجودیات سے مختلف ہے، جس کے مطابق کوئی چیز تدین (eternal) ہے یا ’حادث (accidental)، کوئی چیز ’مخالق‘ ہے یا ’غیر مخالق‘۔ یعنی وجودیات شوئی (dualistic) ہے۔ افلاطون کی وجودیات میں ایک تو افالکی حقائق کا عالم ہے (celestial world) اور دوسرے کون و مکان کی دنیا (spatio-temporal world) ہیں۔ عالم افالک میں خدا ہے، عالم امثال ہے، روح کائنات ہے، اور بھی کئی چیزیں ہیں۔ یہ سب ازلی پر ہے وہ خدا بھی کہتا ہے، اور (۲) ’غالص مادہ (Pure Matter) پر۔ یہ دونوں ہمیشہ سے ایک دوسرے کے متوازنی حقائق ہیں۔ یہ ریکل میں لیکن زمانی و مکانی وجود نہیں رکھتے۔ ہر حادث شے، زمانی و مکانی ہے، وجود رکھتی ہے اور ان دونوں کے امترانج پر مشتمل ہے۔

<sup>39</sup> اس آرٹیکل کی اشاعت کے چند روز بعد تنظیم اسلامی کی دعوت پر جناب اسحاق ظفر انصاری نے بالغ جناح لا بھریری میں اس موضوع پر خطاب فرمایا کہ مسلمان سائنسی ترقی میں کیوں پیچھے ہیں۔ انہوں نے بالکل ڈاکٹر اسرار احمد ہی کے نظریات کی تائید کی۔ راقم بھی اس موقع پر موجود تھا۔

<sup>40</sup> رچرڈ ڈاکنز (Richard Dawkins, 1941) اپنے آرٹیکل "Science Discredits Religion" میں نظریہ ارتقاء پر عیسائیت کے عقائد تقدیمی جائزہ لیتے ہوئے کہتا ہے کہ انسان سے قریب ترین مماثلت رکھنے والے جانوروں میں سے خدا نے کسی فرد کو سلیکٹ کر کے اس میں انسانی روح انجیکٹ کر دی، تو یہ ایک تاریخی واقعہ ہے، یہ کب شیش آیا! میں سال پہلے؟ دو ملین سال پہلے؟ یہ ابتدائی حیوان کون تھے؟ [یہ بات ڈاکٹر اسرار احمد پر بھی پوری ترقی ہے۔]

<sup>41</sup> اگرچہ اللہ کی شان ہر انسانی حوالے سے اور اعماق ہے، بھر بھی انسانی حوالے بات کو فہم کے قریب کر دیتے ہیں۔ خلق اور امر کے تعلق کو کمپیوٹر کے ہارڈ ویر اور سوف ویر سے مماثلت کے حوالے سے سمجھا جاسکتا ہے۔ اللہ کے امر کے نازل ہوتے رہنے کو اسے اپ ڈیٹ کئے جانے کے حوالے سے سمجھا جاسکتا ہے۔ نظام کائنات جسے ایڈ منٹر کیا جا رہا ہو، یہ تصور اس کے ساتھ متناقض بھی نہیں ہو سکتا۔

<sup>42</sup> یہ نظریہ اصلاد تین الکام کے درج ذیل پانچ اصولوں پر مشتمل جو کہ درج ذیل ہیں:

حدوث (Temporality) اس اصول کے مطابق کائنات حادث اور محدود ہے، اور تخلیق، عدم (ex nihilo) سے ہوئی۔ (Al-Alousi 1980:59; Wolfson 1976: 359-372)

غیر مسلسل، مجرد (Discreteness) یہ کہ سپیس، ناٹم، انرجی، مادے اور ہر چیز سے متعلق عرض اپنی ساخت کے اعتبار سے غیر مسلسل اور مجرد اور علیحدہ ہے۔

مسلسل اور مستقل تخلیق (Continual creation) یہ کہ کائنات ہر لمحے از سر نو تخلیق ہو رہی ہے۔ اس نظریے کی بہت اچھی تشریف (al-shamil Fi Usul al-Deen) میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس

نظریہ پر ایک جدید بحث و لفصال (Wolfson: 1976: 392-406) میں موجود ہے۔

عدم جبریت (Indeterminism) یہ کہ قوانین فطرت حادث اور غیر متعین (undetermined) ہیں۔ یہ نظریہ کو انہم تھیوری کی کوپن ہیگن تعبیر کے مثال ہے۔ (see Jammer 1974:259)

سپیس-ناٹم وحدت (space-time integrity) یہ کہ سپیس اپنے طور پر وجود نہیں رکھتی۔ سپیس موجود ہے اگر کوئی جسم موجود ہے، اور ناٹم بھی اسی صورت وجود رکھتا ہے اگر سپیس میں کوئی واقعہ رونما ہو رہا ہو۔ (Altaie 2005)

(Altaie 2008, 154)

<sup>43</sup> Cosmology is the scientific study of the large scale properties of the universe as a whole. It endeavors to use the scientific method to understand the origin, evolution and ultimate fate of the entire Universe. Like any field of science, cosmology involves the formation of theories or hypotheses about the universe which make specific predictions for phenomena that can be tested with observations. Depending on the outcome of the observations, the theories will need to be abandoned, revised or extended to accommodate the data. The prevailing theory about the origin and evolution of our Universe is the so-called Big Bang theory.

<sup>44</sup> A key concept of General Relativity is that gravity is no longer described by a gravitational "field" but rather it is supposed to be a distortion of space and time itself. Isaac Newton's original theory of gravity, c. 1680, in that it is supposed to be valid for bodies in motion as well as bodies at rest. Newton's gravity is only valid for bodies at rest or moving very slowly compared to the speed of light-

<sup>45</sup> یہ معلومات جاوید چودھری کے کالم نمرن کے درویش مطبوعہ ڈیلی ایکسپریس مورخ 21 مئی 2017 سے لی گئی ہیں جو اسے سرن لیبارٹری کے ایک پاکستانی سائنسدان ڈاکٹر مہر شاہ سے ملی ہیں۔ ہم نے انھیں جن ویساٹس یا اتنا بول سے کفرم کر کے پیش کیا ہے ان کا حوالہ دے دیا ہے۔

<sup>46</sup> The so-called quantum size effect describes the physics of electron properties in solids with great reductions in particle size. This effect does not come into play by going from macro to micro dimensions. However, it becomes dominant when the nanometer size range is reached.

([http://www.nanowerk.com/nanotechnology/ten\\_things\\_you\\_should\\_know\\_3.php](http://www.nanowerk.com/nanotechnology/ten_things_you_should_know_3.php))

<sup>47</sup> کو انتم فرکس چھ بندیا دی مفروضوں پر مشتمل ہے۔ 1۔ کائنات میں موجود ہر شے بیک وقت ذرا تی (particle) بھی ہے اور موی (wavelike) بھی۔ زیادہ موزوں الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سب اٹاک آجیکٹ جن سے کو انتم میکن ڈیل کرتی ہے نہ تو پار یکل ہوتے ہیں اور نہ ویلانک، بلکہ ایک تیری قسم ہوتے ہیں جو کچھ خصوصیات موی (فریکونسی، ویولینٹھ وغیرہ) اور کچھ خصوصیات ذرا تی (شاریاتی، اور کسی حد تک لوکائزڈ) ظاہر کرتے ہیں۔ (2) کو انتم فرکس غیر مسلسل (discrete) ہے۔ کو انتم فیلڈ میں تمام آجیکٹ یکساں از جی کے حامل نہیں ہوتے بلکہ ایک بنیادی اکائی اور کسی قدرتی عددا حاصل ضرب ہوتے ہیں۔ اس تمام آجیکٹ علیحدہ، ممیز اور غیر مسلسل ہوتے ہیں۔ (3) کو انتم فرکس احتمالی (probabilistic) ہے۔ یہاں کوئی چیز حقیقی یقینی نہیں ہوتی۔ کو انتم فرکس کا انتہائی حیران کن پہلو یہ ہے کہ کسی کو انتم سسٹم میں کسی تجربے کے رزلٹ کی تیقین کے ساتھ حقیقی پیش نہیں کی جاسکتی۔ کو انتم سائنسدانوں کی کسی تجربے میں ممکنہ نتائج کی پیش نبی ہمیشہ احتمالی ہوتی ہے اور تجربے کو متعدد بار ہر اک تھیوری اور ایکسپریمنٹ کے موقع نتائج کے تقابل کو نتائج کی احتمالی تیقین (probability distribution) کی صورت میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ (4) کو انتم فرکس (بالعموم) بہت چھوٹی ہوتی ہے۔ کو انتم فرکس ہمارے روزمرہ تجربات کے حوالے سے بہت مختلف اور عجیب ہوتی ہے۔ جوں جوں آجیکٹ کا سائز بڑھتا ہے، ایٹمیکٹ چھوٹا ہوتا جاتا ہے۔ اگر آپ کسی کو انتم آجیکٹ کا کو انتم ہمیشہ (quantum behavior) غیر مبہم طور پر دیکھنے کیلئے جتنا اس کا موئمہ بڑھاتے ہیں، اسی نسبت سے اسکی ویولینٹھ کم ہو جاتی ہے۔ (5) کو انتم فرکس جتنی چاہے عجیب اور ہمارے روزمرہ احساس سے مختلف ہو، کوئی پر اسرار چیز (magic) نہیں ہے۔ جو پیشہ بنی اس سے حاصل ہوتی ہے وہ تسلیم شدہ ریاضیاتی تواضع اور اصولوں کے عین مطابق ہیں۔ (6) کو انتم فرکس نان اولک ہے۔ کو انتم فرکس ایسے سسٹم کو تسلیم کرتی ہو جہاں بہت فاصلوں پر واقعے لوکیشنوں پر کی گئی پیمائشیں آپس میں کسی نامعلوم طریقے سے الجھی ہوئی ہوتی ہیں کہ ایک کا رزلٹ دوسرا کی پیمائش کو متعین کرتا ہے۔ یہ صرف اسی صورت ممکن ہے کہ کوئی کامن

فیکن پہلے سے ہی پیا اش کے رزلٹ کو معین کر رہا ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی آجیکٹ آپس میں اس طرح انجھے ہوئے / مربوط (entangled) ہوتے ہیں کہ انگی صحیح لوکیشن کا تعین ممکن نہیں ہوتا۔ (Orzel 2015, 1-2)

## کتابیات

- Al-As'ari, Abu 'L-Hasan 'Ali Ibn Isma'il .Al- Ibaanah an Usul Ad-Diyaanah ( Eng. tr.The Elucidation of Islam's Foundation ترجمہ بندریعہ .Walter C. Klein .(American Oriental Society, New Haven, 1940.
- Al-Ash'ari, Abu'l Hasan ali b. Is-ma'il .The Theolgy of Al-Ash'ari, (Eng, trans. of the Kitab Al-Lu-ma Rishalat Isthisan al-akhawd fi'ilm al-Kalam ترجمہ بندریعہ .S.J. McCarthy . Beyrouth: Imprimerie Catholique, 1953.
- al-Baqi, Muhammad Fuad .The Concordance of the Quran .Lahore:Suhail Acadamy, 1992.
- al-Ghamdi, Javed Ahmed .Surah Al-Baqara .Al-Maward .n.d . [\(حاصل شدہ 7,77\)](http://www.javedahmadghamidi.com/quran/82/P60)
- Altaie, M. B“ .Creation and the Personal Creator in Islamic Kalam ”.Humanity, the World and God, Studies in Science and Theology) Lund University, Sweden (Vol. 11 , .166-149 :(2008)
- Altaie, M. Basil .Has Science Killed the Belief in God ؟Dr. Osama Athar.2015 .
- Bentmann, Erich W .Bridge to Islam .London: George Allen & Unwin, 1953.
- Chittick, William C“ .Wahdat al-Wujud In Islamic Thought ”. The Bulletin ,Jan.- Mar. 1999.
- Fazli, Abdu Hafeez“ .The Qur'an: Creation or Command ﴿ ﴾ ”.The Qur'anic Theology, Philosophy And Spirituality ,Abdul Hafeez Fazli .78-61 ، Lahore: Depart of Philosophy, University of the Punjab Lahore, 2016.

- Fazli, Abdul Hafeez“ .H. A.Wolfson & A. H. Kamali on the Origin of the Problem of Divine Attributes in Muslim Kalam ”.The Qur'anic Theology, Philosophy And Spirituality .Lahore: Dept of Philosophy, University of the Punjab, 2016.
- Fazli, Abdul Hafeez“ .Christian Theologians and Philosophers' View of Omnipotence and Human Freedom ”.Iqbal Review) Iqbal Academy Pakistan) 47,47 (October .68-33 :(2006
- Fazli, Abdul Hafeez“ .Divine Omnipotence and Human Freedom ”.The Qur'anic Theology, Philosophy And Spirituality ,Abdul Hafeez Fazli .— Lahore: Dept of Philosophy, University of the Punjab, 2016.
- Fazli, Abdul Hafeez“ .Free Will and Predestinarian Verses in the Quran ”.The Qur'anic Theology, Philosophy And Spirituality ,Abdul Hafeez Fazli.— Lahore: Dept of Philosophy, PU Lahore, 2016.
- Fazli, Abdul Hafeez“ .H. A. Wolfson and A. H. Kamali on the Problem of Divine Attributes in Muslim Kalam ”.The Qur'anic Theology, Philosophy And Spirituality , Abdul Hafeez Fazli .242-231,— Lahore: Dept of Philosophy, University of the Punjab Lahore, 2016.
- Fazli, Abdul Hafeez“ .Ibn Sina, al-Ghazali and Ibn Taymiyyah on the Origination of the World ”.IJHR)(1)2 February.30-19 :(2013
- Fazli, Abdul Hafeez“ .Iqbal's view of Omnipotence and human freedom ”.The Muslim World.(2005) 95,
- Fazli, Abdul Hafeez“ .Is 'al-Haqq' one of al-Asma' al-Husna ”,!The Qur'anic Theology, Philosophy And Spirituality ,Abdul Hafeez Fazli .399,— Lahore: Dept of Philosophy, PU Lahore, 2016.
- Fazli, Abdul Hafeez“ .Knowledge of Allah's Pleasure (Rada) and Knowledge of Allah's Will (Mashiyat ”.(IJHSS) USA] 19,2 (Special Issue October 2012]: 298- 300.

- Fazli, Abdul Hafeez“ .Qur'an: Khalq ya Amr , (2003 ”.(Taleemi Zawiyay (4)13 .44-35 :(2003)
- Fazli, Abdul Hafeez“ .Qur'anic View of Omnicience and Human Freedom ”.The Qur'anic Theology, Philosophy And Spirituality ,Abdul Hafeez Fazli .<sup>ج</sup> The Department of Philosophy, University of the Punjab Lahore, 2016.
- Fazli, Abdul Hafeez“ .The Qur'anic ontology and staus of al-Haqq ”.The Qur'nic Theology, Philosophy And Spirituality .60-49 ,Lahore: Dept of Philosophy, University of the Punjab Lahore, 2016.
- Ghamdi, Javed Ahmed .Javed Ahmed's Videos .n.d .  
<http://tune.pk/video/3594054/kismat-taqdeer-aur-insan-ka-ikhtiyar-javed-ahmed-ghamidi>.
- Hourani, G.F“ .The dialogue between Al-Ghazali and the philosophers on the origin of the world ”.The Muslim World.(1958) 48
- Hourani, G.F“ .The dialogue between Al-Ghazali and the philosophers on the origin of the world, part-I ”.The Muslim World vol.48.85-184 :(1958) 4, <sup>ج</sup>,
- Iqbal, Muhammad .The Reconstruction of Religious Thought in Islam <sup>ترتیب و تدوین بذریعہ</sup>. Muhammad Saeed Sheikh .Lahore: Institute of Islamic Culture,n.d.
- JACKSON, JASON .Ishmael or Isaac? The Koran or the Bible ?n.d .  
[\(حاصل شد 15 جولائی 2017\)](https://www.christiancourier.com/articles/1161-ishmael-or-isaac-the-koran-or-the-bible)
- Khaliq, Dr. Abdul“ .Problem of the Eternity / Createdness of the Quran in Early Islam' p.10-11 ”.JR(H,(xvi(2.(
- Khan, Maulana Waheedudin“ .Islam on Secular Science ”.The Milli Gazette ) [www.milligazette.com/Archives/15082001/26.htm](http://www.milligazette.com/Archives/15082001/26.htm) 16, <sup>ج</sup>,2 (n.d.(

- Koshal, Basit Bilal"“ .Muhammad Iqbal's Reconstruction of the Philosophical Argument for the Existence of God" in میں ”., Muhammad Iqbal: A Contemporary , Suheil Umer. Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 2012.
- Marmaduke Pickthall .The Glorious Qur'an (Text and Explanatory Translation .(Taj Company Ltd, 1984.
- Michael E. . Marmura“ .Some aspects of Avicena's theory of God's knowledge of particulars ”.Journal of the American Society.304 :(1962) 83.3
- “Attacks on religious belief میں ”.Contemporary Debates in Philosophy of Religion ، Raymond J. VanArragon Michael L. Peterson سے، ترجمہ و تدوین بن ریج سے Raymond J. VanArragon Michael L. Peterson, 1-28 .Blackwell Publishing, 2004.
- Nasr, Seyed Hossein .Ideals and Realities of Islam .London:George Allen & Unwin Ltd, 1966.
- Nasr, Seyyed Hossein“ .The Quran and Hadith as source and inspiration of Islamic Philosophy میں ”. History of Islamic Philosophy part-1 (Seyyed Hossein Nasr and Oliver Leaman (edts .(London: Routledge, 1996.
- Orzel, Chad .Six Things Everyone Should Know About Quantum Physics .2015 ,7 8 .  
<https://www.forbes.com/sites/chadorzel/2015/07/08/six-things-everyone-should-know-about-quantum-physics/#8922ca7d4672>. (2017 ,6 7 ) حاصل شدہ
- Pervaiz, Ghulam Ahmed .Lughat ul Qur'an (Urdu .(vols. 4 (in single binding .لڑکی ( Lahore, Pakistan: Idara Tal'u e Islam, 1984.
- Pike, Nelson .God and Timelessness .London: Routledge & Kegan Paul, 1970.
- Shahrastani, Muhammad b. Abd al Karim“ .Muslim Sects and Divisions میں ”.Kitab al-Milal wa'l Nihal ,Muhammad b. Abd al Karim Shahrastani سے، ترجمہ بن ریج J.G. Flyni A.K.Kaz .London: Kegan Paul International, 1994.
- Sheikh, M. Saeed .Studies in Muslim Philosophy .Kashmiri Bazar Lahore: Sh. Muhammad Ashraf, 1974.

- Swinburne, Richard .The Coherence of Theism .Oxford: Clarendon Press, 1977.
- Tate, Karl .Alternatives to the Big Bang Theory Explained
- (Infographic .2014 ,2 21 .(<http://www.space.com/24781-big-bang-theory-alternatives-infographic.html>).(2017,6 حاصل شدہ 7)
- The Physics of the Universe: Cosmological theories through history .n.d .  
<http://physicsoftheuniverse.com/cosmological.html>. (
- Wolfson, H.A“ .Avicena, Al-Ghazali and Averros on divine attributes ”.Homenaje a Miltas vallicrosa II.(1956)
- —Religious Philosophy: A Group of Essays .Cambridge: The Belknap Press of Harvard University Press, 1961.
- .—The Philosophy of the Kalam .Cambridge: Harvard University Press , 1976.
- Wollack, Dr. Edward J .NASA .2010 ,4 16 .  
[https://map.gsfc.nasa.gov/universe/bb\\_cosmo.html](https://map.gsfc.nasa.gov/universe/bb_cosmo.html).(2017,6 حاصل شدہ 7)
- .—NASA .2012,12 21 .[https://map.gsfc.nasa.gov/universe/uni\\_age.html](https://map.gsfc.nasa.gov/universe/uni_age.html).(2017,6 حاصل شدہ 6)
- Yousaf Ali, Abdullah .An English Interpretation of the Holy Quran .Lahore Pakistan: Sh. Muhammad Ashraf, 1934.
- احمد، ڈاکٹر اسرار۔ "خلافت کے اقتصادی نظام کی اصولی اساس۔" ندائے خلافت۔ (مرکزی انجمن خدام القرآن) 1، نمبر 4۔
- احمد، ڈاکٹر نعیم۔ ایام حسیب۔ شعبہ فلسفہ پنجاب یونیورسٹی لاہور، 2002.
- احمد، ڈاکٹر نعیم۔ "ایام حسیب۔" شعبہ فلسفہ پنجاب یونیورسٹی لاہور، 2003ء۔ n.d .
- الازہری، پیر کرم شاہ۔ ضیاء القرآن۔ 1 جلد۔ لاہور: ضیاء القرآن پبلیکیشنز، 1978۔
- الغزالی، ابو حامد۔ الاقتصاد في الاعتقاد .n.d .
- بریلوی، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا غانش، سید محمد نعیم الدین۔ کنسٹ الائیان فی ترجمۃ القرآن، تفسیر حنزائی۔
- العرفان۔ n.d .<http://quranpdf.blogspot.com/2013/03/kanzul-imaan-tarjumatul-qur'an.html> (حاصل شدہ 15,7)

- خان، ببابا۔ ”کابل کوٹھا، لے بابا بابا میں، شب دیدہ۔“ n.d.
- شیدائی، ڈاکٹر عبدالحق، پروفیسر یوسف۔ مسلم فاف۔ سینئر، ارادہ بازار لاہور: عنزہ پبلشرز، 1988۔
- عبد القادر، ڈاکٹر قاضی کشاف۔ اصطلاحات فاف۔ (اردو۔ انگریزی)۔ کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی پرنور شی، 1994۔
- عرب، نقیر سید محمد رفائل۔ تفسیر رفای۔ دینی کتب خانہ، 38 - اردو بازار لاہور。n.d  
<https://sites.google.com/site/tafseererafai/home>
- فاضلی، حضرت فضل شاہ اور محمد اشرف۔ تفسیر فاضلی جلد دوم، لاہور: فاضلی فاؤنڈیشن، 1996۔
- فاضلی، حضرت فضل شاہ، محمد اشرف۔ ”تفسیر فاضلی منزل چہارم۔“ فاضلی فاؤنڈیشن لاہور، 2012۔
- —۔ تفسیر فاضلی منزل سوم، بار دوم، 7 نسخے، لاہور: فاضلی فاؤنڈیشن لاہور، 2010۔
- —۔ تفسیر فاضلی، سینئر، 2 جلد، 7 نسخے، لاہور: فاضلی فاؤنڈیشن، 1996۔
- —۔ تفسیر فاضلی منزل اول، 1 جلد، 7 نسخے، لاہور: فاضلی فاؤنڈیشن، 1982۔
- —۔ تفسیر فاضلی منزل اول، سینئر، 7 نسخے، لاہور: فاضلی فاؤنڈیشن، 1992۔
- —۔ تفسیر فاضلی منزل ششم، لاہور: فاضلی فاؤنڈیشن，n.d.
- —۔ تفسیر فاضلی منزل هفتم، 7 نسخے، فاضلی فاؤنڈیشن، 1998۔
- فاضلی، عبد الحفیظ۔ ”تحلیق، صدور اور ہم ازیت۔“ اقبالیات (اقبال آکیڈمی لاہور)، جولائی 1988: 181-199.
- فاضلی، عبد الحفیظ۔ ”قدرت مطلق اور انسانی آزادی۔“ الحکمت (شعبہ فلسفہ جامعہ پنجاب) 20 (2000)۔
- فاضلی، عبد الحفیظ۔ ”کیا اللہ الدھر ہے؟“ الحکمت (شعبہ فلسفہ جامعہ پنجاب لاہور) 29 (2009): 1-16.
- فاضلی، عبد الحفیظ۔ ”مسئلہ ذات و صفات۔“ اقبالیات (اقبال آکیڈمی پاکستان)، جولائی 1999: 27-43۔
- فتح اللہ گلن، محمد۔ ”قدیر: کتاب و سنت کی روشنی میں۔“ ترتیب و تدوین بذریعہ نظر ثانی شازیہ یعقوب، ترجمہ بذریعہ محمد غالہ سیف، اسلام آباد: ہماری پبلیکیشنز، 2009۔
- کمالی، عبد الحمید۔ ”نائبیت خود آگئی اور خودی کی تشكیل۔“ اقبال ریویو (اقبال کادمی پاکستان)، نمبر جولائی 1963، (1963)۔
- کمالی، عبد الحمید۔ ”مقولہ صفات اور تصور امام۔“ اقبال ریویو (اقبال کادمی پاکستان لاہور)، جولائی 1964: 5-13۔
- مسلم، امام۔ ”صحیح مسلم شریف مع شرح نووی (محضیر)۔“ ترجمہ بذریعہ علامہ وحید الزماں، مشتاق بک کارنر، اردو بازار، لاہور، 1995۔

- 
- ندوی، مولانا محمد حنفیف۔ ”اپنے تیسیہ کا تصور صفات۔“ پاکستان مسلموں فیکل حبیرنی (پاکستان فلسفہ کا نگریں)، جنوبری 1962
  - ہائنس، سٹیون۔ وقت کا سفر۔ ترجمہ بذریعہ ناظر محمود۔ لاہور: روپنامہ، 1992۔